ماہنامہ

شہاب

حیدرآباد دکن

شہاب

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

قیمت سالانہ

جلد ۱۵ اسفندار ۱۳۵۶ف م جنوری ۱۹۴۷ء نمبر ۴

ادبیات ایران قبل اسلام و بعد اسلام

جناب الف-ح صاحب ایم-اے (علیگ)

بسلسلۂ گذشتہ

بہرحال سلجوقی عہد کی تصانیف میں حسب ذیل تصانیف جو تصوف-تذکرہ و تاریخ-سیاست و اخلاق-ادب اور طب پر مشتمل ہیں-خصوصیت سے قابل ذکر ہیں-

۱-کشف المحجوب-اسرار التوحید-تذکرۃ الاولیاء (تصوف)

۲-زین الاخبار-تاریخ بیہقی-راحت الصدور (تذکرہ و تاریخ)

۳-سیاست نامہ-قابوس نامہ-کیمیائے سعادت (سیاست و اخلاق)

۴-چہار مقالہ-حدائق السحر-مقامات حمیدی-کلیلہ و دمنہ (ادب)

۵-ذخیرہ خوارزم شاہی (طب)

چنگیزی یلغار اور ادب ایران

ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں "تمرجین" نامی تاتاری نے گوشہ جبل سے اٹھ کر چنگیز خاں کا لقب اختیار کیا-اور ایشیائے وسطی-ایران و عراق وغیرہ ممالک کو اپنے زیر نگیں کر کے تقریباً چھ ہزار میل تک اپنی سیادت قائم کی بلکہ اسلامی تمدن کو پامال کرنے کی پوری کوشش کی-یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ ماوراء النہر میں حکمرانی کرتا تھا اور اتابکوں کی فارس میں حکمرانی تھی-بہرحال یہ دونوں نام نہاد حکمران اور ان کی حکمرانی چنگیزی طوفان کی نذر ہو گئیں-نہ صرف علماء و صوفیائے وقت نذر طوفان ہو

بلکہ ان کے علمی و ادبی کارنامے بھی تاتاریوں کی وحشت اور بربریت پر پروان چڑھ گئے۔ کتابیں اور کتب خانے جلا دیے گئے۔ مصنفین تہہ تیغ کئے گئے۔ اور عمارات مسمار کی گئیں۔ اگر چنگیزی قیامت خیز ہنگامہ نے ممالک اسلامیہ کی علمی فضا کو ملیامیٹ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن یہ وہ لازوال چیز تھی جس کو چنگیزی بربریت فنا نہ کر سکی، بلکہ اس کے برعکس بربریت اور سفاکی اس لازوال چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی اور درندگی انسانیت سے بدل گئی۔ غرضکہ یہ ادعا مبالغہ نہیں ہے کہ انہیں اسلامی علوم کی یہ برکات تھیں کہ درندے کی اولاد نے انسانیت کا جامہ اختیار کیا۔ اور سلطان غازان نے اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ مغلوں میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا

ہلاکو اور اس کے بعد کے عہد کے چند مصنفین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو تاتاریوں کی حکومت کے دست راست تھے۔ مثلاً خواجہ نصیر الدین طوسی مولف اخلاق ناصری۔ وزیر ہلاکو۔ خواجہ شمس الدین محمد جوینی صاحب دیوان وزیر سلطان اباقا۔ خواجہ عطا ملک جوینی مصنف تاریخ جہانکشا۔ رشید الدین فضل اللہ وزیر سلطان غازان

تیموری حملہ اور ادب فارسی

چنگیزی طوفان کی تلافی ہوئے ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ دوسرے مغل نے آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی تمدن پر دھاوا بول دیا۔ اور وہ تیمور تھا۔ جس کے خاندان نے دسویں صدی ہجری تک ایران پر حکمرانی کی اور جو آخر کار صفویہ خاندان کے ظہور پر ختم ہو گئی۔

تیموری یورش بھی چنگیزی طوفان سے کسی حالت میں کم نہ تھی لیکن باوجود اس قتل و غارت اور تباہ کاریوں کے جو تیمور کے ہاتھوں ممالک اسلامیہ میں رونما ہوئیں اور جن کی وجہ سے علوم و ادب پر بھی ایک حد تک وبال آیا۔ تیموری یلغار بھی اس لازوال چیز کو فنا نہ کر سکا۔ تیمور فنا ہو گیا۔ اس کی دستبرد فنا ہو گئی لیکن علوم باقی رہے۔ حاملان علم و ادب فنا ہو گئے لیکن وہ اپنی علمی و ادبی حیات کو آئندہ نسلوں کی فلاح و بہبود کے لئے چھوڑ گئے۔ جو تیموری چنگل سے بچے وہ اپنے علمی ذخیرے جو کتابوں اور سینوں دونوں میں محفوظ تھے۔ ساتھ لے کر قدر دانوں کے پاس پناہ گزیں ہوئے اور وہاں پہنچ کر اپنے علمی جوہر دکھائے۔ اس کے علاوہ تیمور میں جہل و بربریت اس درجہ نہ تھی جو چنگیز میں تھی و نیز اس میں خود تھوڑا بہت علمی ذوق تھا۔ جو آئندہ چل کر اس درجہ پر پہنچا

تھا کہ علماء اور ادیبوں کے مجالس منعقد کر کے وہ ان سے لطف اندوز بھی ہوا کرتا تھا۔ شرف الدین علی یزدی کو اسی نے تصنیف و تالیف کے لئے مقرر کیا تھا۔ تیمور کے بعد اس کی اولاد و احفاد نے علوم کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ ان کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی اولاد میں الغ بیگ تھا جو علماء اور ادیبوں کی صحبت سے مستفید ہوا کرتا تھا۔ عالم بھی تھا اور علم پرور بھی۔ بالخصوص علم نجوم میں ایک حد تک وہ کامل تھا۔ چنانچہ "زیچ الغ بیگی" اس کی اپنی تصنیف ہے اس کا بھائی بایسنقر نہایت ادیب تھا مورخین اور ادیبوں کی صحبت سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ والی خراسان ابو الغازی سلطان حسین نے چالیس سال تک حکومت کر کے علوم و ادب کو رواج دیا۔ مولانا جلال الدین رومی سعدی حافظ۔ جامی۔ دولت شاہ۔ ملا حسین واعظ کاشفی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے شعرا متصوفین علماء مورخین تیموری عہد کے یادگار ہیں۔ مصوروں میں بہزاد و شاہ مظفر۔ خوش نویسوں میں سلطان علی مشہدی۔ ابو الغازی کے علم پرور اور ہنر پرور عہد کے پیداوار ہیں غرضکہ "ادبیات ایران" کی ترقی پر دوسو سال کے تیموری عہد کا بہت بڑا حصہ ہے چونکہ ایران ایک مدت سے تاتاریوں کا جولانگاہ بن چکا تھا۔ اس لئے یہ قطعاً ناممکن تھا کہ فارسی ادب تاتاری زبان اختلاط اور اثر سے محفوظ رہتا۔ اس کے علاوہ زبان کی ترقی کا راز اس میں نہیں ہے کہ اس میں کسی غیر زبان کے الفاظ نہ آنے پائے بلکہ اس کے برعکس دوسری زبان کے الفاظ کی ترقی کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

عربی ادب نے فارسی زبان پر جو کچھ اثر کیا وہ عیاں ہے لیکن تاتاری اور ترکی الفاظ نے بھی فارسی ادب میں جگہ پائی اور ان میں گھل مل کر وہ گویا خالص ایرانی بن گئے۔ چنانچہ تاتاری "اردو" "یلغار" "کوچ" "یتما" "ایلچی" "تمغا" "خان" "خاقان" "خاتون" وغیرہ وغیرہ نے فارسی پر چھاپہ مار کر ایران میں چھاؤنی چھائی اور فارسی سے وہ اختلاط پیدا کیا کہ مشکل ہی اجنبیت کا اظہار ہو سکتا ہے۔

ادب ایران اور ہندوستان یوں تو فارسی ہندوستان میں تیموری گھرانے کے آنے سے بہت پہلے آچکی تھی۔ لیکن وہ آنا پردیسیوں کا سا آنا تھا۔ البتہ بابر اور اس کے بعد تیموری شاخ نے اس کو یہاں لا کر بسادیا اور سنسکرت کی وہ بہن جو ایک زمانہ سے جدا تھی ہندوستان میں آکر اس طرح سے چمکی جس طرح کہ اپنے پیدائشی ملک میں چمک

چمک رہی تھی۔ بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ چمکی۔ بہرحال سکندر لودھی نے قدم بہ قدم تقریبًا (۷۰) سال کے بعد اکبر اعظم کے عہد نے باشندگان ملک کو بالخصوص اس طرف متوجہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ ... ہندوؤں کو بھی اتنا گرویدہ بنا دیا ... اہل ہند کے فارسی تصانیف اس کی جمہوریت اور مقبولیت کے شاہد ہیں۔ صرف ... کاروبار فارسی زبان میں ہوتا تھا بلکہ باہمی گفتگو۔ یعنی مراسلت۔ نیاد لہ خیالات ... افسانہ نویسی۔ تاریخ نویسی سب فارسی میں ہوتی تھی اور اس طرح سے جلیل القدر مصنفین اور شعرا۔ ہندو مسلمان نے اپنے کمال سے فارسی کے مرتبہ و بلندی بہت بلند تر کر دیا۔ اگر اب فارسی کا دور دورہ نہیں رہا جو شاہان مغل کے زمانہ میں تھا۔ لیکن پھر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی کا ہندوستان کی سرزمین سے اخراج ہو گیا ہے۔ علمی مسند پر اب بھی اس گئے گذرے زمانہ میں اس کو ممتاز جگہ ملتی ہے جتنی کہ موجودہ زمانہ کے یونیورسیٹیوں میں بھی "کرسی" کے وہ مستحق ہے اور مغربی ادبیات و علوم کے دوش بدوش درس گاہوں میں جلوہ افروز ہے۔

سنہ عیسوی کے متعلق دلچسپ بات

۱- کوئی صدی - چہارشنبہ - جمعہ اور یکشنبہ سے شروع نہیں ہو سکتی -

۲- کسی سال کی جنتری بیسویں برس میں صحیح طور پر استعمال ہو سکتی ہے -

۳- اکٹوبر کی پہلی تاریخ کو ہمیشہ وہی دن پڑیگا جو جنوری کی پہلی کو ہوگا - اور اسی طرح پہلی تاریخ یکم جولائی سے یکم سپٹمبر اور یکم ڈسمبر سے بلحاظ دن کے مطابق ہوں

۴- فروری - مارچ اور نومبر ہمیشہ سے ہر سال ایک ہی دن شروع ہوتے ہیں -

۵- مئی - جون - اگسٹ - متفرق دنوں سے شروع ہوتے ہیں اور کبھی ... مطابقت نہیں ہوتی -

۶- ہر سال کا پہلا اور آخری دن ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے -

یعنی اگر یکم جنوری کو دوشنبہ ہے تو ۳۱ ڈسمبر کو بھی ضرور دوشنبہ ہی ہوگا

علم ادب قدیم وجدید

جناب مولوی ضیاء اللہ صاحب اختر بی اے (امرتسری)

میں اب تک اسی خوش فہمی میں ادب قدیم وجدید کی نسبت یہ خیال کرتا رہا کہ یہ
یہ ایک ہنگامی بحث ہے ایک روز ختم ہو جائے گی لیکن رسالہ "نیرنگ خیال" (لاہور) عید نمبر نے
میری آنکھیں کھول دیں۔ کہ یہ تو ایک منظم سازش ہماری ادبی زبان اردو کے خلاف ہے حضرت
عطار د حیدر آبادی کی بالغ نظری نے اسے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اردو جو گذشتہ
نسلوں کے بہترین دل و دماغ کی کاوش سے موجودہ صورت میں رونما ہوئی اب چند روز کی مہمان
ہے۔ عید نمبر میں دو مضامین "علم ادب قدیم اور تعلیم جدید" اور "آل انڈیا ریڈیو" جاذب
توجہ ہوئے۔ یہ نگارش دو ایم اے حضرات کی ہے۔ بظاہر ان میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔
لیکن وہی خانہ خراب نام نہاد ترقی پسند علم ادب جدید دونوں میں کارفرما ہے۔ مجھ سے رہا
نہ گیا اور دونوں پر ایک تبصرہ لکھ کر جناب مدیر کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس کے بعد کچھ اور باتیں
بھی ذہن میں آئیں جو شہاب کے لئے اٹھا رکھیں۔ سے

ز رقیب دیو سیرت بخدائے ما پناہ ست — مگر آں شہاب ثاقب مددے کند سہا را

اول الذکر مضمون میں فاضل مقالہ نویس نے اپنا نظریہ یہ پیش کیا ہے کہ علم ادب اور تعلیم
دو جدا جدا ماحول ہیں۔ نصاب تعلیم میں مخرب اخلاق سوقیانہ زبان میں مضامین کا داخلہ
مذموم ہے۔ اگرچہ ادبی لحاظ سے ان میں فنی خوبی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے، مگر وہ ازروئے [illegible]
فاضل مضمون نگار کا نظریہ "گنج دارد و مرنجہ" کے ہم معنی ہے۔ لیکن تمام بحث کا نقطہ اور اس
کی تان اس کلیہ پر ٹوٹتی ہے۔ تو پھر ترقی پسند علم ادب جدید کو کیوں ناپسند کیا جائے جب کہ وہ

عریانی اور فحش نگاری ادب قدیم میں بھی ہے اور یہ کہ اس کی تمام تر ذمہ داری ادب قدیم ہی پر عاید ہوتی ہے جس نے اس کی ابتدا کی۔ تائید میں فسانۂ عجائب اور چہار درویش کے چند فقرے، ناسخ مرحوم کے دو شعر اور مثنوی گلزار نسیم سے چند ابیات پیش کئے گئے ہیں، معلوم نہیں کہ فاضل مضمون نگار نے نظیر اکبرآبادی کی ہزلیات اور جعفر دہلوی کی زٹلیات اور سودا اور انشا کی ہجویات کیوں نظر انداز کر دیں۔ کم سے کم مزید تائید ہو جاتی۔ نظیر کی ہزلیات جن کو ترقی پسند حضرات آب و تاب سے شائع کر رہے ہیں اور جن کی تعریف زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں ان کی نسبت شیفتہ "گلشن بیخار" میں حقارت آمیز اشارے کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "یہ سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں" اور نظیر اس لائق نہیں کہ "ایسے زمرہ شعرا میں جگہ دی جائے" معلوم نہیں کہ یہ روایت کہاں تک صحیح ہے کہ جب حضرت نظیر لکھنو میں وارد ہوئے تو انشا نے ایک قطعہ میں ان کا استقبال کیا۔ (یہ قطعہ عریاں ہے)

غالباً یہ کسی اور ہی ہزل گو کی توانح میں تاریخ لکھی گئی ہوگی، لیکن نظیر پر بھی چسپاں خوب ہوتی ہے، نظیر کے متعلق میرا ایک مضمون شہاب میں شائع ہو چکا اس کی نسبت کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اس کے اشعار سوقیوں کی زبان پر اس لئے جاری ہیں کہ اس کی زبان سوقیانہ ہے۔ زٹلیات کی اشاعت تو قانوناً ممنوع ہے، رہا ہجویات کا سوال یہ استادان فن کے دامن کمال پر بدنما دھبہ ہے اور ان میں کوئی فنی خوبی نہیں منظوم فحش نگاری ہے اور اہل نظر نے ہمیشہ ناپسند کی ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے ترقی پسند ادب کی عریانی کے جواز میں یہ ایک دلیل پیش کی ہے، لیکن یہ الزامی جواب ہے، اگر ایک گناہ مجھ میں ہے تو وہ کار ثواب اس لئے تو ہو نہیں سکتا کہ "در شہر شما نیز کنند"۔ لیکن فاضل مضمون نگار ایک غلط فہمی میں الجھے ہوئے ہیں، صرف یہی ایک بے حیائی ہی نہیں جس کے لئے ترقی پسند علم ادب ناپسند کیا جاتا ہے، اس کے وجوہ اور بھی ہیں اور زیادہ تر یہی ہیں اور اس کی تشریح حضرت عطارد (شہاب بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء) فرما چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ علم ادب تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے، علمی اور تفریحی اور لطیف، اول الذکر میں علوم و فنون کی تمام تصنیفات و تالیفات شامل ہیں۔ تفریحی میں قصص و حکایات اور ناول اور ڈراما وغیرہ داخل ہیں۔ ادب لطیف شعر و شاعری سے تعبیر ہوتا ہے۔ اس میں ہر ایک قسم کا منظوم کلام آ جاتا ہے لیکن ہر ایک قسم کے لئے مقدم شرط صحت زبان اور لطافت بیان ہے اور اس سے کوئی ادیب عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک

اس کو علم صرف ونحو واشتقاق ولغت وبیان ومعانی اورعروض وقافیہ سے مناسب حد تک
واقفیت نہ ہو۔ اور یہی وہ بات ہے جس سے ترقی پسند علم ادب بے بہرہ ہے اور اسی وجہ سے
ناپسند کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں اردو کی حیثیت ثانوی ہے اور کالجوں
میں سرے سے مفقود ہے، حکومت کی زبان انگریزی ہے اور اسی کی طرف توجہ تمام تر لگی ہوئی ہے،
اس لئے طلباء جب فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں تو ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایسی بالعا
میں اظہار خیالات کریں جو ان اوصاف کی حامل نہیں ہو سکتی جس کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی کا
نام ان حضرات نے ترقی پسند علم ادب رکھ دیا۔ مسٹر "بکل" اپنی تاریخ تہذیب وتمدن میں
لکھتا ہے کہ اس کے ارتقاء کے ساتھ فنون لطیفہ کا زوال لازمی امر ہے، لیکن یاران شاطر اس کو
"ترقی" کہتے ہیں جو معکوس ہے۔

آل انڈیا ریڈیو پر جو دوسرے فاضل مقالہ نویس نے لکھا ہے اس کے ایک ایک حرف سے
ہمیں اتفاق ہے، یہ ایک خطرناک آلہ کار ہے جس کی زد براہ راست اردو پر پڑتی ہے نشریات
کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان راگ اور راگنوں سے قطع نظر جن میں پختگی پائی جاتی ہے، فلمی گانے،
گیت، غزلیں، تقریریں، ڈرامے، فیچر ہی ہوتے ہیں اور ان کی زبان وہی ترقی پسند علم ادب
کی ہے اور ان کی تصنیف میں زیادہ حصہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہونہار فارغ التحصیل
طلباء کا ہے، وہ نسل جو ادب قدیم کو پسند کرتی ہے یہ سویر ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ یہ
ناخلف لے رہے ہیں اس حقیقت پر نظر کرتے ہوئے دردمند فاضل مضمون نگار نے یہ مشورہ
دیا ہے کہ اردو کی حفاظت اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہمارے غیور ادیب وشعرا آل انڈیا ریڈیو کا
مکمل مقاطع کریں، جب یہی غیور ادیب وشعرا ہی اپنے ہاتھوں سے خانہ خرابی میں لگے
ہوئے ہوں تو مقاطع کون کرے گا۔ ایک دوست سے میں نے پوچھا کہ خداداد قابلیت کو اس
بیہودہ نگارش پر کیوں ضائع کر رہے ہو، پہلے ٹوٹا لنا چاہا، اصرار پر کہا کہ بازار ادب
میں اس کی مانگ زیادہ ہے اور اسی کی قدر وقیمت ہے۔ میں سمجھ گیا کہ سوال پیٹ کا ہے "روٹی
تو کما کھائیں ـــــ" کیا ہم حیدرآباد کے محکمہ نشریات کے ارباب حل وعقد کو بھی مشورہ دیں کہ
فلمی گانوں، گیتوں وغیرہ کا مکمل مقاطع کریں جو ان کا اخلاقی فرض ہے تو قابل قبول ہوگا اور
اگر جواب نفی میں ہو تو اردو کی سرپرستی کا دعویٰ فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور بڑی خرابی
یہ ہے اس کا مذموم اثر نوجوان طبقہ کے اخلاق وعادات پر ہو رہا ہے جس کا سد باب اگر آج نہ ہوا تو شاید
گرفتنی بہ پیل "

استاد داغ پر نکتہ چینی

جناب عطارد صاحب

اردو شاعری کے "دو آخری تاجدار امیر و داغ" کے بعد نواب فصاحت جنگ امام الفن حضرت جلیل علیہ الرحمہ نے اردو ادب و شعر کی جو خدمت کی وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گی آنیوالی نسلیں اوس سے استفادہ کرتے رہیں گے - ہندوستان کے طول و عرض میں اس پائے کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا حالانکہ آج شاعری کا گھر گھر چرچا ہے - مرحوم کی طبع خداداد کا جوہر ہماری تعریف سے مستغنی ہے - ان کی زبان دانی اور سخن سنجی کی داد وہی دے سکتا ہے جو اس کوچہ کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہے -

قدر گوہر شہ بداند یا بداند جوہری

ان کے انتقال پر ہندوستان کے طول و عرض میں صف ماتم بچھ گئی مرثیے لکھے گئے تاریخیں لکھی گئیں مضامین طبع ہوئے لیکن ارباب مجلہ عثمانیہ نے جلیل نمبر شائع کرکے ایک طرف امام الفن کے مختلف اصناف سخن پر ان کی قدرت بیان اور لطف زبان سے اصحاب ذوق کو محظوظ ہونے کا اور دوسری طرف نوآموزان فن کے استفادے اور رہبری کا سامان فراہم کیا اچھے اچھے مضامین جمع کئے کسی نے حسن و عشق کے کسی نے جدید شعری رجحانات کے کسی نے خمریات کے تو کسی نے اخلاقیات کے کسی نے لغت کے منتخب اشعار پر بحث کی کسی نے تاریخ گوئی کے محیر العقول ملکہ کو نمایاں کیا کسی نے حکمت و تصوف کے اشعار کی قابلانہ تشریح فرمائی - کسی نے استاد داغ اور حضرت امام الفن کے متحد المضامین اشعار پر

رائے زنی کی غرض یہ ایک مختلف النوع مضامین کا عمدہ مجموعہ ہے جس سے لایق مضمون نگاروں کی سخن فہمی اور سخن شناسی کے جوہر بھی کھلتے ہیں - اس مجموعہ مضامین میں ایک عجیب و غریب مضمون مولوی محمد احمد صاحب بی - اے عثمانیہ کا بھی ہے جنھوں نے اس ضمن میں استاد داغ کے کلام پر دل کھول کر اعتراضات کئے زبان کے عیوب بتائے اور بیان پر نکتہ چینی کی - ممکن ہے کہ استاد داغ کا کوئی شعر کسی کے ناپسند ہو لیکن شخصی ناپسندیدگی اور نکتہ چینی میں بڑا فرق ہے اور یہ نکتہ چینی بھی اس استاد فن کے کلام پر ہے جس کا یہ دعویٰ ہے کہ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے -

ان تمام اعتراضات کو بغور پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب معترض فن شاعری کے مبادیات سے ناواقف ہیں اور ساتھ ہی زبان اردو پر آپ کو عبور نہیں ہے مجھے اجازت دیجیے کہ رفع اشتباہ کے لئے میں بھی کچھ عرض کروں میں صرف انہیں اشعار پر بحث کروں گا جن میں غلطی بتائی گئی رہا یہ امر کہ کسی شعر میں جناب معترض کو کوئی لطف کا پہلو نظر نہیں آتا تو مجھے اوس سے غرض نہیں کیونکہ اس کا تعلق ذوق سلیم سے ہے -

میری آہیں رقیبوں کی دعائیں یہ فوجیں لڑ رہی ہیں آسماں سے

اعتراض - رقابت ثابت کرنے کے بعد دعا کی شروعات ہی کیا رہی قطع نظر اس کے دعاؤں اور آہوں کو آپس میں لڑنا چاہئے کہ مقتضائے رقابت بھی ہوسکتا ہے آسماں پر دونوں طرف سے فوج کشی ہوئی تو آہوں اور دعاؤں میں اتحادی فوجوں کی حالت پیدا ہوجائیگی رقابت باقی نہ رہے گی -

جواب - جناب معترض کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ شعر کا یہ مسلمہ مفروضہ ہے کہ آسمان عشاق کا دشمن ہے اسی لئے آسماں کی تشبیہات میں دشمن یار - کجرو - بے وفا - ظالم - سنگدل - بدگو بیر وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں یہ بھی واضح رہے کہ عشاق اور رقیب جس مقصد کے لئے آہیں اور دعائیں کرتے ہیں وہ کوئی قابل انقسام شے نہیں ہوتی لہذا آہیں اور دعائیں متحد ہوکر آسمان پر فوج کشی کریں یا علیحدہ فوج کشی کی غرض یہ ہے کہ دونوں میں سے آسمان کو جو پہلے شکست دیگا وہ دوسرے فریق سے پہلے پہنچ جانے میں کامیاب ہوجائیگا اس تصریح کے بعد بھی شعر کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو اسے سمجھ کا قصور کہئے شعر میں تو غلطی نہیں ہے -

چلے لے راہ اگر راہبر شوق پہنچ جاتی ہے منزل کارواں سے

اعتراض - راہبر کو لے راہ کہدیا جائے تو وہ راہبر نہیں رہا - پھر کارواں کا منزل سے پہنچ جانا ایسی بات ہے کہ

جس کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔

جواب - رہبر کی بے راہ روی معلوم ہونے کے بعد اوس کو جو چاہے کہئے یہ تو اظہار واقعہ ہے شوق خود رہبر ہے یا شایق شوق کی رہبری کرتا ہے۔ بہرحال وفور شوق میں بے راہ روی مستبعد نہیں جس کو اس کا تجربہ ہے وہی ان باتوں کو سمجھ سکتا ہے کوچۂ عشق کی راہوں سے خضر بھی واقف نہیں۔ وفور شوق میں عشاق حصول مقصد کا غلط طریقہ بھی اختیار کر جاتے ہیں اور یہ واقعہ ہے۔ جو اس منزل کی راہ رسم سے واقف نہیں وہ اس شعر کے معنی کیونکر سمجھ سکیگا۔ مصرعہ ثانی جن الفاظ سے مرکب ہے اور جن استعارات کا استعمال ہوا ہے اون سے وہی لطف اٹھا سکتا ہے اور اثر بھی اوسکے دل پر ہو سکتا ہے جو زبان اردو کی محاورات سے واقف ہے۔

کونسا طائر گم گشتہ اسے یاد آیا　　دیکھتا بھالتا ہر شاخ کو صیاد آیا

اعتراض: "جو طایر دام میں نہ آیا ہو اوسے گم گشتہ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلاش صید میں دیکھتا بھالتا ہر شاخ کو صیاد آیا علاوہ اس کے جو طایر پھنس کر نکل گیا ہو اسے گم گشتہ کہنا درست نہیں۔"

جواب - یہ عجیب بحث ہے جو طایر پھنس کر نکل گیا ہو اسے گم گشتہ کہنا درست نہیں تو آخر اسے کیا کہیں گے اور گم گشتہ کے معنی کیا ہیں کچھ تو بتایا ہوتا۔ فارسی میں لفظ گم کے ساتھ مختلف مصادر کا استعمال ہوتا ہے گم گشتن اور گم شدن قریب المفہوم ہیں جن کے معنی ہیں غایب ہو جانا خواہ دام میں پھنس کر نکل جائے یا دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جائے ع زر نشان طشتے بمغرب شام گہ گم گشتہ بود (نظام) ع گم گشتہ ام زخویش وکسم در سراغ نیست (شاپور) ع مراجوئے کہ عنقا ز جستنم گم شد (صادق گیلانی) دیکھئے ان مصرعوں میں گم گشتن اور گم شدن غائب ہو جانے اور نظر سے اوجھل ہو جانے کے معنی میں مستعمل ہے۔ زیر نظر شعر میں شاعر تعجب سے پوچھ رہا ہے کہ کونسا طایر گم گشتہ یاد آیا صیاد کے پھندے میں تو سب ہی گرفتار ہیں آخر وہ کون ہے جو غائب ہو گیا جس کی تلاش میں یہ اہتمام ہے کہ صیاد ہر شاخ کو دیکھتا بھالتا آ رہا ہے۔

افسوس ہے کہ ٹوٹ پڑے گا وہیں فلک　　ہم جان توڑ کر جو کہیں گھر بنائیں گے

اعتراض: "افسوس ہے کہ اس شعر میں "افسوس" کھلی ہوئی بھرتی ہے گھر بنانے اور فلک ٹوٹنے سے پہلے افسوس کیا گیا۔"

اردو زبان سے کامل واقفیت نہ ہونے کی یہ ہی ایک مثال ہے۔ فلک اور آسمان مرادف الفاظ ہیں آسمان کی دراندازی اور بیوفائی مسلمہ ہے۔ جو چیز پہلے سے معلوم ہو یا جس کا واقع ہونا یقینی ہو ایسے موقع پر بھی لفظ افسوس کا استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں افسوس یہ بیمار جانبر نہ ہو سکیگا حالانکہ بیمار ابھی زندہ ہے۔ شاعر کہتا ہے فلک کی کجروی اور دغا بازی معلوم ہے ہم جان توڑ کر کہیں گھر بنائیں بھی تو فلک تو وہیں ٹوٹ پڑے گا اس پیش آمدنی واقعہ پر افسوس کیا گیا

جو بالکل صحیح ہے اس کو بھرتی کا لفظ کہنا سراسر غلط ہے ۔

وہ رفتہ رفتہ شہر کو محشر بنائیں گے		بے کار جائیگا نہ کوئی فتنۂ خرام

اعتراض ۔ " شہر کی کوچہ گردی خرام ناز کے لئے نازیبا ہے بلکہ اہانت یہ فعل عشاق کا ہے "

جواب ۔ فاعل خرام ناز نہیں خرام ناز کا فتنہ ہے کوچہ گردی کا کیا محل ہے ۔ فتنہ تو ہر قدم کے ساتھ ہے ۔ رفتہ رفتہ کے الفاظ پیش نظر ہوتے تو یہ مہمل اعتراض نہ ہوتا ۔

مجھ کو یہ چاہ بری تجھکو یہ صورت تیری		دیکھئے کرتی ہے رسوائے زمانہ کیا کیا

اعتراض ۔ " دیکھئے کے ساتھ تجھ کو تو شتر گربہ ہوگیا ۔ پھر صورت کا کمال تو یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو رسوا کرے نہ کہ خود رسوا ہو جائے ۔ اس شعر میں صورت کی ہجو کا پہلو ہے بجائے مدح کے ۔ "

جواب ۔ " دیکھئے " یہاں مخاطبت کے لئے استعمال نہیں ہوا ہے شاید جناب معترض کو اس کا علم نہیں کہ یہ لفظ عموماً ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جہاں کسی امر کے وقوع پذیر ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور اس کی معنی ہیں دیکھا چاہیے اور مفہوم یہ ہے کہ انجام کیا ہوتا ہے سہ

چلتا ہے یار کونسی رفتار دیکھئے		طاؤس و کبک کو ہے نکل چلنے کا خیال		آتش

صورت کی ہجو کا پہلو بھی خوب نکالا ۔ حسن نہ ہوتا تو کوئی فریفتہ کیوں ہوتا ۔

سامان عیش ۔ اڑ کے مرے ہوش ہوگئے		بگڑا مزاج اون کا تو محفل بگڑ گئی

اعتراض ۔ ہوش اڑنا مسلم مگر سامان عیش کو اڑتے اسی شعر میں دیکھا ۔

جواب ۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ جناب معترض مبادیات شعری سے بھی ناواقف ہیں ۔ مصرعہ ثانی کی عبارت یہ ہے ۔ میرے ہوش اڑ کے سامان عیش ہوگئے ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کا مزاج بگڑا تو محفل بگڑ گئی سامان عیش درہم برہم ہوگیا ۔ معشوق کا مزاج بگڑنے کی وجہ عاشق کے ہوش اڑ گئے تو اہل محفل کے لئے یہی سامان عیش ہوگئے ۔

کیا غور ہے کہ وہ ہمہ تن گوش ہوگئے		میری برائیاں تو نہ کرتا ہو مدعی

اعتراض ۔ مصرعہ ثانی میں " غور " قابل غور ہے ۔

جواب ۔ یہ اعتراض محض بے اعتنائی کا نتیجہ ہے جس بات کو پورے انہماک سے سننے یا کسی چیز کو خاص توجہ سے دیکھنے کو ہمہ تن گوش اور ہمہ چشم ہونا کہتے ہیں اسی کا دوسرا نام غور ہے افسوس کہ ایسی معمولی بات ہی سمجھ میں نہ آئی ۔

ذیل کے اشعار مثنوی سے انتخاب فرمائے گئے ہیں۔

گات بانکی بدن سڈول تمام　　فتنہ قد فتنہ جسم فتنہ خرام

اعتراض۔ گات بانکی سے اردو کی فصاحت مجروح ہوگئی۔

جواب۔ کوئی لفظ بذات خود فصیح اور کوئی غیر فصیح تو ہو ہی نہیں سکتا معلوم نہیں جناب معترض کے حضور میں فصاحت کی کیا تعریف ہے۔ کاش گات کا مرادف کوئی فصیح لفظ بتایا ہوتا اردو میں تو اس معنی کا یہی ایک لفظ ہے جس کو تمام فصحا استعمال کرتے ہیں۔

نہ تیری بات بری ہے نہ تیری گات بری　　نظر آئی نہ مجھے کوئی تیری بات بری　　ناسخ

مجھ میں جرأت ہی بھلا دست درازی کی کہاں　　دیکھ کر مجھ کو چھپا لیتے ہو تم گات عبث　　جرأت

پینے کو آتش شیدا کے گاتی باندھ کر　　دلربائی ختم کی اس جان جاناں نے گات میں　　آتش

جٹی جٹی بھوں کی وہ تحریر　　کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر

اعتراض۔ ایسے مضحکہ خیز اعتراضات پر لوگ قہقہہ مار کر ہنستے ہیں آخر اس لفظ کو کس نے غیر فصیح قرار دیا۔ جٹی بھوں کے لئے آپ کے ذہن میں دوسرا فصیح لفظ کونسا ہے۔ ہندو دکن میں سب وضیع و شریف اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں ؎

عاشقوں سے اپنے وہ جٹی بھویں ٹیڑھی ہوئیں　　اہل قبلہ سے پھرا مونہ کعبہ کے محراب کا　　آتش

نگہ مست ہوشیاری سے　　لڑنے والی چھری کٹاری سے

اعتراض۔ چھری کٹاری کی احتیاج نے نگہ مست کی توہین کر دی۔

جواب۔ کون سمجھائے کہ جناب چھری کٹاری تیغ و تیر اور خدنگ وغیرہ نگاہ کے تشبیہات ہیں اور اسی کو آپ نگاہ کی توہین قرار دے رہے ہیں۔ چھری کٹاری معشوق کی نگہ مست کا دوسرا نام ہے یہاں احتیاج کا کوئی محل ہی نہیں ؎

نیم کش کرد جہاں تیغ نگاہے کہ زبیم　　شوق دست نظر از دامن پاکش برداشت　　طالب آملی

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو　　کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

نگہ مست سے عاشق کی طرف دیکھنا چھری کٹاری سے لڑنے کے برابر ہے یعنی عاشق کا دل اس نگہ مست کی چھری کٹاری سے گھایل ہو رہا ہے۔

چشم خونریز وہ فساد انگیز　　جس کا شاگرد فتنہ چنگیز

اعتراض۔ فتنہ چنگیز کا شاگرد ہو جانا آنکھ کے لئے قابل فخر نہیں ہو سکتا جب کہ چنگیز نے

آنکھ سے کوئی کام نہیں لیا۔

جواب۔ اس اعتراض پر اور خصوصاً آخری جملہ پر کوئی ہنسے یا روئے۔ اردو شاعری ایک طرف آج تو زبان اردو و شعر فہمی پر بھی غم گسار ہے۔ اس کا جواب بجز اس کے اور اور کیا ہو سکتا ہے۔

سخن شناس نئی دلبرا سخن اینجا است

گردن اوس کی ہے وہ صراحی دار ہو صراحی بھی دیکھ کر سرشار

اعتراض۔ صراحی سے گردن کی تشبیہ دی گئی کوئی جدت نہیں ہے۔

جواب۔ یہ تو فرمائیے کہ جدت سے آپ کی کیا غرض ہے اور شاعری میں جدت کے کیا معنی لئے جاتے ہیں آپ نے صرف گردن اور صراحی کے الفاظ پر ایک رائے قایم کردے شعر کے پورے الفاظ پر غور نہیں فرمایا ہوتا تو جدت ہی نمایاں ہو سکتی۔ آخر میں میں اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اصناف سخن میں غزل، مثنوی اور قصیدے کی زبان اور طرز بیان میں نمایاں فرق ہوتا ہے خصوصاً قصیدے کی زبان غزل اور مثنوی سے بالکل جدا ہوتی ہے قصیدے میں مضمون آفرینی کے ساتھ شوکت الفاظ کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ غرض اشعار غزل کے ہوں یا مثنوی کے قصیدے کے ہوں یا واسوخت کے فارسی میں ہوں یا اردو میں جب تک مبادیات فن شعر سے واقفیت اور زبان پر کافی عبور حاصل نہ ہو کسی کو کسی شعر میں کوئی حقیقی لطف ہی نہیں مل سکتا۔ مولانا شبلیؒ اپنے ایک دوست کو خط میں زبان دانی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے استاد داغ کا یہ شعر ؎

بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمہیں یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

لکھ کر فرماتے ہیں ممکن ہے کہ اس شعر اور محاورے کو ہر شخص سمجھ لے لیکن جس کو اردو زبان کا چسکا اور ذوق ہے وہ اس محاورے پر تڑپ اٹھے گا۔" مولانا کی یہ ہدایت آب زر سے لکھ رکھنے کے قابل ہے۔ ذوق زبان اور محاورہ زبان کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے کہ آج اردو کی نظم و نثر میں بیسیوں غلطیاں نظر آتی ہیں۔ لوگ بلا پس و پیش کسی شعر کو اچھا اور کسی کو برا کہہ دیتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کسی کی تعریف اور کسی کا سکوت قابل اعتناء نہیں تا وقتیکہ وہ صحیح معنی میں سخن شناس نہ ہو۔

واردات

عکاس

یاد ہیں اور خوب یاد ہیں وہ دن جب کبھی میں روٹھ کر تیری جلوہ گاہ ناز سے باہر آجاتا اور تو منایا کرتا تھا اور میں محض اس خیال سے کہ دیکھوں تجھے میرا خیال کس حد تک ہے۔ اپنے کلبۂ تاریک میں اپنے آپ کو مقید کر لیا کرتا تھا اور جب تیرا قاصد یہ پیام لیکر آتا " اللہ کتنے دن ہو گئے آئے نا " تو میری بیتابیوں کا وہ عالم ہوتا کہ راستہ کاٹے نہیں کٹتا اور میں یہی چاہتا تھا کہ پر لگا کر پہنچ جاؤں اور جو وقفہ راستہ طے کرنے میں گذرے وہ تیری دید ہی میں کیوں نہ صرف ہو۔

کہنے لگی، لیجائیے نا اپنی کتابیں، میں نے جواب دیا " رہنے دو جلدی کیا ہے، بیکار جو دھری ہیں " اچھا تو لادو کسی اور کے کام آئینگی "۔ وہ چلی گئی اور میری نگاہیں اوس کے خرام ناز میں کھو گئیں اوس کے ہر نقش قدم پر میرا تخیل ایک رنگین شعر پیش کر رہا تھا اور میں اوس کے تصور میں کھویا ہوا تھا کہ اوس کے قدموں کی آواز نے چونکا دیا، آنکھیں اوٹھائیں تو کتابیں سر پر رکھی ہیں اور زلفیں تا بہ کمر، لبوں پر شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میں نے کہا اتنی ساری کتابیں میں کیونکر لیجا سکوں گا۔ تم ہی میرے ساتھ چلی چلو۔ کہنے لگی :- اور جو کوئی آپ کو مار کر مجھے چھین لے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور میرے تخیل کی رنگین دنیا چمک اوٹھی۔

غزل

جنابِ مسلمؔ

(۱)

کلماتِ عشق بگوشِ من چو صدائے مرغِ سحر رسد
زتجلیاتِ جمالِ گُل چو صفائے آب گُہر رسد

مگر از تابہ ہدر رود عرقِ خجالتِ بیکساں
خذرے زاشکِ غمینِ ما کہ ز دل بدیدۂ تر رسد

تو چو کور و کر بجہاں عشق سرِ سیرِ حسنِ بتاں مکن
کہ دریں سواد بہ ہر نفس ز سرِ یار خبر رسد

بہ طلسمِ عالمِ رنگ و بو چہ بہ نہی دل و سرِ جستجو
ز فسانہ ہائے فسون فہم و خرد بعشق ضرر رسد

چہ مجالِ دیدہ کشادن است دریں یارِ فسونگری
کہ طرازِ جلوۂ تو ہنوز ز ہزار سو بنظر رسد

طلبت اگر ز صفا پر است دلِ تو اگر ز ہوس تہی
چہ بہ میکدہ چہ بمصطبہ ز نگار بہرہ در رسد

غمِ دہر نیست کہ کم شود تو منال مسلمِ خستہ جاں
غمِ یار آنِ تو کردہ شد مگر از تابہ دگر رسد

فلکیات اور اسلام

جناب سردار کریم نواز خان صاحب ایم۔ اے سٹی مجسٹریٹ (پنجاب)

ما طفل کم سواد و ادق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

معجزہ اور قیافہ میں فرق ہے۔ قیافہ فراست انسانی کی اُس قوت کا نام ہے جس سے قرائن کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد انسان دقیق اور دوررس نتائج اخذ کر لیتا ہے مثلاً بادلوں کے انبساط۔ ہوا کے رخ اور موسم کی مناسبت کو دیکھ کر بارش کا قیافہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی ملک کی سیاسی حالت، معاشی رفتار۔ اور تاریخی پس منظر کو دیکھ کر اُس ملک کے مستقبل کا قیافہ کیا جا سکتا ہے۔

معجزہ امور غیبی پر اطلاع دینے کو یا کسی خارق عادت بات کے پیدا کرنے کو کہتے ہیں خوارق عادت اور امور غیبی ایسے ہوں جن کو بوقت اظہار ہمارے حواس خمسہ محسوس نہ کر سکیں اور عقلاً اس کی بابت استنباط نہ ہو سکے۔ اذہان اس کی تشریح سے عاجز ہوں۔

دیگر سب شواہد سے قطع نظر، کسی مذہب کے بانی کی صداقت کی ایک دلیل اس کے معجزات ہیں، اور معجزات کا ظہور صرف انبیاء کی قدرت ہے۔ اگر وہ معجزہ امور غیبی کی اطلاع کا ہو تو ضروری ہے کہ جس وقت اُس کی اطلاع دی گئی تھی اُس وقت ایسے قرائن موجود نہ تھے جن کے مطالعہ سے وہ نتیجے اخذ ہو سکیں۔ اور کسی ایسے امر کی بابت اطلاع ہو جسے نہ حواس خمسہ محسوس کر سکتے ہوں اور نہ عقلاً اس نتیجہ پر پہنچا سکے۔

حضور سرور کائنات اور فخر موجودات ہمارے نبی صلعم نے دنیا کو ایک الہامی کتاب

پیش کی جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود ذات جل شانہ نے لی اور جس میں تیرہ سو سال
کے امتداد سے ایک حرف عطف کی تحریف بھی نہیں ہوئی - اس کتاب میں بعض امور غیبی
کے متعلق اطلاع ہے - آؤ دیکھیں کہ دنیا کے جدید انکشافات سے ان پیشن گوئیوں کی
تصدیق ہوتی ہے یا تردید -

اول یہ دریافت کر لینا چاہیئے کہ جن امور کے متعلق پیشن گوئی کی گئی ہے کیا وہ اس
وقت حواس خمسہ سے محسوس ہو سکتے تھے - عقلاً ان کی بابت استنباط ہو سکتا تھا اور
اُن کے متعلق اُس زمانہ میں حکماء کی رائے کیا تھی -

مثلاً حرکتِ ارض کو لیں - رسول اکرمؐ کے زمانہ میں نہ تو دوربینیں ایجاد ہوئی
تھیں اور نہ ہی آلہ جیبر وسکوپ وضع ہوا تھا - کہ اجرام فلکی کی رفتار اور ستاروں کے محل
کے تغیر و تبدل سے حرکت ارض کی بابت قیاس کیا جا سکتا ہو - زمین بظاہر ساکن ہے ہمیں
ہچکولے نہیں آتے جو متحرک چیز پر سوار ہونے سے آتے ہیں - اس کے متحرک ہونے کی کوئی ایسی
بظاہر علامت نہیں اور نہ ہی عقل اور ادراک کے لئے کوئی ایسی معقول تمہید ہے کہ زمین
کو متحرک تسلیم کیا جائے -

اب دیکھیں کہ اُس زمانہ میں حکمار کی اس مسئلہ کے متعلق کیا رائے تھی - اگر اُس زمانہ
کے حکمار کی رائے کے مطابق حضورؐ نے ایک بات کا اظہار کر دیا تو یہ کوئی خاص بات نہیں -
ہو سکتا ہے کہ نبی مکرمؐ نے جو خود اُمی تھے سُن سنا کر وہ بات بیان کر دی ہو اور انکشافات
جدیدہ نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہو - اگر وہ رائے یا اظہار امور اُس وقت کے حکما کی
رائے کے صریحاً مخالف ہو اور ایک ہزار سال بعد جدید آلات مشاہدہ سے اس کی تصدیق
ہوتی ہو تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اُن امور پر اطلاع پانے والا شخص ملہم ہے اور اُس غیب
پر اُن کی اطلاع معجزہ ہے -

ولادت مسیح سے ۱۵۰ سال قبل بطلیموس (PROLMY) مصنف مجسطی
(ALMAGEST) نے زمین کو ساکن ٹھیرایا - مسیحیت کا ظہور ہوا تو پاپاؤں اور اسقفوں
نے اس مسئلہ کو مزید تقویت دی اور دلیل یہ پیش کی گئی کہ جس کرہ پر حضرت مسیح کا نزول
ہو اُس کی شان نہیں کہ وہ دوسرے کُرّوں کے گرد گردش کرے - بلکہ باقی سب کُرے
زمین کے گرد حرکت کریں تو درست اور مناسب ہے -

حکیم غالیلہ (GALILEO) نے بعد ایک ہزار ہجری جب حرکت ارض کا اعلان کیا تو اسے ذلیل کیا گیا۔ طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور ایک مدت تک اسے قید میں رکھا گیا۔

اس کے بعد کورونیال۔ دی کورا۔ اور پرکرونیال الیناکوس اور جان مولر نے حرکت ارض کو تسلیم کیا مگر اعلانیہ اس کی تعلیم نہ دی اور نہ ہی اس کے ثبوت میں کافی دلائل پیش کئے آخر علم ہیئت کے دور جدید کے قاید اول کوبز لیک NICOLOS COPERNIK نے اس موضوع پر رسالے اور کتابیں لکھیں۔ اور اب دُوربینوں جیروسکوپ اور دیگر شواہد سے یہ مسلمہ ہو چکا ہے کہ زمین گردش کرتی ہے۔ گویا حرکت ارض کو غالیلہ نے (۱۶۴۲-۱۵۶۴) پیش کیا۔

اب دیکھیں کہ غالیلہ سے ایک ہزار سال قبل قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا فیصلہ کیا ہے سورہ نازعات کی ذیل کی آیت میں حرکت ارض کی دلیل ہے۔

والارض بعد ذٰلك دحاها اخرج منها مائها ومرعاها والجبال ارساها

(خداوند تعالیٰ نے بعد اس کے زمین کو متحرک کیا اور اس سے پانی وسبزہ وغیرہ نکالا اور پہاڑوں کو میخ کی طرح اُس میں گاڑھا)

مفسرین قرآن نے " دحو الارض " کے معنی زمین کو پھیلانا یا بچھانا کے کئے ہیں حالانکہ " دحو " کے حقیقی معنی تحریک۔ دفع۔ دھکیلنا۔ لڑھکانا کے ہیں۔ معتبر لغتوں نے پھیلانا لفظ 'دحو' کے معنی میں لکھا ہی نہیں اور بعض اہل لغت نے اور معانی کے ساتھ پھیلانا بھی لکھا ہے۔ قاموس میں (دحیت الابل) کے معنی میں نے اونٹ کو ہنکایا۔ لکھا ہے۔ (دحا المطر الحصا) کے معنی بارش کے پانی نے کنکریوں کو ہٹا دیا ہیں۔ حضرت علیؑ کو (داحی خیبر) اس لئے کہتے ہیں کہ آپ نے خیبر کو اکھاڑ کر پھینکنے والے تھے۔ (مدحاۃ) اس لکڑی کو کہتے ہیں جسسے بچے لڑھکاتے ہیں۔ (ادحوہ) اُس جگہ کو کہتے ہیں جہاں شتر مرغ انڈے دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ریت کو ہٹا کر انڈے دیتا ہے۔ جب گھوڑا اپنے دو اگلے پاؤں سے خاک کو اڑاتا ہوا چلتا ہے تو کہتے ہیں (مرالفرس یدحو) اور (دحو بالحجارۃ) گولی کھیلنے کو کہتے ہیں۔

پس والارض بعد ذٰلك دحاها کے معنی " خداوند تعالیٰ نے اس کے بعد زمین کو متحرک کیا " کے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علماء کرام اور مفسرین عظام نے یہ غلط معنی کیوں کئے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل بطلیموس کا نظریۂ فلکیات مسلّم اور درست سمجھا جاتا تھا اور ہمارے

علماء بطلیموس کے اس قدر زیر اثر تھے کہ ہر وہ بیان جو اس کے نظریہ سے مطابقت نہ کرتا ہو غیر صحیح سمجھا جاتا تھا۔ بطلیموس نے زمین کو ساکن ٹھیرایا۔ اور قرآن میں زمین کے متحرک ہونے کا ذکر آگیا۔ ان میں عجیب مشکل درپیش ہوئی۔ بطلیموس بھی درست کہتا ہے اور قرآن بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ تو یہ باہم متخالف باتیں کیوں کر مربوط ہوں۔ اس ادھیڑبن میں انھوں نے نص صریح کی تاویلیں اور تشریحیں شروع کردیں کہ مبادا لوگ استہزا کریں کہ قرآن دنیا کے مسلمہ نظریہ سکون ارض کے خلاف زمین کو متحرک کہہ کر الہامی کیونکر ہوسکتا ہے۔ انھوں نے یہ خیال نہ کیا کہ سائنس کے نظریات ہر روز بدلتے رہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ہم قرآن کی صداقت پر سائنس کو پرکھیں اور اس کی صحت یا غیر صحت کا حکم لگائیں۔ ہم نے قرآن کو سائنس کی تھیوری پر پرکھنا شروع کردیا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ امت روایات میں کھو گئی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ " والارض بعد ذالک دحاہا" کے معنی خداوند تعالیٰ نے بعد اس کے زمین کو متحرک کیا کے ہیں۔ اس کے بعد آیت شریف کے یہ لفظ ہیں " اخرج منہا ماءھا ومرعاہا" اور اس سے پانی وسبزہ وغیرہ نکالا۔ یعنی زمین کو متحرک کرنے کے بعد اس سے پانی وسبزہ وغیرہ نکالا۔ اب دیکھنا یہ ہے ان دو حصوں میں کیا ربط ہے۔ زمین کی گردش سبزہ کے نکالنے میں کیونکر معاون ہوسکتی ہے۔ بعض نافہم اور قرآن کریم کے دقیق مطالعہ سے محروم لوگوں نے ہمیشہ قرآن کریم پر غیر مربوط ہونے کا الزام لگایا ہے۔ اور وہ ان غوامض کو نہ سمجھ سکے کہ قرآن شریف کی ہر آیت کو دوسری آیت اور ہر لفظ کو سیاق وسباق سے تعلق ہے اور ہر دلیل کے بعد ثبوت موجود ہے۔ سائنس کی ترقی نے یہ بات مسلم کردی کہ نباتات کی روئیدگی کا انحصار موسموں کے تغیر اور آفتاب کی تمازت پر ہے۔ ایک موسم کا میوہ دوسرے موسم میں نہیں پھلتا۔ اگر ایک تاریک کمرہ میں کسی چیز کو بویا جائے تو وہ نہیں اگتی کھیت کے اس کنارے کی فصل جہاں پر باڑ کے درختوں کا سایہ پڑتا رہتا ہے ترقی نہیں کرتی۔ اور سورج کے طلوع وغروب اور موسموں کے تبدل کا انحصار زمین کی گردش پر ہے۔ جب تک زمین ساکن تھی اس میں روئیدگی اور نمو کے آثار نہ تھے۔ جب زمین کو متحرک کیا گیا تو اس میں سبزہ کی نمو ہوئی گویا سبزہ کا اگنا زمین کے گردش کی دلیل کا ثبوت ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم " والجبال ارساہا" کے معنی کی طرف آئیں لفظ " دحو" کے معنی میں

جو ایک اور لطیف نکتہ مضمر ہے وہ بھی بیان کر دیں۔

زمین گول ہے۔ اس کے ثبوت میں قرآن کی دلایل کسی دوسرے موقعہ کے لئے اٹھا رکھتا ہوں، جب ایک گول چیز کو دھکیلا جائے۔ متحرک کیا جائے۔ لڑھکایا جائے تو اس میں دو حرکتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اول تو گیند فاصلہ طے کرتی ہے اور دوسرے وہ خود چکر کھاتی ہے اور چکر کھاتے ہوئے فاصلہ طے کرتی ہے۔ فاصلہ طے کرنیوالی حرکت کو اگر آپ "حرکت انتقالیہ" کا نام دیں تو حرکت دوری کو آپ "حرکت وضعیہ" کہہ سکتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ لفظ "دحو" دو حرکتوں کا مرکب ہے۔ "حرکت انتقالیہ" اور "حرکت وضعیہ" اور زمین کی بھی دو حرکتیں ہیں۔ حرکت وضعیہ، یومیہ حرکت ہے جس سے طلوع اور غروب پیدا ہوتا ہے اور حرکت انتقالیہ سنویہ ہے یعنی سال کے بعد پوری ہوتی ہے اور موسموں کا تغیر تبدل پیدا ہوتا ہے۔ گویا قرآن کریم نے صرف حرکت ارض کی بابت ہی اطلاع نہیں دی بلکہ ارض کی ہر دو حرکتوں انتقالیہ اور وضعیہ کا بھی اعلان فرمایا ہے اور اس دلیل میں روئیدگی نباتات کا ثبوت پیش کیا ہے۔

اب "والجبال ارساہا" کو لیں۔ اس کے معنی ہیں کہ پہاڑوں کو میخ کی طرح اُس میں (زمین میں) گاڑھا۔ اب دیکھنا ہے کہ آیت کے اس حصہ کو باقی آیت سے کیا تعلق ہے اور پہاڑوں کو میخ کی طرح گاڑھنا حرکت ارض کی کیونکر دلیل ہو سکتی ہے بلکہ دل میں بادی النظر میں شبہ پڑتا ہے کہ پہاڑوں کو میخ کی طرح گاڑھنے سے تو سکون ارض کی دلیل پیدا ہوتی ہے حرکت ارض کی نہیں۔ آؤ اب اس کا تجزیہ کریں۔

میخ کی دو اقسام ہیں۔ "داخلی" اور "خارجی" خارجی میخ تو اس لئے گاڑھی جاتی ہے کہ جس چیز کے لئے وہ گاڑی جائے وہ حرکت نہ کر سکے۔ مگر ضرور ہے کہ خارجی میخ اس جسم سے جسے ساکن کرنا منظور ہے، کسی اور جسم میں گاڑھی جائے۔ جیسے مویشیوں کو حرکت سے روکنا ہو تو میخ کو زمین یا دیوار میں گاڑتے ہیں اور اس سے باندھتے ہیں جس جانور کی حرکت کو روکنا مقصود ہو میخ اس جانور کے جسم میں نہیں گاڑھی جاتی ایسی میخ کو خارجی میخ کہتے ہیں۔

دوسری قسم میخ کی داخلی ہے جس چیز پر یہ میخ گاڑی جاتی ہے اس کا مقصد اس چیز کے اجزا کو ضبط اور ربط میں رکھنے کے ہیں۔ جیسے میز کے تختوں اور دروازہ کے کواڑوں کے تختوں کو جوڑنے کے لئے میخ گاڑی جاتی ہے۔ یہ میخ جس چیز کا ضبط میں رکھنا منظور ہو اسی چیز کے جسم میں گاڑھی جاتی ہے۔

پہاڑ زمین پر قایم ہیں۔ یعنی پہاڑوں کی میخ خود زمین میں گاڑی ہوئی ہے "والجبال ارسا ہا" یعنی پہاڑوں کو میخ کی طرح اُس میں گاڑا۔ یہ میخ کسی خارجی جسم میں نہیں گاڑی ہوئی بلکہ داخلی ہے، داخلی میخ کا مقصد میز کے تختوں والی میخ کے ہیں کہ حرکت ارض سے اجزائے ارض پریشان ہو کر منتشر نہ ہو جائیں۔ ان اجزاء کے اتصال کے لئے یہ میخ گاڑی گئی۔

اگر کبھی آپ نے موٹر لاری پر سفر کیا ہو تو آپ کو تجربہ ہوگا کہ اگر لاری میں سواریوں کی تعداد اور وزن کم ہے تو لاری کو تیز چلانے سے سخت جھٹکے اور ہچکولے آتے ہیں اور اگر سواریوں کی تعداد زیادہ ہو اور بوجھ بھی کافی ہو تو نہ تو گاڑی اچھلتی ہے اور نہ ہچکولے آتے ہیں۔ کیونکہ وزن کی زیادتی (حرکت سے جو ہچکولے اور جھٹکے پیدا ہوتے ہیں) کو روک دیتی ہے۔ بعینہٖ زمین پر پہاڑوں کا یہ بوجھ اس لئے رکھا گیا کہ حرکت ارض سے ساکنان ارض کو ہچکولوں سے محفوظ کیا جائے۔ اگر زمین ساکن ہوتی تو ان داخلی میخوں کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ایسی میخوں کا کام حرکت کو روکنا نہیں۔ اگر میخ خارجی ہوتی تو پھر سکون ارض کے لئے وجہ جواز تھی کہ اس کی حرکت کو ان خارجی میخوں سے روکا گیا۔

خود قرآن کریم میں ان میخوں کے مقصد کی توضیح موجود ہے " والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم" خداوند تعالیٰ نے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ اس لئے قایم کئے کہ زمین تم کو ہچکولے نہ دے اور اجزا اس کے متفرق نہ ہو جائیں۔

حضور رسالت مآبؐ کی ایک حدیث دُر منثور مصنفہ علامہ جلال الدین سیوطی میں درج ہے " فدحی اللہ الارض من موضع البیت فمادت فاوتدھا اللہ بالجبال" " زمین کو پروردگار عالم نے خانہ کعبہ سے متحرک فرمایا تو جھکولے کھانے لگی۔ پھر جھکولے کھانے لگی۔ تب پہاڑوں کی میخ اس پر گاڑی"

جغرافیئی طور سے مکہ معظمہ مرکز زمین ہے۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو خانہ کعبہ سے متحرک کیا گیا۔ مکہ کے معنی ہیں کہ دبا گیا یعنی متحرک کیا گیا۔

نہج البلاغہ میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ایک ارشاد درج ہے " و وتد بالصخور میدان ارضہ" یعنی پتھروں کے ذریعہ خداوند تعالیٰ نے زمین کے ہچکولے روکے اور " وعدل حرکاتہا بالراسیات من جلامیدھا " یعنی زمین کی حرکت کو گڑے ہوئے سخت پتھروں سے معتدل فرمایا۔

سورۂ سجدہ - سورہ نمل - - سورۂ ملک - سورہ طٰہ میں بھی زمین کے متحرک ہونے کی دلیل میں آیات ہیں جن کی تفسیر کسی آئندہ موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں -

اگر یہ سلسلہ پسند کیا گیا تو مسلسل اس سلسلہ پر مضامین لکھنے کا ارادہ انشاءاللہ تعالیٰ رکھتا ہوں - مگر پھر اپنے اعمال کی سیہ روئیوں کی طرف دیکھتا ہوں تو شرم آتی ہے کہ مجھ ایسا عصیاں کار کلام الٰہی کے معانی پیش کرنے کی جسارت کرے جس کی ساری عمر بقول مرشدنا علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

عشق با مرغولہ موئیاں باختم مدتے با لالہ روئیاں ساختم
بر چراغ عافیت داماں زدم بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم

ہاں البتہ اس مضمون سے کسی بزرگ کو ممکن ہے کہ اس سلسلہ پر مضامین لکھنے کی تحریک پیدا ہو سکے اور ہمارے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان جو بدنصیبی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انکشافات جدید سے نظریہ قرآن کی تردید یں ہو چکی ہیں کی ہدایت اور رہ نمائی ہو جائے - ولا قوۃ الا باللہ علیہ توکلن واللہ الحسیر -

---

جگنو

جناب فخر الدین احمد سعید بی - اے (عثمانیہ)

ان کے شعلہ میں نہیں ہیں سوختہ سامانیاں
آتش نمرود کی شاید یہ ہیں چنگاریاں
یا کہ دیوالی رچی ہے شاہد فطرت کے گھر!
جل رہی ہیں باغ و بن میں چھوٹی چھوٹی بتیاں
یا کہ آتش بازیاں ہیں رات کی بارات میں
یا عروس شب کے پیراہن کی ہیں یہ چمکیاں
واردات طور کے بھٹکے شرارے تو نہیں
ربِّ ارنی - لن ترانی کے بشارے تو نہیں

پھلجھڑیاں

جہاں نورد

ایک "رومانیت" بھرے بزرگوار جنھوں نے نام خدا زندگی کی صرف ساٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں، اپنی "خزاں" کو بہار کا "سندیسہ" دے کر ساتویں مرتبہ گھر بسانا چاہتے ہیں، ماشاءاللہ سے آپ بالکل "صحیح سالم" توانا اور تندرست ہیں، صرف کسی قدر لرزہ براندام رہتے ہیں، لقوہ کی وجہ سے منہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے مگر منہ میں دانت نہ ہونے سے بدنمائی پیدا نہیں ہوئی ہے بصارت کی کمزوری آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے مگر عمر کے بڑھنے سے "بصیرت" بڑھ گئی ہے، کانوں سے برابر سنائی دیتا ہے صرف تھوڑا چلانا پڑتا ہے۔

آپ کے کئی عدد "چھوٹے چھوٹے" لڑکے اور لڑکیاں ہیں، سب سے بڑے لڑکے نے پچھلے مہینے چالیسویں سال میں قدم رکھا ہے اور سب سے چھوٹی لڑکی اٹھائیسویں برس میں کھیل رہی ہے۔ ان سب کو آپ نے "اعلیٰ تعلیم" دلائی ہے، بڑا لڑکا انگریزی میں تار کا مضمون کسی قدر تکلف سے سمجھ لیتا ہے، اردو تو "پدری زبان" ٹھیری! اس میں سب کو کافی "مہارت" ہے، البتہ بعض "پیچیدہ" الفاظ کی املا میں ایک آدھ حرف کی غلطی ہو جاتی ہے، جیسے آم کو "ع" سے، سلام کو "ص" سے، صبح کو "س" سے اور عقل کو "الف" سے بھی لکھا جاتا ہے۔ انگریزی لکھنے کا کام نہیں پڑتا اس لئے اس کی املا میں غلطی کا امکان ہی نہیں! بولنے میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے ذرا تکلف ہوتا ہے اس لئے "یس" اور "نو" پر ہی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ لڑکوں کی تربیت کی طرف بھی پوری پوری توجہ کی گئی ہے اور بڑی کوشش سے ان میں "اعلیٰ کردار" اور "بلند اخلاق" پیدا کئے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ آج کل کی "شریف" صحبتوں میں دن رات گھنٹوں بیٹھے اعلیٰ درجہ کے "مہذب" کھیل مثلاً

برج، پوکر، رمی، فلش وغیرہ میں جی کھول کر حصہ لیا کرتے ہیں۔ موسمی تفریحیں مثلاً گھڑ دوڑ
اور بارش کے سٹہ پر بھی تھوڑی بہت ہار جیت ہوا کرتی ہے ایسے موقعوں پر "ایک گونہ
بیخودی" پیدا کرنے کے لئے "نبت عنب" کو بھی دعوت دی جاتی ہے، "ولایتی" سے زیادہ
رغبت ہے کیونکہ "دیسی" صحت کو بگاڑ دیتی ہے، جب "مس صاحبہ" جلوہ گر ہوتی ہیں تو
سارا گھر ان کے عشوہ و ادا کی کافر ماجرائی پر ختم لگتا ہے، یہاں تک کہ پدر عالی گہر بھی ان کے
حسن جہاں سوز سے اپنی بے نور آنکھیں سینک لیتے ہیں۔

بچوں کی "سعادت مندی" کا یہ عالم ہے کہ اباجان کتنا ہی خفا ہوں خاموش رہتے ہیں
کبھی غصہ آجاتا ہے تو صرف "ڈیم فول" "بلڈی فول" وغیرہ کہدیا کرتے ہیں، اس قسم کے انگریزی
لفظ جب بچوں کے منھ سے پھول بن کر جھڑتے ہیں تو پدر بزرگوار پھولے نہیں سماتے اور
فرماتے ہیں "بچہ اب اچھی انگریزی بولنے لگا ہے"!

لڑکیوں کی لیاقت لڑکوں سے کچھ ہی کم ہے، مگر سب کی سب پڑھی لکھی ضرور ہیں ان
کی تعلیم پر بھی آپ نے کافی روپیہ صرف کیا ہے، اس لئے جب کبھی کسی لڑکے کی جانب سے پیغام
کے سلسلہ میں جہیز وغیرہ کا سوال ہوتا ہے تو آپ بہت برہم ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"تعلیم یافتہ لڑکی کی بھی خواہش کی جاتی ہے اور پھر جہیز بھی"
"مانگا جاتا ہے اگر جہیز تیار کیا جاتا تو ایسی اعلیٰ تعلیم کیسے دلائی جاتی"!

مگر اب تک آپ کو ایک بھی ایسا اعلیٰ خیال، علم دوست برخوردار داماد نہیں ملا جو
آپ کی کسی لڑکی سے محض اس کی اس "مخصوص" اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بیاہ کرنا پسند کرتا،
حال ہی میں بڑی لڑکی کے لئے پیغام آیا تھا مگر شرط یہ تھی کہ ایک "اشد ضروری" قرض کی ادائی
کے لئے فی الحال صرف پندرہ ہزار روپئے دئے جائیں۔ ایک صاحب بہادر آپ کی چھوٹی لڑکی
سے بیاہ کرنا چاہتے تھے بشرطیکہ یورپ جانے کے لئے بیس ہزار روپئے فوراً دے جائیں!
آج کل کے "یہ تعلیم یافتہ" صاحبزادے بیویوں کے روپئے سے اپنی دنیا سنوارنا چاہتے ہیں، معلوم
نہیں ایسے شرمناک مطالبوں کا کب منھ کالا ہوتا ہے اور کب آپ کی صاحبزادیوں کے سہرے
کے پھول کھلتے ہیں!!

لڑکوں کا بیاہ کچھ تو ان کی "کم سنی" اور کچھ پدر عالی مقام کے بیاہ کی مصروفیت کی وجہ سے
کہاں تک نہ ہو سکا۔ آپ کے عزیز اور دوست احباب کبھی ان کے بیاہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتے

ہیں تو مسکرا کر فرماتے ہیں۔

"ابھی بچے ہیں جلدی کیا ہے؟"

مگر ان "معصوم بچوں" نے چپکے چپکے اپنے بیاہ کر لئے ہیں، اور بڑی چھان بین کے بعد بازار سے اپنے اپنے جوڑے خرید لائے ہیں، والد محترم کے بقول "جوانی دیوانی ہوتی ہے اور ایسے کھیل تو سبھی کھیلتے ہیں!"

بعض احمق لوگ اپنی لڑکیاں آپ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، سعادت مند اور ہونہار لڑکوں کو اس لئے دینا پسند نہیں کرتے ہیں کہ وہ بے روزگار ہیں حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے دوسری "نامعقول" وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچوں کے بچے ہوگئے ہیں۔ مثل مشہور ہے "آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے" یہ نئی بات کیا ہے!! ایں سعادت بزور بازو نیست!!!

خیر کوئی اپنی لڑکی دے کہ نہ دے، جو پسلی کا جوڑا ہے ایک دن جوتیاں چٹخاتے آئیگا اور ضرور آئے گا! اس لئے آپ نے لڑکوں کے بیاہ کا خیال ہی چھوڑ دیا ہے، لڑکے بھی باپ کے ہم خیال ہوگئے ہیں اور فی الحال افزائش نسل میں مصروف ہیں، ان کی کوششیں خوب پروان چڑھ رہی ہیں اور گھر میں رنگ برنگی بچوں کا میلہ لگ رہا ہے۔

چند روز سے باپ بیٹوں میں ذرا چلی ہوئی ہے، بچے چاہتے ہیں ابا جان نئی امی جان کو نہ لائیں مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ "جوانی" کی یہ راتیں اور مرادوں کے یہ دن آخر کس طرح کٹیں! اس لئے کسی ایسی "امی جان" کی تلاش جاری ہے جو برس پندرہ یا سولہ کی ہو! ہمارے شہر کے "دفتر پیامات شادی" کے مہتمم صاحب مطلع ہوں، معاوضہ معقول ملے گا اور منھ سونے چاندی سے بھر دیا جائے گا۔

جب سے لڑکوں نے اباجان کے بیاہ کی خبر سنی ہے وہ بھی اپنے اپنے جوڑے بدلنے کی فکر میں ہیں، خدا وہ دن جلد لائے کہ ان سب کی فکریں دور ہوں اور باپ بیٹے اپنی اپنی مرادیں پائیں، آمین!

گھی کے جلیں چراغ جب وہ مراد پائیں!!

غرض تمنا پر یار جواب دے یا نہ دے یار کا صرف مسکرا کر رہ جانا۔ چاہنے والوں کی جان

ہو رہا، ہے!! ، دیتا ہے

"ارتقاء ہندی خواتین"

جناب محبوب الرحمٰن خاں صاحب ایم - اے (علیگ) اندور

بیسویں صدی کی حتمی سرگزشت جب احاطہ تحریر میں آئیگی تو اس کی تحریرات میں شاید سب میں نمایاں خصوصیت خواتین ہند کی وہ تاریخ ہوگی جو اس کی نشو ونما کا اظہار کریگی - آج دنیا کی وسعت و پہنائی میں نئی قوت پھیل رہی ہے جس کا وجود ہر طبقہ کی نسوان میں پایا جاتا ہے - متمول و غریب تعلیم یافتہ یا جاہل سب کو احساس ہے کہ ایک ایسے دور کی صبح نمودار ہو رہی ہے جس میں ان کے طبقہ کے لئے تازہ فوائد موجود ہیں -

جلیل القدر تاریخی دور

کافی تعجب خیز امر ہے کہ دنیا کی پچھلی تہذیب میں عورت کے لئے شاندار دور جلوہ نما ہوا اور ہمیں بہت سی قوموں کا وہ مجاہدانہ دور ملتا ہے جس میں عورت پوجی جاتی تھی اور اسے عزت کی بلند ترین نشست پر بٹھایا تھا - یورپی تمدن کی ابتداء سے صدیوں قبل ہندی قدیم ادب میں عورت نے اس کے شوہر کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا اور اپنی محبت و مشوروں سے ہاتھ بٹاتی رہی - سیتا و دروپدی کی طرح بن باس میں بھی ہمرکاب تھی - رگ وید میں واضح طور پر ان خواتین کا حوالہ دیا گیا ہے جو مکمل طور سے آلات حرب سے لیس ہو کر جنگوں میں گئیں - ایسا انداز کیا جاسکتا ہے کہ ان کو کس قسم کی فوجی تعلیم دی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ سپاہی و لڑنے والی بن سکتی تھیں - زمانہ وید میں یقیناً خواتین کا سیاسی رتبہ مردوں کے ہم پلہ ہوتا تھا - رامائن میں کیکئی کی واحد مثال موجود ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے اندر کے دشمنوں کے خلاف اس کے شوہر کے ساتھ شرکت کی تھی - مہا بھارت میں بھی مستورات کا جنگ میں شرکت کرنا لکھا ہے

اس طرح راجپوت سورمیروں کے زمانہ میں پدمنی، درگاوتی، جہاں مایا اور دوسری دلاور خواتین پائی جاتی ہیں جو اپنی جنم بھومی کیلئے لڑیں بلکہ آزادی کی قربان گاہ پر ملک کیلئے جان نثار کر دی۔

ابتدائی زمانہ میں، عربستان کی مسلمان عورت کو مرد کے برابر ہدایات ملتی تھیں، جبکہ اسلام کا اقتدار اوج کمال پر تھا، عورت جس عمرانی درجہ پر فائض تھی اس سے ثبوت ملتا ہے کہ وہ بھی ان حقوق کی مالک تھی جس سے مرد متمتع ہوتے تھے۔ رسول اکرمؐ کی ازواج مطہرات عزلت کی بیکار زندگی سے کوسوں دور تھیں۔ برخلاف اس کے انھیں بڑی آزادی دی گئی تھی۔

ہارون الرشید کی بیگم ملکہ زبیدہ، بطور شاعرہ کے مشہور تھی اور اسی کی جیب سے مکہ میں نہر تعمیر ہوئی اور شہر اسکندریہ دوبارہ بنا۔ وہ اسکندریہ جسے یونانیوں نے تباہ کر دیا تھا۔ مصر قدیم میں مستورات ان کے مردوں کے برابر تھیں اور ان کا شمار ساتھیوں میں تھا۔ حقوق کا قانون ان پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ وہ ملا گیری اور تخت کے بھی اہل تھیں۔

مدراس کی قیادت: ۱۹۲۱ء میں جب ہند کے صوبوں میں مدراس نے عورتوں کو رائے دہندگی کے حقوق دے کر رہنمائی کی تو قانون ساز مجلس کے اس اقدام کو "دلیر" کہہ کر سراہا گیا۔ دوسرے صوبوں نے اس اچھی مثال کی پیروی کی حالانکہ قومی طور پر بنگالی مسلم ٹکڑی نے اور بہار کے کٹر اصحاب نے صوبہ کو دیگر صوبوں کے برابر آنے سے باز رکھا لیکن دہ سالہ عرصہ میں رائے دہندگی کا حق عورت کو بھی حاصل ہو گیا۔

۱۹۲۳ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان کا عرصہ ملک کے لئے مجموعی طور پر نہایت اہم تھا ہمہ گیر سبک رفتار قومی تحریکات نے ہندی مستورات کے بڑے حصہ کو گھیرے لگایا۔ اور ان کی جگہ سیاسی حلقہ میں مان لی گئی اس وقت جبکہ بیگم بسنٹ اور ان کے بعد بیگم نائیڈو کو ہندوستانی قومی کانگریس کا صدر چنا گیا۔ عام تحریک کی ترقی کے ساتھ طبقہ وار تنظیم کی بھی ترقی ہوئی اور اس زمانہ نے ایک متحدہ تنظیم کی پیدائش اور نشوونما کو دیکھ لیا جو کل ہند مستورات کانفرنس" کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس جماعت کو ابتداء ہی سے آئندہ کے ساطار کے سوال پر سوچ بچار کرنا پڑا۔ ۱۹۳۲ء نے ملک کو سیاسی نافرمانیوں کی شدید جنگ میں دھکیل دیا۔ اسی وقت مختلف طبقوں میں ایسا اتفاق و جمہوریت پیدا ہوئے کہ جو پہلے ملک میں

دیکھنے میں نہ آئے تھے۔

شاید یہ قدرتی بات ہے کہ آئینی تبدیلیوں کے دوران میں عورتوں کے سیاسی رتبے وحقوق نمایاں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان ایام میں بہت سی مستورات جیلوں میں گئیں اور یہ عام طور پر مان لیا گیا ہے ۱۹۳۷ء کی اسمبلی کے چناؤ میں کانگریسی امیدواروں کی کامیابی کے عناصر میں مستورات کی پُر زور تائید ایک اہم عنصر تھی۔ آج ہندی تعلیم یافتہ خاتون کا نظریہ زیادہ منطقی ہے بہ نسبت نظریۂ مرد کے اور اساسی رجحانات جنھیں وہ سیاسی فضا میں لاتی ہے انھیں کو وہ معاشی اور ارتقائی مسایل کے لئے بروئے کار لاتی ہے مستورات کی نقل وحرکت کا بنیادی خیال مرد سے رتبہ ومناسبت وقت میں مساوات کا ہے۔

معاشی خدمت:۔ عورتوں کا سیاسی لیبل کچھ بھی ہو لیکن اُس کی صف بندی کی بابت کچھ شک نہیں۔ معاشی خدمت کے سلسلہ میں بہت سے کام اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک اچھے پڑوسی کے لحاظ سے، مردوں کی تکالیف کو سمجھنے اور ان سے ہمدردی کرنے میں، اور ان سب کے علاوہ خود کو ایک اچھا شہری بنانے میں تاکہ موقع ملنے پر وہ اپنے حق رائے دہندگی کو صراط المستقیم کے لئے استعمال کرے۔

سارے ملک میں نمایاں شہادت ان کوششوں کی موجود ہے جو پچھلے (۲۵) سالوں میں عورتوں کے لئے مناسب جگہ حاصل کرنے میں کی گئیں، تاکہ وہ ملک کی قسمت کو ڈھالیں۔ پونا ——— ایک بار ہندو راسخ الاعتقادی کی جائے پناہ تھا۔ اب نئی زندگی کی نبضیں متحرک کر رہا ہے وہ نئی زندگی جو باہر سے ہند میں داخل ہو رہی ہے۔ اس میں مستورات کی یونیورسٹی اور سیوا سدن ہے (سیوا سدن = خدمت کا گھر)۔ مستورات کے اسی قسم کے ادارے مدراس، بمبئی، اور دیگر صوبائی مرکزوں میں رونما ہوئے ہیں۔

ہندی تہذیب کی ارتقاء یا مغرب کے بہترین خیالات سے میلان میں جو کچھ انجام پذیر ہوا ہے اگر اسے دیکھیں تو ہمیں پکّے، اٹل، ارادوں کی شہادتیں ملتی ہیں جس میں ماہرِ تعلیم نے مقابلہ کیا اور انھوں نے کامیابی حاصل کی۔

لیڈی ارون کالج کا استقرار ——— اس ملک میں یہ مستورات کے لئے درجۂ اول کی درس گاہ ہے جس نے گھریلو سائنس باقاعدہ پڑھانے اور پیشہ ورتعلیم کا احساس کیا ———

علم طب:- اسی طرح ہندی دوشیزاؤں کے لئے طب زیادتی کے ساتھ جاذب و دلکش ثابت ہو رہی ہے - لیڈی ارون اسپتال میں کافی تعداد پر طالبات موجود ہیں ویسے صوبائی طبی اداروں میں ان کی تعداد کافی ہے -

پیشۂ وکالت ——— جس میں بہت زیادتی کے ساتھ بھیڑ بھاڑ ہے - اس میں بھی مستورات بحیثیت وکیل کچھ عدالتوں میں مردوں کا مقابلہ کر رہی ہیں - اگرچہ سارد ا ایکٹ خلاف ورزی کے واقعات اب بھی افسوس ناک زیادتی کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں پھر بھی اوسط عمر و اُس کی تکمیل بڑھ رہی ہے -

عورتوں کی تحریک حقیقی معنوں میں قابل فخر ہے اس لحاظ سے کہ ماضی میں اُس نے ہمیشہ حق و ترقی پسند اقدام کی جدوجہد کی ہے - جوں جوں عورتیں اپنی طاقت و اثر سے باخبر ہوتی جائیں گی ہندی سیاست حقیقی و صحت افزا ہوتی جائے گی اور وہ عام نظم و نسق میں بلا رنگ و ملت ترقی پسند نظریہ پیش کریں گی -

———(×)———

محبت

۱- محبت یہ ہے کہ محبوب جسے چاہے اس کو اختیار کرے گویا محبت بالذات تجھے اس سے نفرت ہو، اور جس چیز سے محبوب نفرت کرے اس کو چھوڑ دے - اگرچہ اوس سے انست و الفت ہی کیوں نہ ہو -

۲- محبت یہ ہے کہ جوش و رقابت پیدا کرے کہ تجھ سا بھی کوئی اور شخص اس سے محبت کرتا ہے -

۳- محبت کا نام محبت اس لئے رکھا گیا کہ سوا محبوب کے سب چیزوں کو دل سے مٹا دیتی ہے -

۴- لوگوں نے مجنوں سے سوال کیا کہ تمھیں لیلیٰ سے محبت ہے ؟ کہا - نہیں، پوچھا کیوں ؟ کہا کہ محبت ذریعہ وصل ہے اور یہاں ذریعہ ہی درمیاں سے ساقط ہو گیا کیونکہ میں "لیلیٰ" ہوں اور لیلیٰ "میں" ہے -

۵- محبت ایک جام ہے جس میں ایسی گرمی ہے جس نے اگر حواس میں قرار پکڑ لیا اور قفس میں ٹھیر گئی تو ساری ہستی کو مٹا کے اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے -

غزل

جناب عرشی (بھوپال)

تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دوا دیتا ہے　　چارہ گر آج نہ جانے مجھے کیا دیتا ہے

کچھ تو ہوتا ہے حسینوں کو خود احساس جمال　　اور کچھ عشق بھی مغرور بنا دیتا ہے

سوز الفت سے وہ کم مایۂ غم سے محروم　　آتش دل کو جو اشکوں سے بجھا دیتا ہے

ہو گیا ترک مراسم کو زمانہ لیکن　　آج تک دل تری نظروں کو دعا دیتا ہے

لن ترانی بھی تھی اک مصلحت خاص جمال　　شوق نظارے کی قیمت کو بڑھا دیتا ہے

زندگی دے کے مصیبت میں ہمیں ڈال دیا　　کوئی یوں بھی کہیں بے جرم سزا دیتا ہے

چارہ گر پاس کے تیور سے تسلی دے کر　　اور بیمار کو بیمار بنا دیتا ہے

دار مل ہی گئی منصورؒ کو عرشی ورنہ

کون دنیا میں محبت کا صلا دیتا ہے

———(＊)———

یہ ہے جمشید پور

مس بلدیپ کور (جمشید پور)

پڑھے لکھے لوگوں اور کم از کم شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کو تو جمشید پور کا نام سُن کر ایک بار "جامِ جمشید" ضرور یاد آجاتا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، ہاں جمشید پور صوبہ بہار میں ایک بہت مشہور صنعتی شہر ہے۔ یہاں پر بمبئی کے ایک مشہور شخص جمشید جی نوشیروان جی ٹاٹا نے ۱۹۱۱ء میں ایک کارخانہ کی بنیاد رکھی شہر کا پرانا نام "کالی ماٹی" ہے کیونکہ یہاں کی مٹی کچھ کالی سی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کے گورنر جنرل جب یہاں تشریف لائے تو انھوں نے جمشید جی نوشیروان جی ٹاٹا کے نام پر شہر کا نام جمشید پور اور اسٹیشن کا نام "ٹاٹا نگر" رکھا مگر اب تک اسٹیشن میں ٹاٹا نگر کے ساتھ "کالی ماٹی" بھی لکھا ہوا ہے۔

یہ شہر چھوٹا ناگپور کمشنری کے پہاڑی علاقہ میں واقع ہے۔ شہر کا رقبہ تقریباً تیس مربع میل ہے۔ شہر کے جنوب میں بنگال ناگ پور ریلوے لائن، مشرق میں جنگلات شمال میں سوبرن ریکھا ندی اور مغرب میں کھرکھائی دریا ہے۔ سوبرن ریکھا دریا میں سونا پایا جاتا ہے مگر نکالنے کا کوئی انتظام نہیں ہے، ویسے یہاں کے جنگلی لوگ ایک سوپ کی طرح لکڑی کے تختہ پر ریت اور مٹی کو دھو دھو کر سونا نکالتے ہیں۔ مگر یہ سونا نکالنے والے کبھی اچھی حالت میں نہیں دیکھے گئے اور نہ کبھی سرمایہ دار بن سکے۔ شمال مغرب میں دریائے کھرکھائی سوبرن ریکھا سے آکر ملتی ہے اور سنگم پر بہت خوشنما جنگل ہے۔ جہاں لوگ اکثر پکنک وغیرہ کے لئے جاتے ہیں۔

شہر کے بیچوں بیچ ٹاٹا کے لوہے کا کارخانہ واقع ہے جو تقریباً آٹھ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ کارخانہ کے چاروں طرف کوئی دس فیٹ اونچی دیوار ہے اور ہر سمت میں کئی گیٹ ہیں۔ ہر سمت سے آنیوالوں کو کارخانہ کے اندر داخل ہونے میں آسانی ہو۔ پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب یہاں کی سڑکیں بہت اونچی نیچی ہیں اور اس لئے سائیکل چلانے والوں کو چڑہائی میں مزہ آجاتا ہے۔ پورے شہر میں تارکول کی پکی سڑکیں بچھی ہوئی ہیں اور جو بہت ہی صاف ستھری رہتی ہیں۔ پورا شہر بہت ہی صاف ستھرا ہے یہاں کی صفائی کا انتظام اور شہروں کی طرح بجائے میونسپل کمیٹی کے ٹاٹا کمپنی خود کرتی ہے اس لئے صفائی کا انتظام بہت ہی اعلیٰ ہے جس کی مثال ہندوستان تو کیا دنیا کے دوسرے بہت کم ملکوں میں دیکھنے کو ملے گا۔ یہ میرا کہنا نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کا کہنا ہے جنہوں نے یورپ اور امریکہ کی بھی سیاحت کی ہے پچھلے دنوں کیبنٹ ڈیلیگیشن ( ) کی لیڈر جمیر مسٹر نکل نے اپنی تقریر کے دوران میں جمشید پور کی صفائی کا خاص طور سے ذکر کیا اور ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی کہا تھا "یہاں کی سڑکیں جتنی صاف ہیں اتنے ہی یہاں کے لوگوں کے دل میلے ہیں" خیر "یہاں کے دلوں" کے بارے میں تو مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے اور یہ پنڈت جی ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ مگر جہاں تک سڑکوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں میری بھی یہی رائے ہے کہ سڑکیں نہایت صاف ستھری ہیں۔ شہر کے شمال میں افسروں کے بنگلے ہیں جو ناردن ٹاؤن کہلاتا ہے۔

باشندے:۔ یہاں کے خاص باشندے وہی لوگ ہیں جس کے بارے میں ہم تاریخ میں پڑھ چکے ہیں یعنی غیر آریا جنھیں وسط ایشیا والوں نے مار بھگایا تھا۔ جن میں کول، بھیل اور سنتھال لوگ کثرت سے ہیں۔ یہ لوگ رنگ کے بالکل کالے ہوتے ہیں اور اب بھی برائے نام کپڑا پہنتے ہیں اور بڑے محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ تیر چلانے میں بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دس بارہ سال پہلے یہ لوگ درختوں کی چھال اور پتے پہنا کرتے تھے جمشید پور آباد ہونے کے بعد یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر اب یہ کپڑا پہننے لگے ہیں مگر وہ بھی برائے نام ——— یہاں دنیا کے ہر ملک اور ہر براعظم کے لوگ دیکھنے میں آتے ہیں جنگ سے پہلے یہاں جاپانی۔ جرمنی اور روسی بھی تھے جو کارخانوں میں انجینیر کے عہدوں پر مامور تھے۔ یہاں پر زیادہ آبادی بنگالیوں کی ہے۔ یعنی تقریباً پچاس فیصدی اور ہر شریف

بنگالی کے کم ازکم چھ بچے ضرور ہوتے ہیں - پھر ہزاروں کے تعداد میں پنجابی، پٹھان، یو۔پی
اور سی۔پی کے لوگ بھی نظر آئیں گے اور چونکہ ٹاٹا کمپنی ایک پارسی کمپنی ہے اس لئے
ٹاٹا کے بڑے آفیسر زیادہ تر پارسی ہی ہیں اس لئے یہ لوگ بھی کافی تعداد میں دیکھنے
میں آتے ہیں - شہر کی آبادی تقریبًا دو لاکھ ہے -

کارخانے :- یہاں پر دنیا کا دوسرے نمبر کا اور ایشیا میں اول نمبر کا ٹاٹا صاحب کا
دی ٹاٹا آئرن اینڈ سیٹل کمپنی لمیٹڈ ہے جس میں چوبیس گھنٹوں کام ہوتا ہے لوگوں
کی ۸ - ۸ گھنٹے کی ڈیوٹیاں ہوتی ہیں - اس کارخانہ میں تقریبًا چالیس ہزار مزدور کام
کرتے ہیں - کارخانہ میں لوہے کے پتھر کو پگھلا کر لوہا اور فولاد بناتے ہیں اور ان سے ریل
کی پٹریاں - پل بنانے کے لئے لوہے کے گارڈر اور ٹین کی چادریں بنتی ہیں -

ٹاٹا کمپنی کے بعد ٹین پلیٹ کمپنی کا نمبر ہے - یہ ایک انگریزی کمپنی ہے جس میں تقریبًا
پانچ ہزار سے زاید مزدور کام کرتے ہیں یہ کارخانہ ٹاٹا کمپنی سے لوہا لے کر ٹین کی چادریں
اور لوہے کے گارڈر بناتا ہے - اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کمپنیاں ہیں مثلاً کیبل
کمپنی جس میں بجلی کا تار بنتا ہے اور اس لحاظ سے یہ ہندوستان کی سب سے بڑی فیکٹری
ہے - کھیتی باڑی کے اوزار بنانے کے لئے " ایگریکلچرل کمپنی " ہے - اس کے علاوہ ٹاٹا
نگر فاؤنڈری ہے - انڈین ٹینی نٹ کمپنی اور ہوم پائپ کمپنی بھی ہے پھر ہندوستان
کے مشہور سکھ لیڈر و منسٹر مسٹر بلدیو سنگھ کے پتاجی نے انڈین اسٹیل اور وائر پروڈکٹ کے نام
سے ایک کارخانہ قایم کیا ہے اور یہ کارخانہ شہر کے بالکل مشرقی سرے پر آبادی سے کسی قدر
دوری پر ہے اور چونکہ مسٹر بلدیو سنگھ کے پتا کا نام سردار بہادر اندر سنگھ ہے اس لئے لوگوں
نے اس مقام کو " اندر نگر " جیسے رومانٹک نام سے یاد کرنا شروع کر دیا ہے مگر در اصل
اس کا نام سرکاری طور سے نہیں پڑا بلکہ یونہی دل جلوں نے اس کا یہ نام رکھ دیا ہے اور
اس لئے بہت ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد یہی نام رائج بھی ہو جائے -

پیشہ :- یہاں چونکہ بہت سے کارخانے ہیں اس لئے عام طور پر لوگ ملازمت پیشہ
ہیں اور تھوڑے بہت لوگ تجارت بھی کرتے ہیں - کچھ گجراتی لوگ یہاں آکر بس گئے
ہیں جو دکانداری کرتے ہیں اور تقریبًا ہر چیز کی پچھتر فیصدی دکانیں انہیں لوگوں کی
پائی جاتی ہیں -

تعلیم۔ یہاں کی تعلیمی حالت قابل رحم ہے، اتنے بڑے شہر میں جو بہار کا دوسرے نمبر کا شہر ہے اور اتنا امیر شہر ہوتے ہوئے بھی یہاں صرف تین ہائی اسکول، کچھ چھ مڈل اور کچھ پرائمری اسکول ہیں اور کالج یہاں کے لئے عنقا سے کچھ کم نہیں۔ ہر سال بہ مشکل تمام تین سو امیدوار میٹرک کا امتحان دیتے ہیں۔ خاص کر لڑکیوں کی تعلیم کا تو بالکل اچھا انتظام نہیں۔ لے دیکے دو ہائی اور دو مڈل اور دو ہی پرائمری اسکول ہیں لڑکوں کے اسکولوں میں اردو، انگریزی، بنگالی اور اڑیا زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اور لڑکیوں کے اسکولوں میں میٹرک تک صرف انگریزی ہندی اور بنگالی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، اردو بمشکل مڈل کلاسوں تک ہے کیونکہ لڑکیاں جہاں آٹھ نو برس کی ہوئیں اور پردہ کے آڑ میں بٹھا دی گئیں۔ اور پھر ویسے بھی یہاں اردو کا بہت کم چرچا ہے۔ لوگ ایسی گلابی قسم کی ہندوستانی زبان بولتے ہیں کہ طبیعت گھناجاتی ہے اور وہ اس لئے کیونکہ یہاں پڑھے لکھے لوگوں اور جاہلوں کی زبان میں کوئی فرق ہی نہیں پایا جاتا۔ بہت کم لوگ اچھی زبان بولتے ہوئے ملیں گے اور وہ بھی وہ لوگ جنھیں ادب سے کچھ ذوق ہو یا پھر حال ہی میں باہر سے یہاں آئے ہوں۔ یہاں کے سب اسکولوں کا انتظام ٹاٹا کمپنی خود کرتی ہے۔ ایک اسکول کمیٹی ہے جس میں کمپنی کے بڑے بڑے پڑھے لکھے قسم کے لوگ ممبر ہیں اور ایک ایڈوکیشن آفیسر بھی ہیں جن کے ماتحت براہ راست سب اسکول ہیں۔

طرز معاشرت:۔ یہاں چونکہ ہر صوبہ اور ہر ملک کے لوگ نظر آئیں گے اس لئے یہاں کی طرز معاشرت بھی مخلوط قسم کی ہے۔ کوئی دھوتی کرتا پہنے نظر آئے گا تو کوئی شلوار قمیص، تو کوئی سوٹ بوٹ اور کوئی اچکن پاجامہ اور عورتیں جہاں ساڑیوں اور شلوار قمیصوں میں نظر آئیں گی وہاں فراک اور گاؤن بھی میں بھی۔

زبانیں:۔ یہاں چونکہ ہر ملک اور ہر صوبہ کے لوگ نظر آتے ہیں اس لئے ہر زبان سننے میں آتی ہے مگر عام طور پر لوگ ہندوستانی قسم کی زبان بولتے ہیں مگر چونکہ بنگالیوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ اس لئے عام طور پر لوگ بنگالی بولتے ہیں یہاں کے اصل باشندے کول بھیل اور سنتھال بھی بنگالی جیسی زبان بولتے ہیں۔

یہاں کے ڈاکخانوں کی بھی ایک قابل ذکر بات بتائے دیتی ہوں وہ یہ کہ یہاں کے

ڈاک خانوں میں اردو جاننے والا کوئی نہیں اس لئے اگر کسی رسالہ پر یا خط پر صرف اردو میں پتہ لکھا ہو، رہا تو وہ خط بجائے مکتوب الیہ کو ملنے کے لاوارث سمجھ کر ڈیڈ لیٹرز آفس کلکتہ بھیج دیا جاتا ہے اور پھر وہاں سے انگریزی میں پتہ لکھنے پر واپس جمشید پور آکر مکتوب الیہ کو ملتا ہے۔ اسی سے آپ یہاں کی اردو نوازی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

طلباء دار العلوم کالج کے فکر تازہ کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں حیدر آبادی خواتین اور حضرات کے نگارشات ہیں جس کے مدیر سہام مرزا ہیں جو اپنے افسانوں کی وجہ سے ملک میں روشناس ہیں۔

عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ رسائل نکلتے تو ہیں کالج کی طرف سے مگر مضامین پر اگندے ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھیک مانگنی پڑتی ہے اور ہم ہمیشہ اس کے خلاف رہے ہیں کہ کالج کے پرچہ میں طلباؤں ہی کے مضامین رہا کریں چاہے وہ اچھے ہوں یا ابتدائی مشق ہو، آخر انہیں بھی تو ایک دن مضامین نگار بننا ہے اور نہ جانے ان میں کتنے ایسے ہوں گے جن میں جوہر قابلیت موجود ہے ان کو شہ دیجئے تو وہ ترقی کر سکیں گے اور اگر ڈانٹ دیجئے تو جوہر قابلیت ابتدا ہی میں ناس ہو جائے گا۔

فکر نو غیروں کے مضامین سے بے نیاز ہے یہ آئندہ بھی اسی روش پر جادہ پیما ہو تو ملک میں شاید چند اچھے لکھنے والے اور بھی پیدا ہو جائیں گے۔ عموماً یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کالج سے اول اول جو رسائل نکلتے ہیں وہ نہایت ٹھاٹ باٹ اور بلند بانگ ہوتے ہیں لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے کوئی جانتا تک نہیں کہ رسالہ تھا بھی! فکر نو کو سب سے پہلے اپنی بقا اور پابندی وقت کا خیال پیدا ہو جائے تو ہم سمجھیں گے۔ کار سے کردی۔ چندہ سالانہ (للعہ) کلیہ دار العوام کالج حیدر آباد دکن

یہ بچے ہیں؟

جہاں بانو ایم۔ اے

بچوں کو کھلونا کہتے ہیں۔ انہیں پھولوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ بچے گھر کی رونق بڑھاتے ہیں۔ یہ گھریلو زندگی کی بے چین خوش آیند مخلوق۔ صاحبزادی قرۃ العین ہیں تو صاحبزادے نور بصر۔ لیکن بھابی جان کے جیسے ابلیس مجسم بچے ہیں ان سے تو شاید شیطان بھی پناہ مانگے۔ خصوصاً ان کا جاوید ——

پہلے پہلے تو جب یہ گھر آئیں بڑی شرم تھی آنکھوں ہیں۔ میں نے ان کی آنکھوں کی بڑی تعریف سنی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی ان غزال جیسی آنکھوں کو۔ لیکن وہ تو آنکھ کھولنے کی جیسے قسم ہی کھائی تھیں۔ دھیرے دھیرے گھونگٹ اٹھا اور میں نے سہمے سہمے ان کی غلافی آنکھیں دیکھیں۔ جانے کیا کیا سوچتی رہی انھیں دیکھ کر بڑی دیر تک۔ واقعی آنکھیں ہوں تو ایسی ہوں۔

سودا کی وہ کیفیت چشم والا شعر یاد آگیا، اور میں بڑی دیر تک اس کے "ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" پر سر دھنتی رہی۔

اقبال کو تو اپنی تقدیر کی لہریاں نظر آتی تھیں ان جیسی آنکھوں میں شاید قدرت نے بڑی سوجھ بوجھ اور بڑی فرصت کے وقت یہ آنکھیں بنائی ہیں۔ خیر وہ زمانہ گذر گیا۔ اب تو میں آنکھوں وانکھوں کے شعر سے اتنی زیادہ متاثر نہیں ہوتی بلکہ کردار کی روشنی میں کسی کو دیکھنے اور پرکھنے کی نظر مل گئی ہے اب جب یہ آنکھیں خود اتنی دلکش ہیں تو ان نور بصر و قرۃ العین کا کیا حال ہوگا — اللہ جانے۔

دیکھتے دیکھتے ایک سال ہو گیا۔ بھابی جان کی طبیعت نصیب اعداء (مجھے یہ ترکیب لفظی کچھ اچھی نہیں لگتی۔ اس سے خود غرضی اور انسان دشمنی کی بو آتی ہے) کچھ خراب سی رہنے لگی۔ لیکن یہ طبیعت کی ناسازی کی خوشخبری کا پیش خیمہ تھی۔ یکایک ہمیں اطلاع ملی کہ بھابی جان کے لڑکی تولد ہوئی ہے۔

اماں نے منہ بنا لیا لڑکی کے نام سے۔ ممانی جان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ خالہ امی نے کہا لو نام بڑا درشن چھوٹے۔ چچی جان نے فقرہ کسا، بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔ انا بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ انھوں نے دیکھا یہ بچن اگر دولہن کے کان تک پہنچ گئے تو پھر چلہ کا جوڑا بھی گیا۔ سن ہی کیا ہے بھلا۔ آج بیٹی ہے کل بیٹا۔ بوا سلیماً بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔ لیکن ہمارے لئے بیٹا ہو یا بیٹی ایک ہی بات تھی۔ ہمیں تو کھیلنے کو کھلونا چاہئے وہ گیند ہو یا گڑیا۔ کھیل سے غرض تھی۔ ہم دوڑے دوڑے جانے لگے۔ دروازہ پر ہی ایک ڈانٹ سنی۔ "نہیں ابھی تم بچوں کا کام نہیں ہے۔ اندر نہیں جا سکتے" ارے ہم بچے ہی کہاں تھے۔ شرارت پر ہزاروں صلواتوں کے ساتھ یہ کہنے والے کتنے ہی منہ تھے اتنی سیانی ہو گئی اور ادھم مچاتے شرم نہیں آتی۔ دیدہ کا پانی مر گیا۔ میں ہوتی تو ڈوب مرتی۔ غرض کس کس نوعیت سے ہمیں جتایا گیا کہ ہم اب بڑے ہو گئے ہیں۔ لیکن اس سیاسی چال کی کسے خبر تھی کہ کسی موقع پر ہم بڑے ہو جاتے ہیں اور کسی خاص موقع پر اپنے سن سے بھی چھوٹے۔ اونہہ — اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو۔

لیکن بھائی جان کی بچی آخر ہماری بھی کچھ لگتی تھی۔ مگر کون پوچھے یہ سب کچھ۔ اور کوئی ہماری باتوں کا جواب بھی کیا دیتا۔ داخل آدم ہی کب تھے ہم۔ جی جل کر خاک ہو گیا۔ اور یہ دل میں ٹھان لیا کہ اب تو ؎

خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

شام ہو چکی تھی۔ یہ صبح کی واردات تھی۔ امی نے آ کر کہا۔ چل نگہت۔ بچی کو دیکھ لے۔ ادھر سے نیاز ہوتے دیکھ کر ہمیں بھی ناز سوجھا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ نہیں امی میں نہیں دیکھتی کسی کو۔ امی نے للکارا۔ ا ہ ہ۔ یہ زبان درازی۔ بزرگوں سے جوتی سے۔ مت دیکھ۔ اور امی غصہ کے عالم میں اندر چلی گئیں۔

اب کیا ہوگا۔ نانہ بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر۔ ایک موقع ملا تھا۔ اس کو بھی

ہم نے اپنی حماقت سے کھو دیا۔ اب تو کوئی صورت بھی نہ تھی۔ کسی اور کو تو کیا غرض پڑی تھی جو ہم سے اس کی التجا کرتا ۔ تاؤ کھاتی رہی ۔ پشیمانی سی ہونے لگی ۔ موقع کے کھو دینے کا افسوس ہونے لگا ۔ لیکن سارے من میں یہ بچی بسی ہوئی تھی ۔ اَن دیکھی محبت ۔ رہ رہ کر سوچتی کہ اب کیا کروں ۔

مجھے غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے ۔ اور اس وقت کچھ بھی نہیں سوجھتا ۔ حلم اور بردباری بڑی صفات ہیں ۔ میں ان کے لئے ابھی بہت چھوٹی ہوں ۔ پھر جی چاہا ۔ مگر کیا چاہا جی ۔ یہ نہیں معلوم —— نامعلوم سے خیالات آتے رہے ۔ ہر ارادہ ٹوٹتا تھا ۔ جس کو کرنا چاہتی تھی ۔ نیت میں استواری نہ تھی ۔ اور میں کچھ گھڑی سوچ میں چمن کی کیاریوں میں اِدھر سے اُدھر، اِدھر سے اُدھر بے مقصد گھومنے لگی ۔ جیسے کسی کھوئی ہوئی شئے کی مجھے تلاش تھی ۔ چلتے چلتے حوض کے پاس پہنچی ۔ بڑا سا آہنی مور حوض کے درمیانی حصہ میں کھڑا پانی اچھال رہا تھا ۔ جیسے کسی کے غرور کا سر نیچا ہو رہا ہو ۔ معاً پیچھے سے کوئی جانی پہچانی آواز آئی "نگہت ۔ چل بھابی پاس جائیں منّی کو دیکھنے "

یہ شاما تھی ۔ میری ہم جماعت —— یہ سہیلیاں بھی غضب ہوتی ہیں ۔ اگے پیچھے لگی رہتی ہیں ۔" تو جا بھئی میں نہیں آؤں گی "

" شاید ڈانٹ سُنی ہے کچھ ۔ یہ منہ پھُلا ہوا کیوں ہے ؟ دیکھ میں چلی جاؤں گی "

" تو جا منع کون کرتا ہے ۔ میں نے جیسے تمھیں بلایا تھا منّی کو دیکھنے " دیکھا تو سامنے سے بھائی جان جھومتے جھامتے سینہ تنائے ہوئے چلے آرہے ہیں ۔ جیسے بڑا تیر مارا ہے ۔

" نگہت ۔ سنا تو بہت خفا ہے ۔ ارے منی سے کاہے کی خفگی ۔ بچوں سے کوئی یوں روٹھتا ہے ۔ اس نے تیرا کیا بگاڑا ۔ کسی نے کچھ کہا تھا تجھ کو ؟ سارا گھر چھان مارا ۔ سیلانی یہاں گھوم رہی ہے "

شاما بھائی جان کو آتا دیکھ کر جھاڑیوں میں دبک گئی تھی ۔ فوراً نکل آئی کہنے لگی " بھیا کب سے اس کی خوشامد کر رہی ہوں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے ۔ غرض اسی بحث مباحثوں کے بعد بھائی جان نے مجھے زبردستی گھسیٹا ۔ اور ہم دونوں کے ساتھ چلے محل محترم کی جانب ۔

وہاں دیکھا ایک طوفان بے تمیزی کا عالم ہے ۔ سارے خاندان کے لوگ ۔ بھائی جان

کی بے ڈھنگی، مگر اپ ٹوڈیٹ سہیلیاں - ملی جلی اردو انگریزی میں گٹ پٹ کرتی ہوئی بچی کی صورت شکل پر تنقید کر رہی تھیں - میں تو ان کی سہیلیوں سے بہت جلتی ہوں - بڑی مشخت مآب ہیں ان کی سہیلیاں - درجنوں ہیں - مگر ایک بھی سلیقہ کی نہیں - رشیدہ ایف - اے میں پڑھ رہی ہیں - لیکن اپنے نام کے ساتھ یہ دم چھلے لگا کر مضامین لکھتی ہیں - دوسری میں حمیدہ یہ بے ضرورت بھی انگریزی الفاظ ٹھونس کر سب پر اپنی انگریزی دانی کا سکہ جمانا چاہتی ہیں - ریحانہ تو بالکل فلم اسٹار لگتی ہے - تصنع ہی تصنع - اگر کوئی انہیں نسیم سے مشابہت دیدے - تو بڑی خوش اس کے گھر میں سب فلم اسٹار کی تصاویر بھری پڑی ہیں - گویا گھر نہیں نگارستان ہے، غالب، اقبال، ٹیگور، جناح —— وہ ان کا تو خواب بھی نہیں دیکھ سکتی - اب اس غول بیابانی میں ہماری بات کون پوچھے - ہم ننھے ہی کون سے ایسے معزز مہمان —— شامانے دھر کر ایک چٹکی لی - سارا بازو نیلا ہو گیا - تڑپ کر رہ گئی - اس میں یہ بڑی بھونڈی علت ہے - بدتمیز کہیں کی -

" ارے یہاں تو خاصا میلا لگا ہے - ہم بچی کو دیکھ بھی سکیں گے - مگر میں تو واپس جانے کے لئے نہیں آئی تھی - ایک کیتو سی بن گئی تھی - بھابی جان کے پلنگ تک میں سب کو دھکیلتی ہوئی منی تک پہنچ گئی - اس کو دیکھا - خوب گھور گھور کر - گوشت کا ایک لوتھڑا تھا - سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کس کی کیا چیز لائی تھی - آنکھیں بڑی بڑی تھیں - وہی بھابی جان کی بادامی آنکھیں - اور اب میں کچھ سوچنے لگی —— جانے کیا کیا ——

دوسرے دن سے تو یہ نیا مشغلہ سب کی دلبستگی کا باعث تھا - دیکھتے دیکھتے دن مہینوں میں - مہینے سال میں بدلتے چلے گئے - اور بچی جس کا نام میری ہی پسند سے نسرین رکھا گیا تھا، چیخنے، چلانے، ہنسنے اور رونے کا ریکارڈ توڑنے لگی - نسرین مجھ سے بہت زیادہ مانوس تھی - میرے بغیر ایک گھڑی کو چین سے نہ رہتی -

یکایک بھائی جان کا تبادلہ اورنگ آباد ہو گیا - اس وحشت ناک خبر سے میری جان ہی تو نکل گئی - امی کا یہ فقرہ یاد آیا —" اللہ تو اپنی اور اپنے رسولؐ کی محبت دے کسی انسان کی نہ دے " کیوں ہو گئی تھی مجھے اس سے اتنی محبت ! اس کے جانے سے میری زندگی ایک سپاٹ قسم کی زندگی ہو جائے گی —— یہ پریم پیدا کیوں ہوتا ہے ؟ منٹو پوچھتا ہے - اور پھر خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دیتا ہے " یکنے پر پھل میٹھا کیوں ہو جاتا ہے ؟

آگ پر دودھ اُبلنے کیوں لگتا ہے؟ دو پہلو میں دل برابر دھڑکتا ہے - پھر یہ دونوں
مسافروں کی طرح اس پیڑ کو بالکل بھول جاتے ہیں - جس کی چھاؤں میں انھیں آرام ملتا ہے"
مجھے پھر شمس آغا کا "شکوہ" یاد آیا ــــ ہمیں اس واقعہ سے ملتا جلتا ایک نفسیاتی
محاکمہ ہے یہ زندگی کے کھیل میں ان ریلوے آہنی لکیروں کا خاص حصہ ہے - نہ وہ خود ہی
کبھی ملتی ہیں - نہ کسی دوسرے کو آپس میں ملنے دیا ہے انھوں نے - ایک ابدی جدائی کا آہنی
تصور - اپنی ہستی کو اس بچی کے انجان پیار میں کھو دینا چاہا - چالاک شباب نے جب
دھوکہ دیا - اس نے معصوم بچپن پر اعتبار کر لینا چاہا ــــ کتنی ملتی جلتی سی ایک چیز ہے
شمس آغا کی محبت میری محبت سے - لیکن "چالاک شباب" ــــ اس کا ابھی مجھے تو تجربہ
نہیں - یہ شمس آغا کی محبت کا شکوہ ہے -

غرض ادہر امّی کی محبت دامن پکڑتی تھی - ادہر یاسمین روح کھینچتی تھی - لیکن امّی
تو میری اپنی امّی ہیں - وہ مجھے اب کیا بھول سکیں گی - یاسمین کا پیار مجھے پھر کہاں ملے گا -
وہ بھول نہ جائے کہیں - یہ معصوم انجان پیار - امّی کی پختہ کار سنجیدہ محبت تھی - وہ مجھے
یاد کریں گی بہت - کیونکہ اب تو بھائی جان بھی چلی جا رہی ہیں - گھر سونا سونا ہو جائیگا -
بڑی مشکل تھا میرے لئے تصفیہ کرنا -

غرض ہم سب صبح کی ٹرین سے اورنگ آباد روانہ ہوئے - ٹرین میں یہ میرا پہلا سفر
تھا - واقعی سفر بھی کیا مزے کی چیز ہے - آنکھیں کھل گئیں - دیکھتے دیکھتے ٹرین کہیں سے کہیں
نکل جاتی تھی - اور آنکھ کھولتے موچتے اسٹیشن آ جاتا تھا - مسافر چڑھتے اترتے خیالات
بٹو ارہ ہو جاتے - جی اِدھر اُدھر بھٹک جاتا - امّی سے چلتے وقت میں خوب لپٹ کر روئی
تھی - ماں کی محبت کا جدائی کے وقت احساس بہت ہوتا ہے - یہ پریم کی دولت کچھ عرصہ کے
لئے مجھ سے چھن گئی تھی -

اب میں قسم قسم کی سوچ میں پڑ گئی تھی - امی کی یاد یوں ہی مجھے تڑپانے کو کیا کم تھی -
ان غریبوں کے سفر کو سوچ رہی تھی - ان کا بھی کچھ سفر ہے - ایک گٹھری - اسی میں پھٹا بوسیدہ
سا بستر - ایک آدھ ٹوکری - اور بس یہی کائنات - خود ہی مسافر - خود ہی مزدور - نہ
کسی کے محتاج نہ پوزیشن اور شان سے غرض - کھانے کو ملا - کھا لیا - ورنہ یوں ہی پڑ کر
سو رہے - نہ شکایت - نہ گلہ - شکوہ کریں تو سننے بھی کون؟ کس کو پڑی ہے جو ان کی سنے

جن کی سُننے کو صدا ابھی بہت دُور ہے لیکن ان حرماں نصیبوں کی تقدیر میں کسی حرکت میں بھی برکت نہیں - اِدھر سے اُدھر، اِدھر سے اُدھر خدائی خوار پڑے پھرتے ہیں - بے مقصد سی زندگی - ٹرین کے انتظار میں جاہ و تمول والے جاگتے رہتے ہیں - اپنے قیمتی ساز و سامان کی انھیں جو فکر ہے بڑی - لیکن ان غریبوں کا بستر پلیٹ فارم ہو جاتے - خواہ سردی ہو - خواہ گرمی سکڑتے، دبکے، سہمے، وہیں پڑ کر وقت گزار دیئے - ٹکٹ چیکر اور ریلوے گارڈ کی بدسلوکیوں کا شکار - جن کی ٹھوکروں سے جاگ پڑے - "خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے" جیسی کوئی بات نہیں - خیالات کا یہ لامتناہی سلسلہ ٹوٹتا نظر نہ آتا تھا - ٹرین تیزی سے چلی جا رہی تھی - ماضی سے بے خبر سی - مستقبل ہی جیسے اس کا سب کچھ ہے -

نسرین اب چار برس کی تھی - اس کی پیاری پیاری باتیں - اس کے معصوم قسم کے سوال، اس کی انوکھی شرارتیں سفر کے لطف کو دوبالا کر دیتے - نسرین کا ایک بھائی بھی ہو چکا تھا جو اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا تھا - جاوید بڑا بے ڈھنگا بچہ تھا - موٹا موٹا سا وہ مجھے بدھو جیسے لگتا - خیر ہم بھائی جان کے ٹھکانے پر پہنچے - کھانا تیار تھا - ہم سب نے مل کر کھایا - نسرین جتنی شریر اور چنچلی تھی - جاوید اتنا ہی منحوس قسم کا بچہ تھا - اس کی شرارتوں میں ایک تخریبی صلاحیت ضرور تھی - جس چیز کو ہاتھ لگائے توڑے بغیر چین ہی نہ تھا جیسے - توڑ کر اس کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی - میں نے بھابی جان سے بارہا اس کی شکایتیں کیں - آپ کا جاوید شیطان ہے بچہ کاہے کو ہے - بھابی جان غصہ سے جل ہی تو جاتیں - مجھ سے منہ پھلا پھلا رہتا - لیکن نسرین ایک کڑی تھی جو ہم دونوں میں نفاق نہ ہونے دیتی - وہ مجھ سے دن بدن مانوس ہوتی جاتی تھی - آخر اس انوکھے بے لوث پریم کا انجام کیا ہوگا - لیکن ابھی سے انجام کو کون سوچے -

ایک دن میں حمام سے نکل کر دیکھوں تو میرے سارے کمرے میں غارت گری مچی ہے کوئی چیز ٹھکانے سے نہیں سارا کمرہ ابتر عالم میں - مرمت لینے طبیعت چاہی - جی چاہا دو رسید کر دوں جاوید کے بچہ کو - میری فریاد سننے والا بھی کون تھا بھائی جان سے شکایت کرو تو جواب ملتا - بچے ہیں - تم بھی میری چیزوں کا یوں نہیں پاس کرتی تھیں نگہت - لیکن میں تو جی بھر کر پٹ جاتی - اس ناز نخرے کے صاحبزادے کو تو انگلی لگانا منع ہے - بھابی جان کا فتویٰ تھا کہ میں ان کے جاوید سے خدا واسطے بھی جلتی ہوں - میری سیاہی اوندھی ہو گئی

فاؤنٹین پن کا ہولڈر غائب - امّی کو خط لکھا تھا اس پر سب سیاہی الٹی ہوئی - ٹارچ
پچکی ہوئی - گھڑی کا آئینہ پاش پاش - اور میں پھر ان کے برخوردار سے جلتی ہوں -
اسی دن کے لئے آرزو کی تھی کہ گھر میں بچے ہوں - دل لگے گا - ڈھائی برس کے سن میں
ایسا فرعون ہے - آگے چل کر تو دھائی مانگنے کی نوبت آئے گی -

تو یہ ہیں ہمارے گھر کے بچے ———

"یادوں کے دیئے"

سیدہ زہرا رضویہ (اورنگ آباد)

"کسی کی یاد میری زندگی ہے"

جب ساون کی گھٹائیں اودے پربتوں کے پیچھے سے گرجتی ہوئی اٹھتیں.... چمکیلی اور عجیب سی صبح ہوتی.... کلیاں مسکراتیں..... پھول قہقہے لگاتے.... جس سے فضا شیریں اور معطر ہو جاتی... چاندنی اور تاروں بھری راتیں ہوتیں.... پورب سے پچھم تک جیسے کوئی پھولوں کی بارش برساتا ہو.... ایسے سمے جب کہ کائنات کا چپہ چپہ مسرت و شادمانی کے گہوارے میں ہوتا —— میں "یادوں کے دیئے" جلاتی اور کچھ نہیں! صرف یادوں کے دیئے —— ! اور جب ساون آیا اپنی بھرپور امنگوں کے ساتھ... تو بلبل کو گلاب.... قمری کو سرو.... چاند کو چکور ملنے کی حسرتیں جاگ سے اٹھتیں.... حوروں کی سی لڑکیوں کی ٹولی... فرشتوں جیسا معصوم دل لئے اٹکھیلیاں کرتی جاتیں.... شاداں و فرحاں.... سرشارسی.... مسرتوں سے ہمکنار.... غموں سے دور.... ان کی بے نیازی.... بے فکری —— البیلی فطرتیں ہوتیں...... نت نئی شوخیاں اور کبھی نہ ختم ہونے والی داستانیں چھڑتیں.... جانے کیوں ایسے سمے میری آنکھوں میں نمی سی ہوتی اور پھر موتیوں جیسے آنسو باوجود ضبط کے گرنے لگتے.... کسی ٹوٹی ہوئی تسبیح کی طرح اور اس سمے سوائے "یادوں کے دیئے" جلاتے رہنے کے کچھ نہیں کرسکتی ہیں.. . اور کچھ نہیں ——! جب سحر کے وقت شاما سہانے گیت الاپتی....

ہو اکی معصوم دیوی محبت کا نور برساتی .... پجارنیں پھول لے کر مندر جاتیں...
چمن کی کلیاں کسی کا سہارا ڈھونڈتیں.... صبا خرام ناز سے گلشن میں چلنے لگتی...
اور میری بیتاب روح اس دم نہ جانے کیوں ---"یادوں کے دیئے" جلاتی اور کچھ نہیں
---"صرف یادوں کے دیئے"---!

جب نیلے آسمان کی لاتعداد شمعیں اپنی ہلکی ہلکی مدہم اور روپہلی روشنی سے کسی
بھولے بھٹکے مسافر کو آہستہ بتاتی ہیں ملائک فضا کو لوری دے کر سلاتے ہیں....
کائنات کے چپہ چپہ پر خاموشی مسلط ہو جاتی.... ماضی کے حسین افسانے دہراتی ہوئی
... مستقبل کے سنہرے سپنے دکھلاتی دیتے.. حال کو حسرت سے دیکھتی ہوئی ---
زندگی جانے کیوں دوبھر سی معلوم ہونے لگتی اس وقت.... تاریکیوں سے بھرپور سیاہ
رات.... اور ایسے سے ڈرتے ڈرتے گھبرا کر دھڑکتے ہوئے دل سے "یادوں کے دیئے"
جلایا کرتی ہوں میں... اور کچھ نہیں - صرف "یادوں کے دیئے" ---

جب شرمائی شرمائی.... سمٹی سمٹی "انقلاب زندگی" والی لڑکیاں برہا کے برہت جیسے
دن آنکھوں آنکھوں میں "راہ" دیکھ کر کاٹتیں.... محبت کا چاند طلوع ہوتا....
آرزوئیں.... تمنائیں.... حسرتیں سب جاگ جاتیں.... بڑی بڑی امنگوں سے
.... آشاؤں سے.... آنکھوں میں خواب شادمانی کا جھلملاتا.... فضاؤں کی
حسین پنہائیوں میں.... دل ناکام کی گہرائیوں میں.... یوں محسوس ہوتا کہ کوئی
چپکے چپکے کسی کو یاد کرکے اشک بہا رہا ہے.... اور خاموش التجائیں کسی کا بیتابی سے
نام لیتی ہوئی دکھلائی دیتیں.... لیکن مجھے کیا؟ یہ محبت کے چاند سے.... اور
ان حسین پنہائیوں سے.... خاموش التجاؤں سے......؟ کیونکہ میں تو "یادوں
کے دیئے" جلاتے رہنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتی نا؟ --- صرف "یادوں کے دیئے"
--- اور کچھ نہیں ---

یاد کرکے انہی کو جیتا ہوں !!!

تم بات کرو ان سے جو ہوں بات کے قابل ہم بات کے قابل نہ ملاقات کے قابل

جیسے بھٹکا ہوا کوئی دشت نورد

سلطانہ

آفتاب کی رنگین اور دلربا کرنوں کے درمیان کائنات کا پُرفریب پیکر ناکام زندگی پر اپنا جال اور دامن پھیلا دیتا ہے۔ صداقت کی کمزوریاں کذب کے تیز نوکدار چمکیلے نشتروں کے ہجوم میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دل کے خاموش آنسو رات کی تاریکی میں ٹپک ٹپک کر خشک ہو گئے۔ افسردہ روح کی خوابیدہ مسرتیں خزاں رسیدہ غنچوں کی طرح ملامت کی تاب نہ لا کر فضا کے آغوش میں سوگئیں۔ لیکن افترا کا دیوتا مسکرا مسکرا شکستہ حالی کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

کتاب زندگی کے اوراق آہستہ آہستہ گذرتے ہوئے افسانوں کی طرف پلٹ جاتے ہیں نگارخانہ عالم میں نئے ڈرامے پرانی شان سے جلوہ فگن ہوتے ہیں۔ بعض وقت جانی ہوئی جان نواز تصویروں کا پرکشش تصور روح کی مسرتوں کو کاٹتا ہوا عالم خیال کے تاریک بادلوں میں روپوش ہو جاتا ہے اور پلکیں از خود سیلاب اشک سے تر ہو جاتیں۔

دور ویرانے میں لہراتی ہے روح مضمحل
ہو رہی ہیں یہ ہماری قبر کی تیاریاں
ستارے ریت کے ذروں پہ مسکرانے لگے
مذاق گذرے ہوئے وقت کا اڑانے لگے!

3238
REGD. M. N. D.

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیرپورہ سے شائع ہوا

ماہنامہ

حیدرآباد دکن

شہاب

جلد ۱۵ فروردی سنہ ۱۳۵۶ف م فبروری سنہ ۱۹۴۷ء نمبر ۵

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

چندہ سالانہ (۵؍)

"فطرت اور انسانی صنعت"

جناب خواجہ محمد عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے (امرتسر)

کل کائنات جس کا ایک جزو عالم انسانی بھی ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ جو بجائے
خود ایک جہان ہے صنعت کاملہ ہے - اس لئے عالم انسانی اور اس کا عمل فطرت ہی کا عمل ہے،
لیکن اصطلاح میں فطرت یا "نیچر" اسے کہتے ہیں جس میں انسانی علم وارادہ قدرت کا دخل نہ
ہو، اور جس میں یہ کارفرما ہوں وہ انسانی صنعت یا "آرٹ" کہلاتی ہے، بے آب وگیاہ
میدان یا سرسبز وادی فطری حالت میں نظر آتی ہے، لیکن ایک قطعہ زمین پر باغ جسے انسانی
ہاتھوں نے لگایا ہو انسانی صنعت ہے، یہ ظاہر ہے، کہ اس میں انسان نے کوئی ایسی شئی
نئی پیدا نہیں کی جو پہلے ہی کارگاہ فطرت میں موجود نہ ہو، اس لئے صرف اتنا کام کیا کہ
ایک شئی کو دوسری شئی سے ملانے یا توڑنے کے لئے حرکت دی، یہی توڑ جوڑ ہے جو انسانی
صنعت ہے، اس لئے انسان فطرت کی صنعت اور فطرت کا باشعور آلہ کار بھی ہے، اور فطرت
اپنے مقصد اور منشاء کے مطابق اسے استعمال کر رہی ہے، اور اسے طوعاً یا کرہاً اس فطری
منشاء کو پورا کرنا ہی پڑتا ہے، جسے وہ اپنی صنعت سے تعبیر کرتا ہے وہ دراصل فطرت ہی کا
نام ہے، وہ ایک ذرہ بھی نیا پیدا نہیں کر سکتا اور نہ کسی شئی کے فطری خواص کو بدل سکتا
مٹا سکتا ہے، اس کے توڑ جوڑ یا صنعت کی غرض وغایت یہی ہے کہ اشیاء سے زیادہ سے زیادہ
فائدہ اٹھائے جو غیر محدود ہے، اور ان کے فطری خواص کے ضرر سے بچنے کے لئے کچھ توڑ جوڑ کرے
لیکن یہ سب کچھ وہ کر نہیں سکتا جب تک ایسے قوانین فطرت کا علم نہ ہو جو کبھی نہیں بدلتے،
اور اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ انہیں کام میں لا سکے، اس لئے صنعت سے مقدم علم وارادہ

و قدرت کا ہونا واجب ہے، جس سے انسان ایک ذمہ دار ہستی بن جاتی ہے، اس لیے صنعت ایک ایسا عمل ہے جس کا کچھ مقصد ہو، اور جس میں علم و ارادہ و قدرت کار فرما ہوں، چونکہ کل کائنات بلکہ ذرہ ذرہ صنعت ہے، اس لئے اس کا کچھ مقصد اور غرض و غایت اور اس میں صانع کا علم و ارادہ و قدرت کا کار فرما ہونا بھی واجب تھے، ورنہ یہ سب کچھ عبث یعنی باطل ہے، اور اگر یہ عبث ہو تو تمام انسانی علوم و فنون بھی جو اسی سے ماخوذ ہیں عبث ہوں گے اور خود انسان عبث مخلوق ہوگا، عبث جو کچھ کہے سنے عبث ہی ہوگا، اس کی باتوں کا کون یقین کرے گا۔

لغت انسانی میں لفظ عبث فضول، بیکار، بے نتیجہ باتوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ایسی باتیں بھی ہوا ہی کرتی ہیں، لیکن اس کا اطلاق صنعت پر نہیں ہو سکتا، انسان جب کوئی غلطی کرتا ہے، اور ضرور کرتا ہے۔ اور کرنی بھی چاہیئے۔ کیونکہ انسانیت کا یہی تقاضا ہے تو اس کی صنعت کا مقصد جو پیش نظر ہو فوت ہو جاتا ہے اور اس کی کوشش بیکار رہ جاتی ہے، اور بے نتیجہ رہتی ہے۔ لیکن غلطی رفع ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے بلا دینا غلطی امتیازی انسانی خوبی ہے جو اس کو ذہنی ارتقاء میں مدد دیتی ہے بلا دیگر حیوانات غلطی نہیں کرتے، لیکن آفرینش سے ایک ہی حال میں ہیں، انسان غلطی کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہیگا، جب معلوم کرتا ہے تو رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے، ظاہر ہے کہ علم کی کمی اور مادی دنیا میں مناسب سامان اور مسالہ نہ ملنے کی وجہ سے غلطی ہوئی، وہ پھر سے تلاش کرتا ہے اور آخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی صنعت کبھی کامل نہیں ہوتی ورنہ ترقی رک جاتی نبیوں سے لوگ معجزات طلب کرتے رہے۔ کسی وجہ سے یہ خیال ان کے دل میں تھا کہ نبی فوق العادت ہوتا ہے اس لئے جسے وہ ناممکن سمجھتے تھے۔ نبی کے لئے ممکن ہے، اگر اس سے یہ کہا جائے کہ ایک لہلہاتا باغ جس میں نہریں بہتی ہوں اور جس کے بیچوں بیچ ایک سنہری محل بھی ہو یک لخت نمودار ہو جائے تو وہ کر سکتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ باغ اور اس کی سرسبزی اور نہریں اور ان کی روانی عمل اور ہونا سب ممکنات کے تصورات ہیں، البتہ ان کے خیال خام نے ناممکن بات یہ پیدا کی کہ سب کچھ بلا مناسب اسباب یک لخت آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ حالانکہ یہ تصور بھی ان کے ذہن میں پہلے ہی موجود ہے۔ ہماری نصف زندگی بھی خواب میں دیکھنے گذرتی ہے۔ بحالت بیداری میسر ہے؟ یہی اور اس وقت جب کہ حواس معطل ہوں

اشخاص دیکھا کرتے ہیں اور ہر ایک شخص ممکنات کے تصورات میں توڑ جوڑ کرنے سے یہ بات پیدا کر سکتا ہے، ان لوگوں کی کوتہ اندیشی پر تعجب ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کا حیرت انگیز پختہ نظام صحیح معنی میں معجزہ ہے۔ اس میں تو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور خواہش یہ ہے کہ عقل زائل اور حواس معطل یا مختل ہو جائیں۔ اہل عقل و فکر جو کائنات میں تدبیر کرتے ہیں اپنی صنعت میں ایسے ہزاروں معجزے دکھاتے رہے اور دکھاتے رہیں گے۔ جو ان کوتہ اندیشوں کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے۔

انسان کبھی ممکنات کا تصور اپنے قلب سے محو نہیں کر سکتا اور نہ کوئی ایسا خیال یا "ائیڈیا" (Idea) پیدا کر سکتا ہے جو ناممکن ہو یا ممکنات سے ماخوذ نہ ہو، فرض کرو کہ عالم انسانی ایسی ہی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے، جو خواب یا سراب میں ہوتی ہے، ایسی حالت میں وہ ضرور ایسا ہی معجزہ طلب کریگا جو اس کے برعکس صحیح دل و دماغ کے ساتھ روزمرہ مشاہدہ ہو رہا ہے، یعنی ایک ہی بات کو ایک حالت میں ممکن اور دوسری حالت میں ناممکن سمجھیگا، انسان بعینہ ناممکنات کا دلدادہ ہے اور عجائب پرست ہے۔

بغیر انسان جو بھی ہے جن و ملک دیو و پری
آدمیت کا فقط دوزخ میں ملتا ہے نشان
دیکھئے احوال دنیا میں ہیں جو احوال یہاں
دیدۂ اہل نظر میں ہے جہان کائنات

عالم اوہام میں اکثر ہیں انسان دیکھئے
اہل جنت "خلد" میں ہیں حور و غلماں دیکھئے
عالم دیگر میں ہیں وہ ساز و ساماں دیکھئے
صورت انساں میں ہم ہیں شان رحماں دیکھئے

انسان میں یہ طلب خود فطرت کی پیدا کردہ ہے، اور غرض یہ ہے کہ انسان (انہی) مناسب فطری اسباب کے ساتھ ایسے ممکنات کے احاطہ میں لے آئے، اگر اس تحت الشعور فطری تحریک کو نظر انداز کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہی ہمارے تمام علوم و فنون اور دریافت اور ایجادات کی سنگ بنیاد ہے، یہ انسان کی امتیازی فطری ذہنی خوبی ہے کہ جو کچھ اس کے دخل کے بغیر ہو رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس طرح نہ ہو کسی اور طرح سے ہو، آپ کا کوئی عزیز ہزاروں کوس کے فاصلہ پر ہے، آپ اس کی خیر و عافیت اور کاروبار کے حالات دریافت کرنا چاہتے ہیں، ڈاک نے آپ کی یہ خواہش پوری کر دی۔ اس میں کئی ایک انسانی صنعتیں کام کرتی ہیں مثلاً ریل اور جہاز وغیرہ، آپ چاہتے ہیں اس کے حالات اسی کا

زبانی سنیں۔ ریڈیو نے یہ مشکل بھی حل کردی، اب یہ خواہش ہے کہ وہ خود آپ کے سامنے آکر باتیں کرے۔ "ٹیلی-ویژن" (Television) نے اگرچہ ابتدائی دور میں ہے ایسے ممکن بنادیا۔ اب اگر کچھ اور خواہش ہو تو بے تکلف ترقی یافتہ ذہن سے کریں اور یقین کریں کہ پوری ہوکر رہے گی مگر یہ یاد رہے کہ آپ کوئی خواہش کوئی خیال دل میں پیدا کرہی نہیں کرسکتے جب تک فطرت کے الہام کردہ بے حرف وصوت کی طرف سے تحریک نہ ہو، یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آپ کی کوئی خواہش آپ کی پیدا کردہ نہیں، بھوک اور پیاس کا احساس آپ کا پیدا کردہ نہیں، ان کی تسکین کا سامان جو آپ کو کارگاہ فطرت ہی سے ملیگا آپ کا پیدا کردہ نہیں، وہ تعلقات جو آپ کے حواس اور ذہن اور بیرونی دنیا میں ہیں آپ کے پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے آپ کی خواہشیں یا خیالات بھی آپ کے پیدا کردہ نہیں۔

جب ہم کسی کتاب کا مطالعہ خاموشی سے دل ہی دل میں کر رہے ہوں، تو سب سے پہلے حروف کی صورتیں ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں جو حرف اشارات ہیں جن کے ذریعہ مصنف ہم پر اپنے مافی الضمیر یا خیالات کا اظہار کررہا ہے، یہ خیالات اس نے صحیفۂ فطرت کے مطالعہ سے اخذ کئے ہیں جو تصویری میں حروف میں تحریر ہوا ہے، ناممکن ہے کہ ہم حواس کے ہوتے اپنے ارادہ سے یا بلا ارادہ کچھ محسوس نہ کریں، اگر ہم کوئی شئی دیکھ رہے ہوں تو ساتھ ہی اس شئی کے متعلقات بھی محسوس ہوں گے۔ خواہ ہمیں اس کا شعور نہ ہو، ناممکن ہے کہ ہم سورج کو تو دیکھیں اور اس کی روشنی اور حرارت اور ماحول کا احساس نہ ہو، جو کچھ ہم محسوس کرتے ہیں وہ صرف صورتیں ہیں، رنگ روپ، ڈیل ڈول، نرمی سختی، گرمی سردی، بو، مزہ، آوازیں سب صورتیں ہیں اور حواس صورتوں کے سوا کچھ اور محسوس کرہی نہیں سکتے، ان کا عکس فوراً ہمارے آئینہ دل میں اتر آتا ہے، اور محفوظ ہوجاتا ہے، گویا محسوسات کی دنیا ہمارے دل میں سماگئی، یہ صورتیں اشارات ہیں جن کے ذریعہ فطرت اپنے مافی الضمیر یعنی حقایق کا اظہار ہماری باطنی قوتوں عقل وغیرہ پر اسی طرح کرتی ہے جس طرح عالم صورت ہمارے حواس ظاہری میں رونما ہوتا ہے۔ جب حواس باطنی کو اس کا احساس ہوتا ہے تو خیالات (Ideas) پیدا ہوتے ہیں، یہ دراصل فطری حقائق ہی ہوتے ہیں جو حروف وصوت کا جامہ پہن کر پھر سے ہمارے حواس کے سامنے

آجاتے ہیں۔ اس لئے خیالات کبھی بے حرف وصوت نہیں ہوتے ورنہ اس کا احساس ہی نہ ہو، اور ان کی حیثیت تحت الشعور ایسی ہی ہو جیسے دیگر حیوانات میں مشاہدہ ہوتی ہے، یہ حروف سننے والے کی اپنی مادری زبان میں ہوتے ہیں جسے وہ خوب سمجھتا ہے، گویا فطرت ہماری ہی بولی میں ہم سے گفتگو کرتی ہے۔ " فرخندہ بخت آنکہ بسمع رضا شنید "

زبان تو بے شعور آلہ کلام ہے۔ لیکن حروف وصوت کا شعور بقدر تزکیہ نفس و تصفیہ قلب ہوتا ہے، اس لئے دنیا جہان کی کتابیں صحیفہ فطرت کی ترجمانی ہی ہے۔ مجازاً جسے انسانی صنعت کہتے ہیں حقیقت میں فطرت ہی کا عمل ہے۔

ہر چہ آید در نظر غیرے تو نیست　　خود توئی با خوئی تو با بوئی تو

غزل

جناب محمد جعفر صاحب فطرت

رہ رہ کے آج یاد مجھے آرہے ہو تم
سینہ میں ایک آگ سی بھڑکا رہے ہو تم

سہمی ہوئی ادائیں ہیں نظریں جھکی جھکی
شاید کسی خیال پہ پچھتا رہے ہو تم

بس شکریہ نوازش پیہم کا شکریہ
اک درد نا تمام دئے جارہے ہو تم

یہ طرز التفات مسلسل جفا کے بعد
افسانہ حیات کو دہرا رہے ہو تم

مجھ سے غرض یہاں نہ سہی اور کس لئے
دنیائے آرزو پہ میری چھا رہے ہو تم

نامہربانیوں کی شکایت ہی کیا کروں
کچھ کم نہیں جو مجھ ہی کو تڑپا رہے ہو تم

ڈالی بہ طرز خاص اچٹتی سی اک نگاہ
جیسے کہ راز عشق کو سمجھا رہے ہو تم

میں سوچتا ہوں مجھ سے محبت نہیں اگر
پھر کس لئے غزل کو میری گا رہے ہو تم

آئینہ دیکھتے ہوئے آتا ہے کیا خیال
اپنی نظر سے آپ ہی شرما رہے ہو تم

میرے تصورات محبت گواہ ہیں
آغوش آرزو میں ابھی آرہے ہو تم

جاتے ہو بزم ناز سے لیکن رہے خیال
فطرت کی زندگی بھی لئے جارہے ہو تم

بے وفا مغرب

(فسانہ)

جناب محمد ظہورالدین صاحب (عثمانیہ)

"شیاما" سمندر کی موجوں کو چاک کرتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ معمر کپتان کی اکلوتی حسین اور ناز پرور لڑکی موآگانی جہاز پر کھڑی سمندر کی لہروں کا لطف اٹھا رہی تھی کہ اسے سمندر میں کوئی چیز متحرک نظر آئی ۔ ایک حسین اور نازک ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی کئی ملاح سمندر میں پھاند پڑے اور آناً فاناً وہ چیز جس کو موآگانی سمندر میں دیکھا تھا لاکر پیش کر دی ۔ یہ ایک نوجوان تھا جو اپنے تباہ شدہ جہاز کے ایک تختہ پر بہا چلا جا رہا تھا اور بھوک اور تکان کی شدت سے نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا ۔ کپتان کی حسین اور ہر دلعزیز لڑکی کے حکم سے ملاحوں نے اس نیم جان نوجوان کو جہاز کے دواخانہ میں رجوع کر دیا ۔

آج تیسرا روز تھا ۔ نوجوان صحت یاب ہو چکا ہے ۔ حسین موآگانی اور فرانکلن کی دوستی الفت میں اور الفت محبت میں تبدیل ہو گئی ہے اور ہر وقت دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں ۔

ضعیف اور تجربہ کار کپتان ہیوگو مان چون نے جس کو اپنی اکلوتی لڑکی سے بیحد محبت تھی اپنی ناتجربہ کار لڑکی سے باتوں باتوں میں اس قسم کی محبت کے دردناک نتائج بیان کئے اور اشارتاً یہ ظاہر کر دیا کہ یہ محبت غرض کی محبت ہے ۔ دیرپا نہیں یہ صرف جوشی کی امنگ ہے ۔ تمہارے حسن کے تو چین کے بڑے بڑے امرا اور حسین حسین نوجوان شیدا اور تمہارے ساتھ شادی کے خواہشمند ہیں ۔ مگر نوجوان موآگانی کی سمجھ میں نہ آنا تھا نہ آیا ۔ چین پہنچنے کے بعد چینی رسم و رواج کے مطابق موآگانی اور فرانکلن کی شادی ہو گئی

خوشی و مسرت میں چھ مہینے بھی گذر گئے ایک روز فرانکلن سے راستہ میں چند سوداگروں سے ملاقات ہوگئی جو اتفاق سے اس کے شناسائی نکلے۔ دوران گفتگو میں جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اس نے ایک چینی سے شادی بھی کرلی ہے تو ان لوگوں نے اس کا خوب مضحکہ اڑایا کہ مہذب اور آزاد ملک کے ایک باشندے نے ایشیائی اور غیر مہذب چینی سے شادی کر کے ملک کی عزت وغیرت کو داغدار بنا دیا۔ اس واقعہ کو گذرے چند ماہ ہوگئے ایک دن فرانکلن کو اس مضمون کا بحری تار وصول ہوا کہ "والد سخت بیمار ہیں۔ آخری نظر دیکھ لو اور اسّی لاکھ ڈالر کے واحد وارث بنو" تار پڑھتے ہی فرانکلن کو وطن کی یاد ستانے لگی۔ وہاں کے دلفریب مناظر اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ موا گانی نے بھی ساتھ جانے کے لئے اصرار کیا تو تو کسی قدر تامل کے بعد آمادگی ظاہر کردی۔ اسی وقت سے موا گانی کو بھی جانے کا شوق ستانے لگا وہ بھی طرح طرح کے دلچسپ مناظر کا تصور کرتی اور روانگی کے دن کا انتظار کرنے لگی۔ آخر روانگی کا دن بھی آپہنچا۔ مگر عین روانگی کے روز فرانکلن نے کہا "پیاری مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لیجا سکتا۔ اس لئے کہ میں ایک زمانہ کے بعد جارہا ہوں معلوم نہیں وہاں کے کیا حالات ہیں۔ البتہ سب انتظامات کر کے بہت جلد واپس آؤں گا اور تمہیں لیتا جاؤں گا مطمئن رہنا" اتنا سننا تھا کہ معصوم موا گانی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سر چکرا گیا۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ ناچار خاموش ہوگئی۔ اور فرانکلن بہت جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگیا۔

آج فرانکلن کو گئے ہوئے کامل چھ ماہ گذر گئے مگر کوئی خط نہ آیا۔ بیچاری موا گانی روز ڈاکیہ کا انتظار کرتی مگر بے سود۔ ذرا مکان کے سامنے کوئی خاکی وردی والا نظر آیا یہ ڈاکیہ کا خیال کر کے بے تحاشا دوڑتی اور مایوس و مغموم واپس ہوتی۔ ساتھ کی سہیلیاں وغیرہ طعن کرتیں اور بعض اوقات مذاق اڑاتیں اور یہ ہمیشہ اپنی قسمت پر روتی، اور کبھی اپنے نام کا خط خود ہی لکھ کر ڈاک میں ڈال آتی اور سہیلیوں سے کہتی کہ یہ میرے پیارے کا خط آیا ہے۔ اسی طرح دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ لیکن فرانکلن کا کوئی خط آیا نہ اطلاع ہی ملی۔ ایک روز صبح اسے فرانکلن کا ایک تار وصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ "میں آرہا ہوں" یہ تار پڑھتے ہی موا گانی باغ باغ ہوگئی، خوشی سے اس کا چہرہ

دمکنے لگا۔

فرانکلن کے آنے کے دن مواگانی نہایت شوق و اشتیاق سے اپنا عروسی لباس پہنے انتظار کی گھڑیاں کاٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد ایک موٹر اس کے مکان پر رکا اور فرانکلن اندر داخل ہوا۔ مواگانی نے فرط محبت سے اُس کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور خط نہ لکھنے اور ایک عرصہ کے بعد آنے کا گلہ شکوہ کرنے لگی۔ لیکن فرانکلن نے قطع کلام کرکے روکھے پن کے ساتھ کہا "مس مواگانی تم کو معلوم ہے کہ میں ایک امریکی ہوں۔ دولتمند ہوں اور دولتمند مہذب ملک کا رہنے والا ہوں۔ پس تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک امریکی اور چینی کا ملاپ نہیں ہو سکتا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ تم مجھے معاف کرو اور میری شادی امریکہ میں ایک نہایت حسین دولتمند لیڈی سے ہو گئی ہے۔ اگر تم اُن سے ملنا چاہتی ہو تو اجازت دو، وہ باہر موٹر میں بیٹھی ہوئی ہیں بلا لاؤں" یہ سنتے ہی بیچاری مواگانی کے ہوش اڑ گئے، پھر اپنے آپ کو سنبھال کر اندر بلا لانے کی استدعا کی۔ ایک نہایت حسین اور نازک اندام لیڈی اندر داخل ہوئی۔ مواگانی نے اخلاق سے اس کا استقبال کیا اور اپنے بازو بٹھالیا۔ امریکن خاتون نے کہا "مس مواگانی معاف کرنا میں تمہاری خوشیوں اور راحتوں میں حائل ہوئی" مواگانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ خاموش ہو رہی۔

جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہے۔ روانگی کے لئے تھوڑی دیر باقی ہے۔ مسافر سامان کی دیکھ بھال اور تلاش میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ درجہ اول کے مسافر جو زیادہ تر انگریز تھے سب ایک جگہ کھڑے گپ شپ میں مصروف ہیں۔ اتنے میں ایک خستہ حال حسین چینی عورت دیوانہ وار اس مجمع کی طرف آئی اور روتے ہوئے ایک انگریز سے اس طرح مخاطب ہوئی "پیارے فرانکلن ــــ ! تم جانتے ہو کہ مجھے تم سے نہایت محبت ہے اگر تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے امریکہ لےجانے میں عار ہے تو میں تمہاری اور تمہاری محبوب لیڈی کی خادمہ ہی بن کر ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔ خدا کے لئے مجھ کو اپنے ساتھ لیتے چلو" یہ سنتے ہی تمام انگریز آگ بگولہ ہو گئے اور چینی عورت کو غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور پھر فرانکلن سے استفسار کیا۔ فرانکلن نے مسکراتے ہوئے کہا "عرصہ ہوا جس وقت میں پہلی بار چین آیا تھا تو اس عورت کو اپنے پاس ملازم رکھا تھا، اب یہ دیوانی ہو گئی ہے۔

اس لئے ایسی حرکتیں کر رہی ہے" پھر آگے بڑھ کر مُواگانی سے کہنے لگا "مُواگانی ! تجھ کو اپنی حماقت پر شرم نہیں آتی، بھلا ایک نیم وحشی، مفلس اور بدصورت چینی ایک مہذب اور دولتمند امریکن کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ تجھ کو یہ خیال اپنے دل سے نکال دینا چاہئے"

مُواگانی اسی طرح روتی کھڑی رہی، تمام مسافر جہاز پر سوار ہو چکے، جہاز نے لنگر اٹھایا اور ساحل سے جدا ہو کر نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ جب تک جہاز کی جھلک دکھائی دیتی رہی۔ یہ بیکس ساحل پر کھڑی دیکھتی رہی۔ جب جہاز نظروں سے غائب ہو گیا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا "اے سمندر اب تو ہی مجھے اپنے آغوش میں تسکین دے اور بس" سمندر کی موجوں میں تھوڑی دیر تک تلاطم رہا اور پھر سکون پیدا ہو گیا۔

حیدرآباد دکن کی صحافت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ مستقبل کے لئے فال نیک ہے۔ عموماً بیرون ملک سے ہمارے صحافت کی فہرست آئے دن طلب کی جاتی ہے۔ براہ کرم بعجلت ممکنہ حسب ذیل استفسارات دفتر شہاب میں بھیجدئے جائیں تو آپ کے اخبار یا رسالہ کی نشر و اشاعت میں بیحد مفید ثابت ہو سکے۔

١ - نام اخبار

٢ - روزآنہ ہے یا ماہانہ - سہ ماہی ہے یا ہفتہ وار - یا مہینہ میں دو مرتبہ

٣ - نام اڈیٹر

٤ - تعداد صفحات

٥ - مقام اشاعت

٦ - چندہ سالانہ

٧ - کس زبان میں نکلتا ہے۔

٨ - تعداد اشاعت (اگر آپ بتا سکتے ہوں تو)

٩ - کس سنہ میں پہلا پرچہ شائع ہوا۔

ایڈیٹر کی مشکلات

عکاس

"غم نہ داری بز بخر" کا دلچسپ مشغلہ۔ آپ دیکھنا چاہتے ہوں تو کوئی پرچہ نکالئے۔ پھر مشکلات۔ پریشانیوں۔ حماقتوں۔ کا تماشا کیجئے کہ جان عزیز پرچوبیس گھنٹے عذاب ہی عذاب نازل نہ ہو تو ہمارا ذمہ۔

مہینہ کا ایک پرچہ اچھا برا نکال لیجئے کہ گنگا نہائے لیکن دوسرا مہینہ قرضدار کے تقاضے کی طرح موجود۔ یہ مہینہ کے تیس دن تیس ہی منٹ میں گذر جاتے ہیں (کاش ملازمین کا مہینہ ایسا ہی گذرتا)

سب سے اہم مشکل تو مضامین کا فراہم ہونا ہے اگر کوئی خوش نصیب کے پاس اچھے برے رطب و یابس کا سرمایہ موجود ہے تو وہ اسی کو کانٹ چھانٹ کر ایک مہینہ کا آذوقہ بہم پہنچا لیتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی یہ کوشش ضرور رہتی ہے کہ نمایش کے لئے دو ایک نام نہاد چوٹی کے لکھنے والے رہیں تو الّا ماشاء اللہ لیکن ایسے دو ایک کی نزاکت طبع کا عالم ہی نہ پوچھئے کہ ان کے دماغ پہلے تو رہتے ہیں فلک ہفتم پر اس لئے کسی پرچہ کی رسائی آپ کے خانہ دماغ تک ہو ہی نہیں سکتی اور بدبختی سے ہو بھی جائے تو یہ نگاہ غلط انداز کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے کیونکہ وہ بیک نظر فہرست سے ہی اندازہ فرما لیتے ہیں کہ اس میں ہمارے ٹائپ کا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اس لئے یہ معیاری نہیں ہے لیکن ان معیار پسند ہستیوں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ حضرت پرچہ کا آخر معیار ہی کس طرح بلند ہوگا جب کہ آپ جیسے شکستہ قلم اور فرسودہ نب توجہ بھی تو کریں؟ جو سب

ملتا ہے سعی و کوشش ۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے :۔

"بیٹھے ہوئے ہیں یار کے درباں بنے ہوئے"

معاف کیجئے ابتدائے عشق ہے ابھی اتنی پختہ خیالی نہیں آئی ۔ آتے آتے آجائیگی بعض منچلے پرچہ نویسوں نے یہ لٹکا نکال لیا ہے کہ دوچار اولٹے سیدھے اعتراضات ان پر ٹھونک دے ۔ پھر کیا ہوا کہ دماغی رعونتیں کافور ہو گئیں"۔ کیونکہ پانی وہیں مرتا ہے جہاں پچور ہوتا ہے"

اس مرحلہ سے جب نجات ملتی ہے تو جناب کاپی نویس کے شتر غمزے سوہان روح ہو جاتے ہیں ۔ ہر اڈیٹر تو ایسا خوش نصیب ہوتا نہیں کہ اوس کو اچھے کاتب ملجائیں کیونکہ رتھوں کی پُر لطف کتابت چھوڑ کر کسی پرچہ کی کتابت میں کیا آئیگا ۔ اس لئے ناگزیر کاپی نویس ڈھونڈ ہنا ہی پڑتا ہے اور مل بھی جاتا ہے تو ادباً عرض کرنا فرض ہوتا ہے کہ حضرت "کاپی نویس" "غلط نویس" مشہور رہی ہیں ذرا دیکھ بھال کے ۔ ہاتھ سنبھال کے ورنہ پرچہ نہوگا بلکہ زلف پیچاں کہ سلجھانا اور خط جبی کا حل کرنا ایک ادق معمہ ہو جائیگا ۔ اور ہاں وقت کا خیال ملحوظ خاطر رہے ۔ گردن تو ہلا دی جاتی ہے ۔ جب کاپیاں وعدہ سے ہفتہ عشرہ بعد ملتی ہیں یا خدا دہی جناتی نشان لیا ہوا خط اور وہی غلطیوں کا انبار کہ صحت کرتے کرتے زبان پر یہ مصرعہ بے ساختہ آجاتا ہے

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

اگر زیادہ کہیں تو عتاب کا خوف ۔ شربت کی گھونٹ کی طرح غصہ کو پی کر خاموش رہنا پڑتا ہے کیونکہ دوسری کاپی تیار ہونے تک تاخیر اشاعت کے خوش کن اعتراضات کا اندیشہ اور قارئین کے تلخ تیوروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے ۔ غرض جب اس فعلات سے کاپیاں لے کر پریس میں حاضری دیتے کا فخر حاصل ہوتا ہے تو پریسمین اور سنگساز کی بھی کچھ ناز برداری کرنی ہی پڑتی ہے کہ ہاں بھائی ذرا احتیاط سے ترشش کرنا لیکن ان کشیدہ ناتراشوں کو کسی کے ساتھ ہمدردی کیوں ہونے چلی ۔ وہ تیور کی طرح سنتے ہیں لیکن عمل کرنا کیا جانیں ۔ جب کاپی تر ہو کر پروف صحت کے لئے ملتا ہے تو دیکھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے کہ اللہ اکبر پروف نہ ہوا بلکہ کسی عروس کی افشاں چنی ہوئی جبین ہے اور یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔۔۔

حالِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی - خامہ خونچکاں اپنا

جب پوچھئے کہ مہربانا اتنی التجائیں بھی آپ کے پتھر جیسے قلب کو متاثر نہ کرسکیں تو بس اسی قدر سنئے ، صاحب ہمارا قصور ہی کیا ہے کاپی نویس نے سیاہی سنتھی ہوئی نہیں لگائی - قلم روک کر نہیں لکھا - کاپی نویس صاحب سے پوچھئے کہ حضرت یہ کیا حالت ہے، آپ اپنی زبان سے اس کا حل بھی فرما دیجئے ، کاپی میں نے تو نہایت احتیاط سے لکھی تھی ، پتھر ٹھنڈا ہوگا - یہ پریسمین کی صریح غفلت ہے - واللہ اعلم غلطی ہے کس کی اس کا تصفیہ اور سزا جزا تو عالم الغیب ہی کے ہاتھ ہے ، لیکن عرض کرنا ہی تو اس قدر کہ

" دو مُلاّؤں میں مرغی مردار ہوئی تو کس کی ؟"

اب سنگساز کی بھی داستان سن لیجئے جب ہفت خوان کی یہ اہم منزلیں طے ہوگئیں اور اطمینان نصیب ہوا کہ پرچہ اچھا ہی نکلے گا - فرمے دیکھکر جی بے اختیار چاہتا ہے کہ کم ازکم اپناہی منھ کیوں نہ نوچ لیں کہ دوسروں پر بس نہیں چلتا تمام فارم خس وخاشاک سے معمور ڈرتے ڈرتے یہ وجہ بھی دریافت کرلی جاتی ہے ارشاد ہوتا ہے آپ واقف ہیں کہ میری سنگسازی تو پتھر کی لکیر ہوتی ہے ، یہ غلطی مشین مین کی ہے کہ وہ دوران طباعت میں " ترشئ " نہیں دیتا ، حالانکہ بارہا کہا جاتا ہے - فرمائیے کتنا دل خوش کن جواب ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جھگڑوں میں :-

" آٹا گیلا ہوا تو کس کا ؟"

اب اس دھوم دھام تزک و احتشام سے پرچہ جزبندی کے لئے جارہا ہے یہ جن ہاتھوں میں پہنچنے کی عزت حاصل کرتا ہے وہ نوشت وخواند کے ایسے ہی ماہر ہیں جیسے بوڑھا جوانی سے - اندھا بینائی سے ، پھر صفحوں کی شناخت کیسے ہو گویا " اندھے کے ہاتھ بٹیر ہی لگی " ، ترک سازی ہو جاتی ہے یا تیں تو اس بلا کی ہوتی ہیں کہ منٹوں میں کام ختم ہو جائے گا - کام چلتا ہے دو چار کاغذ کی ترک سازی ہوتی ہے کہ غائب انتظار کے بعد پھر تشریف لاتے ہیں - کہئے جناب کہاں تشریف لےگئے تھے - جواب ملتا ہے ، چاپینے - لیکن یقین مانئے کہ ہر دوسرے کاغذ کے بعد چاء نوری کا مشغلہ ضرور رہتا ہے - بہ ہزار خرابی پرچہ مکمل ہوگیا صفحوں کو دیکھئے تو مقدم موخر اتنا وقت کہاں کہ پھر چاء خوری کا موقع دیا جائے " - قہر درویش " بہ صبر کرتے ہی بنتی ہے - کیونکہ :-

واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

قارئین بھی تو ڈر ا لئے تیار ہیں کہ تاخیر کے کیا اسباب ہیں۔ چلیئے اب مشین کی کٹوائی رہ گئی۔ یہاں اتنی دشواری نہیں تو اتنی آسانی بھی کہاں۔ ڈرتے ڈرتے پرچہ کا ٹنے کی درخواست کیجاتی ہے وہیں سے جواب ملتا ہے کام کی کثرت ہے آپ کا نمبر آئیگا تو ہو جائیگا حالانکہ کام کرنے والے کے پاس نمبر خدا جانے کیا بلا ہوتا ہے۔ اس طرح تو شاید قیامت تک نمبر ہی نہ آئے۔ لیکن لالچ بھی عجیب کارگر منتر ہے۔ خیر میاں ایسا ہی سہی۔ ہاں تم لے یہ چار مینار سگریٹ نئی قسم کا نہیں دیکھا؟ اس کا ذائقہ تو چکھو ہم کو تو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ہاں انہیں، یہی دو آخر یہ بھی تو پیتے ہی ہونگے۔ کیوں بھائی تم بھی تو چکھو نا۔ ایسی کونسی قیمت رکھتا ہے۔ پھر ہمارے سگریٹ کیا کرتے ہیں کہ "خوان یغما" کا لطف پیدا کر دیتے ہیں اور ہم چپکے سے لونڈے کے ہاتھ میں ۲ ر رکھ دیتے ہیں کہ اس کے پیسہ میں دو والے پان کے بیڑے تو لے آنا (اب یہ مصروف بیکار ہستیاں منہ میں سگریٹ دبائے کش لگاتے ہوئے جس میں بہت کچھ وقت صرف ہو جاتا ہے سگریٹ پر اظہار خیال کرتے ہیں اور اس عرصہ میں لڑکا پان لئے ہوئے پہنچ جاتا ہے اب ہر شخص پان نوش سگریٹ کش بن جاتا ہے) اللہ رکھے کام دا اور بھی کثرت شروع ہو جاتی ہے اور ہم آہستہ سے تو ہاں اب ہم کل آئیں گے۔ نہیں جناب عرصہ کتنا لگیگا۔ آپ چندے توقف فرمائیے۔ پرچہ نمبر سے پہلے کٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ یوں حکمت عملی یہاں کام دیجاتی۔ گویا ہماری پہلی درخواست غالباً بغیر اجرت ہی کے تھی جو نمبر کا لحاظ ہو رہا تھا۔

اب "برات عاشقاں برشاخ آہو" کسی طرح کمر بند ہوتا لیبل لگتا رہجاتا ہے۔ چونکہ اس کی ذمہ داری ہماری ذات واحد پر بطور فرض کفایہ ناگزیر ہے۔

سب سے اہم اور مشکل کام ڈاک خانہ کے سپرد کرنے کا رہ جاتا ہے کہ خدا جانے ایکے رتبہ کتنے پرچوں پر ڈاک والوں کا ڈاکہ پڑتا ہے۔ دعائیں مانگتے۔ بسم اللہ کہکر

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

حوالہ ڈاک کر دیتے ہیں اور آرام کا سانس لیتے ہیں کہ ایک مشکل کام ختم ہو گیا۔ لیکن اس کی خبر نہیں رہتی کہ اس کے ساتھ ہی۔ شکایت کی ایک آندھی آنیوالی ہے۔

جناب ۲۰ر تاریخ ہے پرچہ ابتک وصول نہیں ہوا۔ کتابت اتنی دیدہ زیب ہے کہ

شاید کسی عہدہ دار سے لکھوائی گئی ہے۔ طباعت اتنی لاجواب ہے کہ دیکھنے سے آنکھوں میں تاریکی پیدا ہوجاتی ہے۔ مضامین اتنے دلکش ہیں کہ ادب و انشاء کو ناز و افتخار ہے حالانکہ پڑھنے والوں کو اس کی کیا خبر کہ :-

کٹی کچلی گئی پیسی چھنی ٹہلیگی گو ندیہا مہندیا　　جب اتنے دکھ سہی تب اون کے قدم سے لگی مہندیا

ان توصیفی الفاظ کو سن کر ہماری مسرت سر پیٹنے لگتی ہے کہ اے بیداد —— قدردانوں کا حال ہی نہ پوچھئے کہ ایجنسی میں پرچہ پر اس قدر یورش ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے کہ آج خوب مانگ ہوگی۔ ایک پرچہ پر سیکڑوں نظریں پڑ رہی ہیں۔ آخر میں معلوم یہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے اتنا پڑھا اتنا پڑھا ہے کہ صفحوں سے حروف ہی غائب ہوگئے۔ لیکن پرچہ کی شان استقلال ملاحظہ کیجئے کہ وہ ایجنسی کے شوکیس میں بجنسہ ابھی تک اپنی نمائش کے لئے موجود ہے کہ کچھ اور لوگ رنگیلے ہوں تو وہ بھی مستفید ہولیں لیکن ہماری حماقتوں کا حال بھی سن لیجئے کہ باوجود اس ستایش اور تعریف کے۔ پھر شوق کہہ رہا ہے کہ خریدار کی طلب　　عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے

یہ ہے ایک پرچہ کی حیات عمرانی جو آپ کے ہاتھوں تک پہنچنے کی عزت حاصل کرتا ہے اور آپ اس کی اعانت فرماتے ہیں۔ گویا ہم کو خود خرید فرمالیتے ہیں۔

غزل

جناب خواجہ فیاض الدین صاحب مہر

روز و شب در دیدن روئے خوشِ جانانہ ایم　　بارہ دیگر نمی دانیم، ما دیوانہ ایم

یک نمانے شو فروکش، دیدۂ فرشِ منقش　　از برائے تو دلِ خود کردہ چوں کاشانہ ایم

آشنا ئیم از ازل۔ ربطے ست یا محبوبِ رب　　تو نہ از ما، ما نہ از تو، اے خدا بیگانہ ایم

سجدہ در پیش صنم کردن، بود آئین ما　　زاہدا، معذور دار اینکہ ما مستانہ ایم

مصرعۂ سعدی بگو اے مہر سرخوش بار بار

ساقیا مے دہ کہ ما دُردی کش میخانہ ایم

پردیسی کیوں یاد آتا ہے

عماد صدیقی

بڑا پیار تھا ہم دونوں میں، بہنوں کی طرح گھل مل کر رہتی تھیں، ایک ڈالی کی دو نوخیز کلیاں معلوم ہوتی تھیں، مجھ سے زیادہ وہ مجھ پر جان چھڑکتی تھی، میری سمجھ سے باہر تھا کہ کیوں وہ میری الفت کا دم بھر رہی ہے، مجھ سے کیا توقعات وابستہ ہیں اس کے، میں تو ایک قیدی ہوں، گو ڈاکہ نہیں ڈالا میں نے، چوری نہیں کی، خون ـــ اف خدا! خون کا نام لیتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور میں کانپ اٹھتی ہوں، تو بھلا خون اور میں! لیکن پھر بھی مجرم ہوں، کیونکہ عورت کا جنم لیا ہے میں نے، کیا یہ کچھ کم جرم ہے؟ اسی لئے تو قید کر دی گئی ہوں، ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیر میں بیڑیاں پہنا دی گئیں، اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی تو چار دیواری میں قید کر دیا، اور سماج نے ان کے دل فریب نام رکھے زیور اور گھر، تو بھلا ایک قیدی کو قیدی سے کیا الفت جب کہ میں خود ہی اپنے کام نہیں آ سکتی، تو وہ پھر مجھ سے کیا چاہتی تھی، اس کی محبت بجھتی ہوئی چنگاری کی طرح نہیں بلکہ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح تھی، اور دن بدن شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی، وہ اپنی محبت کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں مجھ کو لپیٹ لینا چاہتی تھی، گویا محبت کی انتہا تھی، گو شاہدہ مجھ سے کچھ بڑی ہی تھی، لیکن بارہا میں نے اسے جھڑکیاں دیں، برا بھلا کہا، من مانے کیا، اس کی ہر بات کو رد کر دیا، لیکن کبھی برا مانا ہو تو قسم لے لیجئے، لڑکی نہیں دیوی تھی دیوی، بس ذرا کی ذرا ناراض ہو جاتی، اور پھر اسی طرح مل جل کر رہتی، لڑائی کا خیال بھی کبھی دماغ میں نہ آتا تھا، گویا ہمارے نزدیک لڑائی کا وجود ہی نہ تھا، یہی تو تھے الفت نبھانے کے ڈھنگ، جو بھی چلا جا رہا تھا۔

وہ میرے لئے سب کچھ کر جاتی، اور مجھے ذرہ برابر احساس تک نہ ہوتا۔ بارہا میں نے اس کی کتابیں پڑھیں، کپڑے پہنے، جدھر جی میں آیا پھینک دیا، کوئی روکنے ٹوکنے والا ہو تو، جیسے وہ سب میرا اپنا ہی تو مال تھا۔ لیکن وہ بھی تو میرے اس بے جا سلوک سے ناراضگی ظاہر نہ کرتی، بلکہ خاموشی سے ہر ایک چیز ڈھونڈھ نکالتی، کبھی شکوہ نہیں، کوئی شکایت نہیں، پیشانی ہمیشہ صاف شفاف چمکتی رہتی۔ لیکن نام کو نہیں۔ جب کبھی دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش ہے ——— ایک خاص اثر، جیسے بڑی بہن اپنی ننھی کو شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے، گویا شفقت کرنا اُس کا اولین فرض ہے، نیند آنے پر لوریاں دے گی، تھپک تھپک کر گود میں سلالے گی، مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنا آنچل بھی ڈال دیگی۔ مجھے اس خیال ہی سے غنودگی طاری ہو جاتی۔ کتنا رحم تھا دل میں، کتنی وسعت تھی۔

جب کبھی میں کالج نہ جاتی، وہ پریشان ہو جاتی، دوڑی ہوئی چلی آتی، سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی۔ میں حیلے بہانوں سے اُسے اور بھی پریشان کر دیتی، لطف سا آتا تھا اس کو ستانے میں، گویا وہ میرے نزدیک تفریح کا سامان تھی۔ لیکن میں اس کی نظر میں محبت کا مرکز، جب تک تشفی نہ ہو جائے بے قرار رہتی۔ سر میں کبھی ہلکا سا درد ہونے لگتا۔ گھنٹوں ہی تو دباتی رہتی وہ ——— مردانہ محبت بھی اس کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ جیسے وہ مرد ہی نہیں، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ، لیکن عورت، عورت کی محبت پر کہاں دھیان دیتی ہے۔ مرد کی محبت ہوتی تو مر مٹتی، جان دیدیتی، لیکن شاہدہ تو عورت تھی۔ بھلا مجھے کیا پڑا تھا کہ اس کی محبت کا محبت سے جواب دوں، وہ مسکرائے تو میں بھی مسکراؤں، وہ گلے میں باہیں ڈالے تو میں بھی اس سے لپٹ جاؤں اور اپنی محبت کا بے اختیار اظہار کر دوں، کاش ——— شاہدہ عورت نہ ہوتی ——— شاہد اور شاہدہ میں کتنا فرق ہے، زمین آسمان کا فرق، عورت سے عورت کو عشق، مرد سے مرد کو محبت، یہ تو ان ہونی باتیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن مجھے شاہدہ کی محبت سے تجربہ ہو چکا تھا کہ ان ہونی باتیں بھی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ جیسے مجھ سے عشق ہو گیا تھا اُسے، یا پھر دیوانی ہو گئی تھی، کچھ نہ کچھ ضرور تھا، ورنہ اس قدر وارفتگی کیا معنی رکھتی ہے، کالج میں ہوں تو ایک ساتھ، کلاس میں ہوں تو بازو، بازو، کھانے کی میز پر ہوں تو ایک جگہ، سیر تفریح کو جائیں تو مل کر۔ غرض مجھے شاہدہ کے عورت ہونے ہی پر شک تھا، عورت اور اس قدر محبت،

جونہی کالج کو تعطیلات ہوئیں، وہ وطن جارہی تھی، جاتے وقت ہزاروں وعدے لئے، قسمیں دیں، بھینچ کر گلے لگا لیا، اور بے اختیار بچوں کی طرح رو پڑی، زندگی میں اگر کبھی میں نے شاہدہ سے محبت جتائی تھی تو وہ اُس کی واپسی پر، حقیقت میں اُس دن احساس ہوا اس کی بے پناہ محبت کا، مگر کیا کرتی، پانی سر سے گذر چکا تھا۔ وہ جارہی تھی، آج مجھے دل کی گہرائیوں میں سوز محبت کی خلش محسوس ہوئی، وہ بار بار کہتی "میرے چلے جانے پر بھول تو نہ جاؤ گی" میں نے بھی محسوس کیا کہ حقیقت میں شاہدہ سہیلی تھی۔ ایک درد بھرا دل رکھنے والی سہیلی ایک محبت بھرا دل رکھنے والی، آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔ بڑی مشکل سے کہا "شاہدہ معاف کردو، میں نے تمہیں بہت تنگ کیا ہے، بہت ستایا ہے، تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی، رہ رہ کر کھوئی ہوئی رنگین دلچسپیوں کی یاد مجھے ہر گھڑی ستائے گی، اُس نے دوبارہ مجھے الفت سے گلے لگا لیا، بالکل اُسی طرح جس طرح کبھی کبھار نجمہ کے رونے پر میں اسے گلے لگا کر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوں، بالکل اسی طرح کی محبت تھی اس کی، وہ جا چکی تھی، لیکن اس کی محبت کے نقوش دل پر گہرے ہو گئے تھے۔ گھر کی تنہائی اور اس کی محبت، مجھے کبھی تنہائیوں میں کچھ سوچنے نہ دیتیں، یاد کے ساتھ ہی گھاؤ گہرے ہو جاتے، اور میں بیقرار ہو جاتی، دل چاہتا کہ پر لگ جائیں تو اڑ کر وہیں پہنچ جاؤں، کب تک یہ بے قراریاں رہیں گی، سکون تو نصیب ہو جائیگا مجھ، تڑپتے دل، مچلتے جذبات کو،

شاہدہ نے خطوط کی دوڑ لگا دی، جنوں کی حد تک پہنچ چکی تھی ہماری محبت، بی اماں بھی جانتی تھیں، میری بیقراریوں کو دیکھ کر اجازت دیدی جانے کی، ننھی نجمہ کو لے کر روانہ ہو گئی۔ نجمہ نے پوچھا جمو کو بھلا کیا دلچسپی ہوگی وہاں، میں اس فلسفیانہ سوال کا کیا جواب دیتی، سوچ سوچ کر کہہ دیا کہ وہاں اچھی اچھی گڑیاں ہیں۔ بڑے ہی اچھے کھلونے ہیں اور پھر تمہاری شاہدہ باجی بھی تو ہے، جو تمہیں بہت پیار کرے گی، اچھی اچھی کہانیاں سنائیگی دل بھر کے ہنسائے گی، اور کچھ نہیں تو تمہیں گانا بھی سکھائے گی، باجی سن لو زیادہ زیادہ کم بولوں اولوں گی، چلو تو رہی ہوں، اگر وہاں دل نہ لگے تو آگ میں جائے ایسی محبت، چولھے میں جائے ایسی تفریح جس میں سوائے تکلیف کے اور کچھ حاصل نہ ہو، الٹے پیروں ہی چلی آوانگی، کون جانتا ہے، کیا دھرا ہے وہاں، گدھے لوٹتے ہوں گے گرمے، نہ سینما دیکھنے ملے گا نہ ناٹک، ہوا خوری کو ترس ہی جاؤں گی، یہاں روز اتنا مزہ آتا ہے، وہاں یہ باتیں خواب ہو جائیں گی

دیکھو باجی جا تو رہی ہو، پچھتاؤ گی، میرا کہنا مان لو، ورنہ پھر کہو گی۔ مرضی اپنا اپنی ہمیں کیا،
بجمہ کی اس عالمانہ نصیحت پر میں ہنس پڑی، تنہا سفر میں نے اکثر کئے تھے، لیکن اس دفعہ اتنی
گرمی بڑھی کہ میں تو گھبرا گئی، سفر کا لطف ہی خاک میں مل گیا، جدھر دیکھو لٹکے ہوئے پیٹ کی
موٹی موٹی مارواڑنیں بیٹھی مینڈک کی طرح ٹرٹر کر رہی ہیں، ریل کی گڑگڑاہٹ، دوپہر کی
جھلسا دینے والی دھوپ، اور ان سب کی ٹرٹر میرے لئے آفت سے کم نہ تھی میرے سر میں درد
ہونے لگا، لیکن یہاں شاہدہ کہاں —— بجمہ کو کیا پڑا تھا کہ تکلیف اور لطف کا احساس
کرے، اُس کو تو بھاگتے درخت، ناچتے جانور، دوڑتے بجلی کے کھمبے دیکھ کر لطف آرہا تھا،
آخر تھی ہی بچی، اُس کو کیا خبر تکلیف کیا بلا ہوتی ہے اور لطف کیا، لطف اور تکلیف کا احساس
بھی تو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے، اور ایک منزل پر پہنچ جانے پر محسوس ہوتا ہے۔

اسٹیشن پر شاہدہ ہماری سراپا منتظر کھڑی تھی، ابھی ہم اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ دوڑتی
ہوئی آکر لپٹ گئی، جب مدت کی بچھڑی ہوئی تھی وہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے، نا
معلوم وہ خوشی کے تھے، یا شدت جذبات کا نتیجہ تھا، کھانا کھایا، اور پھر باتوں میں رات کے
بارہ ہی بجا دئے، میری آمد سے وہ بہت خوش تھی، مسرور تھی، مسکراتی رہتی، گنگناتی رہتی،
اور ہر طریقہ سے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتی، چچی اماں تو بہت ہی مفید ثابت ہوئیں گھنٹوں
اُن سے باتوں میں گذر جاتے، جب ذرا اکتا جاتی، شاہدہ کبھی باغ کی سیر کرواتی، کبھی
لہلہاتے دھان کے کھیتوں میں لے جاتی، اور کبھی کمرے میں بیٹھی ہنسا ہنسا کر پردیس کے احساس
کو دور کرنے کی کوشش کرتی،

برآمدے میں بیٹھے ہم چائے پی رہے تھے کہ ڈاکیہ نے چٹھی دی، شاہدہ چٹھی لے کر بھاگ
کھڑی ہوئی، واپس آئی تو مسکرا رہی تھی، گویا کونین کی دولت ہاتھ آ گئی ہے، یا پھر درجہ اوّل
میں پاس ہوگئی ہے، بات کچھ سمجھ میں آتی نظر نہ آئی، تو میں نے پوچھا۔ یہ کیا حماقت ہے، کچھ مجھے
بھی بتا، یا پاگلوں کی طرح یہ رٹ لگائے جاؤ گی، ظہور آ رہے ہیں، کون ہے کمبخت، کس کا کون
ہوتا ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، میری سمجھ میں تو خاک بھی نہ آیا۔ معمہ ہے معمہ میرے لئے، شاہدہ
نے ہنس کر کہا "ظہور میری خالہ جان کے بیٹے ہیں، اُن کے بڑے لڑکے ہیں، ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں،
اچھی طبیعت پائی ہے، خوب مل گذرے گی، میں نے کہا "یہ ظہور آئے تو کیا، کوئی حور آئے تو
کیا، مجھے کوئی سروکار ہی نہیں، تو جان اور تیرا ظہور، بھلا اجنبیوں سے خوب مل گذرنے کی بھی

خوب ہی رہی، ظہور نے اپنی آمد کا خط شاہدہ کے نام لکھا تھا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ خط میرے لئے ہی تو تھا، میری ہی دل بہلائی کے لئے تو آرہے تھے وہ، اس خیال کے ساتھ ہی دل و دماغ کے تمام تار جھن گئے، میں مسکرائی، مسکرا کر مسرت افزا گیت گانے لگی۔ اور آنکھوں میں اچھا دیکھنے خواب رچ گئے، شاہدہ نے مجھے گدگداتے ہوئے کہا، آج بہت خوش نظر آرہی ہو، میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ تمہارے نزدیک رہ کر بڑی مسرت کرتی ہوں، بالوں کو درست کرتے ہوئے پوچھا، ہاں تو کب آرہے ہیں ظہور، شاہدہ نے کہا "کل" دوسرے دن ظہور مع خالہ جان آگئے، جن کا انتظار تھا، جن کے لئے شاہدہ اور کچھ کچھ میں بھی بے قرار تھی، نہ معلوم کیوں! وہ آئے اور اپنی رعنائیوں کے ساتھ آئے، شاہدہ نے تعارف کرواتے ہوئے کہا "یہ ہیں بی ساجدہ ——— میری جان سے زیادہ عزیز سہیلی، نہیں نہیں، بہن اور یہ ہیں ظہور ——— کانپتے ہوئے ہاتھ سے انھوں نے سلام کیا، میں خاموش تھی، وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن اجنبیت کا پردہ حائل تھا، ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ میں بہت خوش ہوا آپ سے مل کر، نا معلوم کیوں میرا بھی دل دھڑک رہا تھا۔ شاید گواہی دے رہا تھا کہ میں بھی خوش ہوا ——— رات کھانے کی میز پر سب اکٹھا بیٹھے ہوئے تھے، میری آنکھوں کے سامنے کسی مصور کے کمال کا اعلیٰ نمونہ یا کسی سنگ تراش کا شاہکار تھا، میں نے جب کبھی دزدیدہ نگاہوں سے انھیں دیکھا تو نظریں آپس میں ٹکرا گئیں، میں شرم سے ڈھیری ہوگئی، اور پھر نہ دیکھا کبھی، رات بھر سینے میں ایک نامعلوم سی جلن رہی، مسکراتے ہوئے تاروں کو دیکھ کر میں انسانی زندگی پر غور کرنے لگتی کہ حسن کیا بلا ہے۔ اور محبت کیا ہے، اور یہ کیونکر ہوتی ہے۔ انسان خوبصورتی پر کیوں مرمٹتا ہے۔ بری صورت کیوں زہر لگتی ہے، حسین پھول بھی تو مرجھا جاتا ہے، اور اس کو پاؤں تلے روندھ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود حسن پرستی کیا معنی رکھتی ہے، محبت ان تمام باتوں کو کہاں دیکھتی، چاہنے اور چاہے جانے کے لئے بے قرار رہتی ہے، جب کبھی وہ شاہدہ کو چھیڑتے، تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ مجھے ہی چھیڑ رہے ہیں، اور میں شرما کر سمٹی ہوئی بیٹھی رہتی، بے تکلفی بڑھتی گئی، ہمارا بہت سارا وقت اکٹھا گذرنے لگا۔ میں تفریح کے لئے مقام تجویز کرتی وہ ہمارا ساتھ دیتے، میں گیت پسند کرتی وہ گاتے، اور بہت ساری باتیں ہوتیں، جو دوسرا سنے تو ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائے۔ ہر موضوع پر بحث ہوتی، مذہب اور اخلاق، مصوری اور شاعری، موسیقی اور افسانہ نگاری

محبت اور عورت، عورت اور مرد کی تخلیق ہے آخر میں ہم دونوں کے خیالات ایک دوسرے سے
مل جاتے، اسی طرح جس طرح گنگا جمنا مل کر آگے بڑھتی ہیں — اور گفتگو کے لیے کوئی اور
موضوع لے بیٹھتے، جب کبھی وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے تو ان کی صاف شفاف آنکھوں میں
سرخ ڈورے دوڑ جاتے، حسن و شباب کی کیف باریاں اور رنگینیاں ان کی آنکھوں سے
جھانک جھانک کر مسرت کا پیغام دیتیں، اور نشہ آفریں کیف میری روح کو گدگدا جاتا۔
شاہدہ کا کمرہ میرے کمرے سے پرے تھا، اکثر ظہور ادھر سے گذرتے، نظریں ان کو روکنا
چاہتیں، لیکن خود ہی پھر خاموش ہو جاتی، کیسے کہے لڑکی اور پھر ہندوستانی، دل تو کہتا کہ
کہہ دوں ذرا دیر کے لیے یہاں بھی بیٹھ جائیے، پردیس میں آ پڑے ہیں ہم، دل ہی بہل جائے گا،
چاہتی ہوں کوشش کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی، جیسے کسی نے پھندا ڈال دیا ہو، میں جوان
تھی، جو ابھی انھوں نے مار رکھا تھا، میرے دل میں بھی بچپن کے حسین خواب جاگ اٹھے،
محبت اور جوانی کلبلانے لگی، تمنائیں کروٹیں لینے لگیں، جوانی جتنی بری ہوتی ہے، اس سے
کہیں زیادہ جوانی کی محبت، کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے بنائے تھے۔ ان کی بے لکھی محبت
کا کھلا پیغام تھا، لیکن میں گھبرا رہی تھی، کہ کہیں ٹھوکر نہ کھا جاؤں، زندگی میں پہلی
بار قدم اٹھایا ہے، وہ بھی ڈگمگا جائے تو پھر کہیں کی نہ رہوں گی، زندگی دوبھر ہو جائے گی،
کیا بھروسہ آج کل کے مردوں کا، مگر دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ تو ایسے نہیں بہت شریف
ہیں — اور امیر بھی — مگر پھر خیال آتا کہ شریف اور امیر — یہی دو چیزیں تو بد
معاشی کی اساس ہیں۔

ایک دن جو مجھے بہت خوش گوار تھا، شب بیداری کی تھکن چند انگڑائیوں میں اتار
دی، اور وہ ایک کرسی بچھا کر بیٹھ گئی، پھر اٹھ بیٹھی، نرم نرم ہوا کے جھونکے سرسراتے، نامعلوم
جذبات میں ہل چل پیدا کر رہے تھے، گدگدی ہو رہی تھی، دل نہ جانے کیسے بے قابو ہو رہا
تھا، موجیں اٹھ رہی تھیں جذبات کی، بالکل اسی طرح جس طرح سمندر میں ساحل سے ٹکرا
کر موجیں مایوس لوٹ جاتی ہیں، مگر ٹکرانے سے باز نہیں آتیں، شاہدہ نے کہا "چلو ذرا
گھوم آئیں"۔

میں بھی بہانہ ڈھونڈ رہی تھی، جلد ہی تیار ہو گئی، میں نے کہا ہوٹل میں چلا دوں گی،
شاہدہ نے کہا میں، ظہور نے کہا میں، لیکن دونوں نے میرے آگے ہار مان لی، وہ پیچھے بیٹھے

تھے ، اور میں خوش تھی کہ ان کے بازو بیٹھے بیٹھے زندگی گذر جائے تو اچھا ہے ، کوئی منزل آئے
اور نہ بچھڑنے کا غم ہو ، وہ کبھی مجھ کو اور کبھی شاہدہ کو ایک نظر دیکھ لیتے ، اور پھر ہنس کر مجھ
سے باتیں کرنے لگتے ، میں سمجھ رہی تھی کہ وہ دونوں کو پرکھ رہے ہیں - بالکل ایک جوہری کی طرح ،
جس کے پاس ایک اصلی اور ایک نقلی ہیرا ہو - جب وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے تو میں سمجھ جاتی کہ
جوہری کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں - میں اپنے آپ پر فخر کرتی ، چہرہ خوشی سے سرخ ہو جاتا .
ندی حسین منظر آگیا - اور میرے تخیلات کی دنیا موٹر کے دیکھنے کے ساتھ تباہ و برباد ہوگئی ، میں
اتری ، وہ اترے اور شاہدہ بھی ، ندی کے کنارے جا بیٹھے - نرم و خوش گوار ہوا کے جھونکوں
سے دل مسرور تھا - سفید سفید بگلے نیلگوں آسمان پر پُر لطف منظر پیش کر رہے تھے - اکثر جگہ
عورتیں درختوں پر جھولے ڈالے جھول رہی تھیں ، جن کو دیکھ کر میرا دل اور خود میں بھی جھولتی
نظر آرہی تھی - ظہور سے گانے کو کہا ، وہ گا رہے تھے ، اُن کے گانے سے پانی کی موجیں ، نیم کی
ڈالیاں ، خود رو پھول وجد میں آرہے تھے ، اُن کی ترنم موسیقی سے میں خیالی دنیا کی وسعتوں
میں کھو گئی ، کتنا پُر سوز گیت تھا جس کے الفاظ میرے کانوں نے سُنے ، لیکن جس کا جان گداز
نغمہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا ، اف کتنا لوچ تھا —— لے کی تڑپ اور درد جگر
کلیجہ میں سما گیا ، اُس وقت چونکی جب ظہور نے مجھے چلنے کے لئے جھنجھوڑا ، راستہ بھر چھیڑ چھاڑ
شوخیاں ، وہی ہنسی مذاق . سب کچھ وہی ، بالکل وہی ، جو ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے ، حسین
واردات ، پُر لطف قہقہے ، ہمارا اب روزانہ کا یہ پروگرام تھا کہ کہیں نہ کہیں سیر کریں گھومیں
پھریں —— لیکن میں تو اکتا گئی تھی ، روز روز کے باسی پروگرام سے ،

صبح ہی صبح ایک دن میرے کمرے میں وہ آئے ، مجھے نیند سے جگایا ، میرا حسین سپنا
پورا ہی تو ہوگیا ، کہ وہ میرے پاس کھڑے الفت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں - کیونکہ خوابیدہ
حسن اور بھی نکھر جاتا ہے ، نہ معلوم اور کیا بات تھی محویت کی ، بالوں کو درست کرتی ہوئی
اٹھ بیٹھی ، ظہور نے کہا چلو ذرا گھوم آئیں ، رات شاہدہ دیر سے سوئی ہے ، اس لئے نہیں جگایا ،
میں پہلے تو اکیلی جاتی جھجکی ، لیکن پھر خیال آیا کوئی غیر تھوڑی ہیں ، وہی تو ہیں ——
دل کے مالک ، جن کی موجودگی میرے لئے حیات نو کا باعث ہے ، ڈر کاہے کا ، شاہدہ کی موجودگی
میں کھل کر بات کرنے کا موقع بھی کہاں ملتا ہے ، سایہ کی طرح تو رہتی ہے ، ہم دونوں باغ میں
پہنچ کر حوض پر بیٹھ گئے - شبنم آلودہ پھول عجیب بہار دکھا رہے تھے ، جیسے رات تمام روتے

رہے کسی کی یاد میں - ظہور کو، پھولوں کا بہت شوق تھا - بے انتہا شوق، باغ میں پھولوں
کی کئی کیاریاں تھیں، جان دیتے تھے پھولوں پر —— نیلے سرخ، سفید پھول بہت
پسند تھے - لیکن گلاب کی نوخیز کلیوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے، بیحد لگاؤ تھا
کھلتی ہوئی کلیوں سے نہ معلوم کیوں —— چند لمحے بیٹھے رہے —— بعد وہ پھولوں کے
جھنڈ میں غائب ہو گئے - لیکن ان کے پُرسوز نغموں کی صدائیں میرے کانوں میں آرہی
تھیں، اُن کی عادت تھی جب کسی خوبصورت لڑکی یا حسین پھول کو دیکھتے تو راحت
افزا نغمے ان کے لبوں سے برسنے لگتے، میں بھی ان کے قریب پہنچی، پھولوں پر بھونرے
منڈلا رہے تھے، ظہور نے کہا دیکھا ساجدہ تم نے بے زبان پرند کی محبت کو انسان کو پھر
کیا دشواریاں ہیں - میں نے کہا میں بھی یہی سوچ رہی ہوں، ساجدہ اب زیادہ بننے کی
کوشش نہ کرو، سچ سچ کہو، ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کیا اس کی بھی وہی حالت ہے جو میرے
بے قرار قلب کی، کیا تمہاری نرگسی آنکھیں بھی کبھی اشک محبت سے بھر آئیں - کیا تم نے بھی
بھیانک راتوں میں میرے تصور سے دل کو بہلایا [illegible] سوچ رہا تھا، کیا کبھی وقت آئیگا -
جب تم میرے دل کی دھڑکنوں کو سن سکو گی، رات، رات بھر مجھے تمہارے تصور نے بیدار
رکھا، پھر [illegible] سوچا کرتا ہوں کہ کیا ہوگا اس کا انجام، میری پرسوز راتوں کو کاش
تم دیکھ سکتیں، جب میں پروانہ کو دیکھ [illegible] ہوں، کچھ دیر تک فضا میں گہری
خموشی اور سکوت طاری رہا، اور [illegible] دل کی دھڑکنیں صدف [illegible] رہی
تھیں، کہیں دور کھلتی ہوئی کوئل [illegible] رہی تھی —— ہوک پیدا [illegible] رہی تھی دل میں،
"ساجدہ خاموش کیوں [illegible]
تو پھر کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے تم سے لگاؤ ہے، دلی لگاؤ ہے، میں نے بھی کہہ دیا "کیوں [illegible]
[illegible]
ہو گئی، دل دھڑک رہا تھا سانس [illegible] تھی - [illegible] دماغ [illegible]
رہا تھا - جیسے ہزاروں [illegible] رہے تھے، رگ رگ
میں درد محسوس ہو رہا تھا - لیکن [illegible] لذت سے آشنا ہوئی تھی، میری
زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا - جیسے [illegible] میں [illegible] ہو گیا ہو،
نہ جانے کیوں ان تمام تکالیف کے میں اپنے آپ [illegible] کی کوشش نہیں کی، جب ذرا

ہوتیں، تھکا ماندہ ہوتے تو اکھڑی اکھڑی سی باتیں، کھری کھری ہوتی، ہر جاڑے میں پتلی پتلی چکیوں
رحمی کہاں سے آ رہی تھی؟ ناشتہ نہیں کرو گی؟ اس کو کیا معلوم تھا کہ اب بھوک کہاں، پیاس
کہاں؟ تب ادھر گھوم گھوم کے رہتی تھی، اور وہ ادھر بستر پر پڑے بل کھاتے رہتیں، آخر کدھر
لگی تمہاری جوانی اور مستی، ستاری کی ساری؟ مجھے شاہدہ کی معصومیت پر رحم آ رہا تھا،
دل کہہ رہا تھا ذرا دیکھو تو جا کر ظہور کو جب پتہ چلے گا، کیا کیا گل کھلا رہی ہیں، جوانی کی
مستیاں۔ دوسرے دن ظہور نے جانے کا سوال اٹھایا، شاہدہ نے کہا "ارے تم اتنا جلد نہیں
جا سکتے" یہ میرا اپنا خیال تھا اور شاہدہ کے الفاظ، ظہور نے کہا "اگر مجبوری نہ ہوتی تو زندگی
بھر آپ لوگوں کے ساتھ ہنس بول کر گذار دیتا" شاہدہ خاموش تھی، ظہور میرے کمرے میں آئے
اور کہا "میں جا رہا ہوں، میرے چلے جانے پر بھول تو نہ جاؤ گی" میں نے کہا "یہ بھی خوب رہی
میں اور آپ کو بھول جاؤں، بچاری اور دیوتا کو بھول جائے؟ نا ممکن ہے" "جب
تمہیں دیکھا اپنے سب کچھ فراموش کر چکی ہوں" "مجھ سے ٹھیک ہی کہا تھا، باجی، جا رہا ہوں تو
مرضی ہو تو سمجھا دو گی" "پھر کہنا مان لو، ورنہ پھر کہو گی" "مرضی اپنی اپنی، ہمیں کیا" "زندگی
میں یہ انوکھا پر لطف انقلاب خود میری سمجھ سے باہر ہے۔ میری زندگی میں آج تک کسی نے ہل
چل نہیں ڈالی تھی، بالکل خاموش تھی زندگی میری، ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح، تم نے مجھے
گھائل کر دیا، انقلاب برپا کیا، اور پھر کہتے ہو کہ بھول تو نہ جاؤ گی؟" "پھر کب ملیں گے؟" ظہور
ـــ "کیا کام ہے تمہیں؟" "کچھ امانت واپس کرنی ہے" "کیا؟" "دل" ہم دونوں ہنس پڑے
اور ظہور نے بے اختیار ہو کر محبت کی مہریں ثبت کر دیں، جیسے میں ان کا ہی مال تھی، ممکن
قبل از وقت مجھے یہ باتیں پسند نہیں تھیں۔ جاتے ہوئے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہا، مگر
اشاروں میں جو کچھ کہہ گئے اس کا مطلب واضح تھا، میرے لئے کوئی دشواری نہیں تھی ـــ
اب کیا دلچسپی تھی میرے لئے ـــ میں بھی چلی آئی۔

گھر پہنچ کر بھی میرا دل نہ لگتا، ہر وقت پریشانی سی رہتی، دل میں ہر آن کچھ عجیب سی
بے چینی اور ہلچل سی محسوس ہوتی، ہر بار تجربہ کرنے پر بھی کچھ پتہ نہ چلتا، کبھی خیال آتا
میں نے ٹھیک نہیں کیا، کبھی دل کہتا تو نے جرم ہی کونسا کیا ہے، جو یکایک ان کا خیال آ جا
بدن میں گرمی سی آ جاتی، اور کچھ کچھ پسینہ بھی، اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ بسا اوقات
معمولی سی بات کے کتنے گہرے نقوش مرتسم ہوتے ہیں، جو مٹائے نہیں مٹتے، آج بھی وہ

مکل اسی طرح آنکھوں کے سامنے ہے، سرخ چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، جیسے وہ ستارے ہیں آکاش کے، اور کانپتے ہوئے لب۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں ——میں اپنے آپ پر ملالت کرنے لگتی، پھر تسلی دے لیتی کہ میں نے آخر کیا ہی کیا ہے، جہاں تک میرا اپنا خیال تھا، اسے گناہ کوئی نہیں کہتا، اور کہنے بھی کیوں چلا، جبکہ میں خود اس کو گناہ نہیں سمجھتی، اس خیال کے ساتھ رگ رگ میں مستی دوڑ جاتی، اور کیف و سرور کی انگڑائیاں آنے لگتیں —اور میں لحاف کی لطف انگیز ضرورت محسوس کرتی۔ انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزرنے لگیں، نہ شاہدہ آئی اور نا وطن سے اس کی کوئی اطلاع ملی، ایک دن میں کالج سے واپس آکر بیٹھی تھی کہ ملازم نے ایک رنگین رقعہ دیا۔ دھڑکتے دل لرزتے ہاتھوں سے کھولا۔ اف میرے معبود ——کیا لکھا تھا، پڑھ نہ سکی چکر سی آگئی۔ جیسے سانپ سونگ گیا ہو، گر ہی جاتی اگر بی اماں نہ ہوتیں، "شاہدہ کی شادی اور ظہور کے ساتھ" زندگی کی حقیقت اب واضح ہوگئی۔ قدم قدم پر تلخیاں، زہر کی سی کڑواہٹ، جبر و تشدد، غم ناپائدار لذتیں، کتنی حزین ہے زندگی —— مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب تک میرے سینہ سے امید کی لاش چمٹی ہوئی ہے، اور میں جی رہی تھی ——تجدید محبت، جوانی اور میں ——اف مجھے یہ باتیں راس نہیں آسکتیں۔ ولولے دل کے صرف ایک بار اٹھے تھے مگر وہ بھی بار غم سے دب گئے۔

جب کبھی سوچتی ہوں تو بیتی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے میرے دماغ میں منڈلانے لگتی ہیں، گم گشتہ خوشیاں آنکھوں میں آنسو بن کر لہرا تی ہیں۔ ویران سینے میں ہر لحہ تھیس محسوس ہوتی ہے، ناکام امنگیں آنسو بہاتی ہیں، زندگی کی دوڑ میں میرے ذہن میں گھوم رہی ہیں۔ ایک سہیلی کی محبت، دوسری اپنی زندگی، کتنی امیدیں لیکر منزل کی طرف بڑھی تھی، لیکن ——اف میرے خدا کتنی مایوسیاں لیکر واپس ہوتی ہوں۔

اندرون ماہ اگر کوئی پرچہ نہ ملے تو مکرر طلب فرمالیں اس کے بعد تعمیل میں دشواری ہے

ازدواجی زندگی

محمدی احمد (حیدرآباد دکن)

شملہ کی ایک خاتون سعادت اختر صاحبہ نے میرے مضمون "ازدواجی زندگی" پر تبصرہ کیا ہے۔ بقول ان کے ان کی نسوانی حس (جو ان میں اوروں سے زیادہ ہے) پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی اور جو صرف اعتراض کرنا جانتی ہیں اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں۔ میں نے مضمون میں کافی سے زیادہ صراحت کردی ہے کہ "ایک دوسرے کی طبیعتوں کو خوب اچھی طرح سمجھیں قربانی اور ایثار کی عادت ڈالیں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ قربانی اور ایثار دوطرفہ ہوں" اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتی کہ کھلے الفاظ میں لکھا جائے کہ صرف عورت ہی ایثار کرے اور مرد کو اس کی ضرورت نہیں۔ اس مضمون میں زیادہ تر میرا خطاب عورتوں سے تھا۔ جس کا آپ نے نہ جانے کیا کیا مطلب لیا۔ اور پھر دعوی کیا ہے کہ میرا مضمون گمراہ کن ہے۔

محترمہ نے یاد دہانی کی ہے کہ ایک کتے میں جان نثار کرنے۔ حکم بجا لانے کے اوصاف بدرجہ ادنیٰ فطرتہ موجود ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی نظر میں ایک جان نثار کرنے والی۔ حکم بجا لانے والی بیوی کتے سے بدتر ہے۔ کیونکہ اس میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو ایک ذلیل جانور میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی رائے ہے کہ اگر مرد کسی عورت میں ان اوصاف کا آرزومند ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ بجائے عورت کے کتے سے دل بہلائے۔

محترم خاتون (کیونکہ وہ خاتون ہی ہیں) "لڑکیوں کو یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ شادی کے بعد ہمیں کیا ملے گا بلکہ یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم اپنے شریک زندگی کو کیا دیں گے" کا جواب

تلاش کر رہی ہیں اور ان کی تیز فہم سے اس کا جواب نہیں بن پڑا - محترم خاتون نے اس پیراگراف کا صرف پہلا حصہ پڑھا - کیا آپ اس پورے پیراگراف کو دوبارہ پڑھ کر سمجھنے کی زحمت گوارا کر سکیں گے۔

اس کے بعد محترم خاتون نے بعض اقوال پر جو میں نے مضمون کے اختتام میں دئے ہیں جملے کسنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے۔

لیکن محترمہ کے نزدیک شیریں بیانی اس وقت تک بیکار ہے جب تک کوئی فرہاد نہ ہو اور سوائے فرہاد کے دوسروں سے شیریں زبانی فضول ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ اگر شوہر بیوی سے فرہاد سا عشق ظاہر کرے جب ہی اس سے شیریں زبانی سے پیش آؤ، ورنہ اس سے تمام باتیں گالی گلوچ میں ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے ان اقوال میں فرہاد و مجنوں کا مطلب کہاں سے تراشا۔

اس کے بعد محترمہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے کہ قرانی ارشادات فراموش کرکے لکھا ہے - میرے مضمون کو شروع سے آخر تک پڑھئے اور پھر پڑھیے اس میں کوئی جملہ ہی ایسا بتا دیجئے جو میں نے خلاف احکامات لکھا ہے۔

محترمہ فرماتی ہیں کہ "عورتوں پر سوائے حفاظت عصمت کے اور کوئی ذمہ داری عاید نہیں کیگئی مگر مردوں پر اس کے علاوہ اور بھی ہیں" بقول آپ کے ہی تمام ذمہ داریاں مرد ہی پر ہیں اور آپ کا نگہبان آپ کے تحفظ یہ کا ذمہ دار اور آپ کی آرام و راحت کے لئے اپنے آپ کو تمدن کی مہلک موجوں میں ڈال کر آپ کے لئے سب کچھ کرے اور پھر آپ ہی فرماتی ہیں کہ مرد کے لئے ان تمام خدمات کے باوجود جانثار کرنا حکم بجا لانا اور اس کو خوش رکھنا انتہا درجہ بے حسی اور ذہنی جمود کا نام ہے۔

آپ نے عام گھرانوں کی حالت بتاتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہر ایک ذلیل کام عورت سے لیا جاتا ہے اور مفت اور پھر آپ نے قرآنی ارشاد کے موافق بتایا کہ ان کی اجرت دینی چاہیئے (اگر رضامندی سے ہوں تو خیر) اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا - لیکن آپ نے اس کا مطلب یہ کیسے حاصل کیا کہ عورتوں کی مستقل آمدنی ہونی چاہیئے - کیا یہ ارشاد پر ظلم نہیں ایک طرف تو فرائض منزلی اور بقائے نوع انسانی کا اس کو ذمہ دار قرار دیا جائے اور دوسری طرف تلاش معاش کا اور مستقل آمدنی کا بھی بار اس پر ڈالا جائے - کیا یہ غلامی نہیں؟ مرد

اچھا کام بھی عورتوں کے سپرد کرکے اپنے طبعی فرائض کے انجام دینے سے روک دئے جائیں اور
عورت کو فرائض منزلی کے ساتھ فکرِ معاش کا بھی ذمہ دار قرار دیں چاہیے تو یہ کہ عورت کو اپنا
کی طبعی فرائض کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ آرام اور اطمینان سے ان کو انجام
دے سکے اور ساتھ ساتھ اس کو کشمکش حیات سے محفوظ رکھا جائے جس کو خود فطرت نے محروم
رکھا ہے۔ الغرض مرد پر واجب ہے کہ عورت کے لئے تغذیہ کا انتظام کرلے اور یہ بھی ایک اٹل
قانون ہے جو صنف نازک کو اس کی اصل زندگی کے منزلی دائرہ تک محدود کرتا ہے اور یہ وہ
سیدھا سادھا طریقہ ہے جو عورت کو طبعی جذبات سے تربیت اطفال جیسے اہم فرض کی بجاآوری
پر مستعد کرتا ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے (جس سے آپ کو بھی اتفاق ہے) "نسلوں کو سنوارنا
عورت کا کام ہے" عورت کو قدرت نے دنیا میں اس غرض کے لئے مخلوق کیا ہے کہ نسل انسانی
کی بنیاد اور اس کی حفاظت و تربیت کرے قوموں کی ترقی کا راز تاریخ شاہد ہے کہ بڑی بڑی
شخصیتوں کی بھی ابتدائی رہی جو انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں صرف ماں کی
کوششوں اور توجہ سے حاصل کی۔ اگر عورت اپنی خواہش کے مطابق بچوں کی پرورش کرے اور
ان کے دلوں پر اپنے حسب مرضی خیالات کا نقش کرلے تو پھر یہی بچے ان خیالات کو اپنی زندگیوں
کا نصب العین بناکر دنیا میں قدم رکھیں گے۔ اس طرح ملک کا ہر انقلاب معاشی ہو تمدنی ہو سیاسی
ہو یا مذہبی ہو، سب عورت کے ہاتھ میں ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے اس ہتھیار سے ملک کے ہر ایک
رسم و رواج کا رخ پھیر سکتی ہے۔ عورت کی اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہوگی کہ وہ اپنے جائز حقوق
کو بھول کر خود اپنی قوم کی پستی کا دکھڑا رو دیئے۔

یہ سراسر ظلم ہوگا اگر اس کا مطلب یہ نکالا جائے کہ عورت صرف غلامانہ زندگی بسر کرنے
کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک حد تک آزادی دی ہے اور اس کے ذمہ تمدن کا
ایک اہم کام سپرد کیا ہے۔ دوسری طرف مرد کو طاقت عطا کی ہے کہ وہ اس کے لئے محنت و
مشقت کرلے اور اس کو آرام پہنچائے۔ اس طرح ان دونوں کا درجہ "مساوی" ہے اور دونوں
نظام حیات و نظام تمدن میں برابر کا حصہ رکھتے لیکن عورت کو اپنے فرائض کے بجا آوری کے
لئے مرد کا محکوم بنا دیا اور یہی عورت کے لئے بہتر تھا اور ترقی کے لئے مناسب ہے۔ یہی وہ اطاعت و
ماتحتی ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں تشریح کی ہے "الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ

بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَہُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۔

اب آپ اس روشنی میں اپنے جائز حقوق کے لئے پوری اسلامی شان سے جد وجہد کیجئے۔ لیکن یاد رہے کہ اس جد وجہد میں مغربی عورتوں کا سا چھچھورا پن نہ ہو۔ یہ مرد پر اپنی فوقیت مستقل آمدنی کی خواہش یہ سب خلاف قدرت ہیں ہنوز نہ ہی اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ وَمَنْ یَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ ۰

آجا

منغنی تبسم

پھر دعاؤں کا اثر دیکھوں میں — پھر تجھے خاک بسر دیکھوں میں

کاش ہو جائے غم دل کا علاج — پھر نئے شام وسحر دیکھوں میں

اپنی تقدیر کا عنوان پڑھ لوں — تیرا انداز نظر دیکھوں میں

تو جو آئے تو بچھادوں آنکھیں — راستہ تا بہ سحر دیکھوں میں

تو کبھی جا درد کا درماں لیکر

تا بکے شمس و قمر دیکھوں میں

غزل

جناب میر عباس علی خاں صاحب نیاؔز

رہو نظروں میں جبتک ہے میری آنکھوں میں دم باقی
کہ جی بھر کر نہیں دیکھا، نہ رہ جائے یہ غم باقی

عجب منزل سے گذرا جا رہا ہوں بیکس و تنہا
نہ اب ان کا کرم باقی نہ اب ان کا ستم باقی

مرا سب کچھ مٹا کر اک دل درد آشنا بخشا
اب ان کا رہ گیا مجھ پر بس اتنا ہی کرم باقی

یہ میری موت تو وقفہ ہے درد جاودانی کا
ابھی سے تھک گئے تم ہے بہت کچھ شرح غم باقی

نہ کہہ اے ہمنشیں یہ تو عنایت ہی عنایت ہے
یہ کیا کم ہے انھیں اب بھی ہے اتنا پاس غم باقی

بجھی سی جا رہی ہے شمع ہستی جب سے تم چھوٹے
تمہاری یاد میں لے دے کے ہے اک چشم نم باقی

اقبال

ملیزہ بانو کاؤس جی۔ بی۔ اے

شہرۂ آفاق اقبال ہندوستان کے بیسویں صدی کے شاعروں میں سب سے زیادہ بلند رتبہ کا مالک ہے۔ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیگر شعرا کی طرح لوگوں کے دلوں ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ان کے خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے اور ایک نئی زندگی کا پیام دیتا ہے۔ اقبال نے عام طور پر دنیا کو اور بالخصوص اپنی قوم کو ایسے لازوال پیامات سنائے جن سے ان کے حوصلے بڑھے، دراں کی پژمردہ قوتوں پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہوگئے اور جمود و سکون، حرکت و عمل میں تبدیل ہوگیا۔

اقبال کا کلام ایک بحر ناپیدا کنار ہے جس میں عملی زندگی موجیں مارتی ہوئی نظر آتی ہے، اسی بناء پر اقبال موجودہ دنیا کے چوٹی کے شاعروں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے اس کے کلام کا طرۂ امتیاز شاعرانہ لطافت، نازک خیالی، معنی آفریں، سلاست بیان اور جدت ترکیب ہیں۔ اور اس مخصوص طرز کی بناء پر اس کی مقبولیت ہندوستان ہی تک محدود نہیں رہی، اہل مغرب نے بھی اس کی علمی و ادبی قابلیت کا اعتراف کیا اور اس کے کلام کی قدر کی، اقبال کے کلام میں امید اور عمل کی جھلکیں نمایاں ہیں، جو اس کی بلند نظری کا مظہر، اور اس کے اعلیٰ خیالات کا مجموعہ ہے۔ زندگی کا ہر پہلو، بلندی و پستی، ترقی و تنزل۔ حرکت و جمود، سوز و گداز، یہ تمام چیزیں اقبال نے اپنے کلام میں ایسے دلکش پیرائے میں بیان کی ہیں جو پڑھنے والوں کو دنیا کے شور و غل اور چہل پہل سے دوچار کرکے ایک ایسے مقام پر پہنچاتا ہے جہاں انھیں دنیا کی ہر چیز اس کے

اصلی رنگ میں نظر آنے لگتی ہے جس سے وہ اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ کچھ نہیں تو تھوڑی ہی دیر کے لئے ان میں جوش عمل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو زمینوں کی تہیوں میں پہاڑوں کی بلندیوں پر اور سمندر کی گہرائیوں میں سیر کرتے ہوئے پاتے ہیں، نیچر کی حسین اور دلکش رنگینیاں اقبال کے حساس دل کو خوب متاثر کرتی ہیں، صبح کا سہانا سماں، شام کی دلفریب کیفیت، رات کی بھیانک تاریکی، ندی کا دلکش کنارہ، باغ کی دل خوش کن بہار، یہ تمام چیزیں جس قدر اپنے اندر کشش رکھتی ہیں اسی قدر اقبال کے کلام میں معراج پر نظر آتی ہیں۔

اقبال نے اپنے کلام میں انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے وہ "خودی" کو جس میں انسان کی حقیقی کامیابی کا راز پنہاں ہے، بہت اہمیت دیتا ہے اور زندگی کی کنہ تک پہنچنے کے لئے بے تاب و بیقرار نظر آتا ہے، اس کا کلام سادہ اور تصنع سے معرا ہے لیکن خیالات کی پرواز اس قدر بلند اور اظہار مطلب میں وہ دلفریبی ہے کہ جسے پڑھ کر ہر حساس طبیعت متاثر ہونے پر اور ہر خوابیدہ بیدار ہونے پر مجبور ہوتا ہے، اقبال کے نظریہ میں احساس خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ جو آفاقی پیامات اس نے گمراہی و ضلالت کے استیصال کے لئے دنیا والوں کو دئے وہ اس کے دل کی آواز ہے، اس وجہ سے اس کے کلام میں بے باکی اور جوش پایا جاتا ہے جو قاری کو چشم زدن میں آسمانوں کی بلندیوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر لے اڑتا ہے، اقبال نے اپنے زور قلم سے "خودی" کی وہ پرجوش تبلیغ کی ہے، جس سے معلوم نہیں کتنی خفتہ قوتیں حرکت میں آئیں اور جمود کو نیست و نابود کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ اقبال کی نظر وں میں وہی لوگ "اشرف المخلوقات" کہلائے جانے کے مستحق ہیں جو اپنی حقیقت اور خودی سے واقف اور اپنے ذاتی جوہر سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔ ؎

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی — خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش! — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اقبال انسان کو اس کے بلند ترین مقام پر دیکھنے کا خواہشمند ہے، مگر اس کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ مقام انتہائی کوشش اور ایثار ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے، اس کے نظریہ میں گویا زندگی ایک بحر ناپیدا کنار ہے جس میں غوطے کھاتے رہنا یا غرق ہو جانا ہی زندگی کا

معراج ہے لیکن اس نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ غوطے لگانا، یا نذر موج ہو جانا "ہم کنار" ہونا یا "بے کنار" ہو جانا بازیچۂ اطفال نہیں ہے، یہ انہیں لوگوں کے کام ہیں جن کے حوصلے بلند، جن کے نظریہ اعلیٰ اور جن کے عقیدے پختہ ہیں، اقبال کے کلام میں بشر مافوق الفطرت قوتوں کا حامل نظر آتا ہے، جس کا رتبہ فرشتوں سے بھی برتر ہے، انسانی عظمت و وقار کو وہ اس طرح پر ظاہر کرتا ہے،

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن　　　تیرا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

یا

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اقبال اس عیش و عشرت کو ہیچ تصور کرتا ہے جو بغیر کسی سعی و کوشش کے میسر آئے جس میں تجسس، کشمکش اور تلخیاں شامل حال نہ ہوں۔ حصول مقصد میں جس قدر بھی مشکلیں پیش آئیں گی اتنا ہی ذوق و شوق بڑھتا جائے گا۔ چنانچہ کہتا ہے،

پشیماں شو، اگر لعلی ز میراث پدر خواہی　　　کجا عیش بروں آوردن لعلی کہ در سنگ است

زندگی کشمکش مسلسل کا نام ہے، ایک لا محدود سمندر ہے جس کا کنارہ نظروں سے اوجھل ہے۔ اقبال، زندگی و عمل کا نقشہ یوں پیش کرتا ہے اور قید و مقام کو تنزل کا باعث تصور کرتا ہے، کہتا،

ساحل افتادہ گفت، گرچہ بسے زیستم　　　ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت　　　ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

اقبال کے تخیلات کی پرواز اس بلندی تک پہنچ گئی ہے کہ وہ موت کو بھی زندگی کا اختتام تصور نہیں کرتا، موت اس کے خیال میں زندگی کا آغاز ہے۔ ایک چیز فنا ہوتی ہے تو دوسری فوراً ہی وجود میں آتی ہے۔ اسی تخیل کو وہ اس طرح پر پیش کرتا ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات، تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود، کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود

اقبال کے خیال میں زندگی کی تلخیاں ہی زندگی کو سنوارتی ہیں، کاہلی اور آرام طلبی ایک ایسا مہلک مرض ہے جو ترقی اور ارتقاء کے لئے پیام موت ہے: اور جس سے قوت عمل معطل ہو جاتی ہے، کہتا ہے۔ ۔

پرسیدم از بلند نگاہے کہ زندگی چیست گفتا، مئی اوکہ تلخ تراست، نکو تراست،

اوالعزمی، بلند خیالی، حوصلہ مندی، تڑپ، طلب ہی ایسی صفات ہیں، جن لوگوں میں یہ ہوتی ہیں وہی حادثات روزگار کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتے ہیں لیکن جو لوگ بزدلانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور نفس کشی کرکے زمانہ کا ساتھ دیتے ہیں وہ حقیقت میں زندہ نہیں، ان کی روح فنا ہو چکی ہے۔ کہتا ہے۔

حدیث بے خبراں ہے۔ تو "با زمانہ بساز"

مگر اقبال کا قول ہے۔ زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز،

اقبال اس بات کا قایل ہے کہ انسان کی فطرت میں قدرت نے غیر معمولی صلاحیتیں اور قابلیتیں ودیعت فرمائی ہیں، اگر انسان ان صلاحیتوں سے نا آشنا ہے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، یا یوں کہا جائے کہ وہ ماحول سے اس قدر متاثر ہے کہ اپنی خودی کو پہچاننے کی صلاحیت کو معطل کر چکا ہے، کہتا ہے،

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!
کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے!!

اقبال انسان کی زندگی کو سمندر بے کنار تصور کرتا ہے اور اس رنگ و بو کی دنیا میں بسنے والوں کو یہ پیام عمل دیتا ہے کہ سمندروں کی پُرشور موجوں کی مانند، پیچ و تاب کھا کھا کر اپنی زندگی میں وہ جوش اور وہ ولولہ پیدا کرو جو آشنا بہ ساحل نہ ہو، ساحل آرام و سکون کا مستقر!! آرام و سکون عمل کے لئے پیام اجل!! کہتا ہے،

تلاطم بحر میں کھو کر سنبھل جا تڑپ جا پیچ کھا کھا کر نکل جا
نہیں ساحل تیری قسمت میں اے موج ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا،

اقبال نے اپنے کلام میں خودی کے بعد عشق کا مقام بھی نمایاں کر دیا ہے، اقبال کے نظریہ میں عشق وہ طلب صادق ہے جس کی انتہائی منزل کو حاصل کرنے کے لئے انسان سرگرداں اور پریشان نظر آتا ہے۔ بغیر عشق صادق کے انسان کی زندگی ہیچ ہے وہ عشق کو انسان کا سچا رہنما تصور کرتا ہے جو کسی حال اپنے طالب کو صراط مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتا، انسان کے قلب میں جب طلب صادق پیدا ہو جاتی ہے تو وہ کٹھن سے کٹھن منزلوں کو بھی طے کرنے مستعد نظر آتا ہے، اسے تلخیوں مصیبتوں سے دوچار ہونے میں لطف آتا ہے اور

اجر سے بے خبر کہ وہ ہم کنار ہو گا یا بے کنار۔ سعی و کوشش میں سرگرداں نظر آتا ہے اور محظوظ و بیخود ہوکر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک   اس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

تپش و انتظار، اور مسلسل کشمکش شہود کے قلب کو گرماتی ہیں اور اس میں آگے بڑھنے کا جوش پیدا کرتی ہیں، عاشق صادق کا مطمح نظر وصال معشوق نہیں ہوتا لیکن اس کے حصول میں نہ بجھنے والی آگ جو وہ اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے، اس کو وہ مشتعل دیکھنا چاہتا ہے مسلسل مشتعل !!! کہتا ہے،

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق   وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

حقیقت بھی یہی ہے، کہ مطلوب کے حاصل ہو جانے سے آرزوئیں اور تمنائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن مطلوب کے حصول میں جو تپش اور انتظار میں جو کیف ہے اس کی لذت وصال سے بالاتر ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ تمنا یہ مقصود جس قدر اعلیٰ ہوگا۔ اسی قدر حصول میں جوش و اخلاص پایا جائے گا وہ اس جوش اور اس ولولہ کو درجہ منتہا پہ دیکھنے کا آرزومند ہے، کہتا ہے۔ ؎

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را   یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

اقبال نے اپنے زور قلم اور غیر معمولی ذہنیت کے ذریعہ انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کی کمزوریوں سے اسے روشناس بھی کیا ہے وہ کہیں زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی تدبیریں پیش کرتا ہے تو کہیں انسان کو اس کے اصلی مقام سے آگاہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ الغرض حقیقت حال یہ ہے کہ اقبال بنی نوع انسان کا سچا ہمدرد ہے۔ اس کا کلام بند و موعظمت سے لبریز ہے اور اس میں زندگی کے اسرار منکشف کئے گئے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ اقبال کا نام سفق دہر پر مہر و ماہ و انجم کی طرح ہمیشہ درخشاں اور تاباں رہے، اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی شمع ہدایت کا کام دے !!

تبدیل پتہ سے دفتر کو اطلاع دیجئے۔

ازدواجی زندگی

یاسمین (کلیہ اناث)

نومبر کے شہاب میں محمدی احمد صاحبہ (نام سے تو صاحبہ ہی معلوم ہوتی ہیں) کا مضمون بعنوان "ازدواجی زندگی" میری نظروں سے گذرا اور ڈسمبر کے ماہنامہ میں سعادت اختر صاحبہ کا تبصرہ بھی۔ سعادت اختر صاحبہ نے محمدی احمد صاحبہ کے مضمون پر صرف تبصرہ کیا ہے لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی یہ بتلانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ازدواجی زندگی کیا ہے؟ ازدواجی زندگی کا موجودہ زمانہ میں کیا مقام ہے اور اس کو ہونا کیا چاہئے؟

ازدواجی زندگی دراصل ایک مقدس بندھن ہے جس میں دو نامعلوم ہستیاں ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ کردی جاتی ہیں۔ ایک کو دوسرے کی رفاقت ہمدردی و مسرت کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے بدنصیب ملک میں تو ہر اچھی تحریک ہر نیک اقدام، نہ صرف برا بلکہ قابل مذموم ثابت ہوتا ہے، ازدواجی زندگی کی غرض و غایت تو ہوتی یہی ہے کہ زندگی سکھ چین سے گذرے، ایک خاندان کا آغاز ہو اور اس طرح انسانی نسل کی بقاء ہو۔ لیکن موجودہ زمانہ میں سوائے بقاء نسل کے اور کوئی فائدہ ازدواجی زندگی کا نظر نہیں آتا۔ مشترکہ خاندان کا رواج تو اب بہت ہی معدوم ہوتا جارہا ہے قربانی، ایثار، اور بے لوث ہمدردی جو مشترکہ خاندان کی بقا کے لئے لازم و ملزوم ہیں وہ تو سرے سے مفقود ہی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ آج کل زوجین میں تک باہمی یگانگت و اتفاق

نہیں، ایک دوسرے پر اعتماد نہیں۔

شوہر کی نگاہوں میں بیویوں کی کوئی وقعت نہیں۔ اس کا درجہ ایک مہذب کنیز کے برابر ہے جس کا کام اپنے آقا کی وقت بے وقت بیجا اطاعت کرنا ہے (معاف کیجئے یہ سارا کیا دھرا ہم عورتوں ہی کا تو ہے نہ ہم ہر وقت ساس کی شکل میں بہو کو نند کے روپ میں بھاوج کو اطاعت کرنے کی تلقین کرتیں اور نہ آج یہ روز بد دیکھنا پڑتا)

بچپن ہی سے ہمارے لڑکے بڑی بوڑھیوں کی زبانی یا قدیم روایتی کہانیوں کی زبانی یہ سنتے چلے آتے ہیں کہ "عورت مکار ہوتی ہے" عورت بیوفا ہوتی ہے، لیکن اس کو آزادی کبھی بھی نہ دینی چاہئے بلکہ جہاں تک ہو سکے اس پر قیود عاید کرنے چاہئیں۔ یہی وہ جاہلانہ نظریئے ہیں جنھوں نے عورت کو اس کے حقیقی مقام سے دور لیجا پھینکا۔ یہی وہ غلامانہ ذہنیت ہے جس نے صدیوں سے اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا اس کی زندگی تباہ و تاراج کر دی۔ ظالم سماج نے عورت کی تربیت کچھ اس طرح کی کہ وہ غلامی ہی میں خوش رہے ان کا داؤں بڑی حد تک کارگر رہا۔ لیکن کبتک؟ قدرت کو ایک نہ ایک وقت مظلوم پر ضرور رحم آتا ہے۔ زمانہ نے ایک نئی کروٹ لی۔ آج ہندوستان کی عورت بیدار ہو چکی ہے۔ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے میں وہ کسی قوم سے پیچھے نہیں ہے، ردعمل میں ہمیشہ شدت پائی جاتی ہے۔ ہماری مثال بعینہ ان مظلوم ہندوستانیوں کی سی ہے جن کی حکومت، جن کے حقوق غصب کر لئے گئے لیکن ایک صدی کی مسلسل و پیہم جد و جہد کے بعد اپنے غاصب شدہ بہت کچھ حقوق ہندوستانیوں نے بالآخر حاصل کر ہی لیا۔ جس طرح آج ہمارے سیاسی و سماجی نظام میں ایک انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ہم عورتوں کی ذہنی زندگی میں بھی ایک نمایاں تغیر ہو چلا ہے۔ آج [illegible] کی کون روشن خیال خاتون یہ تصور تک نہیں کر سکتی کہ وہ ہمیشہ کسی مرد کی غلام بنی رہے کسی کی بے جا و بیجا اطاعت کو اپنا دین و ایمان سمجھے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ایک عبوری دور ہے نازک دور ہے۔ ایسے وقت میں اگر ہم پھر وہی غلامانہ ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عورت کو بے جا بیجا اطاعت کرنے کی تلقین کریں تو ردعمل یقیناً برعکس ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر عورت غریب ہی کو کیوں پند و نصائح کے دفتر سنائے جاتے ہیں؟ اس کی خودداری ہی کیوں گلا گھونٹا جاتا ہے؟ کیوں مرد ہی کو یہ نصیحت

نہیں کی جاتی کہ عورت تمہاری شریک حیات ہے۔ باندی نہیں۔ اس سے صرف وہی خدمات لینے چاہیئے جو اس کے شایان شان ہوں۔ نیز ادنی حکم کی بے جا و بیجا تعمیل کرنا تو مہذب ممالک میں ملازمین کے لئے تک روا نہیں رکھا جاتا۔ چہ جائیکہ بیوی جو نصف بہتر کہلاتی ہے۔ قریب قریب شوہر کے برابر کا درجہ رکھتی ہے۔ ماں کی حیثیت سے تو اس کا درجہ بہت بڑی بلند ہے "جنت تمہاری ماؤں کے قدموں تلے ہے۔ (قرآن کریم) لیکن بیوی کی حیثیت سے بھی وہ ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ "تم ان کا لباس ہو اور وہ (عورتیں) تمہارا لباس ہیں)

ایک اور آیت ہے "دنیا یوں تو ساری کی ساری ایک پونجی ہے لیکن سب سے بہتر پونجی ایک نیک عورت ہے"۔ "عورتیں تمہاری امانت ہیں تم ان پر کسی قسم کا ظلم یا زیادتی نہ کرو، ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ تم ان کے محافظ اور ذمہ دار ٹھیرائے گئے ہو۔ قیامت کے دن تم سے باز پرس ہوگی۔ ان کے بارے میں یہ ہیں قرآن کریم کے احکامات۔ جنہیں آج ہمارے نوجوان سپوتوں نے پس و پشت ڈال رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آئے دن باہمی شکر رنجیاں اور اختلافات نے ایک خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام نے صرف مرد ہی کو ان احکامات کی تلقین کی ہے۔ عورت کو اپنے شوہر کے حقوق کے بارے میں کچھ بھی نہ بتلایا۔ بیشک اسلام نے عورت پر بھی مرد کے چند حقوق واجب کر رکھے ہیں جن میں بنیادی یہ ہیں (۱) شوہر اور اس کے اقرباء کا احترام کرو۔ (۲) پیٹھ پیچھے شوہر کی شکایت نہ کرو کیونکہ غیبت بدترین گناہ ہے اور بہت سی عورتیں قیامت کے دن اس جرم میں گرفتار ہونگی۔ (۳) بیجا ضد اور نافرمانی نہ کرو۔

لیکن ان احکامات سے کیا کہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت مرد کی کنیز ہے؟ اسلام نے جب لونڈی اور غلام کے ساتھ تک مساوات کی تلقین کی تو بیوی کے ساتھ حاکمانہ طرز عمل بے دردانہ سلوک کس طرح ترغیب دے سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں وہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں دے سکتا۔ ہندوؤں میں تو عورت مرد کی لونڈی ہی تصور کی جاتی ہے۔ خواہ بھوک سے جان کیوں نہ نکل جائے لیکن شوہر سے پہلے کھانا کھانے کا مجاز نہیں رکھتی۔ آباء واجداد کے ترکہ میں سے اس کا کوئی

حصہ نہیں - وہ ہر حال میں مرد کی محکوم و مجبور رہے - برعکس اس کے اسلام عورت کو ہر طرح
کی آزادی دیتا ہے - والدین کے ترکہ میں سے چوتھائی کی وہ مستحق ہے - شوہر کی جائداد
سے بھی بہت کچھ اس کو ملتا ہے اور اس کی اپنی کوئی جائداد ہو تو اس کی وہی واحد
مالک و مختار ہے - حتیٰ کہ اس کی شخصیت تک اس کی اپنی نہیں ہوتی - مسلمان عورت
کے مقابلہ میں عیسائی عورت کے حقوق بھی کچھ نہیں - شادی سے پہلے وہ اپنے باپ
کے نام سے اور شادی کے بعد اپنے شوہر کے نام سے موسوم ہوتی ہے - عیسائیت کے
اصولوں کے بموجب تو وہ اپنے شوہر کی ملک ہوتی ہے وہ اگر چاہے تو اسے فروخت
بھی کر سکتا ہے - بہرحال جتنے بھی حقوق آج اسے حاصل ہیں وہ سب مذہب اسلام
ہی سے لیکر اپنائے گئے ہیں - لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جن اصولوں
کی خوبیوں سے متاثر ہوکر اغیار نے اس کو اپنا لیا ہے آج ہم نے انہیں پس و پشت
ڈال کر انواع اقسام کی مصیبتیں اپنے پر نازل کر رکھی ہیں -

موجودہ زمانہ میں ازدواجی زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کا ایک بڑا سبب
یہی ہے کہ ہم اپنے فطری مذہب کے اصولوں سے بالکل بے بہرہ ہیں اور جو تھوڑا بہت واقف
بھی ہیں تو ان پر عمل کرنا ہمیں انتہائی ناگوار گذرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں
مرد عموماً بلاکسی خاص وجہ کے دو دو بلکہ تین تین شادیاں کرتے ہیں لیکن عورت غریب
خواہ وہ کس قدر کم سنی میں بیوہ ہی کیوں نہ ہو، کیا ہندو ودھوا کے مانند عقد ثانی
اس سے حرام ہے - چونکہ ہندوستان میں ایک مطلقہ عورت بری نگاہ سے دیکھی جاتی
ہے - اس لئے ہندوستان کی عورت مرد کے ہر ظلم و ستم کو خاموشی سے برداشت کرتی چلی
آتی ہے، لیکن اب عورت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے - اب عورت بغاوت پر آمادہ ہے
ایسے نازک موقع پر عورت کے ساتھ جابرانہ طرز عمل نہیں بلکہ مخلصانہ طرز عمل ہونا چاہئے
اختلاف مراتب کا زبردست احساس عورت کو ہمیشہ اپنے شوہر سے تک بے تکلف ہونے
سے باز رکھتا ہے - وہ اپنے خیالات، تاثرات کو اپنے شریک زندگی سے تک پوشیدہ رکھتی
ہے کہ ان کے افشا سے شوہر کے مرتبہ کو ٹھیس پہنچے گی اور اس طرح رفتہ رفتہ اس کی خودداری
کا خاتمہ ہوتا ہے اور حساس عورتیں اندر ہی اندر گھل گھل کر ختم ہو جاتی ہیں - ایسے دور
میں جب کہ عورتوں کو اپنی غلامی کا احساس اور اپنے حقوق کا خیال ہو گیا ہو مردوں کو

چاہئے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی کو پُر مسرت بنانے کے لئے عورت کو حقیقی معنوں میں شریک زندگی سمجھیں - اپنے ہر اچھے برے معاملہ میں اس سے مشورہ لیں - اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اس پر بے بنیاد الزام لگانے سے احتراز کریں - (۳) عورت کو بلا وجہ ناقص العقل یا معمولی معمولی باتوں میں مکار بے شرم کہہ کر اس کی دل آزاری نہ کریں - بیوی کا بھی فریضہ ہے کہ (۱) وہ خواہ مخواہ اپنے شوہر کو زیر بار نہ کرے - (۲) بے بنیاد باتوں پر یقین کرکے اس پر بے جا تہمتیں نہ اٹھائے - (۳) معمولی معمولی باتوں پر سکون فضا کو مکدر نہ کرے -

در اصل یہ جھگڑے، یہ اختلافات خیالات کی غیر ہم آہنگی کا نتیجہ ہیں اس لئے والدین کو چاہئے کہ رشتہ کرتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ لڑکے لڑکی کے خیالات آپس میں میل کھاتے ہیں یا نہیں - شادی کے بعد یہ زوجین کا فرض ہے کہ اگر وہ کسی معاملہ میں ایک دوسرے کے ہم خیال نہ بھی ہوں تب بھی وہ ایک دوسرے کو قایل کرنے کی دھن میں اس حد تک نہ الجھیں کہ خود ان کی زندگی ہی ایک الجھن ہو جائے ازدواجی زندگی تو فی الحقیقت وہی ہے کہ ایک کو دوسرے کا احساس ہو - آپس میں اتحاد و یگانگت ہو - ایک دوسرے پر اعتماد کریں -

میاں بیوی کو آپس میں کہیں غلط فہمیوں کا شکار نہ ہونا چاہئے، ورنہ یہی غلط فہمیاں آیندہ بڑے بڑے مصائب کا پیش خیمہ بنتی ہیں - خود غرضی اور غصہ یہی دو بڑے اہم عناصر ہیں جو ازدواجی زندگی کی ناکامی کا باعث ہوتے ہیں - بہن محمد احمد صاحبہ (یقیناً وہ صاحبہ ہی ہوں گی، نام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے) نے عورتوں کو خود غرض ٹھیرایا ہے - حالانکہ یہ بالکل حقیقت کے خلاف ہے - مرد خود غرض ہو سکتا ہے لیکن عورت نہیں - بہن صاحبہ نے معلوم ہوتا ہے عورت ہو کر بھی عورت کی فطرت کا بغور مطالعہ نہیں کیا - حالانکہ مشاہیر عالم اس بات پر متفق ہیں کہ "عورت مرد کی فطرت سے زیادہ بلند ہے" (اگراہم)

"عورت زندگی کی کٹھن منزل کے لئے رہبر کامل ہے۔ (بیکن)

عورت چشم بصیرت رکھنے والوں کے لئے بہترین درس حیات ہے (شکسپیر)

یہ اور اس قسم کے اور بھی بہت سے مقولے ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا خالی از دلچسپی ہوگا

لیکن طوالت کا خوف دامنگیر ہے آئندہ کی اشاعت میں ایک علحدہ عنوان کے تحت شائع کرنا ہی بہتر ہوگا۔

مضمون نگار حضرات اور بالخصوص خواتین کو چاہیئے کہ وہ اس موضوع (ازدواجی زندگی) پر قلم اٹھانے سے قبل اپنے اردگرد کا موجودہ ماحول کا صحیح جائزہ لیں اور جہاں تک ہوسکے ان غلامانہ ذہنیتوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں جو عموماً آپس کی شکر رنجیوں کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک خوشگوار اور کامیاب زندگی کا خاکہ پیش کریں جس کا عمل ہر دو فریق کے لئے باعث اطمینان و مسرت ہو۔

صدائے دل خراش

سفر میں بعض اوقات دلچسپیاں اور بعض وقت تکلیف ہوتی ہے
حال ہی کے ایک سفر میں ذیل کا دردناک خط نہ جانے کیسے کاغذات میں
آگیا ہے پڑھیئے اور اس مسئلہ پر غور کیجئے۔

قدسی منزلت جناب قبلہ گاہی۔

قربانت شوم۔ اب جبکہ میرا وقت قریب ہے اور میں اس دنیا اور اس کی بھلائیوں، برائیوں۔ خوش نصیبیوں۔ بدبختیوں کو الوداع اور موت کا خیر مقدم کرنے والی ہوں۔ ایک شکستہ سازکی چند صدائیں چھوڑ جانا چاہتی ہوں جو آنیوالی نسلوں کے والدین کے لئے سبق آموز ہوں، کاش وہ اس سے سبق لیں۔

اباجان۔ آپ اس دنیا ہری بھری دنیا میں مدتوں رہیں رہ کر سینں مجھ سی بدنصیب بیٹیاں ہوں گی۔ ہو ہو کر رہیں گی۔ رہ رہ کر مریں گی۔ مجھے اس دنیا اور اس کی دلچسپیوں کو دیکھنے کی اب مطلق آرزو باقی نہیں رہی۔ دنیا دیکھ لی اور بہت کچھ دیکھ لی۔ اس دنیا سے جس قدر جلدی جاؤں اسی قدر میرے لئے مفید ہوگا۔

منصف مزاج اباجان۔ غور کیجئے۔ انصاف شرط ہے۔ یکطرفہ فیصلہ نہ کرنا۔ تالی ایک ہاتھ سے

نہیں بجتی - اگر آپ نہ ہوتے تو میں نہ ہوتی جو میں نہ ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا -

للّٰہ بتائیے کہ مدت کے گرسنہ کے سامنے لذیذ کھانوں کا دسترخوان بچھا ہوا ہے وہ نہایت ذوق شوق سے ایک لقمہ لے چکا ہے - دوسرا لینے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ دسترخوان بڑھا دیا گیا - ایک پیاسا کہ شدت پیاس سے جس کی ہونٹوں پر جان ہے اور وہ پانی کے لئے ہر طرف پریشان ہے کہ کہیں ایک کٹورہ پانی ملا - وہ ایک گھونٹ پی چکا ہے - جس کی تشنگی ہل من مزید کی آوازیں لگا رہی ہے - دوسرے گھونٹ کی نوبت ہی نہیں آئی کہ کٹورا ہاتھ سے چھوٹ گیا - فرمائیے کہ اس کی شدت پیاس کا کیا عالم ہوگا ؟

ہائے میری وہ شادی جو میرے حق میں حقیقی بربادی کا باعث بنی مہینہ بھی نہ ہوا تھا کہ میرے ساتھی کے لئے پیغام اجل آگیا وہ اس کی موت نہ تھی بلکہ میری موت تھی وہ تو مرگیا لیکن میں تو جیتے جی مرگئی -

اب کون تھا جو میرے ساتھ ہمدردی کرتا - میرے زخمی دل پر مرہم رکھتا ہر طرف دیکھتی تھی بجز یاس وحسرت کے کچھ دکھائی نہ دیتا - ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ تنہا پنج سالہ زمانہ فراق کی طویل طویل وحشت ناک اندھیری راتیں کس کرب کس بےچینی کس مصیبت کن سختیوں میں کٹا ہوگا -

میں اپنے ساتھ والیوں کو دیکھتی تھی جو میری ہی ہم جنس تھیں آخر ان میں اور مجھ میں فرق ہی کس چیز کا تھا - وہی ہاتھ - وہی پیر - وہی منھ - وہی بال - وہی لباس - وہی بول چال - وہی حسن ، وہی انداز - وہی خواہش - وہی جذبات - لیکن وہ خوش حال اور شادماں اور میں مغموم اور محزون - یہ کیسا بیّن فرق ہے - سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان کے سروں پر تاج شوہری رکھا ہوا ہے - ان کے شمع حسن کا پروانہ فدائیت کا سبق پڑھ رہا ہے اور میرا پروانہ جل گیا - اجڑ گیا - اس کا صدمہ اس قدر جان لیوا اور روح فرسا تھا کہ میں اندرونی طور پر خود بخود گھلنے لگی اور مجھ کو آہستہ آہستہ دیمک چاٹنے لگی - البتہ اس عالم میں خیال ہوا ہوتا تھا کہ وہ شمع جو بجھ چکی ہے اب از سر نو روشن فرمائیں گے - لیکن میں دیکھتی تھی کہ آپ کے جانب سے اوسی قدر مایوسی ہوتی چلی - کیونکہ آپ کو سماج ظالم سماج کا خوف تھا - اب بتائیے کہ اس وسیع دنیا میں میرا کون تھا جو میرے لئے درد سے ہمدردی کرتا - اور میرے زخمی دل پر مرہم رکھتا - میری درخواست آپ پاس اس لئے لائق پذیرائی نہ تھی کہ وہ آپ کے عزت اور قدرت کے شایان شان نہ تھی حالانکہ میری یہ جائز طلب کوئی ناجائز نہ تھی جس کو خدا اور اوس کے رسول نے جائز قرار دی تھی ،

لیکن حقوق کے غاصب۔ راستی اور انصاف کے گلے پر الٹی چھری پھیرنے والے۔ ظالم۔ بے رحم۔ کیوں متاثر ہونے چلے۔ کسی کی جان جاتی ہے بلا سے۔ ہمیں تو اپنے کام سے کام ہے۔

میں بھی تو آخر انسان تھی۔ دل تھا۔ میری رگوں میں بھی خون رواں تھا۔ جذبات مجھے بھی تو ابھارتے تھے۔ میرے منہ میں بھی زبان تھی۔ صبر کہاں تک۔ ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے۔

جا بھی کوئی ستم کی آخر بشر ہیں ہم بھی کب تک سہا کریں گے ہر شئی کی انتہا ہے

ابا جان مساوات کے۔ ذرا ابا جان آپ ہی بتا دیجئے یہی انصاف اور یہی مساوات تھا۔ خود کھائیں دوسروں کو نہ کھلائیں۔ آپ اچھے سے اچھے کپڑے پہنیں دوسروں کو نہ پہنائیں ہم کیونکر اندازہ کریں کہ آپ کے دل میں رحم۔ نیکی۔ انسانیت۔ ہمدردی کا مادہ ہے آپ پھر کس مورت پر آزادی کے طلب گار ہیں جب کہ اپنی ماں۔ بہنوں۔ بیٹیوں کو غلامی سے آزادی نہیں دیسکتے وہ کیا انصاف کریں گے جو خود منصف نہیں۔ ہم کمزور ذات ہیں، نقار خانہ میں طوطی کی آواز کہاں پہنچتی ہے۔ یہ کیسی منطق اور یہ کیسا نرالا قانون ہے کہ کسی شخص کی بی بی مرجائے تو جتنی دفعہ وہ عقد کرے جائز، اگر اتفاق سے کسی عورت کا شوہر مرجائے تو وہ ہمیشہ بیوگی کا تلخ زمانہ کاٹنے پر مجبور کی جائے!!

جن لوگوں کے دلوں میں جیتا جاگتا دل ہے وہ اس پر ہاتھ رکھکر بتائیں کہ جب تمہاری بی بی مرجاتی ہے تو گوشہ تنہائی کیوں نہیں اختیار کرلی جاتی۔ عیش وعشرت سے نفرت کیوں نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ تمہیں عیش وتنعم کا شوق رہتا ہے اور ہمیں مصیبتوں میں چھوڑ دیتے ہو۔ کیا یہی تمہارا انصاف ہے؟

ابا جان۔ پیارے ابا جان۔ اطاعت گزار۔ فرماں بردار۔ آپ کے احکامات پر پتلی صفت پھرنے والی۔ بدنصیب۔ بیکس۔ لاچار۔ بیٹی کو جو عدول حکمی کو گناہ عظیم۔ عتاب کو فرمان موت سمجھنے والی کو کیا اس کا بھی حق نہیں جو ذرا بھی یہ پوچھے کہ یہ جبر وتشدد۔ اور یہ سزا وجزا کس جرم کے پاداش میں۔ کیا حقوق پدری سے اس کی بھی توقع نہ رکھے۔

ممبر پر کھڑے ہوکر عصمت وپارسائی کا موثر الفاظ میں واعظ کرنے والے واعظ۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھکر حقوق ومساوات کا فیصلہ کرنے والے منصف۔ مرض لاعلاج کی تشخیص کرنے والے نباض طبیب۔ دنیا اور اس کی دلچسپیوں پر فریفتہ نہ ہونے کی تلقین کرنے والے زاہد۔ آپ ہی بتا ئیں کہ ہمارے لئے یہ تمہارا کیسا ناطق فیصلہ اور کیسا انصاف ہے۔

کہ آج ایک کمزور معصوم - مظلوم - فرتو پٹ رہا ہے - مر رہا ہے ، اور اہل دانش وبنیش کھڑے ہوئے اُس کی حالت زار کا تماشہ دیکھ رہے ہیں وہ خاموش کیوں ہیں اور وہ ہمدردی اور خیر خواہی کہاں گئی ؟ کیا یہ سب دکھاوا ہی دکھاوا تھا !!

جاؤ کبھی گور غریباں کی سیر کرو - آنکھیں ہوں تو دیکھو کہ اون کی ٹوٹی پھوٹی قبریں اور اوس کی بوسیدہ ہڈیاں لب گور سے تمہیں ایسی پر درد داستان سنائیں گی کہ وہ ہمیشہ تم پر بھروسہ کرنے والی ثابت ہوں گی - لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے بدلے تم لے او نہیں کیا دیا ؟؟

ابا جان میرے آخری وقت کے ابا جان - آپ دنیا میں شاد بامراد رہیں ، ان کی مظلوم اور دکھی بیٹی کی رام کہانی جو آپ کے عیش کو تلخ بنا رہی ہے قریب الختم ہے - اب وہ کانٹا تلووں سے دور ہو رہا ہے خلش جائیگی - طبیعت کو چین آجائیگا - آہ زندگی ایک خواب غفلت - اوس کی دلچسپیاں - نظر فریب - آرزو وتمنا ؤں کا بندہ فریب خوردہ جذبات اور خواہشات کا شیدا منفعل وشرمندہ - کامیابی اور شادمانی کا طالب اندھا

لیجئے حکم قضا شیم پہنچ چکا ہے - البتہ یہ چند الفاظ ہیں جو میں چھوڑ جا رہی ہوں جو شکستہ دل کی ایک صدائے دل خراش ہے :-

او تسلیم ہستی کی بستی پر نازاں - او مٹی اور پانی کی بنی ہوئی صورت تو - او کافور کی من موہنی مورت تو - اپنی بے زبان زندگی کے شریک جائز - عزیز اولاد کو جس کو تم نے خون جگر دے دے کر سینچا ہے اون پر رحم کرو - زیادہ نہیں - بس - عقد ثانی -

---

اسلام کا پہلا مدرسہ

بیہقیہ ہے جو نیشا پور میں تعمیر ہوا ، امام الحرمین (امام غزالی کے استاد) نے اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی لیکن عام شہرت ہے کہ دنیائے اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ بغداد کا نظامیہ تھا چنانچہ ابن خلطان نے بھی یہی دعویٰ کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فخر بغداد کے نیشاپور کو حاصل ہے بغداد کا نظامیہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا کہ نیشاپور میں بڑے بڑے دار العلوم قایم ہو چکے تھے جن میں ایک بیہقیہ اور دوسرا سعدیہ تیسرا نصریہ ہے جس کو سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے قایم کیا تھا اس کے سوا اور بھی مدرسے تھے جن کا سرتاج نظامیہ نیشاپور تھا - امام الحرمین اسی مدرسہ کے مدرس اعظم تھے -

یاد رکھئے

راحیل

۱۔ دوست کو زبردستی کسی فعل پر مجبور کرنا حماقت ہے۔

۲۔ ایک انسان کے بہت سے دوست ہوتے ہیں۔ آپس میں رشک نہ کیجئے۔ اگر کوئی تیسرا دوست ملتا ہے تو اس میں جلن اور حسد کیوں؟ وسیع الخیال بننے کی کوشش کیجئے۔

۳۔ انسانی زندگی کو منٹوں میں شمار کیجئے۔ گھنٹوں کی بھی تو نہیں ہیں یہ ناپائیدار و مستعار گھڑیاں!

۴۔ زندہ اس طرح رہنے کی ضرورت ہے کہ مرنے کے بعد کوئی تو کبھی کبھی یاد کرلے۔

۵۔ زبردستی اور جبر سے ان دونوں کو زندگی میں کبھی آنے نہ دو۔

۶۔ جنگ میں صلح کا خیال بڑی بزدلی ہے۔ یا تو انسان لڑے نہیں۔ لڑے تو پھر ایسا لڑے کہ دشمن بھی پناہ مانگیں۔

۷۔ ساری زندگی یا ایک "ہاں" ہے یا ایک "نہیں" — ! پتہ نہیں کیا ہے۔ مگر ہے کچھ ضرور۔

۸۔ بندگی کی نیازمندی میں بھی خدائی کی سی بے نیازی پیدا کرو۔

۹۔ "شادی تو ایک بیڑی ہے۔ وہ پھولوں کی ہی کیوں نہ ہو۔ نہیں۔ شاید یہ زندگی کا وہ میوہ ہے جسے کھا کے بھی پچھتانا ہے۔ نہ کھا کے بھی پچھتانا ہے"

۱۰۔ انسان کے لئے دنیا میں سب سے ضروری چیز پاس انسان ہے۔ خلق کی ہر ممکنہ مدد ہے۔ غریبوں کی دستگیری ہے۔ کس مپرسوں کی خبرگیری ہے۔ اور غالباً دنیا میں انسان اسی لئے بھیجا گیا ہے۔

3238
REGD. M.N.D

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

محمود یہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرپور سے شائع ہوا

ماہوار

شہاب

حیدرآباد دکن

شہاب

مرتبہ

قیمت ماہانہ (۸/)

محمد عبد الرزاق بسمل

جلد (۱۶) آذر ۱۳۵۰ف م اکتوبر ۱۹۴۷ء نمبر (۱)

سخن ہائے گفتنی

صحافت کی دنیا میں سالناموں کا رواج عام ہے چونکہ شہاب اپنی ۱۵ سالہ زندگی ختم کر کے سولہواں نمبر پیش کر رہا ہے اس لئے اب کی دفعہ اس بدعت کی نیت کی تھی کہ آذر ۱۳۵۵ف ایک علمی نمبر ہو چنانچہ اپنے ملک کے تخمیناً ۲۵ پی۔ ایچ۔ ڈی حضرات کی خدمت میں تین مہینے پہلے درخواست کی گئی تھی وہ مضامین اور بلاک اگر ہوں تو قلمی اعانت کریں اور یہ خواہش تھی کہ ۵ر آبان تک اپنے ارادے سے اطلاع دیں۔

مگر آپ تعجب نہ کیجئے کہ الا پروفیسر سعید الدین صاحب کے جنہوں نے مضمون اور بلاک بھجوایا۔ سبھوں نے اس کو اچھا سمجھا کہ جواب کی زحمت ہی کیوں کی جائے۔ البتہ ڈاکٹر زور نے تکرر یاد دہی، ڈاکٹر قاری کلیم اللہ نے وعدہ کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے تاخیر سے مضمون بھجوایا، ڈاکٹر حسین علیخاں نے معذرت چاہی۔

یہ ہے ہمارا ملک جہاں شاندار یونیورسٹی قائم ہے اور ہمیں ناز ہے اردو کے نشر و اشاعت پر۔ وہاں اہل علم کی یہ سرفرازیاں اتنی ہمت شکن ہوں تو پھر ایسی بدعت سے توبہ ہی بھلی۔ ہم آج سے ایک عرصہ پہلے اس کو محسوس کر چکے تھے اور اسی اندیشہ کے بارے سالنامہ کی بدعت سے بھاگتے ہی رہے مگر بعض علم دوست کے اصرار پر یہ بھی کر دیکھا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ہاں نثر میں خواجہ عباد اللہ صاحب اختر بی۔ اے، جناب عطارد صاحب، جناب ابرار حسین صاحب ایم۔ اے اور محترمہ جہاں بانو صاحبہ ایم۔ اے، شفیق بانو صاحبہ یاسین صاحبہ اور اختر محمود صاحبہ کے چنگے مضامین نے شہاب کی بڑی اعانت کی ہے۔ اور جناب مسلم اور جناب عرشی بھوپالی نے غزلوں سے بزم سخن کو چمکایا۔ اور یہی اعانتیں کافی ہیں۔

دیکھئے سولہواں سال کن امیدوں اور تمناؤں کا حامل ہوتا ہے۔

صنعتوں میں پودوں کی اہمیت

جناب پروفیسر محمد سعید الدین۔ ایم اے بی ایس سی
ایف، آر ایم ایس، ایف ایل ایس صدر شعبہ جامعہ عثمانیہ

عصری صنعتوں میں نباتات کے مختلف شعبوں کی جو اہمیت ہے اس پر انڈین سائنس کانگریس کے پچھلے اجلاس (جنوری ۱۹۴۷ء) میں غور و خوض کیا گیا اور ماہرین نے مقالے پڑھے تھے۔ مجھ سے یہی خواہش کی گئی کہ میں نظامی نباتات کی ان صنعتوں میں جو اہمیت ہے اس پر روشنی ڈالوں۔ جناب مدیر صاحب ماہنامہ شہاب کی خواہش کی تکمیل میں یہ مختصر مضمون پیش کیا جارہا ہے۔

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں نظامی نباتات کی توضیح ضروری سمجھتا ہوں۔ نباتات کا یہ شعبہ پودوں کی شناخت اور انکی درجہ بندی سے متعلق ہے۔ درجہ بندی میں پودوں کی خصوصیات اور انکے آپس کے تعلقات نیز ماحول سے ان کے گوناگوں توافقات وغیرہ کا غائر مطالعہ کیا جاتا اور انہیں ایک قدرتی سلسلے میں ترتیب دیا جاتا ہے۔

صنعتوں کے نشو و نما میں ماہرین نباتات کی خدمات سے اس حد تک استفادہ نہیں کیا گیا ہے جتنا کہ ماہرین طبیعات اور کیمیا کی خدمات سے۔ یہ ہندوستان کی حد تک مخصوصاً صحیح ہے۔ اب یہ احساس روز بروز ترقی کرتا جارہا ہے کہ سائنس کیمیا و طبیعات ہی کا ٹھیکہ نہیں ہے بلکہ حیاتیاتی سائنسوں نے جو نسبتاً کم قدیم ہیں انسان کی فلاح و بہبودی میں ایک اہم حصہ لیا ہے۔ لہذا یہ قدرتی بات ہے کہ حیاتیات اور بالخصوص نباتات کا بھی عصری صنعتوں کی ترقی میں اس کا جائزہ ہونا چاہیے۔

صنعتوں میں نباتات کی جو اہمیت ہے اس کا ایک سرسری خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد چند پودوں کا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔ حسب ذیل صنعتیں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ چوبی صنعت۔ (۲) کاغذ اور گودے کی صنعت۔ (۳) دباغت کی صنعت (۴) رنگ سازی۔ (۵) تیلوں کی صنعت بشمول عطریات وغیرہ (۶) ریشے کی صنعت (۷) گوند

اچھا رنگا جاتا ہے۔ میں اس مفید درخت کو ہر ایک باغ میں لگانے کی سفارش کرتا ہوں

ب۔ پودے جن سے سرخ رنگ حاصل ہوتا ہے۔

۱۔ کرڈڑ Safflower ،۔ جس کے پھولوں سے سرخ رنگ اور بیجوں سے تیل نکالنے کے لئے بکثرت اگاتے ہیں۔

۲۔ خیر یا کتھے کا درخت۔ اس کی اندرونی چوب کو چونے کے ساتھ ابالتے ہیں جس سے ایک مدھم سرخ رنگ حاصل ہوتا ہے۔ اگر اس میں تانبے کے نمک ملائے جائیں تو رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ کپڑا چھاپنے میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ آل Morinda citrifolia ،۔ اس کی جڑ کی چھال سے رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔ کسی ذیلی رنگ اور پھٹکڑی وغیرہ ملانے سے کپڑا حسب خواہش گہرا یا ہلکا سرخ رنگا جا سکتا ہے۔

۴۔ دھان پھل۔ اس کے پھولوں سے سرخ رنگ حاصل ہوتا ہے جس سے سوتی کپڑا گلابی رنگا جا سکتا ہے۔ دوسرے رنگ بھی ملائے جاتے ہیں۔

ج۔ نیل، اندرجو اور آل کی جنس کے پودے سے نیلا رنگ تیار کیا جاتا ہے۔

د۔ سیتا پھل اور ہلدی کے پودے سے گہرا سبز رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔

ھ۔ بلادہ کے پھل کے غلاف سے سیاہ رنگ اور کے پھل کے پوست سے خاکی رنگ حاصل ہوتا ہے جس میں لوہے کے نمک ملا کر سوتی کپڑے کو حسب خواہش رنگا جاتا ہے۔

۵۔ تیل اور عطریات کی صنعت۔

ہم سب چند اہم پودوں سے واقف ہیں جن سے تیل حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بہت سوں کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ کس جانب وہ صنعتوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق مختصراً بیان کیا جائیگا۔

الف۔ نباتی شحمیات

۱۔ جنگلی اخروٹ۔ Candle nut (Tree) ۔ اس درخت کے پھل سے تیل نکالا جاتا ہے جس کو لکونا۔ (Kekuna) بھی کہتے ہیں۔

۲۔ مہوہ کی قسم کے پودوں کو Indian butter trees کہتے ہیں۔

مہوہ کا تیل موم بتی کی صنعت میں بہت استعمال کیا جاتا ہے۔ اور بہت اچھا بنتا ہوتا ہے۔

۳۔ جنگلی بادام Canarium commune کا تیل کھوپرے کے تیل کے مشابہ ہوتا ہے۔

۴۔ پوشر ونگالی Carapa moluccensis سے ایک ٹھوس تیل حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ کوکم (ہندی) Garcinia Indica۔ اور دوسری نوع سے Garcinia Morella سے سکو جیسا ٹھوس تیل حاصل ہوتا ہے

۶۔ کھوپرے کے تیل سے ہم سب بخوبی واقف ہیں

۷۔ رھس کی انواع Rhus spp سے نیپال میں موم نکالا جاتا ہے۔

۸۔ چین کے ایک درخت The tallow Tree of China سے موم حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس درخت کو زیادہ اگا کر موم نکالا جا سکتا اور موم بتی کی صنعت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے درختوں سے بھی تیل یا موم حاصل کرنے کے امکانات ہیں۔ ان پر تحقیقات جاری ہیں۔

ب۔ مائعی روغنیات

خشک ہونے والا روغن		خشک نہ ہونے والے روغن	
۱۔ السی	۱۔ تلاکرٹا (ترنگی)	۱۔ سرسوں	۱۔ کالادانہ
۲۔ اخروٹ		۲۔ تل	
۳۔ گانجا		۳۔ مونگ پھلی	
۴۔ خشخاش		۴۔ کھوپرا	
۵۔ کدو		۵۔ جنگلی بادام	
۶۔ سورج مکھی		۶۔ چینی بادام	
۷۔ تمباکو		۷۔ سفید دار	
۸۔ اڑندی		۸۔ کرنج	
۹۔ کپاس کی انواع وغیرہ		۹۔ جمال گوٹا	

عطریات۔ واٹ Walt نے اپنے لغت Dictionary of the Economic product of India۔ میں عطریات کے متعلق خوب کہا ہے کہ مشرق میں صنعت کا کوئی شعبہ جو خالص تعشیات کی فراہمی سے متعلق ہے۔ اس قدر اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ عطریات کا ہے۔ اس نے تقریبا ۲۰۰ پودے بیان کئے ہیں جن سے عطر تیار کیا جا سکتا ہے۔ عام عطریات سے ہم سب بخوبی واقف ہیں لیکن بعض بدیسی پودے جو ہندوستان میں اچھی طرح بس گئے اور خوب پھلتے پھولتے ہیں ان سے عطر تیار کیا جا سکتا ہے وہ ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔

۶۔ ریشے کی صنعت۔

چند مشہور پودے جن کے مختلف حصوں سے کارآمد ریشے حاصل کئے جاتے اور صنعت میں عام طور پر استعمال کئے حسب ذیل ہیں۔ کپاس درروئی، انباڑہ Bombay or Deccan Hemp۔ لال انباڑہ Rozelle Hemp۔ سن Sunn Hemp۔ گانجے کا پودا Indian Hemp۔ پات اور بان یا Jute۔ ریشمی روئی وغیرہ۔ ناریل اور تاڑ کی قسم کے پودوں Palms۔ نیز ساگر مٹھے کی قسم کے پودوں Agaves۔ سے جو ریشہ نکلتا ہے معمولی ضروریات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

۷۔ گوند اور رال کی صنعت۔

چند اہم پودے جن سے گوند اور رال حاصل کئے جاتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں ببول (کیکر)، کتھے یا خیر کا درخت، ارنجی، اقاقیہ کی ایک دوسری نوع، بکلا، گوگل، کالا دار، کمبی، ڈیکا مالی، لوبان، بیجا سال Indian kino tree۔ گوہو، سال، Win، سفید دار، چیرونجی

۸۔ پودوں کے دودھ Latex کی صنعت

ربر کی صنعت میں جن پودوں کا دودھ استعمال کیا جاتا ہے مشہور ہیں مثلاً لینڈ ولفیا، Landolphia۔ دلوبیا، Willoughbeia۔ کیسٹیلویا Castilloa۔ فائیکس Ficus۔ اسی جنس سے انجیر، گولر، پیپل اور ربڑ تعلق رکھتے ہیں) ۔ ہیویا Hevea۔ اور منیھاٹ Manihot۔

دسکر کنداہندی)۔ مجھے افسوس ہے کہ ان پودوں کے اردو یا ہندی نام نہیں ہیں ۔اس لئے لاطینی ناموں پر اکتفا کرنا پڑا ۔دوران جنگ میں ایک خودرو بیل کرسپٹو اسٹیجا۔ Cryptostegia کو جس سے دودھ نکلتا ہے ٹراونکور میں وسیع پیمانہ پر اگایا جاکر ربر تیار کیا جارہا تھا ۔

۹۔ جڑی بوٹیوں (ادویہ) کی صنعت

ہمارے وسیع ملک میں طبی اہمیت رکھنے والے پودوں کی کمی نہیں ہے اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے کہ ان پودوں کی فہرست دیجا سکے جو یونانی طب وغیرہ میں استعمال کے جاتے ہیں۔اب جڑی بوٹیوں سے انگریزی طب میں خاطر خواہ کام لیا جارہا ہے۔ چنانچہ کلکتہ میں بنگال کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل کمپنی جڑی بوٹیوں سے بہت اچھی ادویہ تیار کررہی ہے۔ ہماری جڑی بوٹیوں سے متعلق وسیع تحقیقات کی ضرورت ہے ۔ اس ضمن میں کرنل چوپڑا کا نام نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے کلکتہ کے ٹراپیکل اسکول آف میڈیسن اینڈ ہائجین کے ناظم کی حیثیت سے ہندوستانی جڑی بوٹیوں پر قابل قدر تحقیقات کی ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں جڑی بوٹیوں کے تحقیقاتی مراکز قائم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ طبی اہمیت رکھنے والے پودوں کو وسیع پیمانہ پر اگاکر دواخانہ کی ضروریات بھی پوری کیجا سکتی ہیں۔ اس سے دواخانوں کو اصلی جڑی بوٹیاں بھی فراہم کی جاسکتی ہیں کیونکہ بازاری بوٹیوں میں بہت کچھ آمیزش رہتی ہے

تیل کے چشمے حاصل کرنے میں کوشاں ہیں ۔ مگر اب قوت حاصل کرنے کے انقلاب انگیز اور
سستے طریقوں پر وسیع تحقیقاتیں ہو رہی ہیں ۔ یہہ قوت کا بالکل سستا ماخذ سورج کی شعاعیں
ہیں ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صحرائے پر جو سورج کی شعاعوں سے ایک دن میں قوت پہنچتی
ہے وہ چھ سو (۶۰۰) کروڑ ٹن کوئلہ جلانے کے مساوی ہے اور دنیا کی سطح پر ایک منٹ
میں سورج کی شعاعوں سے اتنی قوت پہنچتی ہے کہ اگر اس کے حاصل کرنے کا موزوں
طریقہ معلوم ہو جائے تو دنیا کی تمام ضروریات کے لیے یہہ قوت ایک سال تک استعمال
کی جا سکے گی ۔

۳ ۔ پرتگال اور ہسپانیہ کی عورتیں حسن کی افزائش کے لئے ایک خاص قسم کی مٹی
استعمال کرتی ہیں جسکا نام (بیوکارو) ہے ۔ مٹی کو مزہ دار بنانے کے لئے اس میں کالی مرچ
کالی مرچ بھی شریک کر لی جاتی ہے ۔ سترھویں صدی میں اس کے استعمال کی وبا اتنی
عام ہو گئی تھی کہ اس کو قانوناً روکنا پڑا ۔ مگر اب اس مٹی کا استعمال تقریباً مفقود ہے ۔

۴ ۔ انگریزی زبان کے ۲۶ حرفوں کو
۶۲۰، ۴۴۸، ۴۰۱، ۷۳۳، ۲۳۹، ۴۳۹، ۳۰۰، ۰۰۰ مختلف طریقوں سے لکھا جا سکتا ہے

۵ ۔ دنیا کے مشہور فوجی جرنیلوں کی زندگی میں مطابقت
ڈیوک آف ولنگٹن اور نپولین کی پیدائش ایک ہی سال یعنی ۱۷۶۹ء میں ہوئی ۔
دونوں کی پیدائش ایک جزیرہ پر ہوئی ۔ دونوں کی فوجی تربیت فرانس کی فوجی اکیڈمی میں ہوئی
تقریباً ایک ہی دن دونوں کو لفٹننٹ کرنل کا عہدہ ملا ۔
دونوں اچھے ریاضی داں تھے ۔
دونوں مشہور فوجی لیڈر ہوئے اور ان کی کمان میں بڑی فوج تھی مگر جنگ واٹرلو
میں ایک فاتح ہوا اور دوسرا مفتوح ۔

۶ ۔ بے تار برقی اور ریڈیو کی ایجاد میں اطالوی سائنس داں مارکونی کا نام مشہور
ہے یہہ صحیح نہیں ہے اس کام کی ابتدا کلرک میکسول کے ریاضی مسائل سے ہوئی
جس کی تجرباتی تصدیق ہرٹز نے کی اور خاص طور سے ہرٹز کا نام بے تار برقی کی ایجاد
میں نمایاں ہے ۔ اس کے علاوہ فیراڈے ، ہنری اور آلیور لاج نے بھی اس میدان میں
کامیاب تحقیقاتیں کیں ۔ مارکونی کی ایجاد سے چودہ سال قبل ممالک متحدہ امریکہ میں تحقیق

کالج کے پروفیسر ڈالبیر کو بھی بے تار برقی کی ایجاد کا پٹینٹ دیا گیا تھا۔ مارکونی نے بے تار برقی کے لئے ایسے آلے ایجاد کئے کہ تجارتی طور پر یہ کامیاب ہوا۔

۷۔ آجکل کی حیرت انگیز جراثیم کش ڈی، ڈی ٹی کو پہلے پہل ۱۸۷۴ء میں سوئزرلینڈ میں تالیفاً تیار کیا گیا تھا مگر صرف چھ سال قبل ہی اس کے جراثیم کش ہونے کا پتہ چلا اور ممالک متحدہ امریکہ میں ۱۹۴۲ء میں اس کے موثر ہونے کا پہلا تجربہ کیا گیا۔

جواب استفسار

بابتہ ماہ آبان ۱۳۵۶ھ ف

۱۔ کسی تحریر کا ترجمہ کیا جائے تو لفظ "ٹرافک" کا ترجمہ آمدورفت سے کیا جائے گا اس سے بہتر دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا "آمد و شد" قطعاً بے محل ہوگا ورنہ اصل یہ ہے کہ عام لوگوں اور مسافروں کے مال بنڈیوں موٹروں وغیرہ کی جہاں کہیں گفتگو ہو اس کو انگریزی میں ٹرافک اور اردو میں "آمدورفت" ہی سے تعبیر کریں گے۔

۲۔ آمدورفت اور آمدوشد دونوں صحیح دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی آنا جانا مصدر نہیں بلکہ آنے جانے کا عمل بضرورت شعر ہے "رفت و آمد بھی کہتے ہیں۔ آپ کے دوست "آمدشد" صحیح اور "آمدورفت" اہل ایران کا محاورہ نہیں ہوتا بتلاتے ہیں ان کو اس شعر کے بعد غالباً اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ ملا شہیدی ہی کا ایک شعر لکھتا ہوں ضرورت ہو تو اور بھی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔

زرفت و آمد غم ہائے بے مسقت خبردارم۔ صدا آید بگوشم چوں درد ل باز میگردد

اس کے بعد تو اعتراض کا موقعہ نہ رہے گا۔

عطارد

خودکشی

جناب سید امتیاز علی صاحب

اب تو بیٹا گزر گئیں صبر کر دلہن - آخر اپنا جیرا ہلکان کر کے کیا ملے ۔
دیکھو آنکھیں سوج گئی ہیں اور اب بھی روے چلی جاتی ہو - چار دن کی زندگی ہے
بیٹا - دکھ سکھ سب کٹ جاتے ہیں اور جس بھگوان نے دکھ دیا ہے وہی سکھ بھی دے گا -
نہیں - جی جی ، مجھ سے کچھ نہ کہو میرے بلئے دنیا میں کیا رکھا ہے - تم کہتی ہو سکھ لیکن میں
نہ مانوں گی - اس دنیا میں سکھ کہاں - سنسار کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالو سکھ و چین کا نام بھی نہ
ملے گا - آخر مجھے بھی تو لوگ سکھی کہا کرتے تھے - صرف اس وجہ سے کہ بھگوان کا دیا سب
کچھ موجود تھا - گھر میں چہل پہل رہتی جو آتا ہنستا جاتا اور وہ آتے تو مسکراتے ہوے ـــــ
ان کا ہنس مکھ چہرا دیکھ کر میرا دل رونے لگتا -

سو بچی ہنسی غم کا پیش خیمہ ہے - ہمارا ساتھ جلد ہی چھوٹ جائے گا -
جب ایک دن میں نے ان سے کہا کہ اچھا بتاؤ میرے مرنے کے بعد تم مجھے یاد کرو گے
تو کہنے لگے " یہ کیا سوچا کرتی ہو سوشیلا " گھبراؤ نہیں پہلے میں جاؤں گا پھر تم - کیا جانتی
تھی کہ وہ نہیں موت کا فرشتہ بول رہا ہے - بس اسی سال شہر میں طاعون پڑا پہلے مجھے
بخار چڑھا - میری جب آنکھ کھلتی دیکھتی وہ سرہانے بیٹھے ہوئے ہیں - میں لاکھ کہتی ذرا
آرام کر لو پھر بھی وہ آنکھ نہ جھپکاتے -

چار رات متواتر جگتے رہے اور جب میں اچھی ہوئی تو ان کا بدن جل رہا تھا ـــــ
میں نے کہا " ڈاکٹر بلاؤں " کہنے لگے " نہیں " تمہارے سے بخار آگیا ہے پریشان نہ ہو صبح
تک اتر جائے گا -

رات کو بخار تیز ہو گیا " پانی پانی " چلانے لگے ، پانی لے گئی پی کر کہنے لگے سوشیلا -
میرے گلٹی نکل آئی ہے صبح تک شائد رہوں لیکن میرے بعد رونا نہیں میری آتما دکھی ہوگی
اور تمہارے آنسو اسے بیکنٹھ میں بھی چین نہ لینے دیں گے ادھر بال بچوں کا خیال ہے

- - - - - - - - - - - - - - -

بس وہ خاموش ہو گئے لاکھ جھنجھوڑا نہ بولے مجھے سکتہ ہو گیا نہ میں روئی نہ چلائی۔۔ خاموش بت بنی انھیں گھور گھور کر دیکھتی رہی ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا! گویا وہ ابھی — سو رہے ہیں —

" یہ سوچ سوچ تم اپنا غم اور بڑھاتی ہو ۔ بھول جاؤ سنسار دھوکا ہے ۔ سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں "

کیسے بھولوں کہاں تک بھولوں " رجی جی " یہ بات بھی بھولنے کی ہے ۔ جائداد تباہ ہوئی ، لڑکا پاگل ہوا اسے میں نے برداشت کیا اور کچھ نہ بولی ۔ سمجھی تقدیر کے کھیل ہیں ۔

یہی دو لڑکیاں تھیں ان کو لڑکوں کی طرح پالا ، اس فکر میں لگی رہتی کہ انھیں تکلیف نہ ہو کہیں دوسرے بچوں کو دیکھ کر بھڑکیں نہ اور زندہ بھی رہی تو ان ہی کے لیے ۔ میں نہ ہوتی تو ان کے آرام کا خیال کون رکھتا ۔؟ لیکن جب پھلنے پھولنے کے دن آئے تو تمہیں معلوم ہی ہے کیا ہوا ۔

کیا عین بہار ہی کے دن موت آنا تھا ؟ اور سنو " رجی جی " جب کملا نمونیا کا شکار ہو گئی تب بھی تم لوگوں نے کہا تھا " صبر کرو ، ابھی بملا تو ہے ۔ اب بملا بھی نہیں وہی تو میری زندگی کا آخری سہارا تھی ۔ افسوس بیچاری کی تیمارداری بھی تو نہ کر سکی ۔ گھبرائی ہوئی جب اس کے یہاں پہنچی اس نے میری صورت دیکھتے ہی ہنس ہنس کر باتیں کیں اور بالکل گماں ہی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ بیمار ہے ۔ بس یکایک درد نے زور کیا اور بڑھتا گیا ۔ آدھ گھنٹے بعد ہاتھ پیر میں اینٹھن ہو رہی تھی اور اب جو ڈاکٹر آیا تو اپنا ہی منہ دیکھتا رہا اور پھر باہر چلا گیا ۔ جاتے وقت اس نے آہستہ سے کہا ۔ " بابا ہم کچھ نہیں کر سکتا " اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک بملا کے ہوش وحواس قائم رہے اور اس نے کہا ۔ " ماتا جی میرا کہا سنا معاف کر دو میں تمھاری کوئی خدمت نہ کر سکی " پھر کچھ نہ بولی —— اس کا سندر چہرہ گلاب کی طرح کھل رہا تھا لیکن کیا معلوم تھا کہ وہ گلاب کی زندگی ہی لے کر آئی تھی ۔

موت سب کے لیے ہے بہن کوئی آگے تو کوئی پیچھے ۔ پھر اس کی چنتا کیا آج بملا نہ مرتی تو کل مرتی ۔ اچھا اب نہ روؤ آدھی رات آچکی اب سو جاؤ " " اچھا " ——

یہ کہکر اٹھی۔ بملا کا بکس کھول کر اس کے کپڑے دیکھنے لگی۔ بعض کو سینہ سے لگا لیا اور پھر آہ سرد کے بعد علیحدہ کر دیا۔ اب وہ ایسی زندگی کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی جس میں دکھ ہی دکھ ہو۔ حسرت و یاس کی نظر اس نے ہر طرف دوڑائی کچھ دیر تک خاموش سوچتی رہی پھر ایک سفید سی چیز اس نے منہ کے طرف بڑھانا چاہا۔ پہلے جھجکی لیکن کچھ توقف کے بعد سفوف منہ میں رکھ لیا اور سو گئی۔

وہ سوتی رہی صبح ہو گئی اور پھر دوپہر۔ سورج کی کرنوں نے جھروکے سے جھانکنا شروع کیا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھا بلکہ وہ زندگی پر ہنستی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اس کی روح سکون و طمانیت کی فضا میں اڑ رہی تھی۔

غزل

جناب مُسلم

پرتوے حسن تو در مادشے نیست کہ نیست　　ہوسِ عشق تو در بادہ کشے نیست کہ نیست

رعبِ حسن تو گلوگیر شکایت گردید　　ورنہ ایں جا ز ستم نالہ کشے نیست کہ نیست

غفلت آموز بود چشمِ فسوں ساز کرم　　خالی یک سر ز سرِ سر زنشے نیست کہ نیست

طعنۂ برقِ جمالِ تو دل و جاں کردند　　خرمنِ ہستی ما بے طپشے نیست کہ نیست

دستِ حسرت بزند سینہ حرماں مسلم

درکفِ پائے جنونم خلشے نیست کہ نیست

غزل

سعید شہیدی

رازِ دل اپنا بہ صورت نمایاں ہوگیا — میرے سرنامہ کا لفظِ عشق عنواں ہوگیا

عشق میں رہتا نہیں حفظِ مراتب کا خیال — پرزے پرزے ایک پیغمبر کا داماں ہوگیا

باتوں باتوں میں خزاں کے دن بھی آخر کٹ گئے — پھر بہار آئی گلستاں پھر گلستاں ہوگیا

کب تجلی نفس کی رہتی ہے پابندِ حدود — شعلہ ناموس یوں بھڑکا کہ عریاں ہوگیا

یونہی آجاتا تھا کچھ پہلے پہل تیرا خیال — یہ تخیل بڑھتے بڑھتے آج ارماں ہوگیا

تُو نے کچھ سوچا بھی او معمارِ تعمیرِ بلند — اس بنائے نو سے گھر کس کس کا ویراں ہوگیا

شامِ فرقت کی سیاہی اب میرے گھر میں کہاں — آپ کے تشریف لاتے ہی چراغاں ہوگیا

میں اگر خوش ہوں تو ہر ذرہ خوشی میں محو ہے — میں پریشاں جب ہوا عالم پریشاں ہوگیا

سینکڑوں جھونکے حوادث کے تھے شہرت کو سعید
مصلحت تھی میں چراغِ زیرِ داماں ہوگیا!

یادمسعود

جناب نصیرالدین صاحب ہاشمی

سر سید راس مسعود مرحوم المخاطب نواب مسعود جنگ کو ملک و قوم سے جیسی کچھ دلچسپی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، ان کے کارنامے ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گے، مرحوم کے کارناموں کی صراحت طویل صفحات کی متقاضی ہے، اگر صرف "اردو" زبان کے متعلق ان کے کارناموں کو دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ انھوں نے اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور اردو کے محسنوں میں ان کا شمار کرنا چاہیے۔ مرحوم کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی ان کو اس کی ترقی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی، عرصہ تک وہ انجمن ترقی اردو کے صدر رہے اور صدر کی حیثیت سے اونھوں نے انجمن کی بڑی خدمت کی خصوصاً انجمن کی مالی حالت درست کرنے کے لئے اونھوں نے بڑا کام کیا اور اپنی کوشش اور اثر سے انجمن کے لئے ایک کافی سرمایہ فراہم کردیا۔ آج مسعود مرحوم ہی کی بدولت انجمن کے سرمایہ میں اچھی رقم موجود ہے۔

سید راس مسعود نے "انتخاب زرین" کے نام سے ایک کتاب شایع فرمائی جس میں شعراء اردو کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ انتخاب زرین کے بعد ہی دوسرے اصحاب مثلاً الیاس برنی وغیرہ نے اس قسم کی کتابیں شایع کیں اور آج بیسیوں انتخابات موجود ہیں، اس کی داغ بیل ڈالنے والے مسعود مرحوم ہی تھے۔

"نظامی پریس بدایون" کی اونھوں نے سرپرستی فرمائی اور انیس کے مراثی اور دوسری کتابیں نہایت اہتمام سے شایع کرانے میں ہمت افزائی فرمائی اور مدد دی۔ چنانچہ اس پریس نے اردو کی کچھ کتابیں شایع کی ہیں وہ اپنے ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور قابل ستایش ہیں۔

مرحوم نے اپنے نامور دادا سر سید احمد خان کے خطوط بھی شایع کئے اور ان کی اشاعت کے بعد ہی نواب محسن الملک اور وقار الملک کے مکاتب بھی شایع ہوکر اردو ادب میں اضافہ کا موجب بنے ہیں۔

سید راس مسعود صاحب کا سب سے بڑا اردو کارنامہ جامعہ عثمانیہ کی

تشکیل اور اس کا قیام ہے، اگرچہ حیدر آباد میں ایک جامعہ کے قیام اور اردو زبان میں تعلیم کا مسئلہ تقریباً ربع صدی بلکہ اس سے زیادہ عرصہ سے علمی حلقوں میں زیر بحث بنا ہوا تھا مگر عملی طور پر اس کی جانب متوجہ ہونے والے اور دشواریوں پر غالب آکر جامعہ عثمانیہ قایم کرنے کا سہرا سیدراس مسعود ہی کے سر ہے، یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے اگر مسعود کی کوشش، دلچسپی اور توجہ نہ ہوتی تو کم از کم اور ربع صدی اس کے لئے درکار تھی، دارالترجمہ کا قیام اور جامعہ کا افتتاح وغیرہ ان ہی کی وجہ سے جلد سے جلد دفتری امثلہ سے طے ہو کر عملی طور پر ظہور پذیر ہو گئے - بہر حال مسعود کا یہ کارنامہ تاریخ اردو میں آب زر سے لکھا جا سکتا ہے -

نواب مسعود جنگ کے حالات میں ایک مختصر رسالہ کمال رضا صاحب نے شایع کیا ہے اور رسالہ اردو کا مسعود نمبر بھی شایع ہوا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ خاص طور پر ان کے مکمل حالات زندگی لکھنے کی ضرورت ہے جس میں ان کی بیرونی اور اندرونی زندگی کے حالات وغیرہ مفصل ہونا چاہیے، اس کام کے لئے مولانا محمد امین زبیری نہایت موزوں شخص ثابت ہوں گے - بچپن سے مرحوم کے حالات کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں اور اندرونی خانگی زندگی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں - کاش مولانا اس کی جانب متوجہ ہوں -

اس موقع پر میں صرف ان حالات کا تذکرہ کرتا ہوں جو میری حد تک ہیں مرحوم کے نام سے سب سے پہلی مرتبہ میں اس وقت واقف ہوا تھا - جب کہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کا حادثہ ہوا، اور مرحوم بھی مقدمہ کے سلسلہ میں مظہر الحق بیرسٹر کے ساتھ کام کرنے کے لئے کانپور گئے تھے - اور آپ کا فوٹو الہلال میں شایع ہوا تھا - اس کے کچھ عرصہ بعد آپ ہندوستان کے سررشتہ تعلیمات میں شامل ہو گئے - اور پھر پہلی مرتبہ آپ کو ۱۳۲۵ف میں دیکھنے کا موقع ملا جب کہ آپ ناظم تعلیمات کی حیثیت سے الما سٹیفن ناظم تعلیمات کو وداع کرنے اسٹیشن نام پلی آئے تھے، اس لطیفی کو طلبہ اور حیدرآبادی پبلک نے جس طرح الوداع کہا وہ حیدرآباد کی تاریخ میں یادگار رہے گا -

اس زمانہ میں میں مدرسہ دارالعلوم میں زیر تعلیم تھا اور انجمن ثمرۃ الادب دارالعلوم کے سکریٹری کے فرائض کی ادائی میرے ذمہ تھی - انجمن کا سالانہ جلسہ اس زمانہ میں ہونے والا تھا -

جلسہ کی صدارت کی درخواست کرنے کے لئے میں موصوف کے پاس گیا، اور پہلی ملاقات ہوئی، اس پہلی ملاقات سے جو نقش ان کی محبت اور ہمدردی کا میرے دل پر ہوا وہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔ مرحوم اپنی زندگی تک مجھے جس محبت سے یاد کرتے تھے وہ ان خطوط سے واضح ہوگا جو اس مضمون کے آخر شامل کئے گئے ہیں۔

میرے نانا مولوی حسین عطاء اللہ صاحب مرحوم سے سرسید کے روابط تھے، اور سید محمود (سید مسعود کے والد) سے بھی ربط تھا۔ جب وہ حیدرآباد کی عدالت کی اصلاح کے لئے آئے تھے تو میرے نانا ان کے ساتھ ہی کام کرتے رہے تھے اور آپ کے خطوط بھی موجود تھے، جب میں نے سید مسعود مرحوم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا اب اس کی تجدید ہوگئی ہے ایک مبتدی طالب العلم سے ناظم تعلیمات کا اس طرح گفتگو کرنا مرحوم کے وسیع اخلاق ہونے کی کتنی بڑی دلیل ہے۔

انجمن ثمرۃ الادب کے سالانہ جلسہ کے بعد میں کبھی کبھی دفتر میں بھی ملاقات کے لئے جایا کرتا تھا اور مرحوم ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی مہربانی اور ہمدردی سے پیش آتے رہے، ۱۳۲۶ف میں جامعہ عثمانیہ کے قایم کرنے کے لئے دارالعلوم میں دو خاص انگریزی تعلیم کی جماعتیں قائم کی گئیں اور اس میں ان طلبہ کو شریک کیا گیا جو مولوی، منشی، دبیر اور عالم کامیاب ہو چکے تھے ان کو میٹرک تک انگریزی تعلیم دلاکر جامعہ کے "ایف اے" میں شریک کرنا مقصود تھا۔ میں اس وقت عالم کی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ مجھ سے مرحوم نے فرمایا تھا کہ اگر جامعہ سے ایف اے میں کامیابی حاصل کرلوں تو مجھے سب سے پہلے مزید تعلیم کے لئے اکسفورڈ روانہ کیا جائے گا۔

بدقسمتی سے کچھ ایسے واقعات رونما ہوگئے میں ایف۔ اے میں شریک نہیں ہو سکا اور ملازمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن مرحوم نے انگلستان روانہ کرنے کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ دوسری صورت سے پورا ہو گیا۔

مجھے بچپن سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا، مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے مجھے اردو زبان کی تاریخ لکھنے پر توجہ دلائی اور ان ہی کے حسب ایماء میں نے "دکن میں اردو" مرتب کرکے شائع کی۔ کتاب جس قدر مقبول ہوئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے اس کا پہلا اڈیشن چند ماہ میں ختم ہو گیا۔ نواب مسعود جنگ مرحوم نے مجھے کتاب کے صلہ میں نقد معاوضہ دینے کا خیال ظاہر کیا۔ میں نے استدعا کی کہ مجھے اس کے بجائے انگلستان روانہ کیا جائے

تاکہ میں اپنی کتاب "دکن میں اردو" کے لئے مزید ذخیرہ فراہم کر سکوں۔ اس زمانہ میں نواب سر امین جنگ بہادر صدر المہام پیشی اعلیحضرت اور ساتھ ساتھ صدر المہام عدالت بھی تھے۔ نواب صاحب نے میری درخواست اپنی سفارش کے ساتھ جامعہ عثمانیہ میں روانہ کی۔ جامعہ نے مجھے یورپ کو روانہ کرنا تو منظور کر لیا مگر رقم کا سوال درپیش تھا۔ مسعود مرحوم نے جامعہ کی کونسل میں اس پر آمادگی ظاہر کی کہ سررشتہ تعلیمات سے اس کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ نے مجھے ایک سال کے لئے انگلستان روانہ کرنا منظور کر لیا تاکہ میں انگلستان کے کتب خانوں سے مزید مواد فراہم کروں۔ جب منظوری کے دیگر مراحل درپیش تھے تو میرے بعض مخالفین نے اخبار رہبر دکن وغیرہ میں میرے خلاف مضامین شائع کئے اور گمنام خطوط بھی مسعود مرحوم کے نام روانہ کئے جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ اس کام کے لئے کسی دوسرے شخص کو روانہ کیا جائے۔ بظاہر تھا کہ مجھے بطور معاوضہ کتاب اور صلہ تصنیف امداد دے کر روانہ کیا جا رہا تھا۔ اس لئے کسی اور کو گلہ یا شکایت کا موقع نہیں تھا۔ جب اخبار میں مضامین شائع ہوئے تو مسعود مرحوم کے بعض دوستوں نے ان سے کہا کہ میرا روانہ کرنا موقوف کر دیا جائے۔ مرحوم نے جواب دیا کہ سرکار عالی کے جہاں لاکھوں روپیے بلا مصرف بھی خرچ ہو جاتے ہیں ہاں اگر ہاشمی کے لئے بھی چند ہزار خرچ ہو جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں مگر مجھے ہاشمی سے توقع ہے کہ سرکار کے اس عطیہ کا اچھا مصرف ثابت کرے گا۔

مجھے اس امر پر فخر ہے کہ میں نے مسعود مرحوم کے خیال کو عملی جامہ پہنایا اور ایک سال کی قلیل مدت میں سات سو صفحات کا ذخیرہ فراہم کر کے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" شائع کی اور دکن میں اردو کو تیسری بار تقریباً چھ سو صفحات اور پھر مدراس میں اردو بھی شائع کیا۔ اس کے علاوہ انگلستان کے کتب خانوں کے کیٹلاگوں کی صحت کی جس کی وجہ سے ارباب کتب خانجات سرکار عالی کا شکریہ ادا کیا کہ حضور نظام کے روانہ کئے ہوئے شخص کی وجہ سے ان کے کیٹلاگوں کی صحت ہوئی۔

میں جس زمانہ میں لندن میں تھا مسعود مرحوم کانٹیننٹ میں تھے اور جب وہ لندن آئے تو میں اڈنبرہ میں تھا۔ اس لئے بدقسمتی سے وہاں ملاقات نہ ہو سکی۔ یورپ کی واپسی کے بعد مرحوم کا تعلق حیدرآباد سے باقی نہیں رہا وہ پہلے علی گڑھ اور پھر بھوپال

میں مامور ہو گئے، سید مسعود مرحوم ایک نہایت معروف شخص تھے اس لئے ان سے زیادہ خط و کتابت دشوار تھی۔ ان کے چند خطوط جو مجھے وصول ہوئے ہیں وہ یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ ان سے مرحوم کا وہ خلوص ظاہر ہو سکتا ہے جو ایک مجھ سے تھا اور پھر ان کی قوم و ملت سے محبت کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔

علی گڑھ ۱۰ ڈسمبر ۱۹۲۹ء

ڈیر نصیر الدین

بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارا خط مورخہ ۴ ڈسمبر ۱۹۲۹ء معہ یورپ کے صداقت ناموں کی نقول کے ملا، مجھے یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہو کہ وہاں تمہارے کام کی بابت لوگوں نے اس عمدگی سے تمہارا شکریہ ادا کیا۔

جس دن سے کہ میں نے یہاں اپنا کام شروع کیا ہے کثرت کار کی وجہ سے ناممکن ہو گیا ہے کہ میں کسی کے خط کا بھی جواب وقت پر دے سکوں، لہذا امید کرتا ہوں کہ تمہارے خط کے جواب میں جو دیر لگی ہے اس کو معاف کروگے۔

بد قسمتی سے ہمارے کتب خانہ کی حالت یہاں ایسی عمدہ نہیں ہے جیسی کہ مسلمانوں کے مرکزی درس گاہ کے کتب خانہ کی ہونی چاہیئے تاہم تم جو کچھ دریافت کرنا چاہتے ہو وہ (لائبریرین) مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ کو لکھ کر دریافت کر سکتے ہو۔

خاکسار

سید راس مسعود

بھوپال ۲۳ نومبر ۱۹۳۴ء

ڈیر نصیر الدین ہاشمی

بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارا عنایت نامہ و کتاب مجھے کل ملے، جب وقت ملیگا تو تمہاری جدید تصنیف کو ضرور پڑھوں گا، تم ان چند لوگوں میں سے ہو جو حیدرآباد میں مجھے ابھی تک بھولے نہیں۔ یہاں کا نظام تعلیم میں بدلنا چاہتا ہوں خواہش یہ ہے کہ اس ریاست میں سچی قومی تعلیم جاری ہو جائے افسوس کہ میری صحت ایسی خراب ہو گئی ہے کہ اب (۴) گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ جرمنی اور آسٹریا علاج کرانے

گیا تھا۔ لیکن قلب کی بیماری کا سوا آرام کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ جو کچھ بھی میری صحت تھی وہ علی گڑھ کے نظر کر چکا، یہ صرف نواب صاحب بھوپال کی محبت تھی کہ وہ مجھے یہاں کھینچ لائی۔ یہ ایک نہایت دانشمند بادشاہ ہیں، اور خدا نے چاہا تو ان سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ یہ ریاست بھی انشاءاللہ جلد علم کا مرکز بن جائیگی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کام کرتے ہو اور کیا تنخواہ پاتے ہو، عبدالسلام مرحوم کے والد کو میرا سلام کہہ دینا، خدا کرے اس مرحوم کے بچے خیریت سے ہوں۔ فقط

میں ہوں تمہارا سچا خیر طلب

سید راس مسعود

نوٹ:۔ یہ خط خود مرحوم کا قلمی ہے۔

بھوپال ۸ ڈسمبر ۱۹۳۵ء

ڈیر نصیر الدین ہاشمی

تمہارا عنایت نامہ مورخہ ۶ ڈسمبر ۱۹۳۵ء مجھے ابھی ملا، یہ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہندوستانی اکیڈیمی میں اپنا مقالیہ پڑھ رہے ہو۔ خدا مبارک کرے۔

افسوس کہ جس زمانہ میں تم ادھر سے گزروگے میں بھوپال میں نہ ہوں گا۔ یہاں سے ۱۸ ڈسمبر کو روانہ ہو رہا ہوں اور دوسری یا تیسری جنوری سے پہلے واپس نہ آنا ہوگا۔

والسلام۔

میں ہوں تمہارا سچا خیر طلب

سید راس مسعود

بھوپال (سی، آئی) ۱۵ اکٹوبر ۱۹۳۶ء

برخوردار نصیر الدین ہاشمی۔ تسلیم

تمہارا عنایت نامہ مورخہ ۵ ستمبر ملا۔ کتابوں کی پارسل بھی پہنچی، لیکن انتہائی مصروفیت کی وجہ سے ان کو ابھی پڑھ نہ سکا۔ اس کا یقین ہے کہ جو کچھ تم کو تم نے لکھا ہوگا وہ نہایت قابل قدر ہوگا۔ میری دعا قبول کرو۔ اور میرا سلام عبدالسلام مرحوم کے والد کو پہنچا دو۔ فقط

میں ہوں تمہارا خیر طلب

سید راس مسعود

اگرچہ یہ چار ہی خط میرے نام آئے تھے۔ مگر ان سے بھی جو امور ظاہر ہوتے ہیں ان سے مرحوم کی بہترین سیرت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ کاش کوئی مرحوم کی مکمل سوانح عمری لکھنے کی کوشش کرے تو ملک و قوم اور اردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔

بقیہ سلسلہ صد ۳۲) آئندہ مجھے کچھ لکھنا نہیں ہے۔ داستان ختم ہو چکی۔ ساز ٹوٹ چکا مان ٹوٹے تاروں کے نغمے ابھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی ہے۔ مگر میں بیٹھا اپنی ڈائری مکمل کر رہا ہوں۔

ہاں ــــ تو وہ چلی گئی۔ مکان اسی طرح آج بھی مقفل ہے جیسا کہ اس سے قبل تھا۔ سنسان ویران۔ بھیانک۔ جیسے قبرستان جس میں میری آرزوئیں تمنائیں دفن ہو گئیں۔ نہ جانے وہ کون تھی۔ کدھر سے آئی اور کہاں چلی گئی۔ سامنے بالکنی خالی پڑی ہے اور گذشتہ کی ایک مبہم دھندلی دھندلی تصویر میرے پردۂ تخیل پر ابھر رہی ہے۔ عجیب کشمکش میں ہوں۔ شاید یہ سبب میرا دیوانہ پن ہے۔ میں نے اس کی سیاہ آنکھوں کو بارہا غور سے دیکھا لیکن ان آنکھوں کے پردے کے پیچھے اس کی روح کے متعلق کچھ نہ جان سکا کیا معلوم وہ میرے متعلق کیا سوچا کرتی تھی اور سوچتی تھی بھی یا نہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہو کہ وہ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح میں اسے چاہتا ہوں۔ اف۔ تنہائی کے پر ہول سپنے میرے دل پر مرتسم ہو رہے ہیں۔ ہر طرف خلا میں تاریکی ہے۔ تاریکی۔ روح تاریکیوں کے غار میں اوندھی متھا پڑی سسکیاں بھر رہی ہے۔

بزم کہکشاں

جلیسیات

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

جبتک خلش درد تھی اک گونہ مزا تھا
جب سے مجھے آرام ہی آرام نہیں ہے

آپ اور سوگ یا کیا کہنا
دیکھیے لب پہ ہنسی آتی ہے

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

رہا اسیر تو شکوہ رہا اسیری کا
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

وعدہ کرکے اور بھی دقت میں ڈالا آپ نے
زندگی مشکل تھی اب مرنا بھی مشکل ہو گیا!

او آنکھ چرا کے جانے والے
ہم بھی تھے کبھی تیری نظر میں

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے
ہاں مری جاں پھر اسی انداز سے

اب کیا کروں تلاش کسی کارواں کو میں
گم ہو گیا ہوں پا کے ترے آستاں کو میں

بیخودی کا ہے رہا یہ عالم
تیغ کو دیکھ کے سر یاد آیا

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے نہیں
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا

قاصد پیام شوق کو دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں!

پھر شوق تماشائے جاناں ہے کسی سمت
پھر ذوق نظر مجھ کو تماشا نہ بنا دے

تیری آنکھوں کے صدقے ایک نئی دنیا میں بستی ہے
طوفان ہے - سحر ہے - اعجاز ہے شوخی ہے مستی ہے

بجلی کی تاک جھانک سے تنگ آ گیا ہوں میں
ایسا نہ ہو کہ پھونک دوں خود آشیاں کو میں

میں کسی اور سے کیوں شکوہ بیداد کروں
یہ شرف جب ہے کہ تجھ سے تیری فریاد کروں

ستم کی چال - ستم کی ادا - ستم کی نگاہ
ترے ستم کا ستمگر کوئی حساب بھی ہے

اے جرس تو تو نہیں قافلے والوں سے جدا
تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا

بچھڑ کے کارواں سے میں کبھی تنہا نہیں رہتا
رفیق راہ بن جاتی ہے گرد کارواں میری

فغاں میں درد - دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

ب۔ مہرونیر

جانے کیا کہنا ہے ——— !

جہاں بانو
ایم۔اے

زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ بقول میرؔ

سرسری ہم جہاں سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

پہلے گھنٹوں بات چیت ہوتی تھی۔ لمبی چوڑی ملاقاتیں۔ مہینوں کی مہمانداریاں۔ اب زندگی کی مصروفیت صرف "ایک نظر" کی مہلت دیتی ہے۔ اس ایک نظر میں انسان۔ اگر وہ اہلِ نظر سے ہو۔ بہت کچھ دیکھ لیتا ہے۔ سادگی و پُرکاری کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ ظاہر و باطن کو ٹٹول لیتا ہے۔ خلوص اور غرض کو اس کا ذہن خوب سمجھ جاتا ہے۔ دلشکنی اور طنز کی گفتگو سے فوراً بہت سی گہری گہری باتیں بلکہ رموز سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ وہ ظاہرداری کی مروت کو بھی اپنی پہلی نظر سے تاڑنے لگتا ہے۔ وہ تعصب اور حسد کو بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ "پہلی نظر" ہی سب کچھ ہے۔ بعد کی نظریں تو صرف سکنڈ ہینڈ کاپیاں ہیں۔ پروف کاپی تو وہ پہلی نظر ہی ٹھہری۔

راستہ پر گزرتے ہوئے قسم قسم کے خیالات آتے ہیں۔ خیالات، بس ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں تا جہاں ان کو گرفت نہ کیا جا سکے۔ ویسے لکھنے بیٹھو یا بولنے کہنے کی نوبت آئے تو ایک بات بھی پتے کی یاد نہیں آتی۔ سونے سے پہلے بہترین خیالات کا انوکھی جدتوں کا دماغ پر حملہ ہوتا ہے۔ اتفاق کی بات، جس دن سرہانے کاغذ پنسل رکھا، بس اس روز سوچنے سے بھی گئے۔ نیا خیال، کوئی نئی ادا انوکھی بات پاس نہیں پھٹکتی۔ جیسے صیاد کے بچھے ہوئے دام کو دیکھ کر طیور آس پاس آنے سے گھبراتے ہیں۔ اور ویسے پھول کے درختوں پر بڑے مزہ میں اڑ کر جھولنے لگتے ہیں۔

راہرو نے چلتے چلتے سیدھے بائیں نظر دوڑائی۔ زندگی کی ہر چیز میں بے ترتیبی ملی۔ بس خود کو جو چیز پسند نہ آئے انسان اسی کو خامی سمجھتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ دوسرے کی پسند ہے۔ تیری اپنی رائے کا اس میں کیا دخل؟ اب مثلاً ایک مکان پر تختہ لگا ہوا دیکھا۔ رہنا تو چاہیئے تھا صاحب خانہ کا نام۔ وہاں یہ دیکھ کر نوید کی دنیائے تخیل تہ و بالا ہو جاتی ہے۔ بیگم صاحبہ کا نام۔ ان کی ڈگری کے دم چھلے۔ ان کے عہدہ کا

اتا پتہ ۔ اور آخر میں ۔ کسی ایک نامعلوم سے گوشہ میں بیچارے صاحب خانہ کا نام ۔
ہمارے ملک میں "لیڈیز فرسٹ" کہاں رائج ہے ؟ نگران کی بیٹھ ٹھونکی جائے تو مناسب ہے کہ انھوں نے اس کی ابتداء کی ۔ اور علامہ حیرتؔ "لیڈیز فرسٹ" کہہ کر انتہا کردی ۔

نوید سے جمیل ملنے آئے تھے شاید ۔ اندر اپنے نام کا کارڈ بھجوایا ۔ یہ تعزی کارڈ بڑے تکلف سے چھپا ہوا تھا ۔ اطراف گل بوٹے ۔ درمیان میں 'جمیل احمد' انگریزی میں لکھا ہوا ۔ اردو میں نام لکھا جاتا تو ذرا ——— یونہی سی بات تھی نا ——— ؟ غلاموں کی زبان ۔ آزادی بھی ملی تو غلام کے غلام رہے ۔ شہانہ اپنی سہیلی سے رخصت ہوتے ہوئے 'چیریو' کہنے میں جو مزہ اور کیف و سرور محسوس کرتی ہے وہ اطمینان قلب اس کو 'خدا حافظ' کہنے میں نہیں ملتا ۔ سعیدہ کی زبان "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہنے میں جو بلبلٹ ہو کر حظ اٹھاتی ہے وہ اس سیدھے سادے جملے "مزاج تو اچھے ہیں ۔ خیریت سے تو ہیں آپ ؟" میں کہاں نصیب! وہ لچک اور وہ کسک! شہانہ کے تو ایک مختصر سے جملہ میں ۷ ۔ ۸ انگریزی الفاظ ضرور ہوتے ہیں ۔ اگر سننے والوں میں سے کسی کو انگریزی نہ آتی ہو تو اس کی بلا سے ۔ اس کی زبان مجبور ہے ۔ اور وہ خود بھی مجبور ۔ کہ انگریزی ہی اس کے منہ چڑھی ہے ۔ جینا اور غلام سا منہ چڑھا تو نہیں چھوٹتا ۔ اس کے منہ سے تو انگریزی چمٹ گئی ہے ۔ جونک کی طرح ۔

حمیدہ نے تو ہاتھ کی چوڑیاں چھوڑ دیں ۔ گلا اس کا ننگا رہتا ہے ۔ زیور نہ سہی ایک ایک دو دو چوڑیاں سے بھی بے نیاز "ہینڈ بیگ" ضرور ہاتھ میں رہے گا ۔ اس کا سہاگ پڑا ہے نا ۔ غالباً یہ بھی بتانا چاہتی ہے ۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی

لیکن باتوں میں اتنی بناوٹ اور نگاہوں میں اتنا نارچڑھاؤ رہتا ہے کہ اس خدا کی دین کو بھی اپنے اس نیا :ٹی انداز سے غارت کر دیتی ہے ۔ صرف ہاتھ و گلے کی سادگی اور بات چیت میں یہ انداز ——— اس کی سادگی کو ذرا سمجھنا پڑے گا ۔ اور اس کے تو کیا یہاں خود اپنے سمجھنے کو بھی وقت نہیں ملتا ۔

اطمینان قلب اور عزت و خلوص کے مسئلہ پر ایک دانا سوچنے لگی ۔ کچھ عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے ۔ تو یہ تو یہ ۔ ہجوم تخیل نے دماغ کی نس نس ہلا دی ۔ کچھ تو نہیں سا جی بہت گھبرانے لگا ۔ کسی کام میں طبیعت نہ لگتی تھی ۔ نماز کی میں ۔ جیسے پابند تو نہیں ۔

جانے روز محشر جب پہلی پرسش اسی نماز کی ہوگی تو "وہ" کتنا کچھ درہم برہم ہوگا۔ میرا کیا ہے۔ اس کو خود شرمندگی سی ہوگی۔ اپنی اس نکمی تخلیق پر۔ لیکن اقبال نے میرے دل کی بات کہدی ہے

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر!

میں زاہد و واعظ کی عبادت کو غرض اور لین دین، بلکہ سودا سمجھتی تھی۔ اب خود کو غیر مطمئن و مضطرب پاکر مجھے بھی اسی طرف رجوع ہونا پڑا۔ جی بے اختیار چاہا اس کے آگے سر جھکانے۔ شاید —— شاید کیا۔ یقینی۔ یہی تو ایک مرکز ہے سکون و اطمینان کا اور تو کہیں نہ ملی یہ دولت۔ غالب کا دیوان لے بیٹھی۔ کتاب کھولتے ہی یہ شعر نکلا ہے

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل جو تیری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

غالب نے تو اور پریشان کر دیا۔ ہم تو اطمینان قلب ڈھونڈتے ہیں اور یہ حضرت دوسری دوسری پریشانیوں کا ذکر کے بارود کے ڈھیر میں دیا سلائی لگاتے ہیں۔ غالب کو رکھدی۔ میر سے پوچھا۔ بتائیے آپ بھی کچھ خلش دل کا علاج جانتے ہیں؟ صفحہ الٹتے ہی یہ شعر سامنے ہے

دل نہ الجھاؤ کہ کیا تجھ سے کہوں اے ناصح! تو کسی زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

میر ہم تجھ سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے۔

اب کیا کروں۔ میر درد بھی تو میرا محبوب شاعر ہے۔ اس کا دیوان بھی قریب تھا اس لئے ورق الٹا۔ انہوں نے بات پتہ کی تو بتائی ہے۔ مگر دیکھئے تعبیر کب نکلے کہتے ہیں۔ ہے

افسوس کہ درد اس کو جبتک ہوئے ہی تیر گذر گئے ہم

کچھ دن اور رہتے تو درد ولی ہو جاتے۔

کلیات اکبر بھی قریب رکھا تھا۔ اکبر تو مسخرے ہیں۔ لیکن بعض وقت چشم بد دور بڑی پتہ کی خبر دیتے ہیں۔ کتنا دلنشین تخیل ہے اکبر کا ہے

انسان فقط عجز و دعا ہی کے لئے ہے جو عزت و عظمت ہے خدا ہی کیلئے ہے

الجھن قلب کا بس اب ایک ہی علاج تیار تھا۔ میں نے وضو کیا۔ نماز کے لئے کھڑی ہوئی۔ نماز شروع تو کر دی تھی۔ اپنی الجھنوں کو دور کرنے۔ لیکن ضمیر کی ٹھنکیاں شروع

ہو میں۔ کیا یہ زاہد کی نماز کی طرح غرض کی عبادت نہیں ہے ؟ کیا اسی کا نام خلوص ہے ؟
اپنے کھوئے ہوئے اطمینان و سکون کو پھر سے حاصل کرنے کی مجھے تو نہیں لگی ہے ؟
اپنے بے غرض محسن کے آگے بھی اظہار محسن کشی ؟ ارے رے رے - اور زیادہ بے چین
کر دیا اس کمبخت ضمیر نے تو ۔ اب کیا کروں۔

لیکن خیر عبادت کے بعد واقعی ایسے لگتا ہے جیسے ایک طمانیت سی حاصل ہے۔ دل کی بھڑاس جیسے رونے سے نکل جائے ۔ لیکن اس ضمیر کو کیا کروں۔ اس کی سرکشی کا تو کوئی علاج نہیں۔ لیکن سچ بھی تو کہتا ہے - اس کی جراحتوں نے زخم کو ناسور بنا دیا ہے۔ عبادت کا فرض ادا بھی ہوا - پھر بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا ؟ ایسے لگا جیسے جی کو نہ لگی یہ عبادت ۔ تاہم ایک روح پرور اطمینان ضرور محسوس ہونے لگا۔ اس خدائے برتر کے آگے سر جھکانے سے - اس کے روبرو اپنی بے بضاعتی کا اظہار - اپنے گناہوں کا اعتراف اپنی کوتاہیوں پر اس رب العزت سے عفو و عطا کی بھیک مانگنے سے۔

اب رہا ضمیر یا میرا دل - ہم دونوں میں ہمیشہ ہی ان بن رہی - کبھی نہ نبھ سکی غرض یہ نوبت ہے اب دل کی سے

دشمنے در بزم تشنہ آشر　　من گماں بردہ ام دلی دارم

دلچسپ معلومات

سلطان سنجر کے شاعرانہ صحبتوں میں مہستی ایک شاعرہ بھی شریک ہوا کرتی تھی ایک دفعہ مجلس عیش قایم تھی۔ مہستی بھی موجود تھی کسی کام سے باہر نکلی تو دیکھا تو برف پڑ رہی ہے واپس آئی - سنجر نے پوچھا ہوا کا کیا رنگ ہے - مہستی نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی -

شاہا فلکت ایں سعادت زیں کرد　　وز جملہ خسرواں نزد تحسیں کرد
تا در حرکت سمند زریں نعلت　　برگل ننہند پائے زیں سیمیں کرد

یعنی آسمان نے اس غرض سے کہ آپ کے گھوڑے کے پاؤں خاک پر پڑنے نہ پائیں زمین پر چاندی بچھادی - سنجر نہایت محظوظ ہوا اور اس دن سے اس کو مقربین میں شریک کر لیا۔

جناب علی احمد صاحب بی۔ اے

(۱)

آج مجھے اس مکان میں آئے ہوئے ایک ہفتہ گذر گیا۔ مکان اچھا خاصا ہے۔ خصوصاً بالائی حصہ جو میرا ڈرائنگ روم بھی ہے، درسگاہ بھی اور خوابگاہ بھی۔ میں دن اور رات کا زیادہ حصہ یہیں گذارتا ہوں۔ نیا مقام، اجنبی ماحول۔ نہ دوست نہ احباب۔ بس تنہائی اور تنہائی۔ مکان کے بالکل مقابل ایک دو منزلہ مکان ہے۔ لیکن مقفل۔ معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں اس میں ایک طوائف رہا کرتی تھی۔ جب یہاں کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا تو کہیں اور قسمت آزمانے چلی گئی۔ اس کے بعد سے خالی پڑا ہے۔ کوئی یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔ نہ جانے کب تک یوں ہی خالی رہے گا

(۲)

میرے مکان کے مقابل جو عمارت ایک عرصہ سے خالی پڑی تھی آج اس کی صفائی ہو رہی ہے تمام دروازے کھول دئے گئے ہیں۔ کچھ چہل پہل نظر آتی ہے۔ ویرانہ معمور ہوگا۔ یا الٰہی کون آنے والا ہے۔

(۳)

اُف۔ وہ بالکنی پر کس بے تکلفی سے کھڑی تھی۔ ہلکا ہلکا گلابی رنگ، سفید ساری، بکھرے ہوئے بال، کچھ کمسن، کچھ جوان۔ مجھے جو اچانک اپنے مقابل کی منزل پر دیکھا تو جھجک کے ساتھ جسم میں ایسی لچک پیدا ہوئی جیسے صرصر کے کسی جھونکے سے شاخ گل لچک جائے میرے دل کا ہر تار جھنجھنا اٹھا۔ جب تک میں سنبھلوں وہ اندر کے کمرے میں جا چکی تھی۔

حسن و جوانی کا یہ دلفریب نظارہ دن بھر میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ شام کو وہ پھر نظر آئی۔ اب کی بار بال قرینے سے جمے تھے۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ ایک آرام کرسی پر نیم دراز مطالعہ میں مصروف تھی اور کسی مصور کا حسین تخیل معلوم ہو رہی تھی۔ میں بھی ایک کتاب لیکر پڑھنے لگا۔ لیکن کتاب کے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ میں نے کئی بار کنکھیوں سے دیکھا بھی مگر اُس کے سادہ چہرے پر کوئی جذبات ہی نہ تھے۔ وہ نہایت سکون اور اطمینان سے بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جیسے ظالم نے میرے دل کی

بیتابیوں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں اپنے دل کی اضطراری کیفیت چھپانے کے لئے گنگنانے لگا اور نہ جانے کبتک گنگناتا رہا۔ پھر جو ادہر دیکھا تو وہ غائب تھی اور میں سوچنے لگا کہ اُس کے چلے جانے سے میرے سینہ میں آگ کیوں سلگ اٹھی۔

(۴)

ایک عورت میرے اندر طلب پیدا کر رہی ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے بالکنی والی۔ میں نے افسانوں میں پڑھا تھا کہ زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جب دل میں طوفان اٹھتے ہیں۔ ان الفاظ کو آج میں صحیح سمجھنے پر مجبور تھا۔ ایک عجیب الجھن۔ ایک میٹھا درد۔ ایک لذت آگین خلش۔ وہ کالی کالی آنکھیں اب تو رات دن میری آنکھوں میں پھرا کرتی ہیں اور اب تو وہ آنکھیں کچھ بولنے بھی لگی ہیں۔ رکتے رکتے۔ چپکے چپکے۔ مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

اب بھی وہ مجھے قصداً نہیں دیکھتی مگر وہ یہ ضرور جانتی ہے کہ میں اس کی طرف اس کے عارض، اس کے بال اس کی گوری کلائیوں اور اُس کی ساری کے ایک ایک شکن کو دیکھ رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے پاس بلاؤں اور باتیں کروں، اتنی باتیں کہ سورج غروب ہو کر پھر افق پر جگمگانے لگے۔

(۵)

رات اس کے کمرے میں دیر تک بتی جلتی رہی اور میں پلنگ پر لیٹا ہوا سوچتا رہا کہ میرے سینے میں بھی تو ایک بتی جل رہی ہے۔ کتنی مٹھاس ہے اس جلن میں کتنی پر لطف ہے اس سوزش۔ اتنے میں ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا میں لرز گیا۔ کیا یہ بتی بجھ جائیگی یا یونہی جلتی رہے گی۔ اتنے میں اس کے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ بتی بجھ چکی۔ میرے دل و دماغ پر اندھیرا چھا گیا اور تاریکیوں میں ڈوب گیا اور نہ جانے کبتک ڈوبا رہا

صبح جب آنکھ کھلی تو اسے بالکنی ہی پر کھڑا پایا۔ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ کو بھی یا شاید مجھے ایسا ہی معلوم ہوا۔ میں نے سونے کا بہانہ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کچھ دیکھنا چاہا۔ عورت کی آنکھیں اس کے دل کا آئینہ ہوتی ہیں لیکن میں نے تو اس کی آنکھوں میں محبت کی کوئی چمک نہیں دیکھی۔ یا یہ میرے تجربہ کی خامی تھی اور میرا نتیجہ غلط تھا۔ پھر وہ چلی گئی اور میری آنکھیں دروازے تک اس کے پاؤں تک تعاقب کرتی رہیں۔

(۶)

وہ کہہ رہی تھی آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔ پر کہے کون کہ میرے دل میں بگولے اٹھا کرتے ہیں۔ نہ جانے مجھے ایسا کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ معاف فرمائیے۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ نے میری زندگی کی خاموش اور پرسکون لہروں میں مدوجزر پیدا کر دیا ہے۔ ہر لمحہ آپ ہی کا خیال رہتا ہے۔ کیا آپ مجھے سہارا دیں گے —— لیکن یہ سب کچھ سپنے کی باتیں تھیں۔ جب آنکھ کھلی تو اندھیرا۔ ہاں صبح کاذب کی روشنی افق پر نمودار ہو رہی تھی۔ اس کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے "آپ سے بہت کچھ کہنا ہے پر کیسے کہوں"

میری تمنا اب روز بروز لمحہ بہ لمحہ میرے دل کے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوگا آخر۔ یہ سکوت، پرخلش اور یہ کشمکش کب تک۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں۔ ممکن ہے۔ مگر جب تک ہم اپنے دلی جذبات کے اظہار سے گریز کرتے رہیں۔ یہ مسرت بخش فریب اتنا ہی دور ہوتا جائے گا اور تنہائی میں اضافہ بے پایاں اضافہ۔

(۷)

مہینوں کی مسلسل غیر حاضری کے بعد آج واپس آیا ہوں۔ ڈائری کے اوراق سادہ ہی پڑے ہیں۔ لیکن اس دوران میں بہت انقلابات ہو گئے۔ آج شام میں نے اسے عجیب حالت میں دیکھا۔ اترا ہوا چہرہ جیسے کئی روز کی بیمار ہو۔ برسے ہوئے بادل کی طرح بھیگی بھیگی آنکھیں۔ الجھے الجھے کھلے ہوئے بال۔ بالکنی کا سہارا لئے افق پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ میں مجنونانہ طور پر اسے گھورنے لگا۔ اسے میری موجودگی کا علم تھا یا نہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ مرمریں گردن پر بالوں کے سنہرے حلقے سے بن رہے تھے جی چاہا کہ ان کا چہلا چہلا سلجھا دوں اور بھیگی ہوئی کنپٹیوں پر پیار سے اپنی انگلیاں پھیر کر پوچھوں —— اے لڑکی بتا تجھے کیا غم ہے۔

(۸)

یہ میری ڈائری کا آخری ورق ہے۔ اس ورق سے پہلے کے آٹھ صفحات ادھر خالی ہیں۔ کیونکہ دوسرے ہی دن پھر مجھے چلا جانا پڑا۔ (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ (۴۴))

مصنفہ

(افسانہ) سیدہ مہر (کلیہ اناث)

میز پر بیٹھی جلد جلد مضمون پورا کرنے کی فکر میں تھی۔ قلم دو چار سطروں کے بعد ہی تھم گیا اور خیالات منتشر ہونے لگے۔ برابر کے کمرے سے ساجد اور شاہین کی آوازیں آرہی تھیں جو اس وقت کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ شاہین نے جو کتاب پڑھی تھی ان کی رائے میں بالکل رذیل تھی زور وشور سے کہہ رہے تھے "کچھ جان بھی ہے ان افسانوں میں ایک افسانہ بھی تو خالص مصنفہ کی دماغی پیداوار نہیں، پلاٹ بالکل پھسپھسے نہ واقعات میں تسلسل اور نہ ترتیب، محاورے نہ جانے کتنے دن سوچ سوچ کر ٹھونسے ہیں مگر اس بے محل کی ٹھونسم ٹھانس نے لطافت کا بھرتہ نکال دیا ہے۔ اور اسلوب بیان تو بس جی چاہتا ہے کہ کتاب اور کتاب کی مصنفہ کو کسی عمیق سے گڑھے میں پھینک دیا جائے۔" میرا تو جی ہی جل گیا شاہین کس بری طرح لتھاڑ رہے تھے بیچاری مصنفہ کو "کوشش منہ دھو رکھو اگر خود لکھنے کی کوشش کر دگے تو اس جیسا آدھا صفحہ بھی عمر بھر نہ لکھ سکو گے" ساجد کہہ رہے تھے واقعات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوا ہی کرتے ہیں! اگر ان افسانوں میں بالکل انوکھا پن نہیں تو کیا ہوا جدت طرازی سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اور پھر آج تک آپ کو دنیا کی کوئی شئے میں بغیر کچھ نہ کچھ عیب نکالے چین نہ آیا اور نہ کبھی کوئی خوبی نظر آئی۔ دیکھتے نہیں کس حسن و نزاکت سے باغ کا منظر کھینچا ہے اب شاہین آڑی صحبت پر اتر آئے تھے "جی وہ باغ ہوگا ہی ویسا حسین تو اُنھوں نے لفظ بہ لفظ اس کی تشریح کر دی۔ یہ کون بڑی بات۔ ارے بھلے مانس ساجد جوش سے چلائے۔ کسی حسین شئے کو بیان کرنے کے لئے جب تک لطیف اور شیرینی میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا انتخاب نہ کیا جائے وہ ہرگز حسین مرقع ہو ہی نہیں سکتا اس کے علاوہ چیز چاہے کتنی ہی بھلی ہو جب تک جمالیاتی ذوق سے نہ دیکھا جائے اس کی خوبیاں تم پر آشکار نہیں ہو سکتیں —— اب میں نے قلم انگلیوں سے چھوڑ دیا اور کاپی پرے ہٹا دی جب اتنی دلچسپ بحث چھڑ جائے جس کا تعلق میری ہی جنس کے ایک فرد سے ہو تو کیوں میرا دل ایک خشک سے مضمون میں الجھا رہتا۔ میں دبے پاؤں دیکھے

(۶)

وہ کہہ رہی تھی آپ سے بہت کچھ کہنا ہے - پر کہے کون کہ میرے دل میں بگولے اٹھا کرتے ہیں - نہ جانے مجھے ایسا کہنا بھی چاہیے یا نہیں - معاف فرمائیے - میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کہنا ہے - ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ نے میری زندگی کی خاموش اور پرسکون لہروں میں مدوجزر پیدا کر دیا ہے - ہر لمحہ آپ ہی کا خیال رہتا ہے - کیا آپ مجھے سہارا دیں گے ——— لیکن یہ سب کچھ سپنے کی باتیں تھیں - جب آنکھ کھلی تو اندھیرا - ہاں صبح کاذب کی روشنی افق پر نمودار ہو رہی تھی - اس کے الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے "آپ سے بہت کچھ کہنا ہے پر کیسے کہوں"

میری تمنا اب روز بروز لمحہ بہ لمحہ میرے دل کے قریب ہوتی جا رہی ہے - لیکن اس کا انجام کیا ہوگا آخر، یہ سکوت، پرخلش اور یہ کشمکش کب تک - کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں - ممکن ہے - مگر جب تک ہم اپنے دلی جذبات کے اظہار سے گریز کرتے رہیں - یہ مسرت بخش فریب اتنا ہی دور ہوتا جائے گا اور تنہائی میں اضافہ بے پایاں اضافہ -

(۷)

مہینوں کی مسلسل غیر حاضری کے بعد آج واپس آیا ہوں - ڈائری کے اوراق سادہ ہی پڑے ہیں - لیکن اس دوران میں بہت انقلابات ہو گئے - آج شام میں نے اسے عجیب حالت میں دیکھا - اترا ہوا چہرہ جیسے کئی روز کی بیمار ہو - برسے ہوئے بادل کی طرح بھیگی بھیگی آنکھیں - الجھے الجھے کھلے ہوئے بال - بالکنی کا سہارا لئے افق پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی - میں مجنونانہ طور پر اسے گھورنے لگا - اسے میری موجودگی کا علم تھا یا نہیں - یہ میں نہیں کہہ سکتا - مرمریں گردن پر بالوں کے سنہرے حلقے سے بن رہے تھے جی چاہا کہ ان کا چہلا چہلا سلجھا دوں اور بھیگی ہوئی کنپٹیوں پر پیار سے اپنی انگلیاں پھیر کر پوچھوں ——— اے لڑکی بتا تجھے کیا غم ہے -

(۸)

یہ میری ڈائری کا آخری ورق ہے - اس ورق سے پہلے کے آٹھ صفحات اور خالی ہیں - کیونکہ دوسرے ہی دن مجھے چلا جانا پڑا - (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۴۴)

مصنفہ

(افسانہ)　　سیدہ مہر (کلیہ اناث)

میز پر بیٹھی جلد جلد مضمون پورا کرنے کی فکر میں تھی۔ قلم دو چار سطروں کے بعد ہی تھم گیا اور خیالات منتشر ہونے لگے۔ برابر کے کمرے سے ساجد اور شاہین کی آوازیں آ رہی تھیں جو اس وقت کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ شاہین نے جو کتاب پڑھی تھی ان کی رائے میں بالکل رذیل تھی زور وشور سے کہہ رہے تھے "کچھ جان بھی ہے ان افسانوں میں ایک افسانہ بھی تو خالص مصنفہ کی دماغی پیداوار نہیں، پلاٹ بالکل پھسپھسے نہ واقعات میں تسلسل اور نہ ترتیب، محاورے نہ جانے کتنے دن سوچ سوچ کر ٹھونسے ہیں مگر اس بے محل کی ٹھونسم ٹھانس نے لطافت کا بھرتہ نکال دیا ہے۔ اور اسلوب بیان تو بس جی چاہتا ہے کہ کتاب اور کتاب کی مصنفہ کو کسی گہرے سے گڑھے میں پھینک دیا جائے" میرا تو جی ہی جل گیا شاہین کس بری طرح لتھاڑ رہے تھے بیچاری مصنفہ کو "کوشش منہ دھو رکھو اگر خود لکھنے کی کوشش کروگے تو اس جیسا آدھا صفحہ بھی عمر بھر نہ لکھ سکوگے"۔ ساجد کہہ رہے تھے واقعات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوا ہی کرتے ہیں! اگر ان افسانوں میں بالکل انوکھا پن نہیں تو کیا ہوا جدت طرازی سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے۔ اور پھر آج تک آپ کو دنیا کی کوئی شئی میں بغیر کچھ نہ کچھ عیب نکالے چین نہ آیا اور نہ تھا کوئی خوبی نظر آئی۔ دیکھتے نہیں کس حسن و نزاکت سے باغ کا منظر کھینچا ہے اب شاہین آڑی صحبت پر اتر آئے تھے "جی وہ باغ ہوگا ہی ویسا حسین تو انھوں نے لفظ بہ لفظ اس کی تشریح کردی۔ یہ کون بڑی بات۔ ارے بھلے مانس ساجد جوش سے چلائے۔ کسی حسین شئی کو بیان کرنے کے لئے جب تک لطیف اور شیرینی میں ڈوبے ہوئے الفاظ کا انتخاب نہ کیا جائے وہ ہرگز حسین مرقع ہو ہی نہیں سکتا اس کے علاوہ چیز چاہے کتنی ہی بھلی ہو جب تک جمالیاتی ذوق سے نہ دیکھا جائے اس کی خوبیاں تم پر اجاگر نہیں ہو سکتیں —— اب میں نے قلم انگلیوں سے چھوڑ دیا اور کاپی پرے ہٹا دی جب اتنی دلچسپ بحث چھڑ جائے جس کا تعلق میری ہی جنس کے ایک فرد سے ہو تو کیوں میرا دل ایک خشک سے مضمون میں الجھا رہتا۔ میں دبے پاؤں دیکھے

میں جا کھڑی ہوئی اور اوٹ سے کمرے کا منظر دیکھنے لگی۔ سامنے میز پر گلدان میں آدھے آدھے جلے ہوئے سگریٹ بحث کی گرمی کا ثبوت دے رہے تھے۔ کچھ کتابیں آس پاس بکھری پڑی تھیں۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے گراما فون بجایا گیا ہوگا جب ہی تو ریکارڈ بلا کور کے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ شاہین آرام کرسی پر پڑے سگریٹوں کا دھواں اڑا رہے تھے اور ساجد پاس ہی صوفے پر دراز کتاب کے بعض بعض دلکش مناظر کشی کے نمونے سنا کر شاہین کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر شاہین کہاں ماننے والے وہ تو ٹھیرے ہم لڑکیوں کے ازلی دشمن۔ ریحانہ کے ساتھ گذشتہ سال ایف۔ اے کے امتحان میں شریک رہے اتفاقاً جناب فیل ہوگئے۔ ایک تو اباجان اور امی کی ڈانٹ ڈپٹ کا خوف دوسرے ریحانہ سے پیچھے رہ جانے کے غم وغصہ میں کئی دن ہم سے اکڑے رہے اور دیوان خانے میں باضابطہ مقیم ہوگئے۔ بھلا اس میں ہمارا کیا دوش سینماؤں کی سیر پارکوں کی تفریح دوستوں کی پارٹیوں اور احباب کی تواضع سے فرصت ملے تو نہ کوئی پڑھے بھی —— اونھوں نے صاف کہہ دیا۔ تم لڑکیوں کے ساتھ خاص رعائت کیجاتی ہے جب ہی تو ساری چھوکریاں اتنے اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتی ہیں۔ نہ ریحانہ کبھی فیل ہوئی نہ شمو نہ ناہید نہ جمالی۔ آخر بات کیا ہے بھئی —— ریحانہ غصہ سے جواب دیتی۔ ہم سال بھر کتابوں سے سر پھوڑ کر اپنی محنت کا ثمر پاتے ہیں اور تم اپنی بیکاری کا پھل کھاتے ہو اس پر تو شاہین جل ہی جاتے۔ پتہ نہیں سارا دن ہم بچیوں کو دق کرنے میں انھیں کیا لطف آتا۔ ہمیں بسورتے دیکھکر وہ کھل اوٹھتے۔ ساجد ان کے برخلاف ہماری طرف داری کرتے۔ آج بھی ہماری جنس کے ایک فرد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے نہ جانے کون مصنفہ ہوگی جس نے دو دماغوں پر اتو کھا اثر چھوڑا ہے۔ شاہین یوں بھی ہر مصنفہ میں ایک نہ ایک کمزوری ضرور تلاش کر لیتے عصمت نہیں اپنی عریاں نگاری کی وجہ سے نہ بھا سکیں حجاب ان کو اس لئے پسند نہ آئیں کہ وہ حقیقت سے کافی دور ہو کر پڑھنے والے کو ایک عجیب سی فضا میں گھسیٹ لیتی ہیں اور صرف امراء ہی کی ہانکے جاتی ہیں۔ ساجد نے جب مناظر سنانے ختم کئے تو اسلوب بیان پر تبصرہ کرنے لگے لیکن شاہین اب بھی نکتہ چین تھے کہ کس بھونڈے پن سے رومان کو پیش کیا ہے۔ بھلا پہلی نظر میں بھی کسی کو عشق ہوسکتا ہے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں زندگی سے

دور ہو کر تصورات کی دنیا آباد کر لینا کونسی خوبی ہے۔ افسانہ کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا چاہئے یا تو اخلاقی ہو یا سماجی یا پھر معلوماتی ——— صرف رومان ——— رومان۔ نسرین نیازی صاحبہ مجھ سے تو آپ کے رومان بالکل نہ بھائے۔ نسرین میں چونکی ارے یہ تو ہمارے ہی کالج کی لڑکی ہے۔ کافی اچھے افسانے لکھتی ہے شائد اس کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہاتھ لگا ہے اس لئے تو بحث چھڑ گئی۔ ساجد کہہ رہے تھے تمہیں اب کون سمجھائے بھلے آدمی ہر شخص اصلاحی افسانے لکھے یہ ناممکن ہے اور نہ ہر شخص اصلاحی افسانے پسند کرتا ہے کوئی اخلاقی پسند کرتا ہے اور کسی کو صرف رومان ہی پسند ہوتے ہیں اس لئے مختلف لکھنے والے بھی اپنے رجحان کے لحاظ سے لکھا کرتے ہیں۔ افسانہ ہمارے تصورات کا مرقع ہی ہوتا ہے گو اس کے کردار ہماری ہی طرح ہنستے بولتے سوتے بسورتے نظر آتے ہیں مگر ہیں تو مصنف کی دماغی پیداوار۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اس کے ماحول اور رجحان کا افسانے پر اثر تو ضرور پڑتا ہے اب دیکھو نا ایسی نسرین نیازی کے افسانوں سے اس کا کچھ پتہ چلا سکو گے۔ شاہین نے حیرت سے پوچھا وہ کیسے؟ ساجد بولے (۱) وہ کنواری ہے (۲) کچھ شرمیلی واقع ہوئی ہیں (۳) طالبعلم ہیں۔ (۴) فطرت کی زبردست مداح۔ آخر کیسے بھئی شاہین نے بے صبری سے پوچھا۔ صاف ظاہر ہے کنواری اس لئے کہ افسانوں میں ایک خاص قسم کی جھجک اور پاس و لحاظ ہے۔ شرمیلی اس لئے کہ بسا اوقات وہ کچھ بیان کرنا چاہتی ہیں مگر رک جاتی ہیں۔ طالب علم اس لئے کہ ہمہ وقت کالج ہوسٹل بس پروفیسر، کلاس، لائبریری، ڈائننگ ہال کے تذکرے کئے جاتے ہیں۔ شاہین نے ہار مانتے ہوئے کہا اگر خیالات حسین ہوں تو کیا ہوا ہو گی بڑی بدصورت۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے کہا اف کتنے ظالم ہو، ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے بیچاری کے بھئی آخر وہ ہو گی جیسی بھی تمہیں اس سے کیا غرض تمہیں تو کوئی لڑکی طبع آزمائی کے لئے ملجائے ابھی چند دنوں پہلے ریحانہ کی دو ایک سہیلیاں آگئیں تو تم نے ایسے ایسے جملے ان لوگوں کے سنائے کہ توبہ اگر وہ سن پاتیں تو ——— کیا کرتیں ہمارا سر؟ شاہین مسکراتے باہر چلے گئے۔ ساجد بھی مسکرانے لگے اور میں شاہین کی زیادتیوں کا خیال کرنے لگی۔

دوسرے دن کالج میں اتفاقاً نسرین سے ملاقات ہو گئی۔ ادھر ادھر کی باتوں میں اس کی نئی کتاب کا تذکرہ چھڑ گیا کہنے لگی شمیم میں نے وہ نئی کتاب تو کیا لکھی ایک مصیبت

مول لی ہے۔ اتنے تعریفی خطوط وصول ہو رہے ہیں کہ بس پڑھتی پڑھتی تھک جاتی ہوں اف!
مجھے تو لوگوں نے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا۔ لیکن نسرین میں نے کہا میرے بڑے بھائی تمہارے
افسانوں سے بہت چڑتے ہیں۔ کل چھوٹے بھائی سے بحث ہو رہی تھی کہنے لگے تمہارا اسلوب
انہیں بالکل پسند نہیں۔ بھائی کا نام سن کر نہ جانے کیوں نسرین کے لبوں پر ایک مسکراہٹ
سی پھیل گئی۔ میری توقع کے خلاف وہ مسکرا رہی تھی وہ دھیمے لہجہ میں کہہ رہی تھی چلو دنیا
میں ایک تو ایسا ہے جو میری برائیاں گنوا سکے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سیدھی راہ دکھا سکے۔

اسی شام کو ریحانہ نسرین کے افسانوں کے مجموعے کی ورق گردانی کرنے لگی تو شاہین
ادھر سے آ گئے اور بولے ریحانہ اس کتاب کی مصنفہ کو میں نے دیکھ پایا ہے ان کے انداز
بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں نیچا دکھانا چاہتی ہیں۔ ریحانہ نے اشتیاق سے پوچھا "کیسی ہے
وہ" میں بھی ہمہ تن گوش تھی " بالکل بدصورت تم دیکھو گی تو ڈر جاؤ گی بھولی ریحانہ
نے یقین کر لیا۔ کہنے لگی" ہاں بھیا افسانوں میں پڑھ رہا تھا کہ لوگوں نے مصنف کے حسین
خیالات پڑھ کر خوش کن تصورات باندھے اور خیالی تصویریں بنائیں مگر جب اصلی
صورت دیکھی تو ساری امیدوں پر پانی پھر گیا بلکہ اپنے خیالی تصویر کو اصلیت سے
ٹکراتا دیکھ کر گھبرا گئے ـــــ ارے ہے کیا نسرین ایسی ہی ہو گی ـــــ" ادھر میں شاہین
کی تصوری نسرین کا جس کی سیاہ رنگت چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیلے ہوئے ہونٹ اور
موٹی سی ناک ہو گی۔ کالج کی بھولی بھالی نسرین کا مقابلہ کرنے لگی۔ سلونی سی رنگت۔
ہنس مکھ اور سیدھی سادی سی لڑکی کبھی رباب خاموش ہو کئی نغموں کی مٹھاس لئے کر چپ
رہے اور کبھی محشر خیال۔ جب کبھی میں نسرین سے گھر کا ذکر کرتی وہ بڑی توجہ اور
دلچسپی سے سنا کرتی مگر پوچھتی کچھ نہ تھی جیسے کوئی جھجک ہو ـــــ اب میں اور نسرین
تری گھنٹے ایک ساتھ ہی گزارا کرنے۔

صبح ہی صبح میں اٹھ کر کتابیں ٹٹولنے لگی۔ امی دالان میں بیٹھی نہایت خوش
الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ ریحانہ ابھی بستر پر لیٹے آنگن میں
موتیا کے سفید سفید پھولوں کو دیکھ کر بحال ہو رہے تھے۔ آم کے پیڑوں میں کوئل
کوک رہی تھی اتنے میں شاہین کی گونجیلی آواز سنائی دی۔ صبح ہی صبح جانے کیا کام ہے
ہیں۔ میں نے سوچا منجن سے بری طرح دانت مانج کر آنگن میں گلگلا رہا ہے تھا

تھیں۔ ساجد چڑ گئے "ارے یہ کیا بد مذاقی کا ثبوت دے رہے ہو کیسی غیر شاعرانہ حرکت ہے"
انھوں نے بیزاری کے لہجہ میں کہا۔ ظاہر ہے "میں نسرین نیازی صاحبہ کی طرح کوئی افسانہ
نویس ہوں اور نہ شاعر جو ہر وقت پھونک پھونک کر قدم رکھوں" ایسی چھوٹی چھوٹی
باتوں کا لحاظ کرنا تو شاہین کے مذہب میں کفر ہے۔ فرش پر جوتوں سمیت چہل قدمی کرنا
سنگار میز پر تیل انڈیل دینا اور سگریٹ زمین پر پھینک پھینک کر پیروں سے کچل
دینا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ بھیا میں کہتی ہوں لڑکیاں ان باتوں سے سخت چڑتی ہیں
برائے خدا ایسی باتیں چھوڑ دیجئے وہ کہتے لڑکیاں تو میرے حصہ میں ہیں نہیں صرف
ایک لڑکی آئے گی اسے بس دو دن میں سیدھا کر لوں گا۔ امی جھنجھلا اٹھیں "ارے
یہ لڑکا ہے کہ طوفان بے تمیزی اتنا بڑا ہوا ہے مگر بچپن نہیں گیا۔ ابھی حال میں شفقت
مرزا شادی کی بات چیت کرنے آئے تھے۔ اتنی پیاری سی بچی کو تجھے بیاہ ہوں تو غریب پر
ظلم ہی ہوگا۔" لیکن جب شاہین امی کو منا لیتے تو ان کا غصہ رفو چکر ہو جاتا اور وہ
انہیں دعائیں دینے لگتیں۔ شاہین تھے بھی کچھ عجیب سے بھلا پھسلا کر چاہے جتنا
کام نکال لو اف نہ کریں گے۔ چاہے کتنا مذاق کر لو ہرگز برا نہ مانیں گے بلکہ الٹا
ہم ہی کو بنا کر رکھ دیں گے وہ زندگی کو عجیب ہی پہلو سے پیش کرتے باوجود چھوٹے
چھوٹے اختلافات کے شاہین کے بنا گھر بھر سونا رہتا۔ ساجد بھی باوجود اپنی نفاست
پسندی کے شاہین کے بغیر خوش نہ رہ سکتے تھے۔ ابا ہمیشہ دورے پر رہا کرتے ان کے آنے
پر شاہین کی لاپروائیوں کو گویا چھٹی مل جاتی اور وہ ایک سعادتمند بچہ کی طرح نظر آتے
اسی لئے ابا ساجد سے کچھ زیادہ ہی شاہین کو عزیز رکھتے۔ دوپہر کا وقت تھا گرمی کی وجہ
سے سب اپنے اپنے کمروں میں چپ چاپ تھے کوئی دراز تھا کوئی نیم دراز۔ یکایک
باہر گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ شاہین دوڑے گئے۔ تھوڑی دیر
میں ابا کی اٹاچی کیس لے کر داخل ہوئے پردے کے پیچھے سے ابا کا تھکا ماندہ چہرہ
نمودار ہوا۔ ہم سب دوڑ پڑے ہیں۔ یہ بے وقت ابا کیسے نہ خط نہ کوئی اطلاع۔ ابا نے
ہمیں اطمینان دلایا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر انھوں نے اپنے بے
وقت آنے کا سبب بیان کیا۔ ابا کے دوست شفقت مرزا وعدہ کر چکے تھے کہ شاہین

لڑکی بڑی حسین ہے انھوں نے بچپن میں اسے ایک دفعہ دیکھا تھا صرف شاہین کے بی۔ اے کر لینے کا انتظار تھا۔ شفقت مرزا کا آبائی مکان بجواڑے میں تھا وہ ہم سے کوسوں دور تھے اس لئے میں اور ریحانہ کبھی نگہت کو دیکھ نہ سکے مگر پھر بھی اطمینان تھا کہ امی کی پسند میری نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان دنوں حالات کچھ ایسے آپڑے تھے کہ شفقت مرزا اپنا وعدہ نباہنا مشکل تھا۔ نگہت کے چچا زاد بھائی نے باضابطہ الٹی میٹم دیدیا تھا کہ اگر نگہت کا بیاہ سوائے ان کے کہیں اور کیا گیا تو وہ عین شادی کے وقت بد نظمی پیدا کر دیں گے اور نگہت کو زبردستی ساتھ لیجائیں گے۔ شفقت مرزا جائداد کے بارے میں اپنے بھتیجہ سے ناخوش تھے۔ انھوں نے سوچ بچار کے بعد یہی طے کر لیا کہ خفیہ طور پر نگہت کا نکاح شاہین سے کر دیں۔ شاہین بعد بھی تعلیم حاصل کر سکیں گے تو گویا پرسوں میں تاریخ مقرر کر آیا ہوں" ـــــ ہیں! ابا پرسوں لیکن اس دن تو میرا فائنل کا امتحان ہے۔ اے ہے غضب ہو گیا۔ کیا تاریخ بڑھ نہیں سکتی ـــ؟" بیٹی موجودہ حالات کی بنا پر تم ہی دیکھو نا کیسی مجبوری ہے۔ تو کیا میں اپنے بھائی کی شادی میں نہ جا سکوں گی میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اتنے دنوں کے ارمان۔ امی نے موقع کی نزاکت میرے ذہن نشین کرتے ہوئے کہا۔ بیٹی ہم رسومات یہاں آکر کریں گے ریحانہ بھی مجھ سے ہمدردی کرنے لگی۔ بھیا تو جیسے مجھے چمکارنے لگے۔ دوسرے دن ضروری سامان کے ساتھ گھر بھر سدھارا اور میں امتحان اور کتابوں کو کوستی رہی۔ امی ریحانہ۔ ساجد شاہین برابر مجھ سے خط لکھتے اور ہر شخص اپنی بساط کے موافق میری تسلی کرتا۔

ہفتہ بھر بعد اس مختصر سے قافلے کے لوٹنے کا تار وصول ہوا۔ شام کی ٹرین سے آرہے تھے۔ میں سارا دن بھر سرگرم رہی کبھی شاہین و نگہت کے کمرے کو سنوارتی کبھی نوکروں پر احکام جاری کرتی۔ خدا خدا کرکے شام ہوئی۔ اب مجھے انتظار تھا ہر لمحہ انتظار اف اتنی ربر کیوں ہو گئی۔ شاید گاڑی لیٹ ہو گئی ہو۔ نگہت بھابی کیسی ہونگی بھیا کے کیا خیالات ہوں گے ان کے متعلق ـــــ پسند بھی آئی ہوں گی کہ پھر کچھ نہ کچھ نکتہ چینی ـــــ اتنے میں وہ مختصر سا قافلہ آن پہنچا میں ان سب کا استقبال کرنے صدر دروازے کی طرف دوڑی آن کی آن میں گھر مختلف اونچی نیچی آوازوں سے گونجنے لگا۔ سرخ لباس میں بھابی ریحانہ کا ہاتھ تھامے سر جھکائے خراماں خراماں چلی آرہی تھیں

میں نے شاہین کے چہرے پر نظر ڈالی، اوہ! کتنے مسرور تھے حضرت! آنکھوں میں ایک طمانیت انگیز خوشی تیر رہی تھی۔ "ارے پہلے میری شمو کو دکھا دو دلہن اس نے نگوڑے امتحان کے پیچھے کتنی بڑی قربانی کی ہے۔ امی کہہ رہی تھی۔ ریحانہ نے بھابی کے چہرے سے گھونگٹ اٹھایا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ صرف سیاہ بال اور ایک دراز سی مانگ دیکھی میں نے بیقراری سے تھوڑی پکڑ کر چہرہ بلند کیا —— ہیں! نسرین —— ! میرے دماغ میں کئی ستار ایک ساتھ جھنجھنا اٹھے —— کون نسرین؟! شاہین حیرانی سے پوچھ رہے تھے۔

غزل

بال و پر ٹوٹے ہیں کیوں پرواز کی طاقت نہیں
ہمنشیں کیا سیر گلشن کی ہمیں حاجت نہیں!

رفتہ رفتہ درد کا احساس ہی جاتا رہا
ہم نے اس دنیا میں جھیلی کونسی آفت نہیں

پھر جگر کو خون آشامی کا سودا ہو چلا
حال دل یہ ہے کہ اس کی ہیئت حالت نہیں

کاش احساسات سے انسان ہوتا بےنیاز
کونسی راحت یہاں منت کش آفت نہیں

ضبطِ غم سے کام لینا ہی شعار اس کا رہا
درد کے اظہار کی ریحانؔ کو عادت نہیں

ریحانہ

ازدواجی زندگی

نجم السحر (وقارآباد)

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب! آپ نے مندرجہ عنوان سے طبقہ نسواں کے ہردلعزیز پرچہ شہاب میں بڑی دلچسپ بحث چھیڑ دی ہے۔ مردوں کی طرف سے لکھے ہوئے مضامین پڑھیئے تو عورت گردن زدنی معلوم ہوتی ہے اور اگر عورتوں کی بحث سنو تو مرد ابوجہل کی ذریات سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بحث کا سلسلہ لامتناہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ کوئی ہستی غیر جانبدار نہیں مل سکتی جو فریقین کا جھگڑا چکانے میں بطور حکم کام دے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ آگ دونوں طرف بھڑکتی ہی رہے۔ جذبات مشتعل ہوتے رہیں اور منافرت میں اضافہ ہوتا ہی رہے۔ اب ہم ایک خطرناک پل صراط پر کھڑے ہیں جہاں معمولی سی بھی لغزش ہمیں تحت الثریٰ کو پہنچا دیگی اس کے بعد پھر اپنے مقام پر لوٹ کر آنا تقریباً ناممکن ہوگا اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ جلے پھپھولے پھوڑنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں عقل سلیم سے کام لیں اور سوچیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے! پہلے ہمیں مساوات اور آزادی کے معنی اور مفہوم کو متعین کر لینا چاہیئے۔ جب ہم ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ کیا اس سے ہمارا مطلب یورپ اور امریکہ کی وہ آزادی و مساوات ہے جو وہاں کی عورتوں کو حاصل ہے تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم میں سے ایسی کتنی بہنیں ہیں جو اس قسم کی آزادی و مساوات کو حاصل کرنا چاہتی ہیں آزادی و مساوات کے سب سے بڑے علمبردار امریکہ کا کیا حال ہے؟ بہت سی بہنوں کی نظر وہاں سے وہاں کے حالیہ اعداد شمار گزری ہوں گے کہ وہاں عورت کی شادی کی عمر کا اوسط بائیس سال اور طلاق کی عمر کا اوسط ستائیس سال ہوتا ہے کیا یہی وہ سکھ شانتی کی زندگی ہے جس کے پیچھے ہم دوڑ رہی ہیں؟ پھر آخر بات کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ مردوں کے مسلسل ظلم زیادتی، جبر و تشدد اس خطرناک ردعمل کا باعث ہیں اب ہر دو نے مل کر ایک مذموم دائرے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ظلم و زیادتی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس ظلم و زیادتی کے احتجاج میں سرکشی حد سے متجاوز ہو رہی ہے آخر اب بھی اس کی روک تھام نہ کی گئی اور اس پر قابو نہ پالیا تو نتیجہ معلوم۔

قطع نظر اس کے کہ مردوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا اور کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے فرقہ کی اس طرح تنظیم کرنی چاہیئے کہ کوئی ہماری طرف انگلی نہ اٹھا سکے۔ برائی کا جواب برائی سے دینا عقلمندی اور بردباری سے بعید ہے۔ بلکہ اس کے لئے وہ حربے استعمال کئے جائیں جو قدرت نے ہمیں دئے ہیں اور جن کو ہم نے بھلا بیٹھا ہے۔ ہم اپنی پوشیدہ اور مقناطیسی قوتوں سے بے خبر ہیں۔ اس لئے خود کو مجبور اور بے بس سمجھ کر ہنگامہ آرائی پر اتر آتی ہے جس سے بات کا بتنگڑ بن جانا اور اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔

قانون قدرت کو کون بدلے کہ نر بالالتزام مادہ سے زیادہ قوی ہوتا ہے یہی قوت ہے جس سے اس کی بہیمیت کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ تو انسان ہے جو اپنی تعلیم تربیت اور رواج کی وجہ اس بہیمیت کا کم از کم مظاہرہ کرتا ہے وہ اپنی فطرت اور قانون قدرت سے مجبور ہے کہ کمزور کے مقابل اپنی قیادت کو تسلیم کرائے۔ دنیا میں سب سے کمزور ہستی سے اس کا جو سابقہ پڑتا ہے وہ اس کی بیوی ہوتی ہے اس لئے یہ ایک فطری بات ہے کہ خود کو حاکم محسوس کرے۔ اگر آپ اس کو دماغ سے اس احساس برتری کو دور کرنا چاہیں تو بجائے اس کے کہ اس سے برسر پیکار ہو جائیں۔ آپ قانون قدرت کو بدل ڈالئے۔ مرد سے بے نیاز ہو جایئے اور بتلایئے کہ عورت ہر وہ کام کر سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی تو پھر آپ کہہ سکتی ہیں کہ عورت ہر لحاظ سے مرد کے مساوی ہے۔ کہنے کی کیا ضرورت ہے آپ خود ساری دنیا پر مسلط ہو جائیں گی۔ رہا اس قانون قدرت کے تحت رہ کر غلبہ پانا یا ہر لحاظ سے مساوات کا درجہ پانا تو اس کے لئے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک امریکہ کو دیکھئے۔ زمانہ دراز سے علم کی افراط اور عورت مرد کے مساوات کے باوجود کیا آپ مجھے تبلا سکینگی کہ وہاں سے عورتوں میں کتنی فوجی جرنیل، کتنی مشہور ڈاکٹر، کتنی شہرۂ آفاق سائینس دان، کتنی بڑی وکیل، کتنی سیاست داں اور کتنی مدبر پیدا ہوئیں۔ اکا دکا مثالیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ یہاں ہم یہ شکایت کرتی ہیں کہ نہ مرد ہمیں پڑھنے دیتے ہیں اور نہ ترقی کرنے دیتے ہیں، جہاں پڑھنے دیا گیا اور ترقی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی گئی تو وہاں کیا تیر مارا جو یہاں بھی ان کی تقلید کر کے آدھی تیتر اور آدھی بٹیر ہونا چاہتی ہیں۔ بیشک بلحاظ انسان دونوں یعنی مرد اور عورت مساوی ہیں مگر دونوں کے وظائف و فرائض جداگانہ ہیں جو ایک دوسرے کا تتمہ ہیں۔ ایک دوسرے کی امداد بغیر زندگی اجیرن

ہو جائے - دنیا کی ترقی اور نشو ونما رک جائے - اس شیرازہ کو بکھرنے سے روکنے کے لئے جس طرح ایک سلطنت کو ایک بادشاہ یا صدر کی ضرورت ہوتی ہے یا ایک محکمہ کے لئے ایک عہدیدار کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح ایک گھر کے لئے ایک حاکم کی ضرورت ہے - اگر ہم نے بلحاظ ضرورت و مصلحت اس منصب کو مرد کے سپرد کر دیا تو کونسی بڑی قباحت ہے نہ اس سے ہماری صنف کی توہین ہوتی ہے اور نہ اس سے ہم میں احساس کمتری پیدا ہونا چاہئے - واقعہ یہ ہے کہ جس طرح آج کل کسی ادارہ کا صدر صرف برائے نام ہوتا ہے اور سارا کام اس کا معتمد یا وزیر ہی انجام دیتا ہے اس طرح آپ بھی صلاحیت ہو ——— اور ہونی کیوں نہ چاہئے کیونکہ یہ تو فطرت سے ہر عورت کو ودیعت ہے - تو آپ ہی سارے کاروبار کی مالک و مختار ہیں - ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ اپنے صبر کے مادہ کو ذرا بڑھائیں فوری مشتعل ہونے سے پرہیز کریں اور مرد کی فطرت کا غور سے مطالعہ کریں - یہ صحیح ہے کہ کہنا آسان اور کرنا مشکل ہے مگر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں کوئی چیز بغیر محنت اور ایثار کے حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے اس کے حصول کے لئے اگر دل پر تھوڑا سا جبر کرنا پڑے تو کرنا چاہئے کیونکہ اس کے بعد ایسی دولت حاصل ہوگی جس سے تمام زندگی سکھ نصیب ہوگا - میں آپ سے بالکل متفق ہوں کہ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک کٹھور، ظالم اور فرعون بے سامان مرد ہے مگر ایسے ہر فرعون کے لئے اگر کوئی موسٰی ہو سکتا ہے تو وہ صرف عورت ہی ہو سکتی ہے - میں یہاں ان تفصیلات میں نہیں جانا چاہتی کہ شوہر کو اپنے اعتماد میں لینے اس کو ہم آہنگ بنانے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے اور کس طرح پیش آنا چاہئے کیونکہ اس کو ہر مرد کی فطرت عادات اور خاندان کے اصول کے لحاظ سے اختیار کرنا پڑے گا - معمولی سمجھ بوجھ کی عورت بھی چند دنوں کی یکجائی کے بعد معلوم کر لے سکیگی کہ اس کو گھر کی ملکہ بننے کے لئے کیا راہ عمل اختیار کرنا چاہئے - اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ فریب اور مکر اختیار کیا جائے بلکہ اس کے برخلاف جو کچھ کیا جائے خلوص و محبت سے کیا جائے - ہمیشہ بڑا اور معاف کرنے والا دل رکھا جائے -

شادی کا ابتدائی زمانہ ہی نہایت کٹھن اور دشوار زمانہ ہوتا ہے اگر اس وقت ہمارے قدم نہ لڑکھڑائے تو ہم نے میدان جیت لیا اور بیڑا پار ہے - یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مرد عورت کو سبز باغ دکھلاتے ہیں - اس کے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے ہاتھ میں سورج لا رکھنے کا عہد کرتے ہیں - اس کی ہر آرزو کی تکمیل کا وعدہ کرتے ہیں اور اس کے اشارہ پر

پر چلنے کا لطف اٹھاتے ہیں مگر چند دنوں کے بعد جب یہ کیف و سرور دور ہو جاتا ہے تو نہ یہ التفات والہانہ باقی رہتے ہیں اور نہ وہ نوازشات دلربایانہ۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہم سے متنفر یا بیزار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ ایک فطری تقاضہ کے تحت کیا۔ اس طرز عمل کو اس شدت کے ساتھ ہمیشہ کے لئے قایم رکھنا اس عملی دنیا میں ناممکن ہے اس لئے کسی قصے یا سینما کی رومانی زندگی کو اپنا مطمح نظر بنانے کی بجائے خود کو عملی زندگی کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ مرد کے عالم بیخودی میں کئے ہوئے تمام وعدوں کو بھلا دیا جائے اس کی اس فطری کمزوری کو معاف کیا جائے۔ ہماری یہ خواہش کس حد تک واجبی ہے کہ شادی کے ہفتہ عشرہ بعد ہی ہم تمام سفید و سیاہ کی مختار ہونا چاہتی ہیں۔ مختار تو ہمیں ہونا گی اور ہو کر رہیں گی مگر اس کے لئے ذرا صبر سے کام لینا ہوگا۔ جب شوہروں کو ہمارا اعتماد ہو جائے تو ایسا کونسا آنکھوں کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہوگا جو اپنی ملازمت یا کاروباری جھگڑوں کے علاوہ گھر کے حساب کتاب میں بھی اپنی ٹانگ اڑائیگا۔ تمہارے حسن انتظام اور تمہاری سلیقہ شعاری کا وہ بدل ممنون ہوگا اور کوئی کام بلا تمہارے مشورہ کے انجام نہ پائے گا۔

میں تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ مرد کی فطرت بالکل بچہ کی فطرت ہوتی ہے وہ فطرتاً ضدی ہوتا ہے، جس چیز سے تم منع کرو وہ اس کو عمداً کرنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی توفیت اور بڑائی جتانا چاہتا ہے۔ اس لئے جس طرح بچہ پر حکمت عملی سے قابو پایا جاتا ہے اسی طرح مرد پر بھی قابو پانا نہایت آسان ہے۔ مثلاً تم نے میاں سے یہ خواہش کی کہ میکہ جانا چاہتی ہو اس وقت صاحبزادے دفتر سے تھکے آئے تھے یا عہدہ دار نے ڈانٹ پلائی تھی یا اپنے شریک کار سے کچھ گلنپ ہو گئی تھی اس لئے خراب موڈ میں تھے چھوٹتے ہی کہہ دیا کہ کوئی ضرورت نہیں یہ جواب تم پر بجلی بن کر گرے گا۔ اگر تم اس کو اپنی ہتک اور توہین سمجھ کر بپھر جاؤ اور جواب دو کہ جاؤں گی اور جا کر رہوں گی یا جا کر بتلاؤں گی تو پھر پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ اب یہ قصہ جتنا طویل کھینچے اور جو کچھ ایک دوسرے کی زبان سے سخت سست نکلے وہ کم ہے۔ دیکھنے کو تو معمولی سی بات تھی مگر یہیں سے خانہ ناتہ کا سنگ بنیاد

رکھا جاتا ہے۔عورت مرد کو بیدرد اور کٹھور سمجھتی ہے اور مرد عورت کو سرکش اور لاپروا تصور کرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی عینکوں سے دیکھنا شروع کرتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے۔ مرد اپنے چوڑے چکلے سینے، قوی بازو، مضبوط گردن اور اونچی آواز کے زور پر یہ چاہتا ہے کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل ہو، باوجود اوس کے غیر متوقع اور تکلیف دہ جواب کے سننے کے اگر تم دل پر جبر کرکے ابرو پر شکن ڈالے بغیر کہدو کہ اچھی بات ہے یا جیسی آپ کی مرضی تو پانچ دس منٹ کے بعد جب صاحبزادے کے دماغ پر سے بخارات نکل جائیں گے تو وہ خود ڈرائیور کے نہ ہوتے کے باوجود خود موٹر چلا کر تمہارے میکہ پہنچا دیں گے یا ٹانگہ یا رکشا لاکر سائیکل پر سسرال تک ساتھ آئیں گے۔ اور واپس ہوتے ہوئے تمہیں خوش کرنے کے لئے کہیں گے آج میرا ارادہ تمہیں سینما لیجانے کا تھا مگر تم ضد کرکے یہاں آئیں اس لئے میں اکیلا ہی جاتا ہوں۔خدا حافظ ۔تم اپنی جگہ خوش وہ اپنی جگہ خوش۔بات آئی گئی۔مضمون کافی لمبا ہوگیا۔ اب خدا حافظ۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۴) توکرا الگ بیزار اور ہر وقت بھاگ کھڑے ہونے پر تیار۔حیرت ہوتی ہے ان لوگوں کو دیکھ کر جو ہر وقت ہنستے ہیں اور ہنساتے بھی ہیں۔چاہے ان نے دل پر کچھ ہی بیت جائے۔ مگر ظاہرا یہی کہتے نظر آئیں گے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ایک ہم ہیں کہ ہماری ہنسی بھی رونے سے بدتر ہے
کبھی تقدیر کا رونا کبھی تدبیر کا شکوہ

زندگی ہے کہ گھسٹم پشتم کسی نہ کسی طرح گذرتی ہی چلی جارہی ہے۔نہ مستقبل کا اندازہ نہ منزل کا پتہ۔

آسیب زدہ گھر (افسانہ)

رقیہ کلیہ اناث

دو مہینے تک کشمیر کی سیر کرنے کے بعد دہلی و آگرہ کی قدیم شاہانہ عمارتوں کی شان وشوکت کا مطالعہ کرتے ہوئے میں اور میری عزیز رفیق زندگی نسیمہ حیدرآباد واپس آئے۔ ہمارا مکان آبادی سے دور ایک خوش گوار فضاء میں آباد تھا۔ جسے ہم نے اپنی ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی بسایا تھا اس کا بنانیوالا فن تعمیر کا ماہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہ مکان ہر پہلو سے بہترین خصوصیات لئے ہوئے تھا لیکن قسمت کہئے یا آفات ناگہانی کہ مالک مکان اس مکان میں قدم رکھتے ہی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ اس وقت سے اس مکان میں کسی نے آکر رہنے کی جراءت نہ کی تھی۔

میں ارواح کا قائل تو تھا لیکن معمولی واقعات کو آسیب کا اثر سمجھ کر جاہلوں کی طرح ایمان نہ لاتا تھا۔ چنانچہ میں اور نسیمہ اس مکان میں ایک سال سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب دو ماہ کی سیر و تفریح کے بعد ہم جس وقت حیدرآباد پہنچے تو شام کا وقت ہو چلا تھا۔ مکان پہنچتے پہنچتے تک اندھیرا چھا گیا۔ مکان دور سے تاریکی میں سپید دیو کے مانند نظر آرہا تھا نسیمہ گوکہ بہادر عورت تھی لیکن ارواح خبیث۔ وہ بھی خائف رہتی تھی۔ خیر جب ہم گھر پہنچے تو تاریکی چہار طرف مسلط تھی۔ مکان کا قفل کھولا گیا ساتھ ہی بجلی کا سوئچ دبایا۔ لیکن بجائے روشنی کے ایکایک گھڑگھڑاہٹ شروع ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں مختلف قسم کی آوازیں کمرے میں گونجتی سنائی دیں۔ نسیمہ تو فرط خوف سے چیخ اٹھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تاکہ اسے قدرے اطمینان حاصل ہو۔

آوازیں مسلسل جاری تھیں کبھی ایکدم اونچی ہو جاتیں کبھی مدھم پڑ جاتیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مختلف قسم کے جنگلی جانوروں کو ایک پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے جہاں وہ اپنی آزادی کے لئے چلا رہے ہیں۔ آوازوں کا شور کچھ مدھم ہوتا گیا۔ یکایک ایک کرخت مردانہ آواز کمرے میں گونج اٹھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ آوازیں اس دنیا کی نہیں بلکہ کسی اور ہی دنیا کی ہے۔ آواز چلا رہی تھی "نکل جاؤ، چلے جاؤ۔ ورنہ ورنہ . . . . . . آواز فرط جوش سے خاموش ہو گئی۔ اس وقت میرا اور نسیمہ کا

برا حال تھا۔ نسیمہ عورت ہونے کی وجہ سے فطرتاً مجھ سے کمزور تھی۔ مارے خوف کے اس کے حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بمشکل اس نے اتنا کہا "دیکھا ہماری غیر موجودگی میں بلاؤں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ یکایک وہی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی "تم .... تم نے ہمارے گھر کو ناپاک کیا ہے۔ تمہیں اپنے بچہ کی قربانی دینی ہوگی" تاریکی چوطرف چھائی ہوئی تھی۔ تارے بھی ہم سے روٹھ کر بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ لیکن نسیمہ کے سرد ہاتھوں اور کپکپی سے میں نے محسوس کر لیا کہ نسیمہ کا نازک دل بری طرح دھڑک رہا ہے

میں عجیب تذبذب کی حالت میں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھر میں کیا اندھیر مچی ہے۔ پھر آوازوں کے مدھم سے شور میں وہی آواز کڑکتی ہوئی سنائی دی "انتقام! انتقام! یکایک وہی بھیانک آوازیں بڑھنی شروع ہوئیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جنگل میں طوفانی بارش ہو رہی ہے اور درخت پہاڑ، دریا اور چرند و پرند سب مل کر چلا رہے ہیں۔ یہ آوازیں تقریباً پانچ منٹ تک جاری رہیں لیکن یہ پانچ منٹ ہمارے لئے پانچ سال بن گئے۔ رفتہ رفتہ یہ آوازیں مدھم ہوتی گئیں اور ان آوازوں کے درمیان ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آنے لگی وہ بھی آخر کار غائب ہو گئی فضا ایسی ہو گئی تھی جیسے بادل خوب برس برس کر خاموش ہو گئے ہوں اتنے میں ایک سریلی نسوانی آواز نے ہمیں چونکا دیا "یہ لکھنؤ ہے اس وقت ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ ابھی آپ نے آغا حشر کا لکھا ہوا ہندوستانی ڈراما "آسیب زدہ گھر سنا" اب ماسٹر مدن لال آپ کو ٹھمری سنائیں گے یہ۔ اب مجھ پر راز کھلا کہ میں نے روشنی کا سوئچ دبانے کے بجائے ریڈیو کا سوئچ دبا دیا تھا۔ اب میرے اور نسیمہ کے قہقہے کمرے میں گونجنے لگے یہ بھی خوب الو بنے"۔

سال ختم ہو رہا ہے جن کے ذمہ چندہ اداشدنی ہے براہ کرم ایصال کر کے ہماری اعانت فرمائیں

بوکھلاہٹ

صغرا عبد السبحان

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم پر اس قدر بدحواسی کیوں چھائی رہتی ہے ذرا ذرا سے کام کا فکر اتنا رہتا ہے کہ نہ کھانا اچھا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنا بولنا بھاتا ہے بات کا بتنگڑ ایسا بنتا ہے کہ اللہ توبہ — کوئی کام آپڑا تو دل دھڑکنے لگا۔ اب کیسے ہو اور کیا ہو؟ کوئی بیمار ہوا تو دیوانوں کے جیسے پھرنے لگے۔ چہرہ فق۔ حال پریشان۔ بیمار سے زیادہ تیمار دار کو ہی سنبھالنے کی حاجت ہوگئی۔ تیاری سفر اور دوران سفر کی بوکھلاہٹیں تو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں گو ؎ وادئ شوق میں وارفتہ رفتار ہیں ہم۔

مگر حالت یہ کہ خود ہی پوچھنے کی نوبت آجاتی ہے ؎

بیخودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم

مہمانوں کی آمد اپنی جان پر۔ تو آئی سو آئی نوکر بیچاروں کی تو پوری شامت ہی سمجھئے۔ ارے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ پہلے وہاں جھاڑ دو دے۔ اچھا نہیں پہلے پانی ہی بھر لے۔ لوٹے خالی لڑھک رہے ہیں اور کمبخت نل بند ہونے کا بھی وقت سر پر آکھڑا ہوا۔ یا الٰہی! بچے ہیں یا آفت کن مصیبتوں سے وہاں صفائی کرائی تھی اور یہ ننھے میاں نے وہیں کھڑے کھڑے جگہ پاک کر دی۔ ارے بابا! اس چاندنی پر تو رحم کرو۔ پاؤں تو دیکھے ہوتے اپنے؟ اللہ کس قدر گندگی ہے ان کی فطرت میں —— غرض کیا بتایا جائے ایک پریشانی سی پریشانی ایک آفت سی آفت۔ ہمارے نوکر بھی تو بیزار آجاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں پھلا دیتے ہیں ہم ان کے —— ذرا کسی کام میں دیر ہوتی ایک ہلچل مچ گئی۔ ارے کمبخت صاحب کے آنے کا وقت ہوگیا۔ وہ فلاں کام پورا نہیں کیا۔ بچے اب آیا ہی چاہتے ہیں اور چولہا ابھی تک ٹھنڈا پڑا ہے۔ ہماری ٹربونگ سے ان بیچاروں کی سمجھ میں بھی تو کوئی کام نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر سے سکون اور اطمینان کا کوسوں پتہ نہیں اور ہر وقت ایک عجیب ہنگامہ بدحواسی۔ سچ ہے ہم نے تو یہ شعر ورد زبان کر لیا ہے۔ ؎

گردش میں رکھنا تھا اور بنانا تھا جام ؎ انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

بچوں کی جان الگ ضیق میں۔ ہماری بوکھلاہٹ انھیں بھی ہر دم بوکھلائے دیتی ہے۔ نہ چین سے پڑھ سکتے ہیں نہ ہنسی خوشی کھیل سکتے ہیں۔ البقیہ ملاحظہ ہو [illegible]

رجسٹرڈ آصفیہ ۲۲

3238
RED. M.N.O

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب پیر پور سے شائع ہوا

شہاب
حیدرآباد دکن

شہاب

جلد (۱۵) خورداد ۱۳۵۶ف م اپریل ۱۹۴۷ء نمبر (۷)

(مرتبہ)

چندہ سالانہ (صہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

خاقانی - ابو العلائی - گنجوی (استاد خاقانی) ذو الفقار شروانی شاہفور وغیرہ یہ سب شعرا اوس کے خوان کرم کے ریزہ خوار تھے۔ منوچہر نے خود اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس بندرہ سطر کا خط لکھ بھیجا کہ "لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجیے"۔ جب یہ خط ملا تو نظامی کو تردد ہوا اتفاقاً ان کے فرزند "محمد" جن کی عمر (۱۴) سال کی تھی اوس وقت موجود تھے۔ اونھوں نے بھی تحریک کی۔ نظامی نے کہا کہ "جان پدر قصہ کی شہرت میں کلام نہیں لیکن جہان کی سرگزشت ہے وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ باغ و بہار چشمہ و سبزہ زار - رقص و سرود - شاہی دبدبہ و دربار - خیل و حشم - جاہ و جلال - کسی چیز کا پتہ نہیں - خشک ریگ زار - اور کوہستان میں کیا صنعت گری دکھاؤں گا۔ یہی راز ہے کہ آج تک کسی نے اس قصہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔" فرزند نے کہا کہ "یہ نہایت آدمی کا مقام ہے کہ موثر اور عجیب و غریب واقعہ نظم کی آرائش سے محروم رہ جائے"۔ غرض نظامی نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل شروع کی اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچایا۔ سال اتمام ۵۸۴ھ ہے اور اس کے صلہ میں شاہ سے خواہش کی کہ میرے لڑکے کو ولیعہد کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل فرمالیں۔ ۱۴ رمضان المبارک ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرب ارسلان کی فرمائش پر ہفت پیکر لکھی جس میں بہرام گور کا قصہ نظم کیا۔

قزل ارسلان کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجہ "محمد" ابن ایلدگز کا بیٹا ابو بکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا۔ نظامی کو اس خاندان سے قدیمی تعلق تھا۔ اوس وقت انھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں سلاطین وقت کی فرمائش سے لکھی تھیں۔ لیکن سکندر نامہ اپنی خواہش سے لکھ کر ابو بکر نصرۃ الدین کے نام سے معنون کیا یہ کتاب ۵۹۹ھ میں ختم ہوئی۔ جب بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی تو علاوہ مقررہ رقم کے ایک گھوڑا - اور ایک بیش بہا خلعت بھی عطا ہوا۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت اون کی عمر (۶۳) سال کی تھی - چنانچہ جو بیان اور حکما کے مرنے کا عنوان قایم کیا ہے اپنے نام کی بھی سرخی قایم کرکے لکھتے ہیں ؎

نظامی چول این داستان شد تمام	بہ عزم سفر تیز برداشت گام
فزون بود شش از شصت سہ سال	کہ آہنگ عزم رہ برد حل زد دوال

اس شعر سے پتہ چلا کہ شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہو گیا - سال وفات میں سخت اختلاف ہے - دولت شاہ نے ۵۷۶ھ - تقی کاشی نے ۶۰۶ھ - اور جامی نے ۵۹۲ھ بیان کیا ہے لیکن اتنی قطعی ہے کہ انھوں نے سکندر نامہ ۵۹۹ھ میں تمام کیا۔ اس کے بعد اون کا انتقال ہوا ہے اور غالباً جیسی

قیدی کا روزنامچہ

جہاں بانو ایم-اے

جب پہلے پہلے میں نے غالبؔ کا یہ شعر سنا ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

تو سمجھ میں نہیں آیا کہ ناصح نے آخر کیوں انھیں قید کر دیا ــــ اور یہ جنونِ عشق کیا بلا ہے۔ ان کے انداز قید ہونے پر بھی کیوں نہیں چھوٹ سکتے۔ بھئی غالبؔ تو کبھی بری سمجھ میں نہ آسکا۔ اتنا اونچا ہو جاتا ہے بعض موقع پر کہ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود انسان گم ہو جائے۔ گویا اسی کی زبان میں ؎

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت!　　دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

حسرتؔ نے بھی تو قید کی سزائیں بھگتی ہیں۔ ان کو اس طرح سنا ؎

روح آزاد ہے، خیال آزاد　　جسمِ حسرتؔ کی قید ہے بیکار

روح کی آزادی کا کتنا تیکھا تخیل ہے ــ اور پھر ایک جگہ اسی "قیدی شاعر" نے یوں اپنی آزادی کو نظم کے سانچہ میں ڈھال دیا۔ ؎

آزاد ہیں قید میں بھی حسرتؔ　　ہم دل شدگانِ خود فراموش!

یہ مادہ کی قید۔ روح سے بھلا اس کو کیا واسطہ۔ تخیل کی جولانگاہ تو ویسے بھی اتنی وسیع ہے کہ قید کی محدود چار دیواری میں ہی اس وسعت و پنہائی کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ جیسے عالمِ تشنگی آب ہفت دریا کا تخیل ــــ حسرتؔ ایک سیاسی قیدی ہیں اور مجھے اس لئے قید کر دیا گیا کہ میں نے چوری کی ہے، ہاں چوری۔ کھانے کو نہ ملے تو پھر کوئی کیا کرے۔ اس تلخی کو پیٹ بھرے کیا جانیں۔ جن کو کبھی بھوکا رہنے کا اتفاق ہی نہ ہوا۔ دمشق میں جب قحط پڑا تو عشق کسی کو نہ سدھرا۔ میں نے ایک جرم کیا ہے۔ واقعی میں مجرم ہوں۔ چونکہ پڑھا لکھا چور ہوں منصف حکومت نے میرے ساتھ اتنی رعایت روا رکھی ہے کہ میں قید میں بیٹھے بیٹھے لکیر پیٹا کروں۔ آج ہی کے دن کے لئے تو بی۔اے کی ڈگری لی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد تو مجھے جوانی بھی نہ دیکھ سکے۔ امی نے کن مشقتوں سے میری پرورش کی۔ کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں انھوں نے۔ رات دن سلائی کر کے صحت و تندرستی اپنی ناس کر لی۔ بیمار رہنے لگیں۔

لیکن میرے خیال سے غافل نہ رہ سکیں - میرا بچہ ڈگری لے لے گا - کھٹ سے ملازمت مل جائے گی -
لیکن ایک اچھی سی دلہن لاؤں گی - دونوں کو خوش دیکھ کر میری دنیا ہنس پڑے گی - غرض کن
کن آرزوؤں اور تمناؤں سے یہ نخل مراد بار آور ہوا - ان کا جمیل گریجوئیٹ ہو گیا مصیبتوں
میں پل کر - مفلسی کا مطالعہ - اف - خدا دشمن کو نہ دے - یہ دن ! محنت ٹھکانے لگ گئی -
درجہ اوّل کی کامیابی ! خدا جھوٹ نہ بلوائے - کیسے نصیب ہوئی ہے - امّی خوشی سے دیوانی
ہو رہی تھیں - اور تو جگ - میں اپنا کوئی نہ تھا - جو اس مسرت بے پناہ میں حصہ لیتا - مجھے
تو کچھ ایسی خوشی نہ ہوئی - غم زندگی نے فلسفی بنا دیا تھا - مسرتوں میں لوگ خوش ہوتے ہیں
غم جھیلتے جھیلتے غالب کی طرح بے حس سا ہو گیا تھا - میں صرف سوچتا تھا کہ خوشی کے جذبہ
میں ایسی کیا کشش ہے جو بالکل کسی کو اپنا لیتی ہے - انسان دوسرے کا دکھ محسوس بھی نہیں کرتا -
میرا دوست محسن - اس کی ناکامی - اور میری کامیابی - مجھے اس کا دکھ کھلتا تھا - اپنی سرخروئی
کی وہ مسرت نہ تھی - خدا نے مسرت بھی دی تھی تو اس سے سوا غم دیا تھا ——

اب میں اس عظیم الشان کامیابی کے بعد کیا کرتا - ظاہر ہے کہ ملازمت - لیکن سچی قابلیت کا
کوئی قدر داں نہ ملا - میرا نفس باغی ہو گیا - آخر انسان ہوں - میں نے اپنے سامنے اپنی آنکھوں
سے یہ دیکھا کہ تھرڈ کلاس بی - اے کو دیکھتے دیکھتے ملازمت مل رہی ہے - اور میں اپنے درجہ
اوّل کو لے کر جیسے بس اب مجھے اس پر اترانا ہے - ناز کرنا ہے کہ میں نے درجۂ اوّل میں کامیابی
حاصل کی ہے - نفس جب باغی ہو جاتا ہے تو انسان کو کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا - میں آخر کب
تک مصیبتوں کی زندگی گزارتا - بیٹھے بیٹھے کلیجہ منہ کو آ گیا —— ہمارے پہننے کو کپڑے تک نہ تھے -
گھر میں بیٹھنے کو جگہ نہ تھی - اتنا مختصر سا گھر - بستر پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے - میری قمیص مرزا
قبا پیوند کی کثرت سے اسپ ابلق بن گئی تھی - ایک کوٹ - کب تک اسی کو پہنا کرتا - سگریٹ کے
تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا - یہ تو عیش و بیکاری کے شغل ہیں - سینما بینی کا ذوق کس کو
نہیں ہوتا - میں بھی جوان تھا - میری تمنائیں - میری خواہشات جوان تھیں - میری امنگوں کا
شباب تھا - آرزوئیں میرے بھی دل میں سر اٹھاتیں - کب تک دوست احباب کا احسان لیتا -
ان کے دکھائے ہوئے کھیل دیکھتا - آخر حمیت بھی کوئی چیز ہے - میں بھی کبھی کسی کے کام آؤں -
لیکن کب ؟ —— ؟

آدھی رات ادھر، آدھی رات ادھر امی کو سوتا پاکر چپکے سے میں نے دروازہ کی کنڈی

کھولی اور گھر سے نکل گیا۔ جیب میں قلم و کاغذ احتیاطاً رکھا تھا۔ ضمیر کچھ چپکے چپکے کہے جاتا۔ نفس اس کی آواز کو دبا دیتا۔ خیالی محل بہت اونچے ہونے لگے۔ پرسوں ہی محلہ میں ایک بڑی دھام دھام کی شادی ہوئی تھی۔ ڈھیروں جہیز ملا تھا۔ ایک ہی بیٹی تھی۔ لاکھوں کا جہیز لائی تھی۔ قدرت کسی کسی کو بے ضرورت بھی کتنا دیدیتی ہے۔ اور مجھ سے بھکاری کو۔ اُف۔ آنچ سی دل میں سلگنے لگی۔ قدرت سے بغاوت کی ٹھنی تھی۔ میں نے دیکھا۔ اونچا سا بنگلہ۔ سبز رنگ کا لیمپ کسی نے بجھا دیا کنجیوں کی آواز آئی۔ شاید سرہانے رکھدی تھیں کسی نے اپنی کنجیاں۔ میں نے رومیو جولیٹ کا ڈراما پڑھا تھا۔ کس طرح رومیو اپنی جولیٹ کے لئے جان پر سے کھیل جاتا ہے۔ بلندی و پستی کا احساس نہیں ہوا اس کو کبھی۔ میری جولیٹ تو میری روٹی تھی۔ میری بھوک تھی۔ میری تشنگی تھی۔ علم حاصل کیا تھا۔ قدرت سے اس کا مجھے معاوضہ نہ ملا۔ میں بھی باغی ہو گیا تھا۔ لیکن علم نے ایک گر بتایا تھا۔ تاہم بہیاں نیت۔ کون دیکھتا ہے۔ میں ایک اونچے سے نیم کے درخت پر چڑھ گیا جو مکان سے لگا ہوا تھا۔ اور چپکے سے غسل خانہ میں گھس گیا۔ آہستہ آہستہ خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ فتنہ دولت خوابیدہ تھا۔ میرے بخت بیدار ہو گئے۔ میں نے کنجیاں سرہانے سے نکال لیں۔ ساری پونجی میرے ہاتھ میں تھی۔ جلدی میں ایک چھٹی لکھی۔ "جتنی چیزیں چرائی جارہی ہیں۔ وہ پھر واپس مل جائیں گی۔ ضرورت نے مجبور کر دیا ہے۔ اگر آپ نے اس مال کی زکوٰۃ دی ہے تو قدرت کی جانب سے یہ مال مسروقہ واپس ہو جائے گا۔ ورنہ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ فقط چور!"

اس ترقی پسند زمانہ میں چوری یا کسی گناہ کو بھی اسی ترقی پسندانہ طریقہ سے انجام دینا ہی ایک انوکھی بات ہے۔

میری نیت واپس کر دینے کی تھی۔ میری نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ جونہی میں نے تجوری کی جانب قدم بڑھائے۔ کسی نے میرا بازو تھام لیا۔ اور ٹارچ سلگائی۔ چور گرفتار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ڈگری میں چوری کا سلیقہ کہاں سیکھا تھا۔ جو مجھے گرفتاری سے بچا لیتا۔ خیر۔ آہ اس طرح۔۔

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

صبح تک گرفتار رکھا گیا۔ نکلنے بھی دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صبح ہوتے ہوتے گرفتاری کے احکام آ گئے۔ حکومت نے سوال کیا۔ میں نے اپنی ساری کھڑاس نکالی۔ لیکن اب مجھے کون

نوکری دے گا۔ درجہ اوّل کی کامیابی نے یہ رنگ دکھایا تھا۔ مجلس میں قید ہوں۔ قیدی نمبر (۱۳) میرا لقب ہے۔ ایک شریف خاندان کا ہوں۔ لیکن اس وقت یہ سب بے معنی سی باتیں ہیں۔ چال چلن تو اس نوبت کے ثابت ہوئے۔ اب بیٹی کون دیتا۔ قیدی نمبر (۱۴) کی آج رہائی کا دن ہے۔ اس نے (۶) ماہ کی قید بامشقت کے بعد آج رہائی پائی۔ اور مجھے ایک سال کاٹنے ہیں۔ کچھ ہو حکومت اپنے ملزم کو بھوکا تو نہ رکھے گی۔ پیٹ کی آگ تو بجھ جائے گی۔ لیکن میری ماں —— اس کا کیا ہوگا۔ وہ مجھ سے ملنے آتی ہے اور میری قسمت پر رو دھو کر چلی جاتی ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ میں اس کی خاطر جینا چاہتا ہوں۔ اپنی روٹی میں سے آدھی ہم دونوں کھاتے ہیں۔ اس طرح زندگی کٹ رہی ہے۔ یہ ہے مکافاتِ عمل۔

دار مل ہی گئی منصور کو واعظ ورنہ　　　　کون دنیا میں محبت کا صلہ دیتا ہے

یاد ہوگا ۱۹۳۵ء میں جب کہ حضرت شاہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر ادام اللہ اقبالہٗ یورپ تشریف لیگئے تھے تو نواب شہید یار جنگ بہادر نے اپنی سیاحت سے متعلق دلچسپ تاثرات نہایت پُرلطف انداز میں لکھے تھے اب کی مرتبہ پھر نواب شہید یار جنگ بہادر شہزادہ موصوف کی معیت میں امریکہ جارہے ہیں توقع ہے کہ مستقبل قریب میں وہاں کے حالات شہاب کے صفحات میں آپ کی نظر سے گزریں گے ؞

براہ کرم [illegible] کیجئے۔

کوئی پرچہ [illegible] طلب فرمالیں اس کے بعد تعمیل ذرا مشکل ہی سے [illegible]

پردیسی آنکھیں

جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب سابق جج
ہائیکورٹ حیدرآباد دکن

شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا ہندوستان کا بادشاہ وقت اورنگ زیب ہے۔ یہ شہزادہ دوسروں سے مختلف مزاج رکھتا تھا۔ متانت اور رازداری لیکن ضبطی کے ساتھ اپنے معاملات کو انجام دیتا تھا۔ افسردہ مزاج۔ ہر دم مصروف انصاف رسانی اور صحیح احکام صادر کرنے کا متمنی رہتا تھا۔ بڑی خواہش یہ تھی کہ لوگ اس کو عقلمند۔ ذہین سا اور صداقت پسند باور کرتے رہیں۔ ایک حد تک فیاض بھی تھا۔ مناسب موقع پر انعام اور تحائف دیا کرتا تھا۔ ایک عرصہ تک وہ یہ ظاہر کرتا رہا کہ میں فقیر اور تارک الدنیا ہو گیا ہوں۔ تخت و تاج سے کچھ سروکار نہیں، عبادت اور ریاضت زندگی کا اصلی مقصد ہے۔

اگرچہ وہ دکن میں تھا پھر بھی اپنی بہن روشن آرا بیگم کے توسط سے دربار شاہی میں اپنے حقوق کی حفاظت کرتا رہتا تھا۔ یہ کام نہایت رازداری اور چالاکی کے ساتھ کیا جاتا تھا تاکہ دوسرے بھائیوں کو اس کا علم یا شبہ نہ ہو جائے۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ بادشاہ اس سے زیادہ محبت نہیں رکھتا۔ اس خوف سے کہ کہیں دکن کی حکومت سے نہ ہٹا دیا جائے اپنے ظاہرداروں سے رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ دارا نے خود بھی کئی دفعہ باپ سے کہا کہ میں اپنے کسی بھائی سے اتنا خوف نہیں کرتا جتنا کہ اس مُلّا اور نمازی سے۔

دربار میں اورنگ زیب کے اغراض کی حفاظت، اور اس کی بہن روشن آرا بیگم کیا کرتی تھی۔ یہ اگرچہ کہ زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن بہت ذہین۔ زندہ دل۔ ظریف الطبع اور اپنی بہن بیگم صاحبہ سے زیادہ شوقین مزاج تھی۔ البتہ رتبہ میں اس کی برابری نہیں کر سکتی تھی فی الجملہ وہ بیگم صاحبہ کی طرح نہ تو خود مختار تھی اور نہ اتنا اثر رکھتی تھی اور باوجود شاہی خاندان میں رشتے کے اس قدر اعتبار پیدا نہ کر سکی جتنا بیگم صاحبہ کا تھا۔ اگرچہ رازداری سے کام لیتی تھی پھر بھی دارا اور بیگم صاحبہ سے اس کی مخالفت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ محل میں رہنے کی وجہ سے اکثر اہم امور کی اطلاع اس کو ملتی رہتی تھی اور وہ اورنگ زیب کو خفیہ طریقہ پر ان باتوں سے باخبر رکھتی تھی۔

شاہ جہاں کا چوتھا اور سب سے چھوٹا بیٹا مراد بخش نہایت کم عقل تھا۔ عیش و عشرت شراب و کباب اور رقص و سرود کے سوا کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آتی تھی۔ نہایت شجیع اور جنگجو تھا۔ ہمیشہ شمشیر زنی کی مشق کرتا تھا اور تیر و تفنگ کے استعمال میں مہارت پیدا کر لی تھی مستقل اور جوشیلا شکاری تھا۔ بھیڑئے اور جنگلی سور کا مقابلہ نیزے سے کرتا تھا۔ یہ صفت اس کے کسی بھائی میں نہ تھی جنگ کے متعلق گفتگو بڑی دلچسپی سے سنتا تھا۔ اپنی قوت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ درباری سازشوں کی اہمیت خاطر میں نہ آتی تھی۔ یہ بات دل میں بیٹھی ہوئی تھی کہ میرے ید قدرت و شمشیر کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

شاہ جہاں کی چوتھی بیٹی مہر النساء بیگم تھی۔ یہ اپنے بھائی مراد بخش کی طرفدار تھی۔ کم سن اور کسی قدر خوبصورت تھی۔ زیادہ تر کھیل کود میں مصروفیت کی وجہ سے سیاسی معاملات میں بہت کم حصہ لیتی تھی۔

شاہی محل میں معمولاً مختلف اقوام کی دو ہزار عورتیں ہوتی ہیں۔ ہر ایک کے فرائض مقررہ ہیں۔ کچھ بادشاہ کی پیشی میں۔ کچھ اس کی بیویوں۔ بیٹیوں اور داشتاؤں کے پاس کام کرتی ہیں۔ داشتاؤں میں تنظیم قایم رکھنے کے لئے ہر ایک کا حصہ مکان الگ ہے اور نگرانی کے لئے مغلانیاں مقرر ہیں۔ اس کے ماسوا ہر داشتہ کے پاس دو یا بارہ مامائیں متعین ہیں۔ مغلانیوں کو عہدہ کی اہمیت کے لحاظ سے تین سو سے لیکر پانچ سو روپے مہینہ تک تنخواہ ملتی ہے۔ ان کے ماتحت جو مامائیں ہیں ان کو پچاس سے لیکر دو سو روپے مہینہ تک تنخواہ دیجاتی ہے مغلانیوں کے علاوہ ارباب نشاط کا انتظام رکھنے والی عورتیں الگ ہیں۔ ان کو بھی تقریباً وہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے علاوہ شہزادوں اور شہزادیوں سے انعام و اکرام الگ ملتا ہے ان میں سے بعض شہزادیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی ہیں۔ بالعموم شہزادیاں گلستان و بوستاں سے جو ایک شاعر سعدی کی تصانیف ہیں پڑھنا سیکھا کرتی ہیں۔

یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ محل کے اندر یہ عورتیں کس کس طرح بادشاہ کی خدمات انجام دیتی ہیں۔ جس طرح محل کے باہر عہدہ دار مقرر رہتے ہیں اسی طرح اندر عورتیں ہیں۔ بعض عورتیں اسی قسم کی خدمت ادا کرتی ہیں جس کے لئے باہر مرد مقرر ہیں۔ جب کبھی بادشاہ برآمد نہیں ہوتا اپنی عورتوں کے ذریعہ زبانی احکام باہر بھیجے جاتے ہیں۔ اس کام کے لئے عورتوں کا انتخاب نہایت احتیاط کے ساتھ

ہوتا ہے۔ یہ حاضر جواب صاحب فہم ہوتی ہیں، اور جو کچھ واقعات ملک میں پیش آتے ہیں ان سے باخبر رہتی ہیں کیونکہ باہر سے عہدہ دار واقعات کی تحریری اطلاع بادشاہ کے لئے اندر بھیجا کرتے ہیں اور ان کی ہدایت کے مطابق یہ عورتیں باہر جواب بھیجاتی ہیں۔ اس کام کے لئے خواجہ سرا بھی مقرر ہیں جو سربمہر کاغذات لاتے اور لیجاتے ہیں۔ مغل بادشاہوں کے ہاں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وقائع نویس اور خفیہ نویس اہم واقعات قلمبند کرکے ہفتہ میں ایک دفعہ رپورٹ کرتے ہیں یہ پرچہ دوپہر میں ایک بجے عورتوں کی زبانی بادشاہ محل میں سنا کرتا ہے۔ تاکہ اس کو معلوم رہے کہ سلطنت میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کے ماسوا مخبر بھی مقرر ہیں جو ضروری باتوں کی ہفتہ وار رپورٹ بھیجتے ہیں اور بالخصوص شہزادوں کے حالات لکھتے ہیں۔

بادشاہ نصف شب تک بھی کام کرتا رہتا ہے۔ وہ صرف تین گھنٹے سوتا ہے اور بیدار ہونے کے بعد عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جس میں ڈیڑھ گھنٹے لگتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ چالیس روز تک تزکیہ نفس کی خاطر گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ اس زمانہ میں زمین پر سوتا۔ روزہ رکھتا اور خیرات کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خداوند کریم سے اقبال مندی اور مقاصد کی بر آنے کی دعائیں مانگے۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کھاتا اور تین گھنٹے سوتا ہے خوابگاہ پر بہادر عورتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ یہ عورتیں تیر کمان اور دوسرے ہتھیاروں کا استعمال اچھی طرح کر سکتی ہیں۔

شاہی باورچی خانہ کے لئے روزانہ ایک ہزار روپیہ دئے جاتے ہیں۔ کارپردازوں کا فرض ہے کہ اس رقم سے ہر ضروری چیز مہیا کریں۔ مقررہ مقدار میں مختلف اقسام کے کھانے بادشاہ کے سامنے چنے جاتے ہیں۔ چینی کے برتن سنہری تپائیوں پر رکھے جاتے ہیں۔ اس کھانے میں سے بادشاہ اظہار خوشنودی کے طور پر اپنی بیویوں۔ بیٹیوں اور افسران محل کو تحفہ دیتا ہے۔ یہ عزت افزائی مہنگی ثابت ہوتی ہے کیونکہ جو خواجہ سرا تحفہ لے کر آتے ہیں معقول انعام لئے بغیر پیچھا نہیں چھوڑتے جب بادشاہ غیر ملک میں ہوتا ہے تو اشیاء کی گرانی کی وجہ سے اخراجات غیر محدود ہوتے ہیں، کیونکہ کھانے کی مقررہ اقسام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ محل میں بیویوں۔ بیٹیوں اور دوسری عورتوں کے اخراجات کے لئے مشاہرہ الگ الگ مقرر ہے۔

کشمیر کا سفر: موسم گرما قریب آ پہنچا تھا اس لئے ضروری تھا کہ ہندوستان سے سورج کی شعاعیں

تیز ہو جانے کے قبل کشمیر کا سفر اختیار کیا جائے - اس معاملہ میں بادشاہ نے اطباء اور بالخصوص
روشن آرا بیگم کے مشورہ پر عمل کیا - بیگم صاحبہ بہت بے چین تھیں کہ کسی طرح محل کی قید سے آزادی
ملے - اس کے ماسوا وہ چاہتی تھیں ایسی شان و شوکت کے ساتھ سفر کیا جائے کہ شاہ جہاں کے
زمانہ میں ان کی بڑی بہن نے بھی نہ کیا ہوگا - سفر کا ارادہ کر لینے کے بعد اورنگ زیب نے ایسے
وفادار افسروں کا انتخاب کیا جن پر اس کو کامل بھروسہ تھا - ہوشدار خاں کو آگرہ کا
صوبہ دار اور مرتضیٰ خان کو میر منزل مقرر کیا - خواجہ سرا اعتبار خان کو شاہ جہاں پر نگرانی
رکھنے کے لئے مزید ہدایات دے گئے -

چھٹی دسمبر ۱۶۶۲ء کو شام کے تین بجے دہلی سے بادشاہ روانہ ہوا - سارے نجومیوں
نے متفق طور پر بیان کیا کہ اس لمبے سفر کے لئے جس میں کم و بیش ایک سال کا عرصہ لگ جائے
یہی ساعت بہترین ہے -

شہر سے نکلنے کے بعد بادشاہ نے ایک وسیع باغ میں جس کو شالیمار کہتے ہیں رات بسر
کی - یہ باغ شاہ جہاں کا بنایا ہوا شاہی محل سے تین کوس لاہور کی سڑک پر واقع ہے یہاں
اورنگ زیب نے چھ روز قیام کیا تاکہ ہر شخص سفر کے لئے تیار ہو جائے اور تیاری کے
بعد لشکر میں شریک ہو تو سفر شروع کیا جائے -

سلطنت مغلیہ میں یہ دستور ہے کہ جب فوج سفر میں ہوتی ہے تو رات کو نو بجے نفیری
بجائی جاتی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ صبح کوچ نہیں ہوگا - چھٹی کی شام کو نفیری نہیں بجی
اور پیش خیمہ روانہ کر دیا گیا - یہ بات معلوم رہنی چاہئیے کہ سلطنت مغلیہ میں بادشاہ اور
دوسرے امراء خیموں کے دو سٹ رکھتے ہیں کہ ایک استعمال میں ہو تو دوسرا آگے بھجوا دیا
جائے شاہی خیمہ جات کی باربرداری کے لئے دو سو اونٹ اور پچاس ہاتھی مختص کر دئے
گئے تھے -

ساتویں دن صبح تین بجے کوچ شروع ہو گیا - پہلے نوبچی کلاں روانہ ہوا - یہ ہمیشہ
ساتھ رہتا ہے اور منزل پر بادشاہ کے استقبال کے لئے تیار رہتا ہے - اسی کے ساتھ ایک
خوبصورت کشتی ایک بڑی گاڑی پر رکھی گئی تھی تاکہ اگر کسی دریا کو پار کرنا ہو تو بادشاہ
کے استعمال میں آئے - توپ خانہ پیچھے تھا جو اسباب تھا - جب صبح ہوئی تو کیمپ تقریباً
خالی تھا - صرف رسالہ اور پیادہ فوج اپنے اپنے مقام پر باقی رہ گئی تھی - باقیماندہ کے ہمراہ

دوسو اونٹ نقرئی سکے سے لدے ہوئے تھے۔ ہر اونٹ پر (۴۸۰) پونڈ کا وزن تھا۔ ایک سو اونٹ طلائی سکہ سے لدے ہوئے تھے اور ہر اونٹ پر اوسی قدر وزن تھا۔ ڈیڑھ سو اونٹوں پر شکار کے لئے جال لادے گئے تھے۔

شاہی دفتر بھی ساتھ تھا کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اصل کاغذات بادشاہ کے ساتھ رہا کرتے ہیں اس کے لئے اسی اونٹ۔ تیس ہاتھی اور بیس گاڑیوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں اہم جواہرات اور انتظامی کاغذات رکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پچاس اونٹ پانی لے جانے کے لئے مخصوص تھے ہر اونٹ پر شاہی ضروریات کے لیے دھات کے دو برتنوں میں پانی ہوتا ہے۔ خاندان شاہی کے اراکین بھی اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے اوسی اہتمام کے ساتھ ہمراہ ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ آٹھ خچروں پر چھوٹے ڈیرے ہیں تاکہ راستہ میں اگر بادشاہ آرام لینا چاہے یا کچھ کھانا چاہے یا کوئی اور ضرورت ہو جائے تو استعمال میں لائے جائیں۔ ان کے ساتھ دو خچروں پر لباس اور ایک خچر پر مختلف خوشبودار پھولوں کے عطر ہیں۔

اس دربار کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ بادشاہ کی روانگی سے ایک رات قبل نو بجے شاہی باورچیخانہ پچاس اونٹوں پر روانہ ہو جاتا ہے۔ دودھ کے لئے پچاس گائیں اچھی طرح پرورش پائی ہوئی ساتھ ہوتی ہیں۔ ہر باورچی کے ذمہ ایک قسم کا پلوان ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے اس کو سامان دیا جاتا ہے۔ یہ محکمہ ایک خاص افسر کی نگرانی میں ہے جس کا فرض ہے کہ ہر پکوان کو سربمہر طلاکاری مخمل کے تھیلیوں میں اندر بھیجے دوسو قلی اس کام پر ہیں کہ چینی کے ظروف اور دوسری اشیاء ٹوکروں میں لیکر چلیں۔ پچاس اونٹوں پر سراپا کے ایک سو صندوق رکھے جاتے ہیں تیس ہاتھیوں پر ایسے ہتھیار اور جواہرات ہوتے ہیں جو سپہ سالاروں اور کپتانوں کو تحفہ کے طور پر دئے جائیں۔ ہتھیاروں کی تفصیل یہ ہے۔ تلوار بمعہ لوازمات ڈھالیں مختلف اقسام کے مرصع خنجر۔ اس کے علاوہ کلغیاں۔ اور مستورات کو دینے کے لئے بہت سی چیزیں ہیں۔ گلے میں پہننے کے مرصع زیورات۔ اور طلائی جوڑ یا (ہار) موتی اور ہیرے کے کام کی۔ اس تمام اسباب کے ساتھ ایک ہزار مزدور بیل پھاوڑے اور کدال وغیرہ لئے ہوتے ہیں تاکہ ناہموار راستہ کو صاف کرتے جائیں۔ ان کے افسر گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں عہد کی نشانیاں مثلاً نقرئی کلہاڑی یا پھاوڑا ہوتا ہے۔ شاہی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد خیمے لگاتے ہیں اور توپ خانہ فلاں قایم کیا جاتا ہے۔ چھوٹا توپ خانہ شاہی خیموں کے اطراف ہوتا ہے۔ دن کے چھ بجے بادشاہ اس تخت پر

بیٹھ کر روانہ ہوا جو ڈیچ قوم نے اس کو نذر دیا تھا۔ تخت کو لے چلنے کے لئے بارہ آدمی تھے علاوہ بریں مختلف وضع کی تین پالکیاں اور تھیں تاکہ جس وقت بادشاہ چاہے کسی میں بھی سوار ہو جائے۔ اس کے ماسوا پانچ ہاتھی ہودوں کے ساتھ تھے۔ بادشاہ اپنی مرضی پر ان کو استعمال کر سکتا تھا۔ جس وقت بادشاہ اپنے خیمہ سے برآمد ہوا چھوٹا توپخانہ اس کے ساتھ ہو گیا۔ اس میں سو میدانی توپیں تھیں اور ہر توپ کو دو گھوڑے کھینچتے تھے

شاہی قافلہ کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے۔ جس وقت بادشاہ اپنے خیمہ سے نکل کر تخت رواں پر سوار ہوا ہمہ اقسام کے جنگی ساز بجنے لگے۔ قلب میں شیخ میر مرحوم کا بیٹا آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ تھا۔ دائیں جانب حسن علی خان ولد الہ وردی خان تھا اسی اللہ وردی خان نے خواجہ کی لڑائی میں شاہ شجاع کو ہاتھی سے اترنے کی رائے دی تھی حسن علی خان کے تحت آٹھ ہزار سوار تھے۔ بائیں پر بھی آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت محمد امین خان کے زیر کمان تھی۔ ان دونوں افسروں کے پیچھے شکاری اپنے گھوڑوں پر سوار چلے آتے تھے۔ ہر شکاری کی کلائی پر ایک شکرہ بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کے عین مقابل نو ہاتھیوں پر خوشنما جھنڈیاں تھیں۔ ان کے پیچھے چار ہاتھیوں پر سبز جھنڈے تھے جن پر سورج کا نشان بنا ہوا تھا۔ ان ہاتھیوں کے پیچھے زین اور زیور سے آراستہ نو شاہی گھوڑے تھے۔ ان کے بعد دو سوار آئے۔ ایک جھنڈا لئے ہوئے تھا جس پر عربی عبارت لکھی ہوئی تھی۔ دوسرے کے ساتھ نقارہ تھا جس کو وہ نیچی آوازیں وقفہ کے ساتھ بجاتا رہتا تھا تاکہ بادشاہ کی سواری کا اعلان ہوتا رہے۔

بادشاہ کے دونوں طرف باقاعدہ قطاروں میں پیادوں کی کمی نہ تھی۔ بعض کے ہاتھوں میں سرخ اور بعض کے پاس سبز جھنڈیاں تھیں۔ چند عصا لئے ہوئے لوگوں کو قریب آنے سے روکتے رہتے تھے۔ دائیں اور بائیں پر متعدد سوار بھی تھے جو نقرئی عصاؤں سے مجمع کو منتشر کر رہے تھے۔ پیادوں میں کچھ عطر دان لئے ہوئے تھے اور بعض سڑک پر چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے ان کے پہلو میں ایک افسر تھا جس کے پاس ان دیہات اور اراضیات وغیرہ کے متعلق جن میں سے بادشاہ کو گذرنا تھا کافی مواد تھا تاکہ اگر بادشاہ پوچھے کہ یہ مقام کیا ہے اور کس کا ہے تو فوراً جواب ادا کیا جا سکے۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے مواضعات کے متعلق بھی اطلاعات دے سکتے تھے کہ کس گاؤں کی کس قدر مالگذاری ہے۔

بعض پیادے ہاتھوں میں رسی لئے ہوئے راستہ اس طریقہ پر ناپتے جاتے ہیں۔ بادشاہ کے برآمد ہونے پر شاہی ڈیرے سے یہ کام شروع ہوتا ہے۔ آگے والا آدمی جس کے ہاتھ میں رسی ہوتی ہے۔ زمین پر ایک نشان بناتا ہے۔ پیچھے والا آدمی جب یہاں پہنچتا ہے تو آواز دیتا ہے۔ اور پہلا شخص دوسرا نشان ڈال کر دو شمار کرتا ہے۔ اسی طرح پورے راستے شمار کرتے جاتے ہیں۔ تین اور چار وغیرہ۔ ایک پیادہ حساب رکھتا ہے۔ اگر کسی وقت بادشاہ دریافت کرے کہ کتنا راستہ طے ہوا تو فوراً جواب دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتنی رسیوں کا کوس ہوا۔ ایک پیادہ کے پاس وقت معلوم کرنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ یہ وقت شماری کرکے ایک پتلی تختی پر موگری مار کے اعلان کرتا رہتا ہے۔ ان سب کے پیچھے بادشاہ خاموشی کے ساتھ آہستہ خرامی سے آتا ہے۔

مغل بادشاہ کے سفر کی شان و شوکت اور نزاکت کا یہ حال ہے کہ سامنے ایک اونٹ پر کچھ کپڑا ساتھ ہوتا ہے تاکہ اگر راستہ میں کوئی مردہ جانور نظر آجائے تو اس پر ڈالدیں۔ کناروں پر بہت سارے پتھر اس خیال سے رکھدیتے ہیں کہ کپڑا ہوا سے اڑنے نہ پائے۔ بادشاہ جب اس مقام پر گزرتا ہے تو ٹھیر کر حالات دریافت کرتا ہے۔

بادشاہ کے پیچھے دس سوار تھے۔ چار کے پاس زرین غلافوں میں شاہی بندوقیں تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں اس کا برچھا۔ ایک کے پاس تلوار۔ ایک کے پاس سپر۔ ایک کے پاس خنجر۔ ایک کے پاس کمان۔ اور ایک کے پاس تیر در ترکش۔ یہ سب چیزیں زرین غلافوں میں تھیں۔ ان کے بعد گھوڑوں پر سوار شہزادگان سلطان معظم و سلطان اعظم تھے۔ ان کے پیچھے باڈی گارڈ اور اس کا افسر تھا۔ پھر شاہی اور شہزادوں کی پالکیوں کا سلسلہ شروع ہوا اس کے ختم پر چوبیس سوار آئے۔ آٹھ کے پاس بانسریاں آٹھ کے پاس نقری اور آٹھ کے پاس نقارے تھے۔ ان سوارہ باجہ نوازوں کے پیچھے پانچ شاہی ہاتھی عماریوں کے ساتھ تھے تین ہاتھی اور آئے درمیانی ہاتھی پر تین نقرئی پنجے اڑی لکڑی میں جو ایک بانس کے سرے پر پیوستہ تھی لگے ہوئے تھے۔ لکڑی پر مخملی غلاف تھا۔ یہ نشان اسلامی اعتقاد ظاہر کرتا ہے۔ بقیہ دو ہاتھیوں پر بھی اسی قسم کے پنجے تھے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ بادشاہ مذہب کا سرپرست اور محافظ ہے۔۔

(باقی)

غزل

جنابِ مسلمؔ

مگو کہ نرگسِ مستش کند خراب مرا — بہ بیں کہ تا بدرش میکشد شباب مرا

کمینہ ذرّہ از خاکِ میکدہ بودم — نگاہِ مغبچہ کرد است آفتاب مرا

بآں مقام رسیدم کہ قیسِ صحرائی — بہ پیر و مرشدِ من می کند خطاب مرا

چہ اعتبارِ وجود و عدم کہ دستِ کسے — کشیدہ است چو نقشے بروئے آب مرا

برو بپرس ازاں بت زمن چہ می پرسی — چرا بہ منظرِ خود کرد انتخاب مرا

ولائے آلِ محمدؐ چو من بدل دارم — ز دستِ ساقیِ کوثر رسد شراب مرا

ز آفتابِ قیامت چہ باک اے مسلمؔ
بس است سایۂ دامانِ بوترابؑ مرا

معصوم دوشیزہ (افسانہ)

جناب محبوب الرحمٰن خان صاحب
ایم - اے (علیگ) اندور

آج سے چند سال قبل جمیلہ سے میری ملاقات ہوئی وہ سن وسال کے لحاظ سے عمر رسیدہ نہ تھی ہم اُسے ادھیڑ کہہ سکتے ہیں - جس طرح دہلی و آگرہ کی عمارتیں خاندان مغلیہ کی جاہ و حشمت کا ثبوت ہیں، جمیلہ کا سلیقہ، نفاست، بانکپن کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ضرور اچھے دن دیکھے ہیں - ہم اسے گل خزاں رسیدہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں - اس کا پاکیزہ ذوق شعری، اس کا رکھ رکھاؤ، اس کے چہرے کی ساخت، کھڑی ناک، کو دیکھ کر آپ ضرور مرقع چغتائی کی جیتی جاگتی تصویر سمجھیں گے یا پھر اپنے تیئں شاہان مغلیہ کے دَور میں لیجائیے آپ دیکھیں گے کہ ہمارے پیش نظر اس خاندان کی کوئی بیگم ہے جس نے ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک دھاک بٹھادی تھی -

جب سلطان خان کا تعارف مجھ سے کرایا گیا تو میں دھک سے ہوگیا - میں نے خیال کیا کہ تعارف کروانے والا بھنگ یا کوئی مسکر شئی استعمال کئے ہے - لیکن حق ظاہر ہوکر رہتا ہے لاکھ اس پر پردہ ڈالا جائے "وقل جاءَ الحقُّ وزہق الباطل اِنّ الباطل کان زہوقا" دو تین سکنڈ تک میں نے سلطان خان کے حلیہ کا جائزہ لیا - دیکھ میں سلطان خان کو رہا تھا اور دماغ جوش کا ہمہ خیال بن کر "حسن اور مزدوری" کے اس مصرعہ پر دھیان کئے تھا -

" ناز نینوں کا یہ عالم مادر ہند آہ آہ "

سلطان خان کا وہ بے ڈول قد و قامت، چپٹی ناک، کریہہ آواز معلوم ہوتا تھا کہ جمیلہ کی متضاد اشیاء کو یکجا کرکے ایک ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے اور یار لوگوں نے ازراہ تمسخر سلطان خان نام رکھ کر اس کا نکاح جمیلہ سے کر دیا ہے - ذرا غور کیجئے مذاق کی بھی حد ہوتی ہے یاروں کی تو ہنسی ہوگئی اور غریب جمیلہ کی زندگی کھڈ میں جا پڑی -

اس میں شک نہیں سلطان خان اپنے نام کے آدھے حصہ پر بلا شرکت غیرے پورا پورا

تسلط جمائے بیٹھے تھے۔ جب ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی تو ان کی پٹھانوں والی "فون فان" دیکھنے کے قابل ہوتی تھی ویسے بھی غصہ ان کی ناک پر رکھا تھا لیکن نام کا ابتدائی حصہ یعنے سلطان غیر حاضر تھا۔ نفسیات کے ماہرین کا قول ہے کہ "گرد وپیش کے حالات انسانی زندگی و کردار پر بڑا اثر ڈالتے ہیں وہ اسے بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ منشی پریم چند بھی انھیں کے ہم خیال ہو کر کہہ گئے ہیں کہ "انسانی فطرت نہ سفید ہے نہ سیاہ وہ گرد وپیش سے متاثر ہوتی ہے۔" فطرتاً سلطان خان بد دماغ نہ تھے لیکن عسرت تنگدستی و متواتر ناکامیوں نے انھیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ جب کبھی بھی وہ کام سے واپس لوٹتے بیوی کی دلخوش گفتگو کے بجائے "آٹے دال کے بھاؤ" والی گفتگو ان کے لیئے ہوش ربا ثابت ہوتی اور ان کی رہی سہی عقل بھی کھو دیتی تھی۔ بیچارے نے زندگی کے چند سالوں میں اتنی جرات حاصل کی کہ کھانے پینے و کپڑے لتے کے علاوہ چند روپیئے چھوڑے جس سے ان کی گور و کفن کا انتظام ہو سکا۔

سلطان خان کی وفات کے دو ماہ بعد جمیلہ کے ایک حسین لڑکی پیدا ہوئی جس کی بابت میرحسن نے کہا ہے ؎

"نظر کو نہ ہو حسن پر اس کے تاب اسے دیکھ بیتاب ہو آفتاب"

جمیلہ نے چکیاں پیسیں، لوگوں کے کپڑے سیئے اور ساجدہ کو آنکھ کی پتلی سا نگاہ رکھکر پالا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمیلہ کی بڑی تصویر کی خامیاں و دھندلے کو دور کر کے قدرت نے جاذب نظر و دلکش چھوٹا مرقعہ تیار کیا ہے۔ ساجدہ کی چال ڈھال اس کے صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر کون کہیگا کہ وہ ایک غریب بیوہ کی چشم و چراغ ہے جب کبھی رشتہ کنبہ میں خوشی یا شادی ہوتی تو جمیلہ، ساجدہ اور جمیلہ کی والدہ شرکت کرتیں۔ بوڑھی بی اماں تو کنبہ کی ریت و رسوم کی نگرانی کرتیں اور حرف بہ حرف اُن خاندانی رسوم کی تلقین کرتیں جو ان کے ہاں بوڑھوں سے چلی آرہی تھیں خاندان کی بہو بیٹیاں بوڑھی بی اماں کی عزت کرتیں۔ جہاں کہیں کسی نے وقتی ضرورت کو مد نظر رکھکر پرانے ڈھکوسلوں میں سے کسی کی تردید کی تو پھر بی اماں کو دیکھئے۔ وہ ان کی ناک بھنوں سکڑ لیتیں اور فوراً کہتیں "ناجیوی ہماری بھی اتنی عمر آئی ہونے تو ایسا کہیں نہیں دیکھا! یہ آج کل کی لڑکیاں اپنے آگو کسی کی چلنے تھوڑی دینگی" "اے ہے غضب خدا کا یہ دلہن کسی سے نہیں شرماتی پٹا پٹ باتیں ملا رہی ہے۔" اُدھر ساجدہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کمسنی کی چہلوں، ہنسی و مذاق میں مصروف رہتی لیکن جب کبھی جمیلہ اسے بلا اٹھنے سینا دوہنا، تعلیم یافتہ

دولہا، تندرست دولہا، متمول دولہا، بردبار دولہا، پر نظر ڈالتی تو معاً خیال کرتی "کاش ساجدہ کے لئے بھی ایسا ہی بَر ملے - قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز شدید ہوتی ہے تو وہ زیادہ عرصہ تک پردۂ راز میں نہیں رہتی جتنی شدید ہوگی اتنی ہی جلد ظاہر ہوگی پھر جمیلہ کی کوئی ناجائز خواہش نہ تھی ہر لڑکی والے کی یہی تمنا و آرزو رہتی ہے کہ بہتر سے بہتر جگہ رشتہ قائم ہو۔ چنانچہ جمیلہ نے اپنی دلی تمنا بہت سے لوگوں کے سامنے ظاہر کی - اس کے بیان کرنے کا ڈھنگ کچھ اس قسم کا ہوتا کہ سُننے والے پر اس کا ضرور اثر ہوتا اور مجھے یقین ہے کہ جمیلہ کے مخلص ملنے والے کوشاں تھے کہ کسی معقول جگہ نسبت طے ہوجائے - جمیلہ ایک ٹھنڈی سانس لیتی اور کہتی "میرے اللہ میری ساجدہ کے لئے بھی کوئی ایسا ہی معقول انتظام ہوجائے" جب کبھی "نیم نجومی" قسم کے پنڈت پوتھی وغیرہ لے کر محلّہ محلّہ چکر لگاتے ہوئے جمیلہ کے گھر کے قریب سے گذرتے جمیلہ فوراً بلواتی اور ساجدہ کے مستقبل کا حال معلوم کرتی جب کبھی پیر دل فقیروں کے مزارات پر جمیلہ کا گذر ہوتا وہ ساجدہ کے اچھے نصیب کرنے کی دعا کرتی"

پیشہ کے لحاظ سے میں معلم ہوں لیکن اسکول کے علوم پڑھے مدت ہوئی - چونکہ اس بیچ ان کا کوئی کام نہیں پڑا اس لئے نہ تو مجھے مغربی گھاٹ کے فوائد یاد ہیں اور نہ ہی میں برہم پتر اور دریائے سندھ کا مقابلہ کرسکتا ہوں - اگر کوئی جامٹری کا مسئلہ چہارم پوچھے تو میں بغلیں جھانکنے لگوں گا - جمیلہ نے دیکھا کہ اکثر طلبا میرے پاس دشواریاں لیکر آتے ہیں اور امتحانات کے قریب ان کا نمبر بڑھتا جاتا ہے تو انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا "میری ساجدہ کو بھی پڑھا دیا کیجئے" - میں کیسے کہہ دیتا کہ ان طلبا کو ادبیات کے چند اشارات سمجھاتا ہوں یا امتحان پاس کرنے کا ایک مختصر راستہ بتلاتا ہوں -

ایک دن ساجدہ اس کی تمام کتابیں لیکر میرے پاس آموجود ہوئی - میں نے انگریزی و جامٹری پڑھانیکا وعدہ کیا - ایک روز پہلے میں جامٹری تازہ کرتا دوسرے دن وہی ساجدہ کے دماغ میں اتارتا - معلوم ہوا کہ ساجدہ کا حافظہ رامپوری چاقو ہے صرف دہار رکھنے کی دیر ہے میں نے جمیلہ سے کہا کہ اگر ساجدہ کو ڈھنگ سے تعلیم دیجائے تو وہ دو سال میں میٹرک کامیاب ہوسکتی ہے - جب جمیلہ نے مجھ سے ساجدہ کی تعریف سنی تو باغ باغ ہوگئی - یہ معلوم ہوا کہ اس کی پژمردہ آرزوئیں جاگ اٹھیں اس کی وہ حسرتیں و تمنائیں جو کچھ عرصہ سے زیر خاک دبی ہوئیں تھیں ایک دم چمک گیئں - جمیلہ نے وعدہ کیا کہ وہ ساجدہ کو ضرور پڑھائے گی -

کسی نے نہ معلوم کس موقع پر کہا تھا۔" اچھی صورت بھی کیا قیامت ہے" لیکن یہ تو ساجدہ پر صادق آیا۔ ساجدہ کا سولہ سترہ برس کا سن و سال تھا کہ رشتہ داروں کے ہاں سے پیامات کی بوچھار شروع ہوئی۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے" غریب کی جورو سب کی بھابی"۔ جمیلہ پے در پے انکار کرتی رہی لیکن توبہ صاحب اس کی کون سنتا تھا۔ اس کے انکار سے لوگ اقرار کے معنی لیتے کوئی کہتا "بھئی لڑکی والے اگر ایکدم اقرار کریں تو اس میں ان کی ہیٹی ہے اسی طرح پہلے انکار کیا جاتا ہے لیکن انکار کے پردہ میں اقرار پنہاں رہتا ہے" کوئی کہتا ابھی معاملہ زیر غور ہے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی تو خیال آیا کہ دراصل غالبؔ بڑے فلسفی تھے وہ انسانی فطرت کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھتے تھے جب کبھی انھوں نے جمیلہ جیسی عاجز، لاچار اور مجبور محض ہستی کو دیکھا ہوگا تو انھوں نے کہدیا ہوگا " درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانیں"۔ جب تک ساجدہ نے عنفوان شباب میں قدم نہ رکھا تھا کسی عزیز نے اس کے ساتھ سلوک نہ کیا لیکن جیسے ہی ساجدہ کا عنفوان شباب شروع ہوا۔ تمام بہی خواہ برساتی مینڈکوں کی طرح اُبل پڑے اور لگے ٹرانے جمیلہ تجربہ کار تھی اُسے زمانہ کی چکی نے ایسا پیس دیا تھا کہ وہ لوگوں کے دنیاوی لالچ، تحفہ تحائف اور آخری ہتھکنڈہ لینے دھمکیوں تک کی پرواہ نہ کرتی تھی۔ لیکن کب تک نہ کرتی؟ اس نے ایک عرصہ تک معاملات کو التواء میں ڈالا۔ پچھلے چند سالوں کی گرانی جان لیوا قسم کی نہ تھی تو اور کیا تھی۔ آپ نے وہ وقت بھی اچھی طرح سے دیکھا ہے جب کہ آپ کے پاس کاغذ کا ٹکڑا (جسے ہم نوٹ کہتے ہیں) تو تھا لیکن چاول نایاب۔ ایسی حالت میں نچلا اوسط طبقہ و غرباء رو رو دئے ہیں۔ امراء کو چھوڑیئے آپ کے پیش نظر ایک بیوہ رہے جو اس کے مکان میں ایک بوڑھی کمزور لاغر و ناتوان اور ایک دوشیزہ کو لئے بیٹھی ہے۔ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ جمیلہ کو اس کے کسی عزیز نے مدد کی ہوگی لیکن یہ بھی تو ہے" بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی"۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جمیلہ ایندھن کی فکر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔ اُدھر جمیلہ کی ماں کے ٹمٹاتے چراغ میں تیل ختم ہو رہا تھا۔ غرض واقعات نے جمیلہ کو روباہ مزاج کر دیا اور اس نے اُس سپر کو ڈال دیا جس کی چاندبی بی، رضیہ سلطانہ اور اہلیہ بائی نے آخر وقت تک پناہ لی تھی۔ جمیلہ نے مجبوراً ساجدہ کا بے جوڑ نکاح کر کے اس پرانے مقولے کو ثابت کر دیا کہ

" تاریخ اپنے واقعات کو دہراتی ہے"۔

غزل

جناب خواجہ عباداللہ صاحب اختر بی۔اے (شملہ)

یہ بادہ خانۂ ہستی خراب ہی دیکھا
جو پی گیا اسے مست شراب ہی دیکھا

وہی ہے گردش ایام اور لیل ونہار
ہماری آنکھوں نے تو انقلاب ہی دیکھا

اڑا کے لیگئی دل میرا سنبل و کاکل
کہ جس میں دیکھا یہی پیچ وتاب ہی دیکھا

فریب ہستی ہیں کہتے شباب سے تعبیر
کسی نے دیکھا اگر ہے تو خواب ہی دیکھا

جو دیکھو دیدۂ ہستی تو ایک گریہ ہے
یہ چشمہ دیکھا تو چشم پُر آب ہی دیکھا

کہا کسی سے جو کچھ میں نے "اک نہیں" سن لی
ہر ایک فرد بشر لاجواب ہی دیکھا

خیال دل میں ہے تیری نشیلی آنکھوں کا
یہ خانۂ مستی سے ہم نے خراب ہی دیکھا

کسی نے دیکھا اگر کچھ ہے چشم عبرت سے
وہ میں نہیں ہوں تو میرا جواب ہی دیکھا

فسون نشہ ہے یا ہے فسانۂ ہستی
کہ جس کو دیکھا یہاں مست خواب ہی دیکھا

جگر ہو، سینہ ہو، دل ہو، ہے داغ ہی اختر
تمام خانہ ترا آفتاب ہی دیکھا

دل زاہد سے حب عالم فانی نہیں جاتی
ابھی تک ہاتھ سے اس کے سلیمانی نہیں جاتی

تیری زلفوں کی باتیں بھی ہیں اک افسانۂ ہستی
کہ میرے خواب سے بھی یہ پریشانی نہیں جاتی

نمایش حسن کی ہر رنگ میں ہوتی ہے عالم میں
اگرچہ پیرہن میں گل ہے عریانی نہیں جاتی

وہی اک دانۂ جنت کا حاصل جنس آدم ہے
اگرچہ قحط انساں ہے، فراوانی نہیں جاتی

حسینوں کے لبوں پر حسن فطرت مسکراتا ہے
کہ روئے گل سے وضع خندہ پیشانی نہیں جاتی

کسی صورت سے آلودہ اگر آئینہ ہو جائے
تو اس سے آبروئے پاک دامانی نہیں جاتی

عصائے کور رہبر اہل بینش کا نہیں ہوتا
دلیل عقل بحث عشق میں مانی نہیں جاتی

سر بے مغز واعظ میں نہیں ہے اور تو کچھ بھی
تہہ دستار جو کچھ بھی ہے نادانی نہیں جاتی

وزارت بھی مٹا سکتی نہیں داغ غلامی کو
یہ خوئے بندگی اے ماہ کنعانی نہیں جاتی

یہاں ہیں بزم ادب میں روشناس وضع مغرب کے
مگر اختر تری صورت تو پہچانی نہیں جاتی

پشیمانی (افسانہ) عکاس

(۱)

سرما کی ایک سرد اور تاریک رات میں جب اپنے گھر واپس ہوا تو میرے کمپونڈ کے سامنے کوئی بیہوش پڑا ہوا ہے اور راہ رو اوس کی حالت زار کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ مختلف منہ اور مختلف باتیں یہ دیکھ کر مجھے رحم آیا راستہ والوں کی مدد سے اپنے گھر میں لاکر پلنگ پر لٹا دیا اور منھ کا گرد غبار صاف کرنے لگا تو تیز شراب کی بو اوس کی ہر سانس سے آرہی تھی اور میرا اعتقاد اپنے مذہب اور اس کی خوبیوں پر پختہ ہوتا گیا۔ جب اوس کے پریشان بال آشفتہ حال چہرہ کو صاف کیا تو مجھ پر ایک سکتہ سا طاری ہوگیا کہ یہ تو میرا عزیز ترین دوست فرخ ہے جس کے فرخندہ طالع پر مجھے ہمیشہ رشک آتا تھا۔ جس کی گم شدگی پر اب بھی میرا دل بیتاب تھا کہ میری عرصہ تک کی تلاش و جستجو آخر ناکام رہی اور مجبوراً صبر سے کام لینا پڑا۔

یا آج اپنے یوسف گم گشتہ کو اس حال میں دیکھ کر اتنی مسرت بھی نہیں ہوئی کہ مدت کے بچھڑے دوست کے پانے میں ہو سکتی ہے۔ تاہم دل میں اس وقت ہمدردی اور خدمت کا جذبہ اور تیز ہوگیا کہ اس سے پوچھوں کہ امید و سعادت خوش حالی اور کامرانی کے چھن جانے کے کیا اسباب ہیں۔

ٹھنڈے پانی کی پٹیاں سر پر۔ اور خوشبو دماغ میں پہنچائی کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر دیوانہ وار در و دیوار کو دیکھکر کہنے لگا میں کہاں ہوں اور یہاں کیونکر پہنچا۔

میں نے کہا ایک دوست کے مکان میں۔ دوست!! دنیا میں اب میرا کوئی دوست نہیں رہا۔ البتہ کبھی کوئی تھا جس کو میں کھو چکا ہوں۔ یہ باتیں تو آئندہ ہوں گی مگر اتنا بتاؤ کہ طبیعت کیسی ہے۔ کہنے لگا مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے کہ ایک بدبخت اور ناکام دنیا میں اسی سلوک کا مستحق ہے۔ میں وہاں سے عمداً ہٹ آیا اور ملازم کو تاکید کردی کہ تمام رات اس کے بستر کے پاس سے جدا نہ ہونا اور اوس کے ہر آسائش میں کوتاہی نہ کرنا۔

صبح جب میں اپنے کاروبار میں مصروف تھا ملازم نے آکر یہ خبر پہنچائی کہ اب اوس کی طبیعت میں سکون ہے اور وہ رات کا ماجرا تفصیلی طور پر پوچھ رہا ہے کہ یہاں کیسے پہنچا اور اس مکان کا مالک کون ہے۔

اچھا تم واپس جاکر کہدو کہ وہ میرے آقا کا ایک دوست تھا! اور اب اپنے مکان واپس ہو چکا ہے اور میرا آقا باہر گیا ہوا ہے۔ لیکن اس کے راحت و آرام کا اسی طرح خیال رکھنا جس طرح کہ تمہیں میرا خیال ہے میں کچھ عرصہ تک اوس سے پوشیدہ رہنا چاہتا ہوں چونکہ پانچ سال بعد اپنے وطن واپس ہوا تھا یہاں کے کاروبار اور ان کی تنظیم میں اتنی فرصت ملتی نہ تھی کہ اپنے دوسرے احباب کو تلاش کروں اور جب کبھی فرصت ملی تو فرخ کی بی بی اور اس کی ناز پروردہ تنعم لڑکی کی تلاش میں مصروف کردی مگر میری تلاش ہنوز ناکام تھی لیکن سعی و کوشش سے میں نے ہمت نہ ہاری۔ شہر کا ہر گوشہ باغ و راغ ڈھونڈھ ڈالا مگر کہاں!!

سب سے پہلے فرخ کے اس عالیشان جنت نشان مکان پر پہنچا جہاں کبھی نغمہ مسرت، قہقہہ اور انبساط کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ دریافت سے معلوم ہے کہ اس مکان پر کسی شنا ٹیلاک کا قبضہ ہے پتہ نہ چلا کہ اس کے سابقہ مکین کہاں ہیں جنھیں آسمان لے اٹھا لیا یا زمین نے اپنے آپ میں جذب کر لیا۔ البتہ ایک ہمسایہ کی ضعیفہ سے اتنا معلوم ہوسکا کہ فرخ کی شب و روز کی بے اعتدالیوں نے آج اس کی یہ گت بنائی ہے کہ مدت سے وہ لاپتہ ہے مکان کے فروخت ہونے کے کچھ دنوں بعد ایک ٹوٹی سرا میں دونوں ماں بیٹی مقیم رہیں اور ایک تاریک رات کی صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ ان دونوں بدنصیبوں کا وہاں پتہ نہ تھا۔

جب اپنی تلاش سے واپس آیا تو ملازم نے بیان کیا کہ رات کا مسافر بار بار آپ ہی کو پوچھ رہا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ کسی نہ کسی حیلہ بہانے سے اوسے اور چند روز تک ٹالتے رہو لیکن اس کا خیال رکھنا کہ وہ اکتا کر کہیں نکل نہ جائے ۔

(۲)

میں روز بروز اپنی جستجو میں ناکام ہوتا چلا۔ حالانکہ شہر کا ہر بوسیدہ سا بوسیدہ مکان دیکھ ڈالا مگر منزل مقصود کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اب میری جستجو تیز سے تیز تر ہوتی چلی تھی۔

ایک شب یوں ہی مایوس یہ سوچتا ہوا کہ آخر میری تلاش کا کوئی نتیجہ نکلے گا پھر ایک تاریک گلی سے گذرا دیکھا ایک شکستہ دروازہ میں ایک بدحال اور حسین لڑکی بوسیدہ لباس میں کسی کی منتظر ہے گویا چاند بدلیوں سے جھانک رہا ہے نہ جانے کیوں میرے دل میں جذبہ جستجو اور تیز ہوگیا۔ آگے بڑھ کر میں نے پوچھا معصومہ کیا بتا سکتی ہو۔ اس مکان کا مکین کون ہے اور تم کس کے انتظار میں ہو وہ کچھ پریشان سی ہوگئی پھر سنبھل کر نہایت غمگین آواز میں جواب دیا

آپ کیوں پوچھ رہے ہیں جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں - اس وسیع عالم میں جن کا کوئی ہمدرد نہیں - اس خاکدان میں بجز دو کے تیسرے کا گذر نہیں - جہاں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور موت کا خیر مقدم ہے کہ کچھ تو آرام ملے -

اوس کے ان دردناک جواب سے میرے دل پر ایک چوٹ لگی اور میں نے کہا معاف کیجئے اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو آپ کے والد کا اسم گرامی کیا ہے - ایک آہ بھر کر کہنے لگی - نام پوچھ کر کیا کیجئے گا - جس کا ایک عرصہ سے پتہ نہیں - جو کبھی آسودہ حال تھے اور آج ہمیں اس بدنصیبی کو پہنچا دیا جن کا عرف عام میں کبھی "فرخ" نام تھا - بے اختیار میری زبان سے نکلا "فرخ" جی ہاں فرخ کیا آپ اونہیں جانتے ہیں؟ میں نے کہا شاید کیا میں آپ کی والدہ محترمہ سے مل سکتا ہوں کہنے لگی وہ اس وقت باہر گئی ہوئی ہیں اور میں انہیں کے انتظار میں ہوں - آپ تشریف رکھیں، وہ آتی ہی ہوں گی - یہ کہکر ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ اوٹھا لائی اور مجھے راستہ دکھانے لگی اور ایک پست کمرہ میں بٹھلا یا - جس کی کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا پلنگ اور بوسیدہ بستر - اور صندوق پر چند داغ دار پیالیوں کے سوا کچھ نہ تھی - یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہ خاندان جس کی خوش نصیبیوں پر مجھے رشک آتا تھا - آج اس حالت کو پہنچ گیا ہے -

میرا تخیل عروج و اقبال - افلاس و نکبت کے حل کرنے میں مصروف تھا - میں گردن جھکائے اسی سوچ میں تھا ایک خاتون سیاہ برقع میں میرے سامنے تھی اور میں تعظیماً کھڑا ہو گیا - کہنے لگی ایک بدنصیب کے کلبۂ تاریک میں زحمت فرمائی کا کیا مقصد ہے؟ میں نے عرض کیا گو آپ میری صورت سے ناآشنا ہیں لیکن نصرت کے نام سے آپ کے کان ضرور آشنا ہوں گے -

آہ! کیا آپ ہی وہ نصرت ہیں!! جن کے جانے کے بعد قسمت نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہمیں اس درجہ پر پہنچا دیا -

اے کاش آپ نہ جاتے تو آج ہم اس حالت کو نہ پہنچتے اور آنیوالے مصائب کے لئے آپ سینہ سپر بن جاتے لیکن تقدیر کے آگے تدبیر کی کیا چلتی ہے - واقعہ یہ ہے کہ آپ سے نیک سیرت دوست کے رخصت ہونے کے بعد وہ بہت دنوں تک بے چین پھرتے رہے پھر کچھ ایسی ناجنس صحبتوں نے اونہیں گھیر لیا اور ان کی نیک اور پاکباز زندگی کو گناہ کی بھیانک تاریکیوں میں ڈھکیلنا شروع کیا - ابتداءً تو گھر کو دیر سے لوٹنے لگے - لیکن رفتہ رفتہ راتیں

حال میں رہے۔ یہ سُن کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ انتہائی ندامت کے ساتھ جواب دیا ماضی کی داستان پوچھکر میرے شکستہ دل کو زخمی نہ کرو۔ جب کسی سے امید سعادت چھین لی جاتی ہے وہ دوست جن پر طمع چڑھا ہوتا ہے جو مکرو فریب سے دوست ـــ بناکر اوس کی دولت کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ جن کی بلند بانگ ہمدردیاں ایک ایک کرکے غائب ہو جاتی ہیں تو اوس دوست کا حال اس سے بدتر ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے کئے کی سزا بھگتے جی پالی ہے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو کہ موت ہی ایک اچھی رفیق ہے جو ان آلام سے نجات دلوائی گئی۔

میں نے ہنس کر کہا دوست تم نے ابھی دنیا دیکھی ہی کیا ہے تمھیں تو اس دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے اپنے لئے نہ سہی اپنی بی بی اور بچی کے لئے۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا خدارا ان کی یاد دلاکر مجھے اپنے جرائم سے خبردار نہ کرو۔ نہ جانے وہ آج کس حال میں ہیں۔ نہ معلوم زندہ ہیں یا مردہ۔

آج میں اوس فرشتہ خصلت بی بی کے مشوروں پر عمل کرتا تو یہ روز بد میرے پیش نہ آتا یقیناً میں دو معصوم ہستیوں کا قاتل ہوں جو میرے ہی کرتوت کی بدولت موت سے ہمکنار ہوئیں۔ آہ میری بی بی اور بچی۔ یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگا۔ جب کافی رو چکا تو میں نے تسلی اور تشفی سے اوس کی ڈھارس بندھائی کہ تمھیں کوئی فکر و تردد نہ کرنی چاہئے۔ جب کہ میں اپنا گم گشتہ یوسف پا چکا ہوں۔ اب ہم دونوں کی مشترکہ قوت سے مستقبل شاندار ہو جائے گا۔ کہنے لگا ممکن ہے تمہاری اعانت مجھے کامیاب بنائے۔ لیکن بی بی اور بچی کی یاد خار بنکر کھٹکے گی اور چین نصیب نہ ہوگا۔

میں نے جواب دیا اتنی مایوسی انسان کے لئے موزوں نہیں۔ ہماری کامیابی ہمارے ہاتھوں اور ہمارے دل و دماغ میں پوشیدہ ہے۔ اب زیادہ رنج نہ کرو۔ بہت دنوں سے تم اس قید تنہائی سے اکتا گئے ہوں گے۔ آج میں تمھیں سیر کرالاؤں تاکہ تمہارے ماؤف دماغ کو کچھ سکون نصیب ہو، اور جب تمہارا میزبان جو چند دنوں کے لئے باہر گیا ہوا ہے آجائے تو اوس سے اجازت لے کر تمھیں اپنے مکان لیجاؤں۔

(۵)

دو چار روز جب کہ اوس کا وقت میرے ساتھ گذرنے لگا تو طبیعت میں ایک اطمینان اور سکون پیدا ہوتا چلا۔ ایک دن شام کو وہ بہ نسبت اور دنوں کے زیادہ بحال تھا میں نے اوس کو کہا کہ چلو آج تمھیں ایک دلچسپ تفریح کرالاؤں وہ آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں نے اوس کو

اوس کی بی بی کے کمرہ کی جانب اشارہ کرکے کہا کہ دو ایک منٹ تم یہاں میرا انتظار کرو میں ابھی واپس آتا ہوں ۔

جب تھوڑی دیر کے بعد جھانک کر دیکھا تو ایک نادم اور شرمندہ شوہر اپنی معصوم بی بی کے حضور میں جھکا ہوا اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے اور لڑکی باپ سے لپٹی ہوئی ہے اس منظر کو دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ رہی اور میں ایک جذبہ بے اختیاری کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوگیا ۔ تینوں نے بے تابانہ دوڑ کر میرا دامن تھام لیا ۔ محلہ کی مسجد سے "اللہ اکبر" کا پر عظمت نغمہ بلند ہو رہا تھا ۔

فریاد بے صدا

جناب عرشیؔ (حیدرآبادی)

تیری صورت آنکھ میں ہے تیرا جلوہ دل میں ہے
رنگ و بو کا ایک عالم ہے کہ آب و گل میں ہے

زندگی کی کشمکش حیرت کی شورش - تیری یاد
یونہی کیا کم تھی بساط دل کہ اس مشکل میں ہے

لیگئی تھی جس طرف تیری نگاہ اولیں
رہرو غم آج تک گویا اُسی منزل میں ہے

یہ ادائیں اور لب نازک پہ پیمان وفا
جانتا ہوں جانتا ہوں جو تمہارے دل میں ہے

اڑ نہ جائے لیکے اس کو بھی تمنائے نشاط
وہ جو اک غم آفرینی سعی بے حاصل میں ہے

کس سے پوچھوں راز ہستی کوئی ہے دانائے راز
بیخودی کا ایک عالم ہے کہ آب و گل میں ہے

جانتا ہوں پھر بھی آجاتا ہے دل کو اعتبار
اک ادائے خاص تیرے وعدۂ باطل میں ہے

یہ بھی عرشیؔ اصل میں ہے یاد جاناں کا مآل
اک تبسم، اک تجلی سی جو میرے دل میں ہے!

ازدواجی زندگی اور ہم

شفیق بانو (نجیب آباد)

فروری کے "شہاب" میں بہن مجدی احمد صاحبہ اور یاسمین صاحبہ کے ایک ہی عنوان پر اظہار خیالات ہیں۔

بہت خوشی ہوئی کہ اس موضوع پر طبع آزمائی ہو رہی ہے ۔ اللہ خیر کرے۔

معاف کیجئے میں ان دونوں بہنوں کے درمیان کسی قسم کی تائید یا تردید کرنا نہیں چاہتی۔ افراط و تفریط سے ہٹ کر میں صرف کچھ عکس ہی دکھلانے چاہتی ہوں۔

اور عکس بھی ایسے دھندلے دھندلے جن کا پہچان لینا بھی کمال ہوگا۔

گزارش ہے کہ قرآن شریف میں بھی سب کچھ ہے اور شرع میں بھی سب آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ نیز یہ تو بتایئے عمل کرنے والے بھی ہیں؟ اگر قرآن شریف کے دو چار احکام پر بھی احترام سے عمل کرنا سیکھ جائیں تو ساری تباہیاں ختم ۔ دونوں مضمون صرف یہ کشمکش ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں زندگیاں کچھ تشفی بخش نہیں ہیں اور بہت ہی تکلیف دہ۔

سنئے صاحب نہ تو میں اب سے پچاس برس پہلے کی عورتوں کی حمایت کرنا چاہتی ہوں جو پورے خاندان کے مظالم سہتے سہتے سسرال میں بھی دبی پلی کی طرح کاٹا کٹوائی تھیں شوہر ہی کی اور اکثر ان کی پسندیدہ دوسری بیویوں پر جانیں ختم کر دیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ میرے خیال میں مظالم کی تبلیغ کی۔ صبر اس کو نہیں کہہ سکتے کہ آنے والی نسلوں کے لئے خوفناک گڑھے کھود کر تیار کر دئے ——— اور خود شاباش حاصل کرلی کہ واہ واہ دیکھ لو فلاں بیوی دکھ سہتے سہتے مرگئیں پر "ہوں" نہ کی ۔ خیر صاحب "ہوں" نہ کی ہوگی ہم کیا کریں؟ ہم سے "ہوں" کئے بغیر رہا نہیں جا سکتا ۔ باز آیئے ایسے سلگنے سے کہ جس کا انجام دوسری بہنوں کے لئے بد سے بدتر ہوتا چلا جائے ۔ اور جناب یہ بھی مجھے پسند نہیں جو اب زندگیوں کا

معیار رہ گیا ہے -

کہایا - پیا - پہنا اور فرائض کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اجی بند کرنا کیا معنی ؟
قطعی بے خبر - یہ بھی کوئی زندگی ہوئی ؟ --- پھر جانوروں میں اور انسانوں میں پہچان کیا رہی :

سب سے بڑا اثر موجودہ تہذیب و معاشرت پر جو پڑا ہے وہ سینما کا ہے

زیادہ طبقہ ایسی عورتوں کا بھی ہے جو بہت ہی یا تو جاہل ہیں اور یا ہیں نیم تعلیم یافتہ
--- ایسی صورت میں وہ صرف یہ سوچنے لگتی ہیں کہ یہ جو کچھ فلم میں ہے گویا سچ مچ ہے یا سچ
مچ بس ایسا ہی ہونا چاہئے - --- جیسے کہ اس میں صرف محبت ہی محبت ہے ہم بھی ہیرو
چیز بن جائیں -

گھریلو زندگی میں کچھ تلخیاں بھی تو ہیں؟ وہی مثل کڑوا کڑوا تھو - میٹھا میٹھا
ہپ ہپ - ہماری بہت سی بہنیں فلم دیکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں وہ کاغذی
محبت ہی کا عملی محبت سے تقابل چاہتی ہیں --- دل بیزار --- دماغ میں وہی خیالی آرائیاں یا وحشت
تیرا آسرا ---

بظاہر تو یہ بہت چھوٹی سی بات ہے کہ آٹھ دس روپے کا خون کیا اور چپکے سے سہیلیوں کے
کسی سینما گئے اور خراب تین چار گھنٹہ کی "جنت" منا کے پھر وہی گھر پایا اور جان

سینما کی بڑھتی ہوئی پسند نہ تو روکی جا سکتی ہے اور نہ کوئی پابندی ہو سکتی ہے ---
بات اپنی حد سے بہت آگے جا پہنچی اب تو صرف یہ سوچنا چاہیئے کہ کم از کم ایسے طریقے ضرور ہونے
چاہئیں جن سے ہماری بیشمار بہنیں سینما صحیح طریقہ سے دیکھنا اور سمجھنا سیکھ جائیں --- تاکہ خراب
نتائج ہماری گھریلو زندگی کا رہا سہا سکون نہ لوٹ لے --- ہونا یہ چاہیے کہ نادانستہ منہ ورکو یہ بتانا
چاہیئے کہ تماشہ کو صرف "تماشہ" سمجھ کر دیکھو - اصلیت کچھ بھی نہیں --- یہ رومان میں ڈوبتے
ہوئے دردآمیز فقرے میں تمہیں چاہتا ہوں . . . . میں تمہاری پوجا کرتا ہوں
میں جان دیدوں گا . . . . . تم ہی سب کچھ ہو . . . . وغیرہ وغیرہ - ان سب بہنوں سے بیانی
رہو کہ پوجا و جان کی سب بات غلط --- جھوٹ --- سراسر مکاری --- یہ فلم ہے فلم دولت
کمانے کا ایک طریقہ -

فلم کی مقبولیت کا اب تو یہ عالم ہو چلا ہے کہ کچھ نہ پوچھئے ایک دس بارہ سال کی بچی بھی عشق کے
نامعقول طریقے سمجھ گئی ہے وہ پوری کہانی کا مفہوم اگر سنا نہیں سکتی تو کیا؟ دل ہی دل تو سوچتی رہتی ہے

اور بازار بھی - یہ اصول اب نہیں چل سکتا ——

مردوں کو چاہئیے کہ حسب توفیق عورتوں سے انسانیت کا سلوک قایم رکھیں اور عورتوں کو چاہیئے کہ "وہ عورت پن" کو ہاتھ سے نہ جانے دیں بلکہ اپنی نسوانی شان - آن بان کو انتہائی احترام کے ساتھ قایم رکھیں -

مرد عورتوں سے زیادہ سینما دیکھنے اور اُس سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ پردہ کی حسین تصویروں کا تقابل اپنی بکھری بالوں والی بیویوں سے کرتے اور کچھ بیزار سے ہوتے جارہے ہیں - یہ طریقہ بھی بیحد تباہ کن ہے گھر اور بازار میں بہت بڑا فرق ہے اور رہیگا -

اب عورت ظلموں سے قابو میں نہیں آسکیگی اگر مردوں کو اپنی زندگی میں سکون حاصل کرنا ہے تو صرف انسانیت کو مدنظر رکھیں اور نرم لب ولہجہ سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کریں ورنہ اندیشہ ہے کہ نیا لہروں میں ایسی ڈوبے گی کہ پھر اُبھرنے کی توقع بھی بیکار ہوگی -

ازدواجی زندگی کے اور بھی کئی پہلو قابل بحث رہ گئے وہ پھر سہی ——!

بقیہ صلا یہ بیوہ جو مرگئی میرے گھر کے برابر میں رہتی تھی —— اور آج میں مسجد کو چنے اور بتاشے بھیج رہی ہوں کہ اس کی ساس مرحومہ کو اپنی بہو نہیں سمجھتی تھی تو اس کو ثواب پہنچانے کی فکر کیوں ہونے چلی ....

ہماری بیوائیں شاید ایسی ہی ہوتی ہیں —— انہیں تو مرجانا چاہئے —— بھلا جینے سے کیا حاصل اوروں کو دکھ ہوتا —— اور ایمان کی کہئے تو اس کے حالات سن کر میں بے اختیار رونے لگتی ہوں —— ہائے . بیوہ بیچاری ——!!

(افسانہ)

سوزِ ناتمام

(سماج کے لئے لائحہ فکر) "یاسمین"

روپا کو آج تیس دن سے بخار تھا۔ اس کے بند بند میں درد تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس کو گھر کا کام کاج کرنا پڑتا تھا۔ مشترکہ خاندان کی ایک بہو کسی حالت میں بھی وہ گھر اور خانہ داری کے مرکز سے بے نیاز نہیں ہو سکتی تھی۔

اس سے قبل بھی ایک مرتبہ اسے شدید زکام ہو گیا تھا۔ نزلہ کی تکلیف کی وجہ سے اس کا بستر سے اٹھنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ اس کی اس حالت پر اس کے بے رحم بوڑھے خسر کو بھی عمر میں پہلی بار رحم آیا تھا اور اس نے اسے آرام لینے کو کہا تھا۔ لیکن اس کا دیور سروپ —— اجڈ گنوار —— دیہاتی نوجوان —— اس سے واقف نہ تھا کہ شہری بھائیوں کا کتنا احترام کرتے ہیں بہنوں کا کیا ٹال دیں لیکن بھابی ..... بھابی کا ہر ادنیٰ سا کام بھی الہام آسمانی سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بھائی ہی کی تو عزت ہے۔ اور کتنی دوڑ دھوپ کے بعد ایک عدد بھابی ہاتھ لگی ہے۔ پھر اس کی بات کو کیسے ٹالیں —— لیکن اجڈ گنوار ان نکات کو کیا سمجھیں۔ تعلیم حاصل کر لی تو کیا ہوا۔ ماحول کا اثر کہاں جا سکتا ہے۔ سروپ نے اس دن بھابی کو کیسی کھری کھری سنائی تھی ... " بھابی! یہ نخرے اپنے میکہ میں چلا لینا۔ یہ بہانہ بازیاں یہاں نہیں چلیں گی۔ تم نے سوچا کہ چلو اس بہانے گھر کے کام کاج سے چند روز چھٹکارا حاصل کروں " ... واہ تم نے یہ اچھی ترکیب نکالی ... اگر تم بیزار آگئی ہو تو کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ ہم بھیا کی دوسری شادی کر دیں گے "

..... ان بیدردانہ جگر پاش جملوں کو وہ سنتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ مشترکہ خاندان کی ایک بہو کیسے مردوں کے منہ لگے ..... البتہ وہ دل کی آگ کو آنسوؤں کی راہ نکالتی وہ زمین کی گرمی زلزلہ کی شکل میں نمودار ہوتی ہے تو دل کی آگ آنسوؤں کے روپ میں۔

شیام (روپا کا شوہر) اپنے گھر کی یہ کیفیت دیکھتا اپنی بیوی کی بے زبانی، بھائی اور باپ کی

بدزبانی۔ بے رحمی کو دیکھتا لیکن اف نہ کرسکتا۔۔۔ اگر وہ بیوی کی حمایت میں کبھی ایک لفظ بھی کہدے تو دنیا اسے بیا کہیگی —— زن مرید یہ طعن کون برداشت کرے لیکن حقیقت کا اظہار کون کرے اگر کرے بھی تو اس پر یقین کون کرے۔ آہ! کتنی تکلیف دہ اور کس قدر صبر آزما ہوتی ہے مجبوری۔۔۔ زندگی تمام مجبوریوں کا۔

مشترکہ خاندان کی سلامتی رہنے کے لئے اس قسم کی بے شمار قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ بیسیوں دفعہ ضبط و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس پر بھی لوگ پھوٹ ڈلوانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ نہ جانے خواہ مخواہ آپس میں بیر ڈلوانے میں لوگوں کو کیا مزہ ملتا ہے۔ شیام کی جان سخت عذاب میں تھی۔ ایک طرف تو ظالم سماج منہ پھاڑے کھڑی تھی۔۔۔ سوسائٹی کے اصولوں کی پابندی احکام الٰہی کی پابندی سے زیادہ ضروری تھی تو دوسری طرف حسن سوگوار کا خیال تھا بیوی کا پر مردہ چہرہ دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ اور یہ وقت ایک ہندوستانی چاہنے والے شوہر کے لئے بڑا صبر آزما ہوتا ہے وہ اُف نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ سوسائٹی کے آہنی زنجیروں کی گرفت میں ہوتا ہے۔ رُوپا کو اس گھر میں آئے ہوئے آج تین برس ہوئے لیکن اس عرصہ میں اس نے کتنا سکھ دیکھا کوئی اس سے پوچھے۔۔۔ ہر وقت بوڑھے خرانٹ خسر کی تیوریاں چڑھی رہتی ہیں اور دیور جوانی کی ترنگ میں ہمیشہ اس کے عیوب ہی ڈھونڈھتا رہتا۔ اب رہا شیام سو وہ بھی ایک خشک طبیعت کا انسان تھا۔ ٹینی سن کی طرح وہ زندگی کو ناکامیوں اور تلخیوں کے زاویہ سے جانچتا وہ شوہر سے کہیں زیادہ ایک فلسفی تھا۔ الہ آباد کا گریجویٹ۔ چار سال فلسفہ کی گتھیوں میں الجھ کر —— وہ زندگی کے ہر پہلو کو فلسفیانہ نظر سے دیکھتا۔۔۔ زندگی اور زندہ دلی سے وہ کوسوں دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رُوپا اس قدر جلد اپنی زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ اس زندگی سے وہ موت کو ہزار بار ترجیح دیتی۔۔۔ لیکن وہ ایک عورت تھی۔۔ ایک ہندوستانی عورت۔۔۔۔ وہ سوائے صبر اور شکر کے کرہی کیا سکتی تھی۔۔۔۔ اس کے کوئی بچہ بھی نہ تھا کہ اس کا جی بہل جاتا۔۔۔ بچے کو پاکر ماں سب کچھ کھوکر بھی بہت کچھ پالیتی ہے سینکڑوں ارمان، ہزاروں حسرتیں ممتا کی چوکھٹ پر ٹکرا ٹکرا کر قربان ہوجاتی ہیں وہ لاولد نہ تھی۔ اس کے بھی ایک بچہ ہوا تھا۔۔۔ لیکن تین مہینہ کے بعد ہی وہ گود خالی کرگیا۔ جب کبھی اس کو اس بچہ کا خیال آتا تو وہ گھنٹوں اپنی بدنصیبی پر روتی۔ اس تنہائی اور بےبسی کے عالم میں سرکتے اُجڑے ہوئے جیون کا ایک نو سہانا ہوتا۔۔۔ آج اس کی طبیعت

معمولا بہت زیادہ خراب تھی۔ ۔ ۔ آج اسے رہ رہ کر بھابی کی یاد آ رہی تھی۔ اس کی ماں کی موت کے بعد بھابی ہی اس کی ماں تھی۔ اسے اس نے کن نازوں سے پالا تھا۔ عام اصول کے خلاف وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھی۔

ایک دفعہ بھابی نے کسی بات پر بہن کو گھرکا تھا تو اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سوجھا لی تھیں اس وقت بھابی نے بھیا کو کتنا ڈانٹا تھا۔ لڑکی ذات کے معاملہ میں دخل دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ دکھیا بہن کا دل دکھاتے ہو۔

اس دن سے پھر بھیا نے کبھی اس کے معاملات میں دخل نہ دیا۔ اس کی پڑھائی کا بھابی کو کتنا خیال تھا۔ گھر کا سارا کاروبار خود کرکے وہ اسے پڑھنے کا موقع دیتی۔ ۔ ۔ ۔ آہ! ایسی بھابیاں دنیا میں کتنی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس کا بوڑھا باپ اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کی خاطر زندہ رہے۔ اس ایک لڑکی کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ اس کی ساری خوشیوں اور دلچسپیوں کا مرکز یہی ایک بچی تھی۔ اس کی خوشی کو وہ اپنی خوشی اور اس کے رنج کو اپنا رنج سمجھتا تھا۔ لیکن آہ! آج اس کی نور دیدہ کی زندگی کتنے مصائب کا شکار تھی۔ اس سے وہ لاعلم تھا۔ کیونکہ ایک خوددار ہندوستانی لڑکی اپنے شوہر اور سسرال والوں کے مظالم اپنے میکے والوں کو سنا کر ان کو رنجیدہ اور خود کو ان کی نظروں میں بے وقعت کرنا نہیں چاہتی۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانی بیویوں کا یہی تو معیار شرافت رکھا گیا ہے۔ وہ شوہر اور سسرال والوں کی ہر قسم کی سختیاں سہے۔ لیکن کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ ۔ ۔ ۔ واہ کیا خوب معیار شرافت ہے۔ بقول نور الحسن صاحب کے "تف ہے ایسی سماج پر جس نے لاکھوں کو بے موت مار، رگڑ رگڑ کر ان کی جانیں گئیں۔ ایسی خاموشی سے سلگ سلگ کر تمام عمر جلیں اور پھر راکھ ہوگئیں کہ دھواں نہ نکلا۔ کیا خوب انصاف ہے سماج کا۔" زیبا نے کبھی آج تک اپنے باپ کے سامنے اپنی تکالیف کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کی۔ بوڑھا باپ مطمئن تھا کہ "چلو بیٹی اپنے گھر خوش تو ہے" لیکن اس کے دل کا حال وہی خوب جانتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایچ۔ ایس۔ ایل۔ سی۔ کامیاب تھی۔ لیکن اب اس کی اس سند کی کیا وقعت تھی؟ مال کا مول تو خریداری کے وقت ہی ہوتا ہے، فروخت شدہ مال کی نہ تو تاجر ہی تعریف کرتا ہے اور نہ خریدار ہی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ پھر کیوں لڑکیوں کی تعلیم کی وقعت، ان کی ڈگریوں کی قیمت شادی کے بعد اہمیت رکھیگی۔ شادی سے

پہلے اس نے کتنے رنگین محل بنائے تھے۔ کتنے سنہرے سپنے دیکھے تھے جو شرمندہ تعبیر ہوئے تھے۔ آج اس کی امیدوں کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ بچپن میں کتنے ہی بار وہ ریڈیو پر گا چکی تھی۔ کلب میں متعدد مزنیہ تقریریں کر چکی تھی۔ ڈراموں میں حصہ لیا تھا . . . . . وہ کلب کی ایک سرگرم رکن تھی، اور سوسائٹی کی جان۔

ادب سے ایک خاص لگاؤ تھا . . . گھر میں خود اس کی اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری تھی سیاسیات میں اس کو کافی دخل تھا۔ موسیقی اور ڈرائینگ میں تو اسے کافی دستگاہ تھی اور یہی اس کی فرصت کے اوقات کے محبوب مشغلے تھے۔ لیکن آہ! اس کی اس وقت کی مصروفیات میں اور اب کے مشغلوں میں کتنا فرق تھا . . . . .

اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی زندگی سے ساری دلچسپیاں نکالدی گئی ہوں . . . . اب اس کی زندگی کا واحد مقصد صرف خانہ داری ہی خانہ داری رہ گیا ہو . . . . . اسے اپنی پچھلی زندگی ایک خواب معلوم ہوتی . . . . . . وہ تنگ آگئی تھی اس خشک زندگی سے . . . . کام . . . . کام . . . . کام . . . . . کولھو کے بیل کی طرح . . . . گو کہ اس کا خسر زمیندار تھا . . . اور گاؤں میں زمیندار بھی ایک تحصیلدار کے مماثل ہوتا ہے۔ پٹیل پٹواری۔ کسان سب پر حکمراں۔ لیکن وہ جس قدر فارغ البال تھا اسی قدر کنجوس بھی۔ کیا وہ دو نوکر نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن کیوں؟ بہو کو لانے کا آخر مقصد ہی کیا ہے۔ اس کو کھانا کپڑا مفت کیوں دیا جائے کنجوس ہونے کے علاوہ وہ ضرورت سے زیادہ تنگ خیال بھی تھا۔ عورتوں کا کتاب ہاتھ میں لینا گناہ کبیرہ، ان کا ڈیوڑھی تک جانا بھی سخت معیوب سمجھتا تھا۔ روپا کو میکہ جانے کی اجازت بھی بمشکل چند یوم کے لئے ملتی۔ کسی سے ملنا جلنا اور کہیں آنا جانا تو اسے سخت ناپسند تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ "پرائی بہو بیٹیوں کے میل جول سے گھر کی بہو بیٹی خراب ہو جاتی ہیں" اس ظالم بوڑھے کو عورت کے نازک احساسات کا علم نہ تھا اور ہوتا بھی کیونکر؟ اس کے آگے کوئی بیٹی ہوتی تو وہ پرائی بہو بیٹی کی قدر جانتا" اس کے مختل دماغ میں تو صرف یہ سودا سمایا تھا کہ "عورتیں صرف انتظام خانہ داری اور مردوں کی خدمت گذاری کے لئے پیدا کیگئی ہیں۔ بیٹوں پر بھی اس کا کافی رعب تھا۔ بڑا بیٹا شیام باوجود شادی شدہ ہونے کے، اتنی جراءت نہ کر سکتا تھا کہ باپ کے سامنے سگار بھی پی سکے یا اپنے دوستوں سے ہنس بول کر بات ہی کرلے۔ بڈھے کے سخت سے سخت اصول کی بھی تردید کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی گو دل میں انتہائی مخالفت کا جذبہ ہی کیوں نہ موجزن ہو۔ یہی

اور صرف یہی وجہ تھی کہ وہ ثریا کو خوش نہ رکھ سکتا تھا۔ ثریا ایک سمجھدار اور طبعاً نیک عورت
تھی، وہ اس کی مجبوریوں کو جانتی تھی اس کی خاطر وہ ساری مصیبتوں کا مقابلہ نہایت صبر و سکون
سے بلا شکوہ کے کر رہی تھی۔ البتہ دل پر اس کا قابو نہ تھا۔ جب کبھی احساسات کا غلبہ زیادہ
ہوتا اور اپنی گذشتہ زندگی یاد آتی تو رات کی تنہائی اور خاموشی میں وہ اپنے بربط دل کے تار دل
کو سہلاتی تو ان سے ایک ایسا شور پیدا ہوتا جو کائنات کو مضطرب کر دے اپنی زندگی کے اس
زبردست انقلاب کو شادی ٹھیراتی۔ ہاں وہی شادی جو ہارڈی کی نظر میں "ایک ایسا جوا ہے
جس میں ہار ہمیشہ عورت کی ہوتی ہے" وہ سوچتی آہ! "شادی" کس قدر جاذب نظر لفظ
ہے اور جتنی بھی جاذب نظر چیزیں ہوتی ہیں وہ صرف دور ہی سے اچھی معلوم ہوتی ہیں ایک
مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ لینا چاہتی ہے۔ لیکن ان کے قریب جانا
خطرناک اور ان کو پانے کی کوشش کرنا انتہائی خطرناک ہے اور حماقت انگیز بھی ـــ شادی
بھی ایک سراب ہے جس کو دور سے دیکھ کر لوگ چشمہ کا دھوکہ کھاتے ہیں۔ لیکن قریب سے دیکھو تو
حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو ایک خواب ہے رنگین ۔ ۔ ۔ ۔ ایک طلسم ہے ہوش ربا۔ ایک
دھوکہ ہے دلچسپ۔ ایک جال ہے سنہرا۔ جس میں ہر لڑکی دیدہ دانستہ گرفتار ہو جاتی ہے۔
وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس کی زندگی کامیاب اور خوشگوار گذرے گی ۔ ۔ ۔ لیکن ہوتا اس کے برخلاف
ہے ۔ ۔ ۔ وہ مذہبی، سماجی اور قانونی گرفت میں آجاتی ہے۔ جب اس کو اپنی آزادی کے
سلب ہونے کا بلکہ "اپنے آپ کو" کھو دینے کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس جال سے نکلنا چاہتی
ہے۔ اس قید سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ حتیٰ کہ اسی کشمکش میں وہ اس طائر بے بال و پر
کے مانند ہو جاتی ہے جو پنجرے میں مقید آزادی! آزادی!! آزادی!!! کی حسرت میں ہی
تڑپ تڑپ کر جان دیا ہو۔ شادی کے ترانوں میں نغمات موت بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔
شہنائی کی آواز زندگی کی رعنائیوں اور دلکشیوں کی بھی ترجمان ہوتی ہے اور تلخیوں کی بھی
۔ ۔ ۔ ۔ یہ اور بات ہے کہ سننے والا سنے لیکن اس پر غور نہ کرے۔ اور زندگی کی ان تلخیوں کو
ان تاریک پہلوؤں کو روزمرہ کے عام واقعات پر محمول کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شاعر، عام انسان
ایک مصنف اور ہم میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ شاعر منظر کی کیفیت سے متاثر ہوتا ہے۔ مصنف
زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پلاٹ کے سانچے میں ڈھالتا ہے لیکن عوام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اس کو
سطحی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انتہائی سبق آموز اور عبرت انگیز واقعات کو بھی روزمرہ کے معمولی واقعات سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں پھر درس عبرت کیسے حاصل ہو . . . . .

یہی اور صرف یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں عورت کے دل کی آواز دنیا والوں تک نہیں پہنچی اگر چہ اس کا نالۂ دل عرش الٰہی کو بھی مرتعش کر دیتا ہے - شاعر کو دیوانہ بنا دیتا ہے . . . مصنف کو خون کے آنسو رلواتا ہے . . . . . . لیکن سماج . . . . بے حس سماج کو اس کے آنسوؤں کی کوئی پرواہ نہیں . . . . . وہ تو مکر ہے اور مکر و فریب عورت کی فطرت میں داخل ہے . . . . . سماج کے آگے ان موتیوں کی قیمت لگانا ایسا ہی ہے جیسا کہ بہرے کے آگے بین بجانا -

کوفت . . . . کوفت - کوفت . . . ہر وقت کا کڑھاپا . . . . دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جانا . . . . ضبط . . . . ضبط . . . ضبط . . . . آخر رُوپا کو دق ہو گیا - ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ انتہائی رنج کے باعث اس مرض نے اندر ہی اندر اپنا کام کیا ہے . . . ابتداء میں تو اس کے اس موذی مرض کو تک بہانہ بازیوں اور "احدی پن" سے تعبیر کیا گیا - لیکن رفتہ رفتہ جب مرض نے جڑ پکڑنا شروع کیا اور اثار مرض بھی صاف طور پر نمودار ہونے لگے تو اس خوف سے کہ کہیں یہ منحوس رُوپا سارے گھر میں نہ پھیل جائے رُوپا کو فوراً اس کے میکے بھیج دیا گیا . . . . وہاں بہت کچھ علاج کروایا گیا - سینی ٹوریم لے گئے - لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی - حتیٰ کہ ایک شام غریب رُوپا باپ ، بھائی اور بھابی کو تڑپتا چھوڑ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئی - بوڑھا باپ اس جانکاہ صدمہ کو برداشت نہ کر سکا . . . . وہ پاگل ہو گیا . . . . . چتا ابھی جل ہی رہی تھی کہ اس میں ایک زور کا دھماکا ہوا . . . . فضا میں ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی . . . . . اور ساتھ ہی ایک اور جسم بھی شعلوں میں لپٹا ہوا نظر آیا ، اور چند ہی سکنڈ میں باپ اور بیٹی دونوں کی روحیں مل گئیں پھر ایسی دنیا میں پہنچ گئیں - جہاں سکون ہی سکون ہے . . . . جہاں سماج کے ٹھیکہ داروں کا عکس بھی نہیں - جہاں مذہب کے نام پر ملت کا خون کرنے والوں کا گذر تک نہیں . . . . . یہ ہے ظالم سماج کا سلوک ایک عورت کے ساتھ . . . . . . ایک ہندوستانی شریف زادی کے ساتھ . . . . ایک ہندو استری کے ساتھ . . . .

مذہب اور سماج کے ٹھیکہ دار آئیں اور دیکھیں کہ ان کی ناانصافیوں نے ان کے

بیجا تشدد نے عورت کو کہاں تک پسپا یا ہے . . . کس حد تک اس کی زندگی اجیرن کر دی ہے - سماجی اصولوں پر مذہب اور اخلاق کے دلفریب الفاظ کے ملمع نے کہاں تک اسے برباد کیا ہے - اس کی ذہنیت کو کس قدر پست . . . کس قدر غلامانہ بنایا ہے . . . حتیٰ کہ وہ اپنے وجود سے نفرت کرنے لگی ہے - عورت ذات کو " دبی دبائی رہنا چاہئے " اس نظریہ نے کتنوں کو بے موت مارا ہے . . . . . .

آہ ! وہ عورت جو روح کو فرحت بخشے - گھروں کی رونق بنے ، دلوں پر حکمرانی کرے اور کائنات کو معطر بنانے کے لئے پیدا کیگئی تھی . . آج وہ اس ہیرے کے مانند ہے جو خاک میں مل کر اپنی اصلی آب وتاب بھی کھو بیٹھے -

عورت یوں گھل گھل کر جان دیدے . . . . اور مرد . . . . اس کی زندگی کے باغ میں کبھی خزاں آتی ہی نہیں . . . . اور جو کبھی کبھار ایک آدھ جھونکا بھی آجائے تو وہ پھر پیار کے جھونکے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی زندگی کے باغ میں سے گذرے اور اس کی روح نو از سر نو معطر کرے . . . . روپا نے تو یوں اپنے آپ کو فنا کر دیا . . . . شتر کہ خاندان کی سلامتی روی کیلئے بقا کے لئے وہ خود فنا ہو گئی . . . . لیکن شیام اس نے ایک ہی سال کے اندر پھر دوسری شادی کر لی اور اب وہ اس بیوی سے بے انتہا محبت کرتا ہے — کیوں نہ ہو . . . دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے - بوڑھا خسر اب بہو بیٹے کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتا . . . کبھی کوئی بات ناگوار خاطر گذرے تو کھانسنے کھنکارنے پر اکتفا کر بیٹھتا ہے - اب اس کی پرواہ ہی کون کرتا ہے . . . . شہر کے سب سے بڑے تاجر سیٹھ ہیرا لال کی اکلوتی حسین فیشن ایبل لڑکی . . . . اگلے وقتوں کے لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی کے ساتھ بدی کریں تو اس کا بدلہ اگلے جنم میں ضرور ملے گا لیکن اس زمانہ میں تو کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے - شاید قدرت کو بھی عورت کی بے بسی بیکسی اور بے زبانی پر رحم آگیا ہے - یہ قدرت کا انتقام ہے اور خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے - ؎

قریب ہے یار روز محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیتک جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

روپا کا چاند سا مکھڑا خاک میں مل گیا . . . . وہ چلی گئی اس دنیا سے . . . . سینکڑوں ارمانوں ہزاروں حسرتوں کو دل میں لئے . . . . . . ناشاد . . . . . نامراد . . . . اس نے اپنی زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھی تھیں . . . . عین موسم بہار ہی میں بلبل کا چہچہانا ختم ہو جائے . . . . ہمیشہ ہمیشہ کے لئے . . . ڈراہی تکلیف دہ اور روح فرسا منظر ہے -

"روپا کی داستان کوئی افسانہ نہیں، ہزاروں ہندوستانی لڑکیوں کی زندگیوں کا عکس ہے تصویر کا تاریک پہلو ہے.... ہماری معاشرت کی تلخ حقیقت ہے..... نہ جانے عورت کب سماج کے ان آہنی زنجیروں کی گرفت سے نکلیگی۔

اقبال نے تو ہندوستانیوں کے موجودہ زوال پر فرمایا تھا" صدیوں رہا ہے دشمن دُور زماں ہمارا" لیکن مجھے تو عورتوں کی موجودہ حالت پر بھی صادق نظر آتا ہے۔

محترم بھائیو! کیا تمھیں اپنے بہنوں کی حالت زار پر رحم نہیں آتا - تمہاری سینکڑوں بہنیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہی ہیں - ہزاروں، ہر سال دق اور سیل کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن تم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا - تم اس کو طبعی موت سمجھتے ہو.........

یہ جو چند عورتوں نے کسی نہ کسی خصوصیت کی بناء پر آزادی حاصل کرلی ہے۔ اور کامیاب زندگی گذار رہی ہیں تو تم یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے ہو کہ" اب اصلاحات کی بالکل ضرورت نہیں رہی عورتیں خود اپنی اصلاح آپ کر سکتی ہیں اور ان کی زندگی اب پہلے کی بہ نسبت بہت اچھی ہے" تو یہ صرف تمہارا خیال ہی خیال ہے - شہر سے قطع نظر کرکے دیہات میں جاؤ جہاں حقیقی معنوں میں اصل ہندوستانی رہتا ہے...... دقیانوسی.... توہم پرست..... اجڈ گنوار ٹھیٹ دیہاتی.... یہاں تمھیں زندگی کی تلخیاں واضح طور پر نظر آئیں گی - کیونکہ شہروں کے برخلاف یہاں کی زندگی اصلی اور فطری ہوتی ہے - تم جان جاؤ گے کہ عورت کس طرح سماج کی کنیز بنی ہوئی ہے اور کس ہوشیاری سے اس کی ذہنی تربیت اس طرح کیگئی ہے کہ وہ غلامی میں ہی خوش رہے - تم ادب اور انشاء کے چمنوں کی سیر کرتے ہو، نیوٹن اور پاتیل کے کلیات کی تصدیق کرتے ہو، ریاضی کے پیچیدہ سے پیچیدہ نکات کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہو، فلسفہ کی گتھیوں میں الجھکر ناممکن چیز کو ممکن کرتے ہو، ناقابل قبول عذرات کو منواتے ہو..... تو کیا یہ روگ تمہارے بس کا نہیں ابھی وقت ہے علاج کرو، ورنہ یہ مرض لاعلاج ہو جائے گا۔

ہم میں حوصلے اور ارادے تو بہت ہوتے ہیں لیکن ہم..... ہم پردہ نشین خواتین تمہارا مقابلہ نہیں کرسکیں - ہمارے درمیان پھر وہی سماجی گرفتیں حائل رہتی ہیں جو اگر تمہارے درمیان آجائیں تو تم ان کو توڑ دو - نیست و نابود کردو، اگر چاہو تو پہاڑوں کو ہٹا سکتے ہو - دریاؤں کو موڑ سکتے ہو - بشرطیکہ تمہارے عزائم ہمالیہ پہاڑ کی طرح بلند اور اٹل ہوں......

پھر دیکھو قدرت تمہاری تمہاری کس طرح مدد کرتی ہے" ہمت مرداں مدد خدا" اور یوں ہی قدرت

ظالم سے مظلوم کو بچانے کے لئے ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔

سماج کی اصلاح کرنا ہر باشندہ کا فرض ہے خواہ وہ مسلم ہو یا ہندو۔ ہندو بھائیوں کو تو اپنی معاشرت کی سدھار کے لئے اور زیادہ سرگرمی اور زیادہ مستعدی سے کام کرنا چاہئے ان کی معاشرت میں عورتوں پر بعض بعض قیود بہت تکلیف دہ اور بیجا ہیں اور ہماری معاشرت بھی ان کے باہمی میل جول سے بڑی حد تک اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی میں اپنی بہنوں سے بھی ملتجی ہوں کہ وہ سارا بوجھ مردوں پر ڈال کر خود عضو معطل نہ بنیں۔ جب دنیا میں آئی ہیں تو اپنے ملک اور قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے کچھ نہ کچھ کریں۔ سماجی سدھار عورتوں کی ہی توجہ کی رہین منت ہے۔ کیونکہ تمدنی زندگی کی ابتداء گھر سے ہوتی ہے۔ مشترکہ خاندان کا رواج گھر ہی میں پرورش پاتا رہا ہے۔ اور گھر عورت کی ملکیت ہے۔ عورت اگر چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ "احساس کمتری" کو نکال دے۔

مردوں سے اگر ہم ہر کام کی توقع رکھیں تو یہ ہماری سراسر نادانی اور بھول ہوگی کیونکہ مشرق کے شاعر اعظم فرماتے ہیں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔۔۔ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہاں پر "قوم" کی جگہ لفظ "جنس" رکھ دیا جائے تو بالکل ہی موزوں ہوگا۔ اور پھر مرد کیا کیا کریں۔ ملازمت بھی کریں۔ سیاسیات کو بھی سنبھالیں اور پھر خانگی ذمہ داریوں کو بھی محسوس کریں۔ . . . یہ ہماری انتہائی ناانصافی ہوگی۔ اگر ہم اسی طرح سارا بوجھ ان پر ڈال کر خود انجان بنے بیٹھے رہیں۔ آج جبکہ ہمارے ہر طرف "انقلاب! انقلاب کی آواز صدائے بازگشت بن کر گونج رہی ہے تو کیا اس آواز پر عورتیں لبیک نہ کہیں گی . . . . انقلاب کے اس دور میں کیا خواتین کچھ بھی حصہ نہ لیں گی۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ عورتیں سارا کام مردوں پر چھوڑ کر خود صرف خانہ داری کے مرکز کی ہی ہو رہیں اور چھالیہ کترنے اور معمولی لکھنے پڑھنے کو ہی معراج سمجھیں ؛

"بیوہ بیچاری"

(افسانہ) رضیہ قمر بی-اے

اب وہ بالکل خاموش رہتی تھی دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔صرف وہ اکیلی تھی۔بچپن میں اس کے ماں باپ زندہ تھے۔اس کے رشتہ دار زندہ تھے۔اس کے احباب زندہ تھے۔وہ خود ایک اونچے گھرانے کی سمجھی جاتی تھی۔اور اس کو اپنانے والا بھی ایک اونچے گھرانے کا ہی تھا۔وہ تھی تو ایک اچھے گھرانے کی لیکن قدرت سے طبیعت کچھ ایسی پائی تھی کہ منہ میں زبان نظر ہی نہ آتی تھی اور ویسے بھی اپنے لوگوں کی زبان چلتی خوب ہے۔اس کی شادی کو ہوئے چند سال آگے پیچھے اس کے ماں باپ چل بسے۔اور قسمت کی ماری جی بھر کر رو نہ پائی تھی کہ شوہر اللہ کو پیارا ہوا۔لاڈ و پیار میں پلی ہوئی دلاری نے غم کا ہے کو دیکھا تھا۔بستر پر کچھ گری ایسا کہ پٹیا بجا کی ہو رہی۔اب وہ بالکل خاموش رہتی تھی۔دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔صرف وہ اکیلی تھی۔خاوند اور اس کے ماں باپ کیا مرے اس کے سارے رشتہ دار اور احباب بھی ایک ساتھ مر گئے صدمہ اور صدمہ۔بس وہ روتی کی روتی رہی۔اور دن بھر روتی رہی۔کھانا پینا حرام ہو گیا گھر والوں کے طعنے سنتے سنتے کلیجہ جیسے پک گیا اور وہ گھلتی گھلتی تانتا سی ہو گئی۔رنگ زرد پڑ گیا، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ہڈیاں ابھر آئیں اور معلوم ایسا پڑتا کہ قبر سے مردہ اٹھ کر ابھی ابھی آیا ہے مرحوم شوہر کی بات جب کبھی کوئی چھیڑتا تو وہ خود کو کوستی اور اپنی موت کی دعا مانگتی اور موت جیسے اس کی صورت دیکھ گھبراتی تھی۔اس کے درد کا حصہ دار کوئی نہیں تھا۔ایک بچہ ہی ہوتا کہ وہ اپنا غم بانٹ لیتی اور نہیں تو اپنے مرحوم خاوند کی نشانی کو دیکھ دیکھ اس دنیا میں جیتی —— شوہر کو فوت ہوئے چھ سال گذر گئے اور اس نے دوسری شادی کا کبھی خیال نہیں کیا —— اڑوس پڑوس والے سمجھاتے مناتے لیکن وہ برابر انکاری جواب دیتی رہتی اس کا شوہر اس کو بے حد چاہتا تھا۔دونوں دو جان ایک قالب تھے۔دنیا کی ساری رنگینیاں جیسے ان ہی کے لئے ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔اور کبھی ان دونوں نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ ان کی مسرتوں کو چھیننے والا بھی موجود ہے ...... وہ باہر سے آئے اور فوراً غٹ غٹ پانی کا پیالہ پی گئے جگر تھام کر بیٹھ گئے۔ . . اور لوگوں نے کہا —— لوگوں نے کہا —— گھر والوں نے کہا ... مر گئے! مر گئے —— ! وہ اپنی تنگ کوٹھری میں پڑی رہتی۔اپنے خاوند کی باتیں یاد کر کر کے روتی جاتی۔سڑک سے کوئی بارات گذرتی —— یا گھر میں کبھی کسی کی شادی کے ڈھکوسلے ہوتے تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔اب اس کے جگر میں تاب نہ تھی۔بس رہ رہ کر کچھ ہچکیاں سی آتیں اور تڑپ جاتی تھی —— ہڈیوں کے ڈھانچے میں روح کی

آرزو تھی - اور اس کو رونا نہیں آتا تھا - کہتے ہیں وہ روتی ہے لیکن آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے -
اس کے شوہر کو مرے ہوئے چھ سال ہوتے ہیں اور دو سال سے اب اس کے آنسوں نہیں نکلتے اور اس کے
بعد بھی وہ روتی ہے . . . . اس کا دل روتا ہے اس کا نحیف و نزار جسم روتا ہے - اس کی یہ زندگی بھی
کیا زندگی تھی — طبعی موت سے پہلے ہی وہ مر چکی تھی ، اپنے ہاتھوں سے — اوروں کے ہاتھوں سے
اور پولس مداخلت نہیں کرتی - سارا گھر اس کو منحوس کہتا - لیکن اس کے منہ میں زبان نہیں تھی کہ
ان کا جواب دیتی سنتی اور اپنے ماں باپ اور خاوند کی قبروں پر جا کر گھنٹوں روتی - لوگوں نے اس کا
سارا زیور اتار لیا - بیوہ کو کیا حق بھلا زیوروں پر — اس کا گھر چھین لیا - اور اس کو ایک کوٹھری
دیدی کہ مرنا ہو تو اس کال کوٹھری میں پڑی پڑی مرجا - اور اگر وہ احتجاج کرتی تو سارا گھر جمع ہو جاتا اور
کہتا کیا تم اپنے میکے سے یہی سیکھ آئی تھیں — ڈائن — چنڈال . . . وہ زہر کے گھونٹ پی کے رہ جا
سارا گھر جیسے اس کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا - اس کی اچھی عادتیں بھی ان کی نظروں میں
کھٹکتی تھیں اور تو کوئی سیدھے منہ بھی بات نہ کرتا تھا وہ جینا نہیں چاہتی تھی لیکن جینے پر مجبور تھی
ساس کہتی میرے بیٹے کو تو کھا گئی - نند بولتی میرے بھیا کو تو نگل گئی — اُف بھوت . . . پریت سے
بھی گئی گذری تھی ، دن بھر نقاہت ، کمزوری کے باوجود گھر کا ذلیل سے ذلیل کام کرتی اور جو نہ کرتی تو
گھرکیاں پڑتیں . . . طعنے شروع ہو جاتے . . . . اور وہ روتی لیکن آنسو نہیں نظر آتے — چڑیوں کے
چہچہانے سے قبل وہ اٹھتی ، دن بھر ماما اور باندی کی طرح ہر چھوٹے بڑے کی خدمت کرتی اور رات میں
کال کوٹھری کے ایک کونے میں اپنی زندگی کی ایک رات کم کر دیتی — علی الصبح اٹھنے میں جو ذرا دیر لگتی
تو وہ الٹی سیدھی پڑتی کہ اللہ اللہ خیر سلا - گھر والے بندے کا ہیکو ہوئے . خود مختار - خدا ہوئے وہ
ایک روز سویرے جو اٹھی تو تیز بخار تھا - ویسے ہی لیٹ رہی . . ساس اماں کی آواز گونجی . . .
آواز گونجتی رہی . . . . اس میں طعن اور طنز کے تیز نشتر تھے - گالیاں تھیں اور اس کے میکہ کی برائیاں
. . . وہ اللہ کو یاد کرتی اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کام میں لگ گئی . . . سب کچھ کیا . . . لیکن دوپہر
پہلے وہ چکرا کر گری اور اس دنیا سے منہ موڑ گئی -

یہ تھی ایک بیوہ کی زندگی . . . جس کی مانگ اجڑ گئی . گھر تباہ ہوا اور دنیا کے مظالم کے آگے
اس نے اپنی جان دینا گوارا کیا - لیکن زبان سے کبھی اف تک نہیں نکالی — وہ مرگئی اور اس کو اس کے
گھر والوں نے قبر میں اتر کر بھی آتا رنا پسند نہ کیا - محلہ کے چند ذی اثر لوگوں نے اس کے کفن دفن کا انتظام
کیا - اور اس نے اپنے سرخ کفن میں اپنی سسرال کے سارے طعنے . . . . ساری گالیاں چھپا لیں . . . .

بقیہ صفحہ ۳۶

3238
REGD.M.N.D.

رجسٹرڈ آصفیہ

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب دبیرپورہ سے شائع ہوا

جلد (۱۵) تیر ۱۳۵۶ ف مئی ۱۹۴۷ء نمبر (۸)

(مرتبہ)

چندہ سالانہ (صہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

ذرّات

شہاب کے پابندی اوقات کا آپ کو اعتراف ہوگا کہ جس نے جنگ جیسی ہولناک عالم میں امتیازی خصوصیت کو ضائع ہونے نہ دیا۔ جو ابتدا رہی سے اس کوشش میں مصروف ہے کہ سنجیدہ اور کارآمد مضامین سے اس کو ایک معیاری پرچہ بنایا جائے۔ لیکن آج تک صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔ آپ کے ذوق حدیث تسکین کیسے مضامین سے ہوسکتی ہے۔

ایک گروہ ٹھوس مضامین کا طالب ہے۔ نوجوان طبقہ افسانوں کا دلدادہ ہے۔ خواتین دستکاری بخت و پز۔ گھریلو زندگی کی جویا ہیں۔ چنانچہ ایسی فرمائشوں کی تکمیل میں ممکنہ خدمت کیگئی ہے تاہم مزید انقلاب پر طبائع مایل ہوں تو خواتین اور حضرات اپنے لئے کوئی عنوان انتخاب کرلیں اور ہر مہینہ اپنی قلمی کاوشوں کی داد حاصل کریں۔ افسانوں کی بڑھتی مانگ ہے لیکن ایسے افسانوں کے لئے شہاب کے صفحات آمادہ استقبال رہیں گے۔ جس میں کسی سماجی مسئلہ کی اصلاح ہو۔ لیکن وہ افسانے جن میں کسی پر طعن یا عریانیت ہو قابل قبول نہ ہوں گے۔ لطیف مزاحیہ مضامین ہمارے معاشرہ کی اصلاح کرسکتے ہیں۔

تاریخی علمی۔ ادبی۔ مضامین میں اختصار سے کام لیا جائے تو نہایت مفید ہوں گے ایسے مضامین جو بااقساط شائع ہوں قارئیں کیلئے ذوق حدیث کا سامان بہم پہنچانے میں مانع ہوتے ہیں کیونکہ ایک قسط پڑھنے کے بعد دوسرے حصہ کا انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے۔

اس مہینہ سے ایک صفحہ استفسارات کیلئے مختص کر دیا گیا ہے۔ خواتین اور حضرات اس کی اعانت کرسکتے ہیں۔

'سبدگل' یا کہکشاں' آپ کے پسندیدہ اشعار کے لئے وقف ہے 'ٹوٹے ہوئے تارے'، آپ کے دلچسپ خطوط اور اون کے پرلطف جواب کیلئے تیار رہیں گے۔ اس لئے حضرات اور خواتین ان عنوانات میں ہمارے ساتھ تعاون کریں کیونکہ شہاب ہمارا نہیں بلکہ آپ سب کا ہے۔

جن خواتین اور حضرات کے عزیز و اقارب یورپ گئے ہوئے ہیں اون کے خطوط کا دلچسپ اقتباس جو قابل اشاعت ہو شہاب کو بھجوا دیں تو باعث تشکر۔ اس طرح یورپ کے حالات سے قارئین باخبر رہ سکیں گے

یورپ سے

سیوائے ہوٹل۔ لندن

۱۵/اپریل سنہ ۱۹۴۷ء

خورداد میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے نواب شہید یار جنگ بہادر حضرت شاہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر ادام اللہ اقبالہ کے ساتھ "امریکہ" کا قصد پرواز رکھتے ہیں۔ چنانچہ شہید کی مستعدی ملاحظہ ہو کہ ۹/اپریل کو کراچی سے پرواز کرکے قاہرہ میں ٹھہرتے ہوئے لندن پہنچتے ہیں اور "سوائے ہوٹل" میں بیٹھ کر ۱۵/اپریل کو ہوائی ڈاک سے اپنے سیاحت کی قسط اول ارسال کرتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ روداد چمن قاہرہ سے لندن اور لندن سے امریکہ تک سنانے والے ہیں۔ اور یہ دلچسپ داستان "لطیف بود حکایت دراز تر گفتم" ہو جائے تو اور بھی کیف انگیز بن جائیگی۔ (ب)

—— (۱) ——

محبی سبحل۔ سلام مسنون اسلام۔ تم نے میرے چلتے وقت وہی اپنا پرانا راگ الاپا تھا کہ شہاب کا خیال رکھنا اور سفر کے حالات ضرور لکھنا۔ اوّل تو اب شہاب کا طفلی کا زمانہ نہیں رہا۔ اس وقت میں زیادہ فکر کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرے یہ کہ پہلے سفر کے وقت طبیعت جوان تھی اچھا بُرا جو خیال میں آیا لکھ مارا۔ اب عمر کا تقاضا۔ احتیاط و غور فکر نے روانی کا ناس کر دیا۔ پھر سچ تو یہ ہے کہ۔

دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے۔

سفر کے حالات لکھنا مشکل ہی نہیں نا ممکن۔ البتہ اپنے پہونچنے کی اطلاع تمہیں دیدینی چاہئے تھی وہ دیدی۔ اب تم جانو تمہارا کام، بمبئی سے ہوائی جہاز پر سوار ہوا تم جانتے ہو ہوائی جہاز پر سوار ہونے کا یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ بقول شخصے اب تو میری زندگی ہوا پر گذر رہی ہے مگر جب کبھی ایروپلین (ہوائی جہاز) پر سوار ہوتا ہوں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرب خدا کا کر رہا ہوں۔ خدا معلوم اس سواری کے متعلق نادر شاہ ایران کی رائے کیا ہوتی۔ ہوائی جہاز کا

سفر (خدا تمہیں نصیب کرے) کچھ عجیب سفر ہوتا ہے۔ بہ ظاہر کوئی تکلیف نہیں۔ رہا خرابی موسم اور AIR POTS یہ شروع شروع کچھ تکلیف دیں تو دیں عادی ہونے سے پریشانی نہیں رہتی۔ البتہ ایک عجیب قسم کا مخفی احساس اعصاب پر اثر کرتا رہتا ہے۔ کس طرح تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ تم نے کبھی نیلگری یا کوئی دوسرے HILLSTATION کا سفر کیا ہے تو اتنا خیال کرو کہ پہاڑ سے اترتے ہوئے موٹر کے بریک ٹوٹ جائیں۔ کہو دل کا کیا حال ہوگا اور تم کس قسم کے احساسات اور تفکرات میں مبتلا ہوگے۔ ایک بڑے تناور درخت پر جھولا ڈالو اور پینگ جب پورے کمال پر ہو تو رسی سے ہاتھ جدا کرلو، اس سے بہتر کوئی دوسرا تجربہ نہیں ہوسکتا۔

غرض میرا مطلب یہ ہے کہ ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہوتا رہتا ہے۔ بمبئی سے کراچی ساڑھے چار گھنٹے کا سفر ہے۔ کراچی میں ایک روز قیام رہا۔ کراچی چونکہ سندھ کے صحرا میں واقع ہے۔ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اپریل کے مہینے گرمی کا کیا عالم ہوگا مگر کراچی کا ٹمپریچر کسی وقت ایک سو سے زیادہ نہیں ہوتا اور اپریل کا مہینہ تو نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ نہایت لطیف ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ راتیں ٹھنڈی فضا پرسکون۔ بمبئی سے جب چلے تھے تو مارے پسینے کے کپڑے شرابور تھے۔ کراچی بھی بندرگاہ ہے مگر یہاں پسینے کی وہ کیفیت نہیں ہے۔ البتہ یہاں چونکہ پانی کی قلت ہے اور بارش بھی سال میں تین چار انچ سے زیادہ نہیں ہوتی باغات اور درختوں کی کمی ہے۔ یہاں دس بارہ میل کے فاصلہ پر گرم پانی کے چشمے ہیں۔ جذامی بھی یہاں رکھے جاتے ہیں اور اون کا علاج ہوتا ہے مگر مقام اتنا کثیف اور رستہ ایسا خراب ہے کہ پانی نہانا کجا دو منٹ ٹھیرنا بار ہوگیا۔ تمہیں یاد ہوگا سوئزرلینڈ کے ایسے چشموں کے متعلق میں نے شاید کچھ لکھا ہے۔ غرض مغرب اور مشرق کا فرق شاید ہی اس سے بہتر کہیں اور نظر آسکے۔ یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ایک چشمہ ہے۔

کہتے ہیں اس چھوٹے سے چشمے میں تقریباً دو سو سے زیادہ مگرمچھ ہوں گے۔ مریدین اور پجاری گوشت اور بکرے نذر چڑھاتے رہتے ہیں اور یہ مگن رہتے ہیں۔ ہمارے لئے بھی بکرے لائے گئے مگر ہم نے خدا کی راہ میں کونسی قربانی دی تھی جو اس مگر کے بچے کو بکرا بھینٹ چڑھاتے۔ صاحب تعجب تو اس پر ہے کہ سندھی مسلمان بھی مگر کو پوجتا ہے۔ اور اعتقاد رکھتا ہے۔ یہی وہ شہر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ قائد اعظم پاکستان کا دارالخلافہ مقرر کرنا چاہتے ہیں اور وہ پلیگ کا

صدر مقام ہونے کے لحاظ سے اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی بہتر تو ہے۔

دوسرے روز رات کے ساڑھے دس بجے کراچی سے پرواز کی یہ ہوائی جہاز YARK کہلاتا ہے۔ اس میں پینتیس ۳۵ مسافر سفر کر سکتے ہیں اس کی رفتار کے متعلق تمہیں وہ شعر یاد ہوگا۔

وہ سبک سیر ہے رہوار کہ راکب اس کا — حاضری کھائے تو دہلی میں تو، لندن میں ٹفن

تقریباً گیارہ بجے رات کے ہم سوار ہوئے۔ بصرہ پر ایک گھنٹہ قیام ہوا اور صبح کے سات بجے ہم اوس سرزمین پر تھے جس کا ذکر دنیا کے بہترین حصہ میں پروردگار عالم نے کیا ہے۔ جہاں دنیا میں حسن و عشق کا پہلا ڈراما کھیلا گیا۔ جہاں خدائی کے دعوے کئے گئے۔ جہاں معجزات و کرامات ہوتے رہے۔ جہاں انسانی عروج و ذلت کی انتہائی مثالیں پیش کی گئیں۔ نبوت تو ختم ہو چکی مگر حسن تو ختم نہیں ہوا۔ قاہرہ میں حسن ہے۔ اور اوسی شان سے باقی ہے۔ آج بھی یہاں حسن، خود اظہار عشق کر رہا ہے۔ یہاں پردیسی یوسف دامن بچاتا نظر آتا ہے مگر زلیخا کی گرفت سے خدا ہی بچائے۔ دیکھا تم نے یہ خدا کی پہلی خلقت یعنی عشق ہم سے مردہ دلوں کے خون میں بھی روانی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ہم "پیری لکے دم زعشق زند بس غنیمت است" کے مصداق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خیر اب ایک روز یہاں قیام ہے اور پھر ہم رات کے ساڑھے گیارہ بجے اڑنے والے ہیں۔ قاہرہ میں ہم نے کیا دیکھا اور کیا کیا پھر کبھی تمہیں سنائیں گے۔ خدا حافظ۔

تمہارا شہید

یہ خبر نہایت المناک ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ مشہور ادیب و مزاح نگار نے حرکت قلب کے عارضہ سے ۲۷ اپریل داعی اجل کو لبیک کہا۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ ہنستا بولتا انسان جو دوسروں کو ہنساتا اور خود بھی ہنستا رہتا تھا یوں ہم سے ہنستے بولتے رخصت ہو جائیگا۔ مرحوم کو زندگی بھر ادب سے دلچسپی رہی اور جب سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تھے اپنے حلقہ احباب میں ایک انجمن ادب قائم کی تھی اور ہر جمعہ کو کسی نہ کسی ممبر کے مکان پر علمی۔ تاریخی۔ ادبی مقالات پڑھے جاتے اس طرح ادب کو زندہ رکھنا چاہتے تھے لیکن اب یہ بزم سونی ہو چکی کیونکہ اوس کی شمع بجھ چکی ہے۔ خدائے قدوس اس ہنستے بولتے انسان کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے اور اوس کی قبر پر نور کی بارش ہوتی رہے۔ ادارہ

دماغی رنگینیاں

عکاس

وہم، خبط۔ذہن۔سنک۔جنون۔کیا دیوانگی کے اقسام ہو سکتے ہیں؟ مجنون کے لئے یہ ضروری نہیں۔کہ اس سے قتل کا فعل ہی سرزد ہو یا گلی کوچوں میں آوارہ پھرے۔

دماغی فتور یا کسی صدمہ کی وجہ کوئی سمجھ بوجھ اور عقل سے قاصر ہو جائے تو کیا وہ دیوانہ کے قبیل میں شمار کیا جاسکتا ہے؟

اگر کوئی لکھا پڑھا یا جاہل کسی دُھن میں اپنا آرام و عیش چھوڑ دے تو کیا وہ مجنون کا لقب پا سکتا ہے؟

نہ جانے کتنے ایسے دیوانے یا مجنون ہوں گے جس سے روز آنہ راستہ۔ریل۔بس میلہ اور سینما میں ہم دوچار ہوتے ہیں لیکن پتہ تو اسی وقت چلیگا کہ ان سے گفت وشنید نشست و برخواست کا موقع ملے۔یا کوئی ایسی حرکت سرزد ہو۔کوئی رقص و سرود یا سینما میں محو ہے۔کوئی ملازمت اور تجارت میں انہماک پیدا کرلے تو آپ اس کو کس صنف میں شمار کریں گے؟

میرے واقف کاروں میں ایسے بہت سے ہیں جنھیں دفتری مصروفیت کا مشغلہ زندگی سے زیادہ عزیز ہے اور ایسے بھی میرے حلقہ تعارف میں ہیں جنھوں نے سینما کے ایک ایک کھیل کو ۱۲ - ۱۵ مرتبہ دیکھا ہے مگر پھر بھی اون کی ہوس دبدر رفع نہ ہو سکی۔کیا یہ مجنون ہیں؟

بعض ایسے بھی میرے پیش نظر ہیں جنھیں گھڑ دوڑ اور سٹہ کی یہاں تک دھن تھی کہ اپنا تمام اثاثہ اس کی نذر کر چکے لیکن ہمیشہ یہ توقع بندھی رہتی کہ ایک دفعہ اسی دھن میں وہ اپنی گئی ہوئی پونجی سے زیادہ حاصل کریں گے۔میں ایک ایسے وجود کو بھی جانتا ہوں کہ جنھوں نے لڑکیوں کے شادی کی رقم سٹہ میں لگادی اس امید پر کہ جہاں میں آج لڑکیوں کو جہیز میں دس بارہ ہزار دینے والا ہوں کل اسی کی بدولت ہر لڑکی کو چالیس پچاس ہزار جہیز کے ساتھ رخصت کر سکتا ہوں۔لیکن آج تک یہ متوقع سرمایہ بہم نہ پہنچ سکا اور لڑکیاں سینہ کا پتھر بنی ہوئی دھری ہیں۔یہ کس قبیل میں آسکتے ہیں؟

آپ نے ایسے شوقین بھی دیکھے ہوں گے کہ تیر جیسے مہینہ کی سخت دھوپ میں کسی دریا

یا تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے پتھر پر صبح سے شام تک بغیر کسی سایہ کے ہاتھ میں بنسی لیئے مچھلی کا شکار کر رہے ہیں جب کہ دھوپ کی تپش سے چہرہ اور ہاتھ سیہ تاب ہو چکے ہیں اور شام کو جب اپنی مشقت اور ریاضت کا شمار کرتے ہیں تو بجز چند پر کلیوں کے کچھ بھی نہیں لیکن ہمت کا زہنی انسان دوسرے دن اور عزم صمیم کے ساتھ آمادۂ شکار ہو جاتا ہے۔ اس کو کیا کہیں گے؟

آپ کو علم ہوگا اوس "ہر فن" کا جو ہر شخص کی خدمت ادا کرنے میں خوشی اور مسرت سمجھتا ہے۔ اپنی بوسیدہ سیکل پر ہوا کے پر لگا کر مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک اڑا چلا جاتا ہے۔ اور شام جب اپنی گردشوں کا جائزہ لیتا ہے تو کام اوسی طرح ادھورا اور غریب کا جیب اوسی طرح سوخ دار رہتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے ایک تعلیم یافتہ شخص کو جو بغیر کسی نفع یا امید کے دوسروں کے مستقبل کو سنوارنے کے لیئے اسکول سے لیکر کالج تک۔ صیغہ امید داری سے محکمۂ باب حکومت تک سعی و سفارش میں مصروف رہتا ہے۔ جس کا ٹھکانہ ایک چاد خانہ یا کوئی مشہور شاپ ہوتی ہے۔

آپ ایسوں سے بھی واقف ہوں گے جنھیں نماز اور روزہ کا اتنا خیال نہیں رہتا مگر "قوالی" پر اتنا پختہ عقیدہ ہوتا ہے کہ طوفان آئے۔ یا قیامت برپا ہو جائے۔ مشرق اور مغرب کی کوئی قید نہیں۔ شرکت جزو ایمان ہے۔ لیکن بی بی کے اس شکایت پر کہ بڑی رات گیئے گھر آتے ہیں، بی بی کو ساتھ لے کر قوالی میں شرکت کرنے سے بھی تامل نہیں۔

آپ روز آنہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک اچھا خاصا انسان اپنے ذاتی مقدمات میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ دماغی صلاحیتوں کو خیر باد کہکر ہوش والی دنیا سے بیہوش ہو جاتا ہے جس کے آٹھ پہر کا وظیفہ عمل۔ عرضی دعویٰ۔ جواب دعویٰ۔ مرافعہ۔ بازداشتی ڈگری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اوس بڑھیا کو عدالتوں کے کمپونڈ میں پھرتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ کسی مقدمہ کے سلسلہ میں اضلاع سے پیروی کے لیئے آتی ہے اور یہ پیروی کچھ اس قدر بھائی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیئے عدالت کے کمپونڈ میں اپنی جائے سکونت بنا لیتی ہے۔ رات نہ جانے کیسی گزرتی ہے۔ جہاں دفتر کھلا ہر صیغہ میں تاریخ پیشی دریافت کرتی ہوئی پھرتی ہے کسی اہل خیر نے دو چار پیسے دیدے تو لے لیئے ورنہ اسی سوائے تاریخ پیشی کے اور کسی چیز کی فکر نہیں رہتی۔

اوس فوجی لفٹنٹ سے آپ بھی واقف ہیں جن کا ڈرائنگ روم آٹھ گھنٹے احباب کے قہقہوں کے لئے وقف رہتا تھا جن کا ہر لمحہ حیات رنگینیوں سے پُر تھا فوجی خدمت جانے پر کچھ ایسے صدمے پہنچے کہ جس کی جدائی میں دماغی توازن ہی کھو بیٹھے اور گلی کوچوں میں اب بھی باضابطہ پریڈ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ سوم تعلقدار کو آپ بھی دیکھ سکتے ہیں جو سڑکوں کے کنارے خاموش کھڑے ہوئے واقف کاروں سے چاء کی ایک پیالی کیلئے ایک آنہ طلب کریں گے۔ اگر آج اون کی یہ دماغی صلاحیت قبل از وقت غائب نہ ہوتی تو یقیناً وہ اول تعلقداری کا وظیفہ پائے ہوتے۔

غرض شہر کی وسیع اور عریض آبادی میں کتنی ایسی ہستیاں ہوں گی جو مختلف وہام یا ذہنی کشمکش کے ہاتھوں اپنی حقیقی زندگی قبل از وقت ختم کرکے وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں سے اونہیں اپنی بھی کوئی خبر نہیں ملتی۔

حال ہی میں مجھے ایک ایسی سمجھ۔ بوجھ اور عقل کے پختہ۔ سرخ و سفید۔ سوٹ بوٹ۔ سیدکل ہستیں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو بازار میں مختلف کتب فروشوں کی دوکانوں میں "روحانی" لٹریچر کی فراہمی میں مصروف رہتے ہیں اور جو کتاب ملی خرید لی اور مزید کتابوں کی پھر بھی جستجو رہتی ہے۔ ان کی نسبت میرا ذہن کبھی منتقل نہ ہوتا کہ یہ روحانیات کا شایق، کسی مرض کا شکار ہوگا۔ میں ایک ڈاکٹر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ یہ تشریف لائے اور انگریزی میں بے تکلف پوچھنے لگے کہ آپ کے سلسلہ میں ایک بورڈ لٹکا ہوا ہے جس پر ماہر روحانیات لکھا ہے وہ کس حد تک اس میں کامل ہیں۔ میرے دوست نے پوچھا کہ آپ کو ماہر روحانیات کی کیوں ضرورت ہے اور آپ ان سے کیا کام لینا چاہتے ہیں جواب دیا کہ ایک زبردست عامل روحانیات نے بغیر کسی تعارف اور شناسائی کے مجھے اپنا "معمول" بنا رہا ہے میں لاکھ چاہتا ہوں کہ اوس کی زد سے دور رہوں مگر وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ مجھے راستہ میں سیکل پر جاتے ہوئے دیکھکر وہ بیک جنبش دست مع سیکل منتقل کر دیتا ہے۔ یہ تفصیلی واقعات سنکر ڈاکٹر نے انہیں کہا کہ میں ایک ماہر روحانیات سے واقف ہوں جن کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ یہ کہکر ایک کاغذ پر نام اور پتہ وقت ملاقات لکھدیا اور یہ صاحب نہایت متشکر اور مطمئن رخصت ہوگئے۔ میں نے اپنے ڈاکٹر دوست سے پوچھا کہ آپ نے جن کا پتہ دیا ہے اون کا روحانیات سے رتی برابر بھی لگاؤ نہیں، وہ دماغی امراض کا علاج کرتے ہیں مینس کر

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ایسے مریض کے لئے ایسا ہی شخص موزوں ہے۔

دو چار روز ہی کا واقعہ ہے کہ میں ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اونھوں نے شرک پر نظر ڈال کر مجھے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسے شخص سے تعارف کراؤں گا کہ ان کے ملنے کے بعد بھی آپ انہیں بھول نہ سکیں گے۔ میں اپنے آپ حیران تھا کہ ان میں ایسی کیا خوبی ہوگی جو ناقابل فراموش ہوگی اس عرصہ میں وہ ہنستے ہوئے۔ بشاش چہرہ لئے ہوئے پہنچے۔ باہمی گفتگو سے پتہ چلا کہ ایک اچھے خاندان کے فرد ہیں اور منصبدار چونکہ قرضہ زیادہ ہوگیا ہے اس لئے عزیزوں نے منصب سے قرضہ کی ادائی کا انتظام کر دیا ہے اور کھانا کپڑا تیار مل جاتا ہے اور جیب خرچ کے لئے روزآنہ پانچ آنے دئے جاتے ہیں۔ چاہے اس سے سینما دیکھیں یا چاد خانہ میں صرف کریں مگر سب سے بڑی حیرت ناک خوبی یہ بیان کی کہ آج بارہ سال سے آپ حریف مرد افگن عشق ہیں اور لطف یہ ہے کہ معیاری عشق کرتے ہیں۔ اس لئے بازاری حسن کی جانب نگہ نہیں جاتی اور ہمیشہ بلند بام مائل پرواز رہتے ہیں۔ چنانچہ سکندر آباد میں مسلسل تین سال تک عشق فرماتے رہے جب آپ کی محبوبہ نے شادی کر لی تو آپ نے بھی "تو نہیں۔ اور سہی اور نہیں۔ اور سہی" پر عمل کرکے کسی اور کو تاک لیا۔ لیکن یہ عجیب خوش نصیبی ہے کہ جہاں آپ عشق فرماتے ہیں وہ بہت جلد سلک ازدواج میں منسلک ہو جاتی ہے اور آپ ملک خدا تنگ نیست پر عمل کرکے دوسرے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اب بیان کر رہے تھے کہ مہینہ ایک روز سے وہ مشیر آباد میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ایسا ہرجائی عشق تو اچھا نہیں۔ نہایت صفائی اور سادگی سے کہنے لگے "یوم جدید عشق جدید" کوئی وجہ نہیں کہ میں جس کی پرستش کروں وہ کسی اور کا پرستار بن جائے تو پھر مجھے بھی حق ہے کہ کسی اور کو نشانہ بناؤں۔ میں نے کہا چھوڑ دیجئے نا اس رفتار کو تو یہ معصومانہ جواب ملا کہ یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی کیونکر۔ ایک نے سوال کیا یہ عشق تو رسوائے عام ہے کہیں اور بھی شریک نہ ہو جائے تو جواب دیا میں سب کو دعوت دیتا آتا ہوں کہ میرا عشق چھپا ڈھکا نہیں آئے اور آپ بھی ٹاپئے۔ اگر آپ کامیاب ہو جائیں تو میں کسی اور کو تلاش کر لوں گا۔ آپ یہ سن کر اور بھی داد دیں گے کہ ایک قرن کے آٹھویں حصہ میں کبھی بھی آپ کو آج تک اپنے مفروضہ مطلوب اور محبوب سے گفتگو کرنے کا بھولے سے بھی موقع نہ ملا۔ سکندر آباد ہو یا مشیر آباد روزآنہ فلک نما سے وہاں تک جانے میں کبھی آپ نے سواری کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ جیب میں جب دام ہی نہیں تو سواری کا خرچ کہاں سے برداشت

کیا جائے۔ پھر یہ پوچھئے کہ گھر سے کب چلے۔ راستہ میں کن کن سے کتنی دیر گفتگو کی۔ اور منزل مقصود پر کب پہنچے تو وقت۔ منٹ۔ سکنڈ۔ تک بتادیں گے۔ کسی نے اعتراض کیا کہ گھڑی تو آپ پاس رہتی نہیں پھر ٹھیک وقت کیونکر بتا سکتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میرا حافظہ نہایت قوی ہے اس لئے وقت۔ منٹ۔ سکنڈ تک یاد رہتا ہے۔ لکھے پڑھے ہیں۔ جذبات عشق کے اظہار کو شعر میں ڈھالنے کا ملکہ بھی ہے۔ بعض واردات عشق کی نسبت اچھے شعر کہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے ملنے کے بعد آپ انہیں کبھی بھول نہیں سکتے۔ کیا یہ سچ ہے " کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
آپ ان سب کو دیوانہ۔ مجنون۔ خبطی۔ وہمی۔ سنکی۔ ذہنی۔ جس نام سے چاہے تعبیر کیجئے لیکن ہم تو یہی کہیں گے ہر وہ زندہ لاش جس میں ہمارا آپ کا شمار ہے اسی قبیل میں آسکتی ہے یا پھر یہ ایک "دماغی رنگینی یا ذہنی شعریت ہے"

۱۹۳۵ء میں جب کہ نواب شہید یار جنگ بہادر نے یورپ کی ڈاک بھیجنی شروع کی تھی تو کئی حضرات نے دو تین اقساط کے بعد قسط اول سے مطالبہ کیا تھا اور شہاب اس وقت تعمیل سے قاصر تھا اب موصوف نے امریکی سیاحت کی داستان شروع کی ہے جس کی پہلی قسط اسی شمارہ میں نظر سے گذرے گی۔

شہید کا اسلوب بیان دوسروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جس میں علمی۔ تاریخی۔ ادبی معلومات کے سوا لطیف مزاحیہ چٹخارہ رہتا ہے وہ حضرات جنہیں ادب کا ذوق ہے مع چندہ کے اپنا نام دفتر میں بھجوا دیں ورنہ گذشتہ کی طرح افسوس نہ رہ جائے۔ یہ کوئی ترغیب نہیں ہے بلکہ اظہار حقیقت ہے۔

۲۔ آئندہ مہینہ ہم جہاں بانو ایم۔ اے کی دلکش مضمون "کوڈی کنال" کے متعلق شائع کر سکیں گے جیسا کہ اس سے پہلے انھوں نے 'مہابلیشور' 'ماتھران' کے نسبت لکھا تھا۔ جس کی رسائل نے ستائش کی تھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ گھر بیٹھے یورپ اور ہندوستان کی سیر کیا کریں چنانچہ شفیق بانو نے نجیب آباد اور مس بلدیپ کور نے جمشید پور کے حالات قلمبند کر کے بھجوائے تھے جو گذشتہ پرچوں میں شایع ہو چکے ہیں اور مس میزہ بانو کاؤس جی بی۔اے نے تاج آگرہ کا ترجمہ بھجوایا ہے جو مستقبل قریب میں آپ کی نظر سے گذرے گا۔

غزل

جناب مسلم

(۳)

مجو مجو سر و سامانِ عشق در دلِ ما — ز برقِ حسن طلب خرمنے ز حاصلِ ما

بیا بمسلکِ دلدادگان و ناله مکن — ز سهلِ تو اگر آسان ترست مشکلِ ما

چه میروی عقبِ گردِ کاروان اے قیس — تلاشِ لیلیٔ خود را بکن به محملِ ما

بحیرتم که چه می خواست زیں تماشائے — کسے که تخمِ محبت بکاشت در دلِ ما

زنا خدا و خدا تا کجا کنی فریاد — که راه دور و دراز است تا بساحلِ ما

به فیضِ مشقِ تصور لقائے آں بت را — چو عکس آئینه بینیم در مقابلِ ما

به یمنِ صحبتِ یاران با صفا مسلم
بگوشِ یار رسیدست شورِ محفلِ ما

پردیسی آنکھیں

جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب سابق
جج ہائیکورٹ حیدر آباد دکن

بسلسلہ

درمیانی ہاتھی کے دائیں جانب ایک اور ہاتھی تھا جس پر ایک تانبے کی تختی بانس میں لگی ہوئی نمودار تھی - اس پر عربی میں یہ لکھا ہوا تھا "خدا ایک ہے اور محمد منصف ہے" ایک ہاتھی پر ترازو آویزاں تھی - اس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ انصاف رسانی کرتا ہے - بائیں جانب ایک ہاتھی پر اعلیٰ قسم کے سفید کپڑے کا بنا ہوا مگرمچھ تھا - یہ جب ہوا سے ہلتا تو اصلی جانور معلوم ہوتا تھا - اس سے مراد یہ ہے کہ "مالک بحرین" ایک اور ہاتھی پر ایک برچھا نصب تھا - یہ نشانی "فاتح" کی ہے - اس کے بائیں پر جو ہاتھی ہے وہ کپڑے کی بنی ہوئی ایک مچھلی لئے ہوئے ہے - ہوا میں اڑتے وقت یہ بہت بڑی معلوم ہوتی ہے - اس سے سمندروں پر حکومت کا اظہار ہے - یہ تمام ہاتھی قیمتی آرائشی اشیاء سے مرصع تھے ان کے پیچھے بارہ ہاتھی اور تھے - ان پر بڑے بڑے نقارے اور دھات کے بنے ہوئے ایسے باجے تھے جو یورپ میں نہیں ہوتے - یہ بڑے بڑے برتنوں کی وضع کے ہیں - ایک کو دوسرے پر مارنے سے اونچی آواز پیدا ہوتی ہے - ان کے بعد راجہ جے سنگھ کی سواری آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ نمودار ہوئی - یہ سب سے پیچھے ہوتے ہیں - ناظرین کو یہ معلوم رہنا چاہئے کہ مذکورۂ بالا ہر جمعیت کے ساتھ چھ مرصع ہاتھی ہوا کرتے ہیں - ان پر سپہ سالار متعلقہ کے دل آویز جھنڈے اڑتے رہتے ہیں -

اس جلوس سے کسی قدر فاصلہ پر روشن آرا بیگم کی سواری تھی - ایک بڑے ہاتھی پر عماری تھی - جس کو میگھ ڈمبر کہتے ہیں - یہ ایک نہایت خوشنما طلائی اور مرصع شاہی تخت ہے - شہزادی کے پیچھے ڈیڑھ سو ملازم عورتیں خوبصورت گھوڑوں پر سوار تھیں - ہر عورت سر سے پاؤں تک رنگ برنگ کا برقعہ پہنے ہوئے تھی اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک بید تھی - روشن آرا بیگم کے ہاتھی کے سامنے چار ہاتھیوں پر جھنڈے تھے - اور متعدد من چلے و بے باک پیادے ہر کس و ناکس کو چھڑیوں سے مار کر اور ڈھکیل کر راستہ سے ہٹاتے رہتے تھے -

ا یہ کیفیت دیکھنے کے بعد مجھے اس یوروپین پر حیرت ہوتی ہے جو لکھتا ہے کہ ایک روز

اس نے ایک ملازمہ کو روشن آرا بیگم کے قریب کبھی ہلاتے ہوئے دیکھ لیا - یہ بات ممکن نہیں ہے کیونکہ شہزادیاں اور امراء کی بیگمات اس طرح پوشیدہ رہتی ہیں کہ کوئی ان کو دیکھ نہیں سکتا حالانکہ وہ سب کو دیکھ سکتی ہیں)

روشن آرا بیگم کے پیچھے اس کا اسٹاف تھا - جس میں بہت سے بدصورت خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار تھے اور بعض پیدل سواری کے اطراف تھے - ان کے پیچھے تین ہاتھی آئے - جن پر زردوزی غلاف کی عماریاں مختلف نمونوں کی تھیں - کچھ فاصلہ پر متعدد پالکیاں تھیں ان پر سنہری تاگے کے جال پڑے ہوئے تھے - ان میں شہزادی کی سہیلیاں تھیں - ان کے بعد تقریباً ساٹھ ہاتھی ایسے آئے جن پر پردہ دار عماریاں تھیں - ان میں شہزادی کے ساتھ کی دوسری عورتیں تھیں - روشن آرا بیگم کے بعد بادشاہ کی تین بیویاں اور حرم کی دیگر مستورات کی سواریاں مع اسٹاف کے آئیں - اس قافلہ کی پوری تفصیل بیان کرنا بہت مشکل ہے - مغل بادشاہ ان باتوں کا اہتمام خاص طور پر کرتے ہیں تاکہ شان و شوکت میں کوئی کمی واقع نہ ہو -

ایک اور بات لائق تذکرہ یہ ہے کہ اس کثیر لشکر کی روانگی سے ایک روز قبل شاہی محلات کا ناظم اپنے کارپردازوں کو لیکر آگے چلا جاتا ہے - تاکہ شاہی کیمپ کے لئے مناسب جگہ کا انتخاب کرے - اس کام کے لئے ہمیشہ کوئی خوشگوار مقام پسند کیا جاتا ہے - کیمپ کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے کہ شاہی قافلہ کے پہنچنے پر کسی قسم کی بدنظمی نہ ہونے پائے سب سے پہلے بادشاہ کے خیموں کے لئے جگہ منتخب کی جاتی ہے - میں نے متعدد دفعہ اس جگہ کی پیمائش کرکے معلوم کیا کہ اس کا دور پانچ سو قدم کے قریب ہوتا ہے - شاہی قیام گاہ کے عقب میں ایک اور حلقہ ہوتا ہے جس میں مستورات رہتی ہیں اور اس حصہ کا بڑا احترام کیا جاتا ہے - اس انتظام کے بعد شہزادوں سپہ سالاروں اور امراء کے لئے جگہ مقرر کی جاتی ہے - اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ان کے اور بادشاہ کے خیموں کے درمیان کافی جگہ خالی رہے - درمیانی میدان کو تین ہاتھ اونچی سرخ قناتوں سے گھیرتے ہیں - اس حلقہ کے اطراف توپخانہ قایم کیا جاتا ہے - توپخانہ کے سامنے خندق ہوتی ہے اور پیچھے جالدار چوبی کٹہرا - داخلہ کے دروازوں کے دونوں جانب ایک سو تیس قدم کے فاصلہ پر دو خیمے تھے - ہر خیمہ میں نو گھوڑے اکثر ساز و سامان سے تیار موجود رہتے ہیں - دروازہ کے سامنے ایک اونچا خیمہ نوبت و نقارہ کے لئے محفوظ کیا جاتا ہے -

بادشاہ کے خاص خیموں میں بعض ایسے ہیں جن میں دربار عام ہوتا ہے۔ یہ خیمے چھوٹے چھوٹے منقش ڈنڈوں پر قایم کئے جاتے ہیں۔ جن کے سروں پر سنہری موٹھ لگے ہوتے ہیں شاہی خاندان کے اراکین کے سوا کوئی اس قسم کے موٹھ استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک بہت اونچے ستون پر قندیل روشن کیجاتی ہے تاکہ بھولے بھٹکوں کو رات کے وقت رہنمائی کرے۔ راجاؤں اور امراء کے ڈیرے بھی اگرچہ اونچے ہوتے ہیں لیکن نہ اس قدر کہ شاہی خیموں سے اونچے ہوجائیں خلاف ورزی کی صورت میں اندیشہ رہتا ہے کہ وہ اوراون کے ڈیرے برباد کر دئے جائیں۔

جب بادشاہ کوچ کے ارادہ سے برآمد ہوتا ہے تو شہزادے۔ امراء اور سپہ سالار سلام کے لئے اس کے اطراف جمع ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ گزارش کرتا ہے جس کا جواب مختصر طور پر دیا جاتا ہے۔ کیمپ کے ختم تک یہ لوگ بادشاہ کے ساتھ جاکر اپنی اپنی جگہ واپس ہو جاتے ہیں۔ پھر بادشاہ شکاریوں کی طرف متوجہ ہوکر اعلان کرتا ہے کہ وہ شکار پر جائے گا یا نہیں۔ اگر جانے کا خیال ہو تو فوج سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ صرف پیادے اور باڈی گارڈ کے سپاہی ہوتے ہیں۔ بقیہ لوگ دھیمی رفتار کے ساتھ منزل طے کرتے رہتے ہیں۔

اگر شکار کا خیال نہ ہو تو شکاری اپنی مقررہ جگہ پر واپس چلے جاتے ہیں۔ منزل قریب آنے پر باجہ نوازی شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بادشاہ کیمپ میں داخل ہوتا ہے۔ اوس وقت چھوٹے توپخانے سے سلامی دیجاتی ہے۔ اور محل کی عورتیں "منزل مبارک" کہکر مبارکباد دیتی ہیں۔

یادِ رنگین

جناب عرشی حیدرآباد

نارسائی نے کیا خوگر تمہاری یاد سے
میں نے سیکھے ضبط کے شیوے لبِ فریاد سے

وہ تو یوں کہئے کہ میں مانوس ہوں صیاد سے
آسماں تک کانپ جاتے ہیں میری فریاد سے

دیکھ پھیکا ہوکے رہ جائے نہ رنگ التفات
اجتناب اتنا بھی اب اچھا نہیں بیداد سے

مٹ چکی ہیں آرزوئیں بجھ رہے ہیں ولولے
دل کے ویرانے میں رونق ہے تمہاری یاد سے

اب نہ جانے وہ پیام ہجر تھا یا عہد وصل
آپ نے اک دن کہا تھا کچھ دل ناشاد سے

اف رے مدہوشی کہ آپ آئے تو اب آیا خیال
آپ نے وعدہ کیا تھا کچھ دل ناشاد سے

عقل اسیر آب و گل ہے۔ اس کو عرشی کیا خبر
راز ہستی پوچھ عشق خانماں برباد سے!

"یاد"

میرے دل کو جب سے خبر ملی کہ کسی کو مجھ سے پیار ہے ۔ میرے دل کی کلی کھلی میری زندگی باغ و بہار ہے

یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ میری زندگی میں خوشی و بیفکری کا دَور دورہ تھا۔ میرا ہر لمحہ مسرتوں و شادمانی سے پُر ہوتا تھا۔ اور وہ روز آتے تھے۔ میرے وہ بہترین اور دلچسپ دوست تھے۔ خوبصورت تو نہ تھے۔ ہر وقت خوش خوش خوب چہکتے آزاد بلبل کی طرح۔ ہر وقت مسکراتے رہتے۔ مجھے خوب یاد ہے بات بات پر میری کھل جاتے۔ وہ مجھے انتہا سے زیادہ پسند تھے۔ مگر میں نے یہ ان پر کبھی ظاہر نہ کیا۔ بلکہ یہ ظاہر کرتا رہا کہ مجھے ان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اس لئے کہ میں خوب جانتا تھا کہ ہم دونوں کو ہمیشہ یکساں تھ تو رہنا ہے۔ نہیں پھر بھلا دل کا روگ لگانے سے کیا فائدہ۔ لیکن وہ اُسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتے بھلا اُن کو میری لاپروائی کی کیا پرواہ تھی۔

جب وہ نہ ہوتے تو اُن کا خیال میرے دل و دماغ کی راہوں پر بھٹکا کرتا سخت پریشان کرتا۔ اور میں اُن کے اور اُن کے خیال کو بھلانے کی ناکام سعی کیا کرتا۔ لیکن پھر بھی جب کبھی اُن کے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں گھنٹوں دور میدانوں میں اُن کے آنے کی راہ تکا کرتا۔ میری پریشان نگاہیں اُن کے آمد کا انتظار کیا کرتیں۔ لمبی لمبی ہوائیں آہیں بھرتی معلوم ہوتیں۔ اور میں بھی اُن کی آہوں میں شریک ہو جاتا۔ اور مجھے یقین ہے یہی ان کا حال ہوتا۔ کیونکہ میں انہیں خوب جانتا ہوں۔

چند ماہ بعد وہ زمانہ آیا جب کہ ان کا آنا کم ہو گیا۔ حالانکہ ہم دونوں میں کبھی لڑائی نہ ہوئی۔ مگر آہ . . . . . صرف چند وجوہات کی بناء پر۔

اب تو ان کی یاد نے خوب ہی ستانا شروع کیا۔ پہلے تو ایک دوسرے سے ملکر کچھ تسکین حاصل ہو جاتی مگر اب . . . . . ؟ نگاہیں اُسی طرح دور میدانوں میں ان کی متلاشی رہا کرتیں۔ آہیں نکل نکل جاتیں اور میں سعی کرتا۔ اور یہ شعر میری زبان سے بیساختہ نکل جاتا۔ ؎

نہ مجھے ستا نہ مجھے جلا۔ میرے خواب میں بھی کبھی نہ آ ۔ میری یاد دل سے بھلا بھی دے مجھے بھول جا مجھے یاد نہ آ

اور مجھے یقین ہے یہی ان کا حال تھا۔

اب زمانہ نے کروٹ لی۔ اُن کا آنا قطعی بند ہو گیا۔ لیکن صرف ایک دفعہ ان سے ملنے کی امید

باقی تھی - اندھیرے میں چمکتی ہوئی ایک کرن کی طرح - کیونکہ وجوہات ہی کچھ ایسے تھے - اب اس دن کا انتظار رہنے لگا - یاد بدستور دل ودماغ پر مسلط تھی - نگاہیں اسی پریشانی سے ان اداس راہوں کو تکا کرتی تھیں جو کبھی میرے لئے آباد تھیں - ہر آنے جانے والے پر شبہ ہوتا کہ شاید وہ ہیں ... مگر ... آہ ایک دور وہ بھی آیا کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ اب قطعی نہ آئیں گے - اب کبھی ملاقات نہ ہوگی وہی لمبے لمبے اداس میدان جو کبھی اُن کی آنیکی راہیں تھیں جن پر لمبی لمبی ہوائیں آہیں بھرتی معلوم ہوتی تھیں - ان پر میری نگاہیں پریشان انداز میں بھٹکا کرتی تھیں - اُن کے کسی زمانہ میں کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجا کرتے تھے - اور بس ... پھر ایک آہ ..... اور مجھے خوب علم ہے کہ ان کا بھی یہی حال تھا -

اب وہ زمانہ بھی آیا جب کہ وہ کبھی کبھی ہی یاد آتے تھے لیکن جب بھی ان کی یاد آتی کلیجہ منھ کو آتا معلوم دیتا دوڑ کر اداس راہوں کو دیکھتا اور پریشان نگاہوں سے انہیں ڈھونڈ تا - مگر میری نظر بن افق سے ناکام ٹکرا کر واپس لوٹ آتیں - آخرش صبر کرنا پڑا - شاید ان کا بھی یہی حال تھا -

آہ ..... آخر ایک دور ایسا آیا جب کہ اُن کی یاد میرے صفحۂ دل سے ایسی غائب ہوئی جیسے پھول سے خوشبو - اب تو اُن اداس راہوں پر بھی کبھی نظریں نہیں پڑتی تھیں - اگر پڑتی بھی تھیں تو نگاہیں پریشان نہیں ہوتیں تھیں اب بھی لمبی لمبی ہوائیں چلتی آہیں بھرتی نہیں معلوم دیتی تھیں - غرضکہ ان کی یاد میرے صفحۂ دل سے بالکل معدوم ہوتی جا رہی تھی - انہیں بھلانے میں میں کامیاب ہو رہا تھا - میری آرزو پوری ہو رہی تھی - اور اس سے میں خوش تھا لیکن بہت ہی کم، جب بھی کبھی اُن کی یاد آجاتی تو تڑپا دینے کافی ہوتی - مگر مجھے امید تھی کہ یہ حالت بھی بہت جلد معدوم ہو جائے گی - مگر مجھے اُن کا کیا حال تھا اس میں شک تھا -

آخرش وہ زمانہ بھی گیا میں نے ان کو پوری طرح بھلا دینے میں کامیابی حاصل کر لی انقلاب زمانہ اب تو بھولے سے بھی اُن کی یاد کبھی نہ آتی - اگر بھلانے کے بجائے یاد کرنے کی کوشش بھی کرتا تو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا -

"ہم بھولنا نہ بھولے - تم بھولنا نہ سیکھے"

میں انہیں اب بالکل بھول چکا ہوں - بالکل بلا وجہ - بغیر کسی کی خاطر ..... یہ واقعہ اب ایک قصۂ ماضی ہو کر رہ گیا ہے - لیکن مجھے امید ہے یہی "اُن کا حال نہیں ہے" وہ مجھے بھولے نہ ہوں گے - ہرگز نہیں بھول سکتے -

ازدواجی زندگی

جہاں بانو (ایم۔اے)

عورت ماں اور بیوی بننے سے پہلے بیٹی اور بہن، پھر نند اور رفتہ رفتہ بھاوج بن جاتی ہے۔جب یہ قضیہ طے ہو گیا تو اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بہن بن کر اس نے کیا فرائض انجام دیے۔ بھائی کے حق میں کیسی بہن ثابت ہوئی۔بہن بھائی کی محبت ایک قوس وقزح کا جلوہ ہے۔ایک حقیقت منتظر صورت مجاز میں۔بہن اپنے بھائی کو جس والہانہ طریقہ سے چاہتی ہے۔جتنی والہ و شیدا ہوتی ہے۔بھائی اس شدت و محبت کا جواب پاسنگ بھی نہیں دیتے۔بھائی کی شادی ہو جاتی ہے۔اس کی دلہن آجاتی ہے۔محبت تقسیم ہو جاتی ہے۔بٹ جاتی ہے۔لیکن بھائی کی محبت بٹ جاتی ہے۔بہن کے سینہ میں دل اسی طرح دھڑکتا ہے۔جیسے پہلے دھڑکتا تھا۔اس میں سرِ نو فرق نہیں آتا۔رفتہ رفتہ بھائی کی دو نظریں ہو جاتی ہیں۔حقیقت مجاز کا روپ لے لیتی ہے۔ بہن کی ہر بات پر اب اس کو اعتراض ہونے لگتا ہے۔بعض وقت تو بھائی اپنی بیوی کی خاطر بہن کے ساتھ نہایت غیر جانبدارانہ قسم کا طرز عمل اختیار کر لیتا ہے۔اس نوعیت کے طرز طریقوں سے دل پھٹ جاتے ہیں۔بہن کی محبت کا والہانہ جذبہ کم نہیں ہوتا۔اس کے تحت الشعور میں چلا جاتا ہے۔محبت کو سر اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔اس لئے وہ کم نہیں ہو جاتی۔ہاں دب ضرور جاتی ہے۔یہ ایک فطری جذبہ ہے۔اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔وہ اسی طرح بھائی کی پجارن بنی رہتی ہے۔لیکن ایک خاموش پجارن۔اس کی محبت اپنے اظہار کے لئے مواقع بھی ڈھونڈتی رہتی ہے۔لیکن اس کو ہر دن ایک نئی مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔بیوی کے لئے اس کا شوہر بہت کچھ ہے لیکن ایک بہن کے لئے اس کا بھائی ایک ماں کے لئے اس کا بیٹا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہے۔

بیوی کو شوہر زندگی کے راستہ میں مل جاتا ہے ہوش سنبھالنے پر ایک دوراہہ ایسا آتا ہے جہاں ان دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ایک اجنبی اپنا ہو جاتا ہے لیکن بہن اور بھائی کا سنگم تو ایک جنم میں ملتا ہے۔تاہم جزئیات کو ہی سمجھنے پر جو قدرت نہیں رکھتے وہ حقائق سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔زندگی کو جتنا قریب سے دیکھو اتنی ہی بھیانک بن جاتی ہے۔اس لئے بھی دنیا اتنا کھوج نہیں لگاتی اور سطح سے موجیں گن لیتی ہے۔

جس طرح بہن نند بن جاتی ہے۔ اسی طرح ماں ساس ہو جاتی ہے۔ دونوں میں۔ اپنی اپنی طرف اب یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ؟

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

یعنی بٹیا بیٹا باقی بھی رہتا ہے۔ بھائی اپنی بہن کو اسی نظر سے دیکھ سکتا ہے یا وہ صرف ایک "اچھا شوہر" بنا بن کر رہ جاتا ہے۔

کسی بھائی یا بیٹے کو محض اپنی ماں بہنوں کا پاس و لحاظ ہے۔ وہ ان کی خاطر بیوی کی ہر بات کو ٹھکرا دیتا ہے۔ بیوی کی خواہش ماں بہنوں کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ کہیں بیٹا سسرال کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ ماں کی محبت اس کی ماممتا اس کا دکھ سکھ سب سے بیگانہ۔ ایک پیسہ کی اس سے آس نہیں رہتی۔ ماں باپ کے حقوق پامال کرنے میں اس کو خاص لطف ملتا ہے۔ کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔ انسان ایک تسخیر پذیر حیوان ہے۔ تاہم ابتک ہم ایک قطعی فیصلہ نہ کر سکے کہ آخر قصور کس کا ہوتا ہے۔ سچ مچ کون مجرم ہے۔ کہیں نند بھاوج میں نہیں بنتی کہیں ساس بہو میں چشمک رہتی ہے، جیٹھ، دیور اور خسر تو ذیلی رشتے ہیں۔ لیکن ان کو غور کرنے اور اس گتھی کو سلجھانے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ دونوں فریق کے متعلق ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ سارے فساد کی جڑ کہیں نند ہوتی ہے۔ تو کہیں بھاوج۔ کہیں ساس تو کہیں بہو "تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے" یہی وہ مقام ہے جہاں یہ مقولہ چسپاں نہیں ہوتا۔ ماں بڑی امنگوں آرزوؤں ارمانوں سے بہو لاتی ہے۔ اس کا ارمان ہے، اس کی تمنا ہے کہ اس کا بیٹا دولہا بنے۔ عموماً ایک اچھی سی دولہن ہی اس ارادہ کی محرک ہوتی ہے۔ اس خواب رنگین کی جب تعبیر ملتی ہے۔ دولہن گھر آجاتی ہے۔ نند اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ ساس کا طرز عمل بدل جاتا ہے۔ وہ چاؤ ارمان نہیں رہتے۔ تمنا سو جاتی ہے۔ آرزو کہیں دبک کر رہ جاتی ہے۔ خواہش جو پوری ہو جاتی ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے تمنا کرنے کو۔

کسی کسی جگہ تو ساس کے ساتھ بہو کا طرز عمل نہایت تکلیف دہ اور عبرت انگیز بھی دیکھا گیا۔ بہو ساس کو برابر کی سمجھ لیتی ہے، تہذیب، شائستگی اور متانت سب کھو کر اپنا کم ظرفی کا کھلا ثبوت دینے لگتی ہے۔ تو اس طرح کون اب فیصلہ کرے کہ یہ سب آخر کیوں ہوتا ہے اور قصور آخر کس کا ہے؟

ایک بہن کہتی ہیں "بھاوج بذات خود بری نہیں ہوتی۔ بھائی برا ہوتا ہے۔ بہو برا

نہیں بیٹیا بُرا ہے۔ اس کو اپنی بیوی کو سمجھانا نہ آیا کہ یہ کیا مراتب ہیں۔ کیا درجہ ہے ان لوگوں کا جو اس سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اور اب اس کی بدتمیزی سے ان کا دل ٹوٹ رہا ہے۔ شریف خون ہے۔ سنجیدگی اور متانت کی وہ جان ہے۔ تو پھر ایسی بہو تو ساس اور سسرال کے ہر رشتہ دار سے انفرادی طور پر نباہ لیتی ہے۔ اس کا سکہ ہر دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ ہر دل میں اس کے لئے تھوڑی سی بہت جگہ بن جاتی ہے۔ اس کو دکھ ہو تو سب ہی دکھ محسوس کرتے ہیں۔ اس کی مسرت پر سب ہی مسرور ہوتے ہیں۔ یہی ہے ہر دلعزیزی۔ جواب ناپیدنہ ہے۔ حسن ہی تو سب کچھ نہیں۔ حسن بہت بڑی دولت ہے۔ لیکن افعال و کردار اس خداوندی عطیہ کی قیمت دو بالا کر دیتے ہیں۔ ورنہ یہی حسن ٹھیکیروں کے مول ہو جاتا ہے۔

پہلے زمانہ میں تو زیادہ تعلیم بھی نہ تھی۔ ایک ایسا دَور بھی گذر چکا ہے جبکہ فلسفیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ "تعلیم کو عام نہ کرو۔ اس چیز کو خاص ہی رہنے دو تو بہتر ہے" جو چیز عام ہو جاتی ہے وہ بدنام بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فی زمانا تعلیم یافتہ گھرانوں میں ہی ایسی بدحواسیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ تعلیم سے اخلاق سنورتے ہیں۔ مگر اس وقت جب کہ تعلیم کو ایک مقصد بنا کر حاصل کیا جائے۔ جس سے زندگی بنتی اور سنورتی ہے۔ تعلیم زدہ بہنوں سے جب ایسے نمونے ہم کو ملتے ہیں۔ اور تعلیم یافتہ بھائیوں سے یہ تلخ تجربہ ہم کو ہوتا ہے تو پھر دماغ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ انسان بُو کھلا جاتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کو ہمیں ٹوکنے اور سیدھے راستہ پر لگانے کا حق ہے۔ لیکن بلا وجہ کا دخل در معقولات سے بزرگی کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے۔ بڑے جب اپنی قدر منوانا ہی چاہتے ہیں تو انھیں بڑا دل رکھنے کے ڈھنگ سیکھنے چاہئیں۔ جزوی باتوں کا پہاڑ بنا لینا۔ یہ بزرگانہ روش کے منافی ہے۔ کیرکٹر اپنی ضد کے ماحول میں نشو و نما پاتا ہے۔ ایک عورت کی زندگی صحیح معنوں میں اس وقت شروع ہوتی ہے۔ جبکہ وہ ایک دوسرے گھر کی زینت بنتی ہے سونا جیسے آگ میں تپایا جا کر نکھرتا ہے۔ اس کے لئے بھی یہ اجنبی ماحول آگ اور ایندھن ہے بعض وقت لڑکی اگر حساس اور فطرتاً درد بھرا دل رکھتی ہے تو ضبط کرتے کرتے لب گور بھی ہو جاتی ہے۔ جینے والے طوفانوں میں بھی جی لیتے ہیں۔ سیلاب و تلاطم کے تھپیڑے کھاتے کھاتے زندگی کو زندگی بنانے کے ڈھنگ انھیں بتدریج آ جاتے ہیں۔ آپ شاید یہ کہیں کہ یہ تو ایک بے غیرت زندگی ہوگی۔ ایسے جینے سے تو مرنا بہتر۔ فرہاد کی طرح سر پھوڑ کر مر جانا اچھا

بس کی بات ہے۔ لیکن اس کے شایان شان نہیں۔ ہاں دل اس پر ضرور جل اٹھتا ہے کہ کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے۔ سوز دروں میں اتنی کمی کیوں۔ کہ اس تنکے جیسے جسم کو جلا کر بھسم کرنا نہ آیا۔ غرض یہ گتھی جانے کس کے سلجھائے سلجھے گی۔ اور کون اس معمہ کا صحیح حل بتا سکیگا۔ تاہم اور کچھ بھی ہو۔ لیکن ساری خرابی دولت و ثروت کی ہے۔ بیوی یہ چاہتی ہے کہ اس کے شریک زندگی کی ہر چیز اس کی ہو جائے، وہ دولتمند ہوا۔ تو وہ اس کے دولت کی پجارن ہے۔ آج وہ امیر سے غریب ہوا۔ اور ان کی ہوا بدلی۔ اس نے مہر لے لیا۔ مکان اپنے نام کروالیا۔ بیمہ کی حقدار ہوگئی۔ اس سے بس یہی پتہ چلتا ہے کہ اس کی محبت صرف دولت کے محور پر گھوم رہی ہے۔

کہیں دل اتنا بے نیاز و مستغنی ہے کہ شوہر کی محبت کے آگے ساری دولت ہیچ ہو جاتی ہے۔ اس کو صرف اس کی اور اسی کی ذات پر ناز ہے۔ وہ غریب ہے تو بھی اس کے لئے باعث فخر ہے۔ اور اتنا ہی بلند ہے۔ جتنا کہ ہفت اقلیم کا بادشاہ۔

ادھر ماں اور بہن کی محبت ہے۔ نہ پیسے کی انھیں طمع۔ نہ کسی قسم کے سلوک کی اس سے توقع۔ محبت کا جوالا اسی آن بان سے روشن ہے۔ اس دیپک کو کون بجھائے۔ جس کا سوز نہ صرف جسم اور خون سے ہے۔ بلکہ روح اس سے وابستہ اور منسلک ہو چکی ہے۔

اس منزل سے کٹھن تر اور کوئی منزل نہیں۔ ازدواجی رشتہ ہی زندگی کو زندگی سے متنوع کرتا ہے۔ جبتک انسان اس گھاٹی میں قدم نہیں رکھتا اس کی بڑے مزہ میں گذرتی ہے۔ کتنی زندگیاں اس سلسلہ میں منسلک ہوکر ٹوٹ جاتی ہیں۔ مثلاً والدین نے عہد کیا تھا۔ اور لڑکپن میں ہی نسبت ہوگئی تھی۔ اس قول کو نبھانا تھا۔ اب چاہے لڑکے کے گن کیسے بھی ہوں۔ اس میں شوہر بننے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ ہم کو اس سے بحث نہیں۔ انسان کو زبان کا پاس رہنا چاہیئے۔ ورنہ دشوار ہے انسان کا انسان ہونا۔ اب لڑکی کا مقدر۔ اس کے نصیب اچھے ہوتے تو لڑکا اس کے حسب خواہش قرار پاتا۔ شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی سماجی نقطۂ نظر سے ایک بندھن کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ لڑکی اپنے گھر رخصت ہو جاتی ہے۔ وہاں پر جو مصائب اس کو جھیلنے ہیں۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہوتا۔ ماں باپ تو شادی کرکے ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ جس پر گذرتی ہے۔ اب وہی جانے۔ دنیا کو اس کے بعد اب اتنی فرصت کہاں کہ وہ جھانک لے ان کی زندگی میں۔ جو گذرتی ہے اس پر وہ اس کا دل جانتا ہے۔ یا خدا جانتا ہے۔ تصویر کے روشن رخ ہی دیکھے جاتے ہیں۔ تاریکیوں میں کون جا کر پریشان ہو۔ لڑکی کا

خاتمہ یا انجام نہایت دردناک ہوتا ہے۔ وہ یا تو نباہ کرتے کرتے مصیبتیں سہتے سہتے ماں باپ کی لاج رکھنے۔ خاندان کا وقار سنبھالنے زندہ درگور ہو جاتی ہے۔ موت اس کے دروازہ پر آٹھوں پہر حکم الٰہی کی منتظر کھڑی رہتی ہے۔ دوسری صورت میں، جہاں لڑکی میں برداشت وضبط نہیں ہوتا وہ پریشان و سراسیمہ ہوکر والدین کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ اور پھر انھیں کے دامن سے آلگتی ہے۔ جہاں شاذونادر ہی اس کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ گھر والے الگ طعن تشنیع سے کلیجہ چھلنی کرتے ہیں، آنے جانے والے علیحدہ اس کے لئے سوہان روح بن جاتے ہیں۔ پھر وہ سوچتی ہے کہ اس زندگی سے تو وہی زندگی اچھی تھی۔ یہ گھر تو اپنا ہو کر بھی اپنا نہیں۔ سب کے سب مار آستین نکلے۔ جہاں سر چھپانے آئی ہے وہیں ہر روز ایک نئی مصیبت کا سامنا ہے۔ کوئی زندگی یوں غارت ہو گئی۔

کسی نے ایک عمر اسی جستجو اور کھوج میں گذار دی۔ متعدد زندگیوں کا مطالعہ کیا۔ عمر ڈھل گئی۔ اور آخر وقت تک وہ شادی سے انکار ہی کرتی رہی۔ کیونکہ اس نے اپنی بعض سہیلیوں کی زندگی کا نہایت خطرناک انجام دیکھا تھا۔ خیر۔ تو آخر اس کیلئے بھی وہ منزل آگئی۔ شادی ہو گئی۔ زندگی کا جتنا گھور گھور کر مطالعہ کیا تھا۔ اتنا ہی زیادہ اس کو ناکامیوں کا سامنا رہا۔ شوہر ملا۔ شرابی۔ بدزبان۔ مسرف۔ رات کے ۲-۲ بجے گھر لوٹنے والا۔ وہ خلل ہوئی۔ بارہ برس بعد گولر میں پھول آیا وہ بھی بکسا ہوا۔

اس کی زندگی ایک خواب پریشان بن گئی۔ اس کے سپنے بکھر گئے۔ وہ اب جاگ اٹھی ہے۔ اور سوچتی ہے کہ آخر انسان زندہ رہنے کے لئے کونسی راہ اختیار کرے۔ ایک اضطراب مسلسل سے اب دوچار ہے۔ شعلہ عشق غالب کے بعد سیہ پوش ہوا تھا۔ لیکن اس نے اب مسلسل سیاہ لباس کو زیب تن کرنے کی ٹھان لی ہے۔

کچھ بیتی ہوئی خوشیاں، چند رنگین و دلنشین یادیں۔ ایک دم توڑتی لیکن سلگتی تمنا، دلنواز لمحوں کے ایک سنہرے جال نے اس کے تخیل کو آٹھوں پہر گھیر لیا ہے۔

لیکن شاید زندگی اور جوانی ان میں چند والہانہ دھڑکنوں اور بے چینیوں کا نام ہے۔

میرا مضمون تو یہیں ختم ہو چکا تھا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور چال سوجھی۔ اس مضمون میں دلچسپی عنقا تھی تو یوں دلچسپ بنانے کے ڈھنگ یاد آئے۔ ایک بھائی کا خط ملا جس میں انھوں نے اپنی ایک بہن کو دور دیس سے لکھا تھا کہ ان کے لئے کوئی دلہن دیکھی جائے۔ جانے بیچاری بہن نے کیا لکھا۔ کیونکہ لڑکیاں اپنی صنف کی اس شدت سے نکتہ چینی نہیں کرتیں۔ بھائی کی

شاعری کو بھی اس موضوع میں بہت کچھ دخل ہے۔ بیان دلچسپ ہے۔ اس لئے سنانا ہی پڑیگا۔
آپ لکھتے ہیں " دنیا میں بہت کم بد نصیب لڑکیاں ایسی ہوں گی جن کی شادی کے لئے
اس طور پر تعریف کیگئی ہو۔ اور ان سے کم مرد ایسے ہوں گے جو ایسی تعریف کے بعد بھی "ہاں"
کہیں گے :-

خوبصورت تو نہیں ہے لیکن بہرحال بدشکل بھی نہیں ہے رنگ گورا تو نہیں لیکن
کالک کی طرح سیاہ بھی نہیں ہے۔ عمر زیادہ تو نہیں لیکن کہیں کہیں بال سفید
ہوگئے ہیں۔ قد میں کوئی خاص بات نہیں البتہ ذرا ٹھینگنی ہے۔ ڈیل ڈول
میں بانکپن نہیں، صرف ذرا بے قابو طور پر جسم پھیل گیا ہے۔ ایسی کوئی
(اڈوانسڈ) تو نہیں ہاں ڈانس اچھا کرلیتی ہے۔

بال لانبے ہیں البتہ چوٹی چھپکلی کے دم جتنی ہے۔ دیکھنے میں تو بُری
نہیں مگر سُنا ہے ذرا اگن خراب ہیں۔ بات چیت تو کرلیتی ہے صرف آنکھوں
سے کم دکھائی دیتا ہے۔ دہانہ بُرا نہیں۔ ہاں چوکرا ضرور ہے

ان سب تعریفوں کے بعد صرف ایک جملہ کہنا رہ گیا ہے :-
" اگر اس کے باوجود آپ شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس بیوقوفی کی کوئی داد
نہیں دے سکتا۔

اب ہماری تعریف بھی وہاں کچھ ایسی ہی یا اسی قسم کی ہوگی مثلاً یہ کہ :-
" متناسب الاعضاء ہیں صرف ذرا پھول کر کُپّا ہو گئے ہیں "

تاہم ایمرسن کا خیال تھا کہ تم ناممکن کی طرف جاؤ تو ناکامی کی صورت میں کم ازکم ممکن تک
تو آجاؤ گے۔ ایسے ہی ہم بھی ہیں۔ لیکن ہماری ترقی ترقی معکوس ہے۔ ہم ممکن ——
بالکل ممکن کی طرف سے ناممکن کی طرف جا رہے ہیں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کاش آپ چندہ وقت پر ادا کریں تو ہمارے کاروبار میں بڑی آسانیاں
ہوسکتی ہیں لیکن نہ جانے کیوں ملازم کو گردش دینے میں لطف آتا ہے غریب
بیچارے کو اور بھی کام رہتے ہیں؟

ساقی

اُمید رضوی بریلی

جہاں میں تو خدا کا آخری پیغام ہے ساقی
بالفاظ دگر تو پیکرِ الہام ہے ساقی

تری چشم کرم سے رنگیں نشاط انجام ہے ساقی
تری نظروں کا پھرنا گردش ایام ہے ساقی

ترے ہوتے ہوئے بھی کاوش انجام ہے ساقی
مجھے کیا ہوگیا ہے کیوں یہ فکر خام ہے ساقی

صراحی مست، ساغر وجد میں، رقصاں ہیں پیمانے
فضائے میکدہ سرشار فیض عام ہے ساقی

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں چاندنی راتیں مدینہ کی
کہ صبح ہند تو اپنی نظر میں شام ہے ساقی

میرے حسن طلب پر آرزوئے دو جہاں صدقے
نظر میں التجائیں لب پر تیرا نام ہے ساقی

خدا شاہد میرے دعوے پہ ہے ما ینطق شاہد
کہ تیری گفتگو تو مطلقاً الہام ہے ساقی

یہ خرق والتیام اک شعبدہ ہے فکر باطل کا
کہ معراج اک فضائے عالم بے نام ہے ساقی

نہ جانے بادۂ دیدار میں ہیں لذتیں کیسی
کہ تیرا بادہ کش پی کر بھی تشنہ کام ہے ساقی

تعالی اللہ تیرے نام کی ہیبت تعالی اللہ
فضائے کفر اب تک لرزہ بر اندام ہے ساقی

تسلسل ٹوٹنے پائے نہ دورِ جام رنگیں کا
بہت کیف آفریں یہ بادہ اسلام ہے ساقی

خدا کردہ کیوں اٹھوں میں تیرے آستانے سے
تیرے ہوتے زمانے سے مجھے کیا کام ہے ساقی

دلوں کے آبگینے ہو چلے خالی محبت سے
اٹھا ساغر کہ پھر تیری ضرورت عام ہے ساقی

تیرے صدقے بدل دے بادہ آشاموں کی فطرت کو
مذاق میکشی اس دور میں پھر خام ہے ساقی

فقط امید محروم کرم ہے کس لئے اب تک
زمانہ پر تیرا فیض نظر تو عام ہے ساقی

آہ میرا مطمح نظر میری زندگی

انجم صحرائی

(افسانہ)

کالج کی زندگی کے بعد میرا محبوب مشغلہ سماج سدھار جدوجہد رہا۔ سماج کی خرابیوں کو دیکھ کر ان کی اصلاح کے لئے میرا دل تڑپنے لگتا اور میں بے چین ہو کر سماجی خرابیوں کو منظر عام پر لاکر خوشگوار زندگی کے خاکے اور مضامین لکھتا جس کو رسائل کثرت سے بڑی بڑی تعریفوں کے ساتھ شائع کرتے جس سے ادبی دنیا میں میری بڑی شہرت تھی۔ سوسائٹی۔ کلب جہاں کہیں میں جاتا ایک ترقی پسند سماج سدھار کی حیثیت سے میری خوب آؤ بھگت ہوتی۔ جس سے میرا شوق اور بڑھتا گیا۔ کچھ دنوں بعد میرے والدین نے میری شادی کی تحریک شروع کی۔ چونکہ میں بہت سے ترقی پسندوں کی طرح شادی کا مخالف نہ تھا بلکہ شادی کو ایک فطری ضرورت خیال کرتا تھا۔ اس لئے یہ تحریک زور پکڑتی گئی۔ کئی جگہ سے پیغامات آنے شروع ہوئے۔ میں اپنے خوشگوار زندگی کے منصوبہ کی روشنی میں ان کو جانچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں میری کئی ایک ادبی پرستاروں نے بھی سلسلہ جنبانی کی اور میرے خیالوں میں شمیم دبے پاؤں داخل ہونے لگی۔ شمیم نے ہماری جامعہ سے بی۔ اے کی ڈگری لی تھی۔ اور اس کے دل میں سماج سدھار کی تڑپ حد درجہ پائی جاتی تھی۔ وہ اکثر مضامین کے سلسلہ میں مجھ سے ملا کرتی اس کے خیالات سے بیحد متاثر ہوتا اور اس کے مضامین کو بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ میرے چھپے چھپے شوق کو میرے ساتھیوں نے تاڑ لیا اور وہ میری اور شمیم کی شہرت کو بدنام کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آزاد خیالی اب رنگ لانیوالی ہے اور جناب نسیم صاحب کے دعوے کہ شمیم سے ان کو سوائے ادبی دلچسپی کے اور کوئی خاص دلچسپی نہیں منظر عام پر آنے والے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں نے میرے ارادوں کو مسمار کر دیا اور سپنوں کا یہ محل ٹوٹ پڑا۔ اس کے بعد بھائی جان صاحب نے اپنی ایک خالہ زاد بہن کی سفارش فرمائیں۔ اس پر والدین نے مجھ پر رضامندی کے لئے اصرار شروع کر دیا۔ والدین نے بڑی توقعات کے ساتھ مجھے پالا تعلیم دلائی۔ میں تعلیم پاکر ان کی توقعات کو صدمہ پہنچانا تعلیم کو بدنام کرنا خیال کیا۔ مجھے فرمانبرداری کے بدلے اپنی زندگی کی قربانی کرنی پڑی۔ اس لئے میں انسانیت کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ غرض کہ بھائی جان صاحب اپنی سفارش میں کامیاب ہو گئیں۔ میرے تمام پرانے خیالات جو

میں نے اپنی خیالی دیوی کے سہارے بنائے تھے۔ بدل کر موجودہ دیوی کے ہمنوا کر لئے اور یہی خیال سے کہ عورت آؤ بھگت اور دلجوئی سے رام کی جا سکتی ہے۔ خوب آؤ بھگت کرنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس کو خوش رکھنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا۔ وہ مجھ سے ہر طرح خوش تھی۔ لیکن اس کی خوشی کی خاطر مجھے اپنی ہر خوشی کی قربانی کرنی پڑی مثلاً

جب کبھی میں اپنے ذاتی شوق سے اپنی پسند کی کوئی چیز ساڑی وغیرہ لے آتا اور اشتیاق سے بارگاہ عالی میں پیش کرتا تو بجائے امی جذبہ محبت کی قدر کے ہمیشہ یہ کہکر اعتراض کیا جاتا کہ "ہائے ہائے لائے بھی تو ایسے بھونڈے رنگ کی۔ امی جان کو تو اسی رنگ سے نفرت ہے۔ میں یہ ساڑی نہیں پہنوں گی۔ اس کو واپس کر کے کوئی لال رنگ کی لا دیجئے وغیرہ" اور جب میں کسی خاص خوشی کے ساتھ مکان میں داخل ہوتا اور پیار سے اپنی بیگم کے کندھے پر ہاتھ رکھکر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا تو یہ کہکر ہاتھ جھٹک دیا جاتا کہ "توبہ۔ ہٹو بھی مجھے یہ بازاری چالیں پسند نہیں" میں ان تمام باتوں کے باوجود جگ ہنسائی نہ ہو اس خیال کے تحت انتہائی کوشش کرتا کہ اپنی زندگی کو خوشگوار بناؤں۔ انسان فطرتاً خود غرض اور نفس پرست واقع ہوا ہے۔ اس کے لئے دوسروں کی خوشی کے لئے اپنی خوشی کی ہر وقت قربانی کرنا ناممکن ہے۔ قدرتی طور پر مجھے بھی گھر سے ایک نفرت سی ہوتی چلی۔ باہر کی ہر چیز میں ایک قسم کی جاذبیت دکھائی دیتی۔ سینما میں جب میں ایکٹرس کو دیکھتا تو ایک خاص کشش پیدا ہوتی۔ اسی وجہ جب میں گھر سے بیزارگی محسوس کرتا تو باہر نکل جاتا۔ باہر سوسائٹی میں مجھے ایک خاص سکون محسوس ہونے لگتا۔ جس کی وجہ میرا بہتر اوقت باہر ہی گذرنے لگا میرے راستہ میں نور بانو طوائف کا کوٹھا تھا۔ آتے جاتے اس سے نظریں چار ہوتی تھیں جب میں مغموم گھر سے نکلتا تو اس کی نظروں میں ہمدردی دکھائی دیتی۔ میرا دل غیر محسوس طریقہ پر اس کی طرف کھینچنے لگا اور مجھے اس میں بے انتہا جاذبیت نظر آنے لگتی۔ لیکن میں فوراً چونک کر اپنے خیالات پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔

ایک دفعہ بازار میں مجھے ایک بلو رنگ کی ساڑی بیحد پسند آئی۔ میں نے اپنی بیگم کے تحفہ کے لئے خرید لی اور خوشی خوشی ان خیالات میں گم کہ آج بیگم اس تحفہ سے بیحد خوش ہوگی۔ گھر پہنچا اور نہایت شوق سے تحفہ پیش کیا اور امید کے خلاف خوشی کے بجائے یہ کہکر کہ "ہائے ہائے۔ اودا رنگ امی جان کو تو اس موئے اودے رنگ سے نفرت ہے۔ لانا نہیں آیا تو یہ

زحمت ہی کیوں مول لی جاتی ہے" کہکر ایک جانب ڈال دیا۔ اور پھر اٹھاکر میرے ہاتھ دیتے ہوئے کہنے لگی۔ دیکھو جی۔ اس کو کسی طرح واپس کرڈالو مجھے پسند نہیں۔ جاؤ جلدی جاؤ آکر چائے پی لینا۔ مجھے فوراً باہر جانے پر مجبور کردیا۔ میں انتہائی مغموم ساڑی لئے باہر نکلا اور کچھ ہی دور گیا تھاکہ کسی کی شربتی آواز سے چونک پڑا اوپر جو نظر اٹھائی دیکھاکہ نور بانو مجھ سے مخاطب تھی۔ میں غیرارادی طور پر اس کے کوٹھے پر چڑھ گیا وہ ساڑی کی بیحد تعریف اور انتخاب کی داد دینے لگی اور یہ سن کرکہ میں اس کو واپس کرنے جارہا ہوں یہ کہتے ہوئے کہ تعجب ہے اتنا اچھا رنگ پسند نہیں" ساڑی لے کر بازو کے کمرے میں چلی گئی اور فوراً زیب تن کرکے میرے روبرو آکھڑی ہوگئی۔ اپنی پسند کی قدر دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں اور میں محو حیرت بن کر اس کو گھورنے لگا۔ مسکرا کر ایک انداز سے ساڑی کی قیمت پیش کرکے کہنے لگی کہ میں بہت ممنون ہوں گی اگر آپ بجائے واپس کرنے کے مجھے دیدیں اور دوسری خریدلیں۔ مجھے اپنی پسند کی قدردانی کو دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی اور میں فرط مسرت میں اس کو لپٹ گیا اور بغیر قیمت لئے ساڑی تحفتہً دے کر گھر واپس ہوا۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر بیگم کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا اور وہ برسنے لگی۔ آخر تنگ آکر میں پھر گھر سے باہر نکلا۔ نور بانو کی خمار آلود استقبالی نظریں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ میں اوپر چڑھ گیا وہ مجھ سے واقعات سُن کر انتہائی ہمدردی ظاہر کرنے لگی جس میں میرے لئے ایک سکون تھا۔ اس شب کے بعد میری ہر شب نور بانو ہی کے پاس بسر ہونے لگی۔ میری موجودہ روش پر بیگم اور عزیز و اقارب دوست احباب لعنت ملامت کرنے لگے۔ لیکن نور بانو کی دلجوئی میں جو سکون و راحت ہے وہ خاندان کی ہمدردیوں میں میسر نہ آیا۔

شہاب کے کثیر تعداد حضرات اور خواتین بتائیں کہ آپ نے اپنے اوقات کو خوشگوار بنانے کے لئے کیا مشغلہ اختیار کیا ہے اور روزآنہ کتنا وقت ان مشغلوں میں صرف ہوتا ہے صبح جب آپ بستر سے اٹھتے ہیں تو پہلا کونسا کام کرتے ہیں یہ ایک دلچسپ سوال ہے اور دوسروں کے لئے باعث ترغیب۔

غزل

جناب عرشیؔ بھوپالی

تنہائی جمال سے گھبرا گئے ہیں آج
کچھ گفتگو نظر سے وہ فرما گئے ہیں آج

تجدید آرزو کیلئے دل مچل نہ جائے
مدّت کے بعد پھر وہ نظر آ گئے ہیں آج

اب دیکھئے پہنچتی ہیں بربادیاں کہاں
اُن کی حسین آنکھوں میں اشک آ گئے ہیں آج

تھمتے نہیں ہیں اشک ٹھہرتی نہیں ہے آہ
جیسے وہ آ کے خود مجھے سمجھا گئے ہیں آج

شاید انہیں بھی رنجش باہم ہے ناگوار
مجھ سے نگاہ ملتے ہی گھبرا گئے ہیں آج

ہر ہم سہی اداس تو قاصد نہ تھے کہیں
وہ التجائے شوق کو ٹھکرا گئے ہیں آج

اب ہم ہیں اور ضبط محبت کی کوششیں
تاکید احتیاط وہ فرما گئے ہیں آج

عرشیؔ نہ پوچھ اب مری بیباکیٔ طلب
نیچی نظر سے وہ مجھے دھمکا گئے ہیں آج

فطرت نسوانی

جناب ۔م ۔ز

اس کی مخالفت اور تائید میں جو مضامین موصول ہوں گے
وہ شکریہ کے ساتھ شائع ہوں گے۔

حقیقی عورت ایک ناقابل فہم معمہ ہے وہ کبھی اپنی نسوانیت کا انکشاف نہیں کرتی اس کا ہر انداز اس کے حقائق کو پوشیدہ رکھتا ہے وہ ایک طلسم ہے جسے اس کا ظاہر اوس کو پُر طلسم بنا دیتا ہے۔

عورت جس راز کو وہ در اصل افشا کرنا چاہتی ہے اس کو بظاہر پوشیدہ رکھتی ہے اور جس حقیقت کو وہ ہمیشہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے اس کو کبھی کبھی افشا کر دینے میں تامل نہیں ہوتا۔ غرض کہ اس کا باطن وہ نہیں رہتا جو پوشیدہ رہتا ہے اور نہ ظاہر جو افشا ہوتا رہتا ہے۔ اس طلسم سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرد اس کی فطرت کو نہ سمجھ سکے کسی چیز سے متاثر رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اس سے پورے طور پر باخبر نہ ہونے پائے۔ عورت یہ راز جانتی ہے اس لئے وہ اپنی ہستی کو کبھی کھلنے نہیں دیتی۔

صحیح معنوں میں عورت وہ ہے جو اپنے ہر انداز سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں لطیف امیدیں پیدا کر دے۔ لیکن انہیں امیدوں کو ایک انداز لطف سے مایوس بھی کر دے امید و یاس کی ان ہی نیرنگیوں میں محبت کرنے والے کی شکست رنگین اور نسوانیت کی فتح لطیف مضمر ہے۔

عورت چاہتی ہے کہ اس کی نسوانیت ساری کائنات کو مسخر کرلے لیکن خود اس کی نسوانیت محض ایک محبت کرنے والے تک محدود رہنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا تو جذبۂ نسوانیت مطمئن ہو جاتا ہے لیکن عین اسی عالم میں عورت کی غیر مطمئن فطرت بغاوت کرتی ہے وہ صرف اسی میں مطمئن ہوسکتی ہے جب اس کے آنکھوں کے سامنے کی ساری دنیا اس کی حکمرانی کو تسلیم کرلے .... جسے محبت کرنے والا سمجھ نہیں سکتا۔

اس طلسم کو کبھی تغافل کہتا ہے اور کبھی جور و ستم، حقیقت یہ ہے کہ عورت کا یہ انداز نہ تغافل ہے نہ ستم بلکہ خود اس کی فطرت کی حوصلہ مندیوں سے اس کے جذبۂ محفوظ یعنی نسوانیت

کا ایک تصادم ہے اگر اس کی فطرت نے جذبۂ نسوانیت کو مغلوب کر لیا تو حقیقتاً جور ستم کا ایک مجسمہ بن جاتی ہے۔ دنیا کی ہر عورت میں ایک کشمکش مضمر ہوتی ہے لیکن جذبہ نسوانیت عموماً ایک توازن قایم رکھتا ہے اور عورت کی فطری سفاکیوں کو ابھرنے نہیں دیتا۔ لیکن دنیا کی مثالیں ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہیں۔ کلو پٹرا وہ خطرناک عورت تھی۔ جس کی نسوانیت اس کی فطرت کے تصادم سے فنا ہوگئی تھی وہ جذبۂ نسوانیت سے اک حد تک محروم تھی اس کی حسن کی سفاکیوں نے محبت کرنے والوں کی زندگی کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ برباد کر دیا۔

عورت میں نہ کوئی کشش روحانی ہے نہ سحر جسمانی۔ حسن نسوانی کائنات کا ایک خوبصورت جھوٹ ہے یا مرد کے شباب کا ایک عکس رنگین۔ اس کی حقیقت عموماً پوشیدہ رہتی ہے لیکن کبھی کبھی محبت کرنے والے کی مسحور نگاہیں بھی عورت کے وجود حقیقی کی کرامتیں دیکھ لیتی ہیں۔ اس کی زندگی کا بدنما رخ اکثر سامنے آجاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ محبت کرنے والے کے خیالات میں ہمیشہ جذبات کا مد و جزر رہتا ہے۔

فطرت نسوانی کا ہر انداز مرد سے مختلف ہے اور بعض صورتوں میں متضاد ہوتا ہے عورت اگر محبت کرنے والے کو منانا چاہتی ہے تو خود روٹھ جاتی ہے اگر اسے سزا دینا چاہتی ہے تو خود معذرت کرتی ہے۔ اس کی فطری کمزوری نے اسے یہ انداز سکھائے ہیں تاکہ ہر صورت میں کامیاب رہے۔ وہ مرد کی شکست کا راز جانتی ہے اور اس کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتی ہے جن میں مرد کی ساری بے بسی کا راز پنہاں ہے۔ فتح نسوانی کا یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ خود مفتوح کو اپنی شکست میں لطف آتا ہے۔ یہی خصوصیت عورت کی تمام فتوحات کا باعث ہے۔

فطرت نسوانی غور و فکر سے بے نیاز ہے وہ صرف اُس ماضی کی قائل ہے جو حال سے وابستہ ہو۔ ورنہ وہ محض حال سے متاثر ہوتی ہے۔ ماضی و مستقبل اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ گذری ہوئی زندگی کے نقوش، اگر وہ حال سے بیگانہ ہیں، اس کے دماغ سے محو ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گذری ہوئی محبت کو محض ایک افسانہ سمجھ کر وہ باآسانی بھول سکتی ہے۔ لیکن مرد اپنے ماضی کو اپنے ساتھ رکھتا ہے وہی اس کا سرمایہ حیات ہے اس کی مایوسیاں اور حسرتیں اسے ہمیشہ کے لئے اپنے ماضی میں محو کر دیتی ہیں وہ کسی سے دوبارہ محبت نہیں کر سکتا۔ اگر کرتا بھی ہے تو وہ محبت نہیں ہوتی۔ حسن عریاں قابل برداشت ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت عریاں کو انسانی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ۔۔۔۔

یادِ رفتگان

سرزمین حیدرآباد سے بڑی بڑی باکمال ہستیاں پیدا ہوئی ہیں اگر ان کی تفصیلی حالات قلمبند کئے جائیں تو حیدرآباد کے شعر و سخن پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

فیض علیہ الرحمہ حیدرآباد کے صاحب دل اور باکمال شاعر تھے جن کے سالانہ فاتحہ کے موقع پر ایک مشاعرہ بھی ترتیب دیا جاتا تھا جس میں غلام قادر گرامی اور ترکی کے سوا دوسرے مشہور شاعر بھی اپنا کلام سنایا کرتے تھے طرح مصرعہ فارسی اور اردو ہوا کرتا۔ انہیں مشاعروں میں "تفضل" نامی ایک شاعر اپنا کلام سنایا کرتے تھے جو فارسی اور اردو آمیز ہوا کرتا تھا۔ پرانے کاغذات میں تفضل کی چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ دلچسپی کے لئے شہاب میں اس کو پیش کیا جائے گا تاکہ یہ کلام محفوظ رہ سکے۔

(حضرت عطار تفضل پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں)

چنانچہ انہیں مشاعروں کا ایک طرحی مصرعہ تھا۔

امید مغفرت از کردگار میدارم

تفضل کی غزل ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں :-

سنان و سیف نہ خنجر کشا ری دارم　　ملے رقیب تو راہ فرار می دارم

بہ تنگ دستئی من دستگیر نیست کسے　　اگرچہ دوست بظاہر ہزار می دارم

نہ شوق مئے نہ مرا ذوق ہست ز آب شجر　　نہ شغل حُقّہ نہ لطف سگار می دارم

حساب کے لئے پہنچے جناب اعلیٰ کے　　مکان کی کوٹھری میں بیشمار می دارم

شب وصال بآن یار راز دل گفتم　　جہیرک کے گفت کہ امشب بخار می دارم

درم فتادہ و دیوار خانہ بشکستہ　　نہ چوب دار نہ من بیل دار می دارم

وزیر[1] فوج کو صد ہا عریضے گذرانا　　درے بجز نہ درے پیشکار می دارم

شراب خواری و جوار ہا و مردم آزاری　　یہ کل گنا ہوں کا اک سر پہ بار می دارم

کئے سے اپنے تفضل ہے منفعل لیکن　　"امید مغفرت از کردگار می دارم"

---

[1] یہ محکمہ نظم میں ملازم تھے۔ پیشکار سے مراد مہاراجہ آنجہانی ہیں۔

ٹوٹے ستارے

۱- رضیہ صاحبہ آپ بار بار استفسار کرتی ہیں ہم نہیں بتا سکتے کہ معصومہ بانو اور صغرا بانو نے ایک عرصہ سے مضامین لکھنا کیوں ترک کر دیا بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امتحانات کی مصروفیتیں مانع ہوں گی۔ البتہ ان کے دو ایک مضامین جو پہلے آئے تھے وہ رکھے ہوئے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اور دلچسپ مضمون ہو۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی قلمی ہمدردیاں لیکن اب نقش نگار طاق نسیاں ہوگئیں۔

۲- نسرین عزیز احمد صاحبہ۔ آپنے غلط سنا کہ شہاب میں اونہیں کے مضامین شایع ہوں گے جو خریدار ہیں البتہ دفتری حد تک نام دپتہ کی ضرورت ہے اور مضامین ایسے ہوں کہ " بلبلیں سنکر میرے نالے غزل خواں ہو گئیں "

۳- یاسمین صاحبہ آپ کے قیمتی مشورے اور ہمدردیوں کا عمیق شکریہ۔ مگر ہمارے مجبوریوں کا کوئی علاج تجویز نہیں کیا۔ مشکلات کی نسبت تو ایک بوڑھے فلسفی کا فرمودہ " مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں " پیش نظر ہے۔

۴- نسرین صاحبہ بی اے۔ ماشاء اللہ آپ لکھتی تو خوب ہیں لیکن انتہا احساس کمتری ایک طرح کی طبیعت ثانیہ ہے۔ شہرت اور پرچوں سے گریز موزوں نہیں۔ اب جبکہ سلسلہ شروع کیا ہے تو آئندہ بھی اس شغلہ کو جاری رکھئے اگر ادب سے آپ کی طرح اور بھی کنارہ کش ہو جائیں تو " دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں "

۵- بانو صاحبہ۔ معاف فرمائیں کہ ہم نے آپ کا شمار ترقی پسندوں کے زمرہ میں کیا تھا اب معلوم ہوا کہ امتحان کی مصروفیتیں مانع نگارش تھیں۔ اب تو فرصت مل چکی ہے لکھئے نا دلچسپ افسانے اور ڈرامے جس کو دیکھ کر " میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں "

۶- شمیم صاحبہ۔ جن خواتین اور حضرات سے مضامین کے حصول کی نسبت آپ نے لکھا تھا اون سے درخواست کیگئی مگر سنئے تو " یاد تھیں جتنی دعائیں صرف دربان ہو گئیں " مضامین نہ آنا تھے نہ آئے۔

کراؤن انک
CROWN INK
قیمت ۹ ر

پھر یاد دلاتے ہیں بھولے ہوئے افسانے

فاطمہ بیگم منشی فاضل لکھنؤ

یوں تو لکھنؤ کے ہر بادشاہ کا عہد حکومت قابل ذکر ہے ہی جس کا تذکرہ با قساط ناظرین کے سامنے پیش ہوتا رہے گا۔ اس وقت تو لکھنؤ کے شریف پرور غریب نواز فقیر منش نواب آصف الدولہ سے آپ کا تعارف کراتی ہوں۔

ابھی آصف الدولہ نے تخت شاہی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس صوبہ میں ایک جان لیوا قحط عذاب الٰہی کی صورت میں نازل ہوا۔ تاریخ اودھ شاہد ہے کہ اس قحط کے عالم میں بھی ایک روپیہ کا آدھ سیر[1] گھی ملتا تھا۔ اس قحط کی وجہ سے نواب کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ رعایا کی تکلیف کے علاوہ یہ خیال اور تکلیف دہ تھا کہ رعایا ہم کو منحوس خیال کرے گی۔ لیجئے دربار خاص منعقد ہوا، امرا، وزرا، جمع کئے گئے اور بادشاہ نے سب سے پوچھا کہ "بتائیے قحط کی مشکلات کا کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ اور رعایا کو فقر و فاقے سے بچایا جائے؟ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ ہر شخص نے اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیا لیکن نواب آصف الدولہ کو کسی کی رائے صائب نہ معلوم ہوئی آخر یہ کہتے ہوئے اپنی رائے بھی پیش کی۔

حاضرین دربار۔ آپ نے جو مشورے دئے جو تدبیریں بتائیں ان پر عمل مشکل ہے قحط سے پہلے یہ رائے کامیاب رہتی۔ علاوہ اس کے معاف فرمائیگا۔ آپ حضرات کی تدابیر میں "شریف طبقے" کا کوئی خاص خیال نہیں ہے اس لئے میری رائے تو یہ ہے کہ سردست تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے جو چوبیس گھنٹے ہوتا رہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد سے نمود سحر تک تو شرفا کام کریں اور صبح سے شام تک معمولی پبلک۔ قحط کے پیش نظر معماروں اور مزدوروں کی اجرت دونی کر دیجائے۔"

نواب کی اس مفید تحریک کو باتفاق سب نے پسند کیا، اب سوال یہ پیدا ہوا کہ عمارت کی نوعیت کیا ہوگی؟ نواب نے جواب دیا "حکومت کی حفاظت قلعوں اور فوجوں سے نہیں ہوتی

---

[1] آج کل تو روپیہ کا پاؤ بھر بھی نہیں ملتا۔

بلکہ اس تخت و تاج کا جو حقیقی محافظ اور بخشنے والا ہے میں اس کا گھر اور اس کے محبوب ترین بندوں کی یادگار قایم کرنا چاہتا ہوں۔ اب مسجد اور امام باڑے کے لئے موزوں جگہ کی تلاش شروع ہوئی۔ حسین آباد کا وسیع میدان اس عالی شان خوبصورت عمارت کے لئے پسند کیا گیا صرف ایک دشواری ہوئی اور وہ یہ کہ امام باڑے کے حدود میں ایک بڑھیا کا کچا سا مکان تھا جس کو وہ کسی قیمت پر بھی دینے کو تیار نہ تھی اور رحمدل بادشاہ ظلم و ستم سے زبردستی چھین نہ سکتا تھا آخر بادشاہ معہ امراء کے خود بڑھیا کے کچے مکان پر گئے۔ بڑھیا نواب کی آمد سے گھبرا گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر آصف الدولہ نے عاجزی سے کہا "بڑی بی! گھبراؤ مت! ہم تم پر کوئی جبر نہیں کرنا چاہتے البتہ یہ سن لو کہ اگر تمہارا مکان امام باڑے میں شامل نہ کیا جائے گا تو امام باڑے کی دیوار مجبوراً ایک سمت سے ٹیڑھی بنانا پڑے گی۔ اس لئے ہم تم سے بہ منت کہتے ہیں کہ تم اپنے مکان کی منہ مانگی قیمت ہم سے لے لو اور اپنا مکان امام باڑے میں شامل کردو۔ بڑھیا نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے جواب دیا "بیع و شرع میں کچھ شرطیں ہوتی ہیں۔ حضور اگر آپ میری شرطیں مان لیں تو مجھے عذر نہ ہوگا۔

نواب نے ہنس کر جواب دیا کہ ضعیفہ ہم اسی لئے تمہارے پاس آئے ہیں تم خوشی سے بتاؤ کہ وہ شرائط کیا ہیں؟

بڑھیا کی پہلی شرط تو یہ تھی کہ جس جگہ میرا مکان ہے اس جگہ محرم کے زمانہ میں تعزیہ رکھا جائے دوسری شرط یہ کہ "میرے رہنے کے لئے جس جگہ میں پسند کروں مکان بنوا دیا جائے" آصف الدولہ نے دونوں شرطیں منظور کیں اور امام باڑے کی تعمیر شروع ہوئی دن کو تو عام معمار اور مزدور کام کرتے تھے اور رات کو شریف اور نجیب لوگ۔ صبح ہوتی اور معمار مزدور کام پر آتے تو وہ شرفا کی غلط سلط بنائی ہوئی دیوار کو گرا کر پھر سے کام شروع کرتے تھے۔ اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "پھر شرفاء سے کام ہی کیوں لیا جاتا تھا؟" یہ صرف اس لئے کہ شرفاء بھی محنت کے عادی رہیں اور ان کی خودداری مجروح نہ ہو ان کو معلوم ہو کہ یہ روپیہ عطیہ سلطانی نہیں بلکہ ان کی خدمت کا معاوضہ ہے۔ اس طرح آصف الدولہ نے اپنی شریف رعایا کی پرورش بھی کی اور ان کی خودداری کو بھی قایم رکھا۔

لیجئے قحط ختم ہوا اور امام باڑہ اور مسجد آصفی بھی بن کر تیار ہو گئے۔ ذی الحجہ کا مہینہ تھا نواب کی خواہش کہ جس قدر بانس بلی۔ اینٹ چونا اور تمام ملبہ وہاں پڑا تھا

جلد سے جلد اٹھا دیا جائے تاکہ محرم کی یادگار اسی نئے امام باڑے میں منائی جائے۔ تعمیر کی نگرانی کرنے والوں نے متفق ہوکر کہا کہ "عالی جاہ! اس سامان کو ہٹانے کے لیئے جتنے مزدور اس وقت کام کر رہے ہیں ان کے دگنے بھی ہوں تو بھی ایک مہینہ سے کم میں امام باڑے کی صفائی ناممکن ہے۔

نواب مسکرائے اور کہا "آپ لوگ ایک ہفتہ کے اندر امام باڑے کو ان تمام چیزوں سے صاف دیکھ لیں گے۔ ہر شخص متحیر نواب جیسے سچے اور پاکباز انسان کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ عملی جامہ کیوں کر پہنتے ہیں دیکھتی۔ ادھر دوسرے دن صبح کو شاہی ڈھنڈورا تمام شہر میں یہ صدا دے رہا تھا کہ "ملک خدا کا حکومت نواب آصف الدولہ بہادر کی بہ حکم شاہی ہے کہ امام باڑے میں جس قدر بانس بلی اینٹ چونا وغیرہ جو کچھ بھی ہے ہماری رعایا اس کو بلا قیمت حاصل کر سکتی ہے" یہ صدا سنتے ہی صاحبان ضرورت روانہ ہوئے اور وہ ملبہ جس کو ہٹانے کے لئے ایک مہینہ کی مدت مانگی جارہی تھی۔ ایک ہفتہ میں صاف ہوگیا اور محرم وہیں کیا گیا۔

بڑی بی کی شرط بھی پوری ہوئی نواب صاحب کے تعزیئے کے ساتھ ساتھ بڑی بی کا ایک چھوٹا سا تعزیہ بھی تھا۔ آصفی تعزیہ امام باڑے کی سہ نشیں پر اور بڑھیا کا تعزیہ اسی جگہ جو اس کے مکان کا حصہ تھا رکھا گیا۔ اور جب سے یہ تعزیہ "بڑھیا کا تعزیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد اور امام باڑہ فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ کبھی فرصت رہی تو ان کا نقشہ پیش کروں گی ؛

۱۔ تباہی ایجاد کی ماں ہے!

۲۔ سخاوت اور شجاعت خوبصورت سے لفظ ہیں۔ لیکن ان کو جب عملی جامہ پہنا دیا جاتا ہے تو ان کی وقعت اور ان کے وزن میں خاصا نکھار پیدا ہو جاتا ہے

۳۔ ایک غیر دلچسپ یا تو نی انسان کے علاوہ مجھے زندگی کی ہر دوسری اذیت گوارا ہے۔

۴۔ مسرت ایک اضافی سی چیز ہے اور پھر اپنی ہر خوشی کی قیمت ہمیں اس سے کہیں زیادہ غم جھیل کر ادا کرنی پڑتی ہے۔

۵۔ مرد کچھ کھو کر بھی بہت کچھ پا لیتا ہے۔ اور عورت بہت کچھ پا کر بھی سب کچھ کھو دیتی ہے۔

سالک ہند　میرے جی میں ہے کہ پوچھوں کبھی مستانوں سے　کہ ملا نگاہ ساقی کو یہ طنطنہ کہاں سے　رخ

اگر ٹکر ہو جاتی !!

(افسانہ)　　اختر محمود

رکشا کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور میرے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور دماغ چکرا گیا - ذرا دیر بعد ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں - پردہ ہٹا کر دیکھا ——— وہاں تو جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا - لوگ ان جانے احساس سے چلے جا رہے تھے اور وہ لاری تو کبھی کی جا چکی تھی جس سے ہمارا رکشا ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا -

یوں ہی ذری سی بات گھنٹوں مجھے الجھائے رکھتی ہے اور آج کا یہ واقعہ تو ——— واقعی میں تو پریشان ہو گئی ——— سچ مچ اگر ٹکر ہو جاتی ؟ ——— اور جیسے دماغ میں کہیں سے بہت ساری برف کی ننھی ننھی قاشیں بکھر گئیں ——— دماغ سُن ہو کر رہ گیا - آگے کچھ سوچ ہی نہ سکی ——— یا اللہ ——— پھر ایک اور جھٹکا اور دل کی دھڑکنیں جیسے رکتی معلوم ہوئیں - گھبراہٹ میں الٹا سیدھا کلمہ پڑھ ڈالا - لیکن اب کے رکشا کسی لاری سے ٹکرانے کے بجائے گھر پر رکا تھا - جیسے پکڑ اتی اندر پہنچی -

ابا جی کے کمرہ میں سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے - نجمی اپنے لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا - مجھے جو دیکھا تو دوڑتا ہوا آ کر ٹانگوں سے لپٹ گیا - "آ گئیں میری آپا جانی" اور میں نے اس کی صبیح پیشانی چوم لی - میرا بھیا - میرا ننھا بھائی ——— اور میرے دماغ میں یکایک وہی جملہ گونج اٹھا ——— اگر ٹکر ہو جاتی ؟ ——— گھبرا کر اسے گود سے اتارا - سب کی طرف دیکھا - ابا جی امی سے باتیں کر رہے تھے - بہت مطمئن معلوم ہو رہے تھے - لیکن اگر ٹکر ہو جاتی - اور اس وقت بجائے میرے، میری لاش آتی تب تو شاید ابا جی کا یہ اطمینان ٹھہر نہ رکھبراہٹوں اور پریشانیوں سے ٹکرا جاتا - ثریا خواہ مخواہ ریڈیو پر جلد جلد اسٹیشن بدل رہی تھی - بھابی اپنے ننھے ظفر کو گدگدا رہی تھیں اور بھیا اپنے بیٹے کے قہقہوں پر مسکرا رہے تھے - سب کے اس اطمینان پر مجھے ہنسی آ گئی -

"اگر ٹکر ہو جاتی ؟" ——— بار بار یہ جملہ دماغ سے ٹکرا رہا تھا - میں نے خیالات کو منتشر کرنے کے لئے سر کو سختی سے جھٹکا - توبہ کس قدر پریشان کن خیال تھا - بہت جلد ثریا کی چھیڑوں - بھابی کی مسکراہٹوں اور بھیا کے دلچسپ قہقہوں کی گونج میں گم ہو کر ٹکر کو تو جیسے بھول ہی گئی ———

لیکن رات کے اندھیرے میں، کمرے کی تنہائی میں پلنگ پر لیٹے ہوئے یکایک دماغ کے کسی کونے سے وہی جملہ تڑپ اٹھتا ـــــ اگر ٹکر ہو جاتی؟ ـــــ اور ایکدم سے بہت سارے عجیب عجیب خیالات دماغ کے نامعلوم کونوں سے ابھر آتے ـــــ بہت دیر تک پلنگ پر پڑی پڑی سوچتی رہی۔ سچ مچ اگر ٹکر ہو جاتی ـــــ؟

معاً مجھے ایسا معلوم ہوا کہ واقعی رکشا ایک ساتھ دو موٹروں سے ٹکرا گیا۔ ساری کتابیں سڑک پر بکھر گئیں۔ لوگ ایک ایک کر کے جمع ہونے شروع ہوئے۔ کسی عملی ہمدردی کے لئے بس یوں ہی جھوٹی دکھاوے کی ہمدردیوں کی بڑھا تکتے۔ لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھکر میرے جسم میں غصہ کا ایک بیباک جذبہ تڑپ اٹھا۔ آخر کیوں انسانیت اتنی بے حس ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں بیچ سڑک پر دو قریب المرگ ہستیاں پڑی ہیں اور لوگ ابھی اس انتظار میں ہیں کہ پولیس آ جائے پنچ نامہ ہو جائے تو کچھ کریں۔ لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اور پھر یوں بھی کون پرائی آگ میں کودتا ہے۔

گھنٹہ بھر پنچ نامہ کے مرتب ہونے میں لگا۔ جس کے دوران میں آہستہ آہستہ میرا جسم ٹھنڈا ہوتا گیا۔ ساتھ ہی دل کی دھڑکنیں ہلکی ہوتی ہوتی نامعلوم ہو کر رہ گئیں اور میرا احساس بھی جیسے دم بھر کے آرام کے لئے سو گیا۔ ایک جھٹکا لگا جیسے کسی نے اوپر سے ایک دم نیچے تاریک گہرائیوں میں پھینک دیا ہو۔ جس سے گھبرا کر میرا احساس جاگ اٹھا۔ میں حیران رہ گئی یہ دیکھ کر کہ سامنے بڑے دالان میں میری لاش ایک تخت پر پڑی تھی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بصارت، سماعت اور احساس کی قوتیں زائل نہیں ہوئیں۔ کیونکہ میں سب کچھ دیکھ، سن اور محسوس کر رہی ہوں ـــــ

میں نے دیکھا میرے مردہ جسم کے قریب ہی بی اماں بیہوش سی پڑی سسکیاں لے رہی ہیں۔ میں نے سوچا اب رو رہی ہیں۔ جب تک جیتی تھی۔ ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ، بیجا پابندیوں سے میری مختصر سی زندگی کو بھی کر موم کی بیجان گڑیا بنا رکھا تھا جو سر سے کھیلے نہ منہ سے بولے۔ جس جان کو ذرا سی پابندی ناگوار گذرے اس پر یہ پہاڑ جیسی پابندیاں ـــــ حقیقت میں تھی جان ان بیجا پابندیوں سے۔

ساتھ کے کمرے میں شمی، نمو، زہری، رہنا اور دو دوسری اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ جیتے جی کب ان دوستوں سے جی خوش ہوا جو اب امید رکھوں کہ میری حسرت بھری موت پر دو آنسو ٹپکا دیں۔ شور کا تو یہ حال ہے کہ ... ... محسوس

کر رہی ہوں، نمو تو خیر یوں بھی معصوم تھی - فرشتوں کی طرح ، تلخی کا مزہ جو نہ چکھیں - اور یہ زہری، رنیا اور رانو تو کلیجہ برمانے میں شمسی سے بھی کچھ چار ہاتھ آگے ہی تھیں - ایک کھلونا تھی جیسے میری زندگی ان دوستوں کے دل بہلائی کا -

سامنے دروازے کا سہارا لئے بجی کرڈا اچھٹی پھٹی حیران ہنگاموں سے لوگوں کا منہ تکے جا رہا تھا اس کی معصوم پریشان نگاہیں میں ہزاروں سمجھ میں نہ آنے والے سوال تڑپ رہے تھے - وہ یوں کھڑا تھا جیسے دماغ ماؤف ہو گیا ہو اس کا سب کچھ سمجھنے کی کوشش میں جیسے کوئی کچھ نہ سمجھ سکے -

رونا دھونا کد ھرکا - ثریا تو میرے کمرے میں پہنچی - وہاں کی ہر چیز پر قبضہ جما رہی تھی - "سنو شبو ، باجی کا یہ ٹیبل لیمپ تو میں لونگی اور بھئی یہ جھاجھم کا ڈوپٹہ بھی میں لئے لیتی ہوں البتہ یہ کپڑے تم لے لو ، اپنے رہنے کے لئے - میں نہ رہوں گی کیسے معلوم اللہ میاں کو باجی کی طرح مجھ پہ بھی پیار آ جائے - اور یہ اللہ ماری کتابیں بھی تم لے لینا - ان کی وجہ سے کل اللہ قسم اتنی زور سے چٹکی لی ہے - اب تک جلن ہو رہی ہے " اور اس نے جلدی سے اپنا بازو ننگا کر کے شبو کو دکھایا ــــ " بجی بڑا دکھنا ہے کتابیں وہ خراب کرتا اور پیٹی میں جاتی ــــ ستیاناسی باجی ! " اور اس نے دانت کچکچا کر میز پر پڑی ہوئی میری تصویر کو گھونسہ بتاتے ہوئے کہا ــــ میں تو حیران رہ گئی اپنی اس اکلوتی بہن کی باتیں سنکر ــــ یا اللہ اس سنسار کا خون اس قدر سفید ہو گیا - یہی ثریا تھی جو آنچل سے بندھی رہتی - جہاں جاؤ ساتھ - مرنے جینے کی فرصت نہیں - سلو باجی ، سلو باجی کہتے نہ تھکتی - بات بات پر چومتی ، چمٹتی ، گلے کا ہار ہو ہو جاتی - یا اب یہ حالت - کسی طرح طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں - چلتے ہوئے سانس کے ساتھ تھی جیسے اس کی محبت - غرضیلی محبت - دنیا شاید اسی کا نام ہے - دیکھے بہ پیار رہیڈ موڑتے ہی انجان ــــ سانس کے پنچھی کے اڑتے ہی محبت بھی مر جاتی پیار بھی ختم ہو جاتا

اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والے کا کیا دوش - اپنے ہی جب اپنے نہ رہے تو پھر غیر کا کہنا ہی کیا - ثریا کا پیار کونسا ایسا سچا تھا کہ بھابی کی چاہت کو ٹھکراتی جو اپنی سہیلیوں میں بیٹھی میری برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سنا رہی تھیں - دل اپنا ٹوٹا دوسروں کو کیا پتہ چلا - موت کا رنج تو کچھ اپنوں کو ہی ہوتا ہے - غیر کے پاس وہ دل ہی کہاں جس میں مرنے والے

سچی محبت چھل رہی ہو - امی کی سی محبت کون کرے - ان کی ڈانٹ میں بھی پیار کا انداز ہوتا۔
ان کی کڑوی نصیحتوں میں تو جیسے امرت گھلا ہوتا - کچھ بھلے ہی کو ڈانٹتی تھیں - اور پھر کون
برا چاہتا ہے اپنی چیز کا - لیکن بھابی کی دکھاوے کی محبت نے اندھا کر رہا تھا، ثریا کی غرض بھری
چاہت نے جیسے جادو کر دیا ہے مجھ پر - امی کی پیار بھری ملامت ناگوار گذرتی - سمجھ بوجھ
رکھتے ہوئے بھی انسان بعض وقت کیسے کیسے دھوکے کھا جاتا ہے، سراب پر مرمٹتا ہے آنکھوں
دیکھے مکھی نگل جاتا ہے اور پھر اپنی عقل کی بڑائی کی کیسی ڈینگیں مارتا ہے - مانو جھوٹ پر
یقین کرکے بڑا تیر مار لیا - بھابی کے آنسوؤں میں ان کی ساری جھوٹی محبت بہہ نکلی - لیکن
امی کو تو جیسے سکتہ ہو گیا ہو ــــ دل ہی جس کا خون ہو گیا ہو، اس کو آنکھیں آنسو بہانا
کیوں نہ بھول جائیں -

بھائی جان اپنے کمرے میں جلدی میں شیروانی کے بٹن الٹے سیدھے لگاتے ہوئے بڑبڑا
رہے تھے "لاحول ولاقوۃ، اس سلو کی بچی کو آج ہی مرنا تھا - کیسا شاندار پروگرام بنایا تھا
کشمیر کی سیر کا - اس لئے اتنے جلدی مرکر تو سارا مزا کرکرا کر دیا۔ اور آج جیسے مجھ پر ساری حقیقتیں
روشن ہوگئیں - کسی کے پیار میں گہرائی نہیں - محض دھوکہ ہے، فریب ہے، سراب ہے - یہی بھائی
جان کیسی کیسی باتیں بناتے - ادھر اتوار کا دن آیا اور لگے صبح ہی سے خوشامدیں کرنے "میری
سلو بہن تو بڑی پیاری ہے کیسی اچھی بہن ہے ہماری ــــ شاباش جلدی سے کوئی مزیدار میٹھا تو
بنادو - یہ ثریا تو کولہو کام کی نہیں ایک کام کی ہے تو بس ہماری سلو ہے - ایسا مزیدار میٹھا
کھلانا کہ ساری عمر یاد کروں، جانتی تھی ان کی کہی ہوئی ساری باتیں جھوٹی ہیں - لیکن پھر بھی
جیسے سوجھ بوجھ کھو دی ہو میں نے ــــ عقل سے انجان ہوکر دل کا سہارا ڈھونڈنے چلی
تھی - ایک ہی ٹھوکر میں حقیقت کھل گئی کہ کون کتنے پانی میں ہے -

نہلانے کے لئے شاید کسی نے لوٹا بھر پانی ڈالا - پانی ٹھنڈا تھا - برف کی طرح سرد - سلگتے
جسم میں کپکپی کی لہریں دوڑ گئیں - گھبرا کر آنکھیں کھول دیں - بھابی کہہ رہی تھیں "اے اب
اٹھو بھی - کچھ مُردوں سے شرط بدلی ہے کہ نو بجنے آئے اور اٹھنے کا نام نہیں" توبہ کیسا ڈراؤنا
اور بھیانک خواب تھا - لیکن سچ مچ اگر ٹھکر ہو جاتی ؟ ــــ تب تو شاید اس خواب
کی ہر کڑی ایک خوفناک حقیقت سے بدل جاتی - اُف خیال ہی سے میری روح لرز اٹھی ــــ

یہ مائیں بیچاری

صغرا عبد السبحان

(محترم ماؤں سے معذرت کے ساتھ)

کیا عجب میرے نوا ہائے سحر گاہی سے زندہ ہو جائے وہ آتش جو تیری خاک میں ہے

بخدا ان سطور سے نہ کسی کی تحقیر منظور ہے نہ دل شکنی۔ مگر کیا کیا جائے جب آنکھوں کے سامنے ایسے واقعات گذرتے ہیں تو جی کھول کر رہ جاتا ہے۔ دیکھئے تو سہی آج کل شاید اس کا فیشن ہی چل گیا ہے کہ مائیں اپنا رعب و داب آل و اولاد کے حق میں بخش دیں یا ماؤں کی ذہنیت ہی اس درجہ بدل گئی کہ وہ اپنے بچوں کے حق میں اپنی مادر زاد قوتوں سے دست بردار ہوگئیں۔ لاڈ و پیار ہر زمانے اور ہر جگہ کی ماں اپنے بچوں سے کرتی ہے مگر آج کل مائیں اپنے بچوں کی محکومیت میں آگئی ہیں۔ صاحبزادی کا حکم سر پر تو صاحبزادے کا آنکھوں پر۔ مجال نہیں جو ان کی کوئی بات ٹل جائے یا ان کے کسی معاملہ میں دخل دے سکیں۔ یہ ماں ہی کا دم ہوتا ہے کہ بیٹی کے ناز کے ساتھ اس کی سہیلیوں کی خاطریں اور بیٹوں کے نخروں کو سنبھالتے ہوئے ان کے دوستوں کی مدارات کرتی ہے۔ بجائے اس کے کہ روز اول سے بچوں کی دیکھ بھال میں جو جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں ان کا کچھ اچھا صلہ پانے کی امید ہو الٹی ذمہ داریاں گلے کا ہار بنتی چلی جاتی ہیں لیکن ماؤں کی خودی کچھ اس طرح کچلی گئی ہے کہ وہ اس حال میں بھی خوش نظر آتی ہیں۔ لڑکی کے سنگھار کے لوازمات آج کل کا فیشن۔ بے پردگی اعلیٰ نظری کا ثبوت۔ لڑکوں کی لڑکیوں اور لڑکیوں کی لڑکوں سے دوستی کیرکٹر کی بلندی کی کھلی نشانی۔ گندے ادب کا مطالعہ۔ پھر فلم بینی۔ آج کل کی فضا۔ غرض کہ ماں کے ہاتھ میں رہا ہی کیا یا اس لے رہنے ہی کیا دیا؟ ہر چیز۔ ہر بات پر زمانہ قابض۔ لڑکے اور لڑکیوں کی سیرت و کردار کی خالق اب ماں نہیں رہی بلکہ زمانہ ہوگیا ہے۔ اچھا ہو یا برا لیکن زمانے کا رنگ اس قدر گہرا چڑھ گیا ہے نئی پود پر کہ اس کو دور کرنے سے ماں بیچاری تو کوری ہی نظر آئے گی۔ ایسی لاپرواہ اور بے خبر مائیں بھی ہیں جو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتیں کہ فلاں بات کیوں ہوئی یا ہو رہی ہے۔ یا حکم بجا لانے میں کمربستہ۔ ایسی ہی لاپرواہ اور بھولی قسم کی ماؤں میں سے ایک کا ذکر ہے کہ یہ بیچاری صاحبزادے کی تابع واقع ہوئی تھیں۔ ایک نوجوان ناکتخدا عزیزہ سے صاحبزادے مانوس تھے اور اکثر وہ آیا جایا کرتی تھیں۔ صاحبزادے آپا۔ آپا کہتے تھے اور وہ بھیا۔ بھیا۔

بیچاری بہت خدمت کرتی تھیں۔ صاحبزادے کی والدہ محترمہ کی شاید اسی صلہ میں ان کو بینگ بڑھانے کے مواقع بھی حاصل ہوتے رہے مگر ایسی باتیں چھپا کب کرتی ہیں پھیل گئی سارے کنبہ میں اب بیچاری ماں کے جیسا سیدھا سادھا سارا کٹم کنبہ کیوں ہونے لگا۔ غرض نہ جانے کس طرح یہ سلسلہ جہاں کا تہاں رہ گیا اور اتنے ہی پر اللہ کا فضل ہوگیا۔ دوسری قسم کی ماؤں میں وہ ہیں جو جانتی ہر بات کو سمجھتی ہر معاملہ کو ہیں لیکن غالباً خیریت اسی میں دیکھتی ہیں کہ اپنے بچوں کی ہر جا و بیجا بات میں ہاں میں ہاں ملائیں اور ان کی ہمت افزائی کرتی رہیں۔ ان میں بعض حد درجہ چالاک بیحد دوررس کیونکہ وہ ہر ممکن طریقہ اپنی اولاد کے فائدہ اور خوشی کے لئے اختیار کرنا چاہتی ہیں چاہے وہ مذہبا ناجائز ہی کیوں نہ ہو۔ لڑکی کی سہیلیاں لڑکے کے سامنے آتی ہیں وہ فرماتی ہیں ارے بھئی یہ تو تمہارے بھائی ہیں۔ پھر بیٹے کے دوست اور خود کے منھ بولے بھانجے بھتیجے آخر یہ سب بیٹی کے بھائی ہی تو ہوئے؟ اب ان سے پردہ کیسا؟ صاحبزادی آج فلاں دوست کے یہاں ٹی پارٹی پر مدعو۔ کل ریڈیو اسٹیشن پر۔ پرسوں فلاں فلم دیکھنے۔ کسی دن پک نک تو کبھی کوئی جلسہ۔ غرضکہ ہر دن اعلیٰ نظری اور بلند ہمتی کا ثبوت۔ کیرکٹر مضبوط ہوتے ہیں نا ان باتوں سے۔ خود اعتمادی سے سیرت پر جلا ہوتی ہے نا؟ چاہے اماں جان کو اس کی ہوا بھی نہ لگے کہ وہاں کیا کیا ہوتا ہے۔ بہت کیا کہہ دیا کہ دیکھو بیٹی دیر نہ کرنا۔ اور شوقین مزاج مائیں تو لڑکیوں کے ساتھ ہی شوخ سے شوخ فلم دیکھتی ہیں صاحبزادی جب گھر پر ان فلمی گیتوں کی تان اڑاتی ہیں تو اماں خوش ہو ہو کر داد بھی دیتی ہیں۔ وہ مائیں جو اپنی لڑکیوں کو محض اس لئے اسکول نہیں بھیجتیں کہ "خیالات آزاد ہو جاتے ہیں"۔ میں کہتی ہوں آخر وہ گھر پر لڑکیوں کو کیا کچھ نہیں سکھاتیں جن سے "آزادی" کا گمان نہ ہوتا ہو۔ گھر میں بیٹھنے والی لڑکیوں کو تو تمام دن بیکار ملتا ہے کہ فلمی منظروں کے خواب دیکھتی رہیں اور ذلیل رسالے جو سانپ بچھو کی طرح آج کل پھیلے ہوئے ہیں پڑھتی رہا کریں۔ ہر رشتہ کے بھائی بہنوی اور منہ بولے بھائیوں کے سامنے لڑکی عریاں لباس زیب تن کرتی ہے اور ماں یہ کہکر داد دیتی ہیں کہ دیکھو خود اس نے سیا ہے۔ صد حیف کہ یہ وہ ماں ہے جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ یہ وہ ماں ہے جس کے ہاتھ گہوارے کو جھلاتے جھلاتے دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ وہ ماں ہے جو ایک گوشت پوست کے لوتھڑے کو اشرف المخلوقات بناتی ہے جس کے اخلاق اتنے پستی میں ہوں کہ وہ اپنے بچوں کی برائی بھلائی نہ سوچ اور سمجھ سکے وہ کس طرح "ماں" کہلانے کے لائق ہو۔ اے ماں کی مقدس ہستی! اپنے اصلی مقام پر جلوہ گر ہو جا۔ استغفراللہ اس ہستی کو

اس روح کو بیدار کر جو تیری نسل کو سدھارے اور اسے سیدھا رستہ دکھائے - اپنی لڑکیوں کو ایسی عورت بنا جس کا دوسرا نام عصمت ہو، عفت ہو اور شرافت ہو - تیرا مقام بلند ہے - اپنی خودی کو پہچان اور اس سے کام لے -

تیری خودی میں اگر انقلاب ہو جائے عجب نہیں ہے کہ یہ چارسو بدل جائے

خیر مقدم

سلطانہ

سرخ سیب کے درخت کے نیچے کھڑی تھی کچھ پرانے خیال آنے لگے - ان کاسنی رنگ کے دریچوں کے قریب لاتعداد مسرور لمحے گزارے تھے - نہر کے وسیع اور شگفتہ کناروں پر اسی طرح بہار کے سبز دامن ابتک لہرا رہے تھے - اسی سفید کشتی کے بادبان موسمی ہواؤں میں کھلے ہوئے تھے -

خیال کے پردوں پر چھائے ہوئے بادل کو ہٹاکر وہی دلربا رخ انور اپنی دلاویز جھلک دکھا رہا تھا - جس کے قریب ہی زندگی اور مسرت کا دیوتا مسکرا رہا تھا -

ایک چھوٹا سا نازک سا خوشنوا پرندہ اڑکر دریچے سے قریب حنا کی پتیوں میں آ بیٹھا - اس کی باریک دلفریب آواز اچانک گونج اٹھی -

میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کونسی پر اسرار کشش تھی جو تمہیں آخرکار اپنے اس کنج عافیت سے باہر کھینچ لا رہی تھی - کسی دلربا تبسم نے جیسے زندگی میں نئی روح نئی جان ڈال دی -

خیر مقدم کے لئے آج ایک طلائی رنگ کا نفیس ریشمی لباس نکالا جس پر بہار کے آسمانوں کی وضع کے آتشیں جال بنے ہوئے تھے -

میری مضمحل روح مسکرانے لگی - زرد رخساروں پر سرخ خون کا رنگ ابھر آیا -

---

نماز

نفیس جہاں نفیش

اسلام میں پہلا فرض نماز ہے۔ جس کا ہر حالت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ نماز کسی صورت سے معاف نہیں کی گئی۔ اگر بیماری یا کسی مجبوری سے وضو نہ کر سکے تو تیمم کر کے پڑھنا چاہئے۔ کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر بھی ادا کر سکتے ہیں۔ بیٹھ کر بھی نہ ادا کر سکے تو لیٹ کر اشاروں سے ادا کرے۔ نماز سے غافل رہ کر انسان مورد عذاب ہوتا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ بہنیں اپنا قیمتی وقت بناؤ سنگار میں صرف کرتی ہیں مگر نماز جس میں دین اور دنیا دونوں کی بہتری ہے پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتی۔ ایک نماز پڑھنے سے کتنے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً صفائی، جس پر ہماری صحت کا دار و مدار ہے وقت کی پابندی۔ نماز پڑھنے والے صبح سویرے اٹھتے ہیں وضو کرتے ہیں جس سے وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے سے سارا دن طبیعت بحال رہتی ہے۔ گناہوں سے بچتے ہیں۔ نماز سے ایک قسم کی ورزش ہو جاتی ہے۔

غریب انسان بھی خواہ اس کے کپڑے پھٹے پرانے کیوں نہ ہوں لیکن نماز کی وجہ سے وہ صاف ضرور ہوں گے۔ نمازی ظاہری و باطنی دونوں طرح صاف ہوگا۔ اس کے برعکس کوئی بے نمازی چاہے کتنے ہی قیمتی کپڑے کیوں نہ پہنے لیکن نمازی کی طرح حقیقی صفائی سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

اکثر بہنوں سے جو مذہبی تعلیم سے بیگانہ ہیں نماز سے نجات حاصل کرنے کی عجیب و غریب باتیں سن چکی ہوں مگر نماز ان تدبیروں سے معاف نہیں ہو سکتی۔ مرد عورتوں سے زیادہ نماز سے غافل ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ میاں ان کے کاروبار کو دیکھ کر نماز معاف کر دیتا ہے۔ صبح میں نماز کے لئے اٹھا نہیں جاتا۔ دفتر سے تھکے ہوئے آتے ہیں اس لئے عصر، مغرب، عشا تینوں (ں) میں سے کوئی ایک بھی نہیں پڑھ سکتے۔ فجر کی نماز کے لئے بہانہ ہے کہ صبح میں اٹھنا ناممکن ہے۔ اگر دفتر کے کسی کام سے جلد جانا ہو تو ضرور اٹھیں گے۔ خدا کے آگے دفتر کو ترجیح دیجاتی ہے (نعوذ باللہ)

ایک بہن صاحبہ فرماتی ہیں کہ ابھی تو کافی عمر پڑی ہے۔ بڑھاپے میں عبادت کریں گے جیسے اب انہیں معاف ہے۔ بڑھاپے کی نماز سے زیادہ جوانی کی نماز و عبادت خدا کو پیاری ہوتی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ نماز پڑھنے سے کیسی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

ایک بہن کہا کرتی ہیں کہ صبح کی اور عشا کی نماز پڑھنا مشکل ہے - کیونکہ صبح کی نیند پیاری ہوتی ہے - اور عشا کی نماز لمبی ہوتی ہے - جب دو نمازیں نہیں ہوتیں تو دوسری پڑھ کر کیا کریں اگر پڑھنا ہے تو پوری پانچ وقت کی پڑھنا چاہئے - اس طرح وہ ایک وقت کی نماز بھی ادا نہیں کرتیں -

ایک مالدار بہن صاحبہ فرماتی ہیں کہ جس طرح خدا نے ان کو دنیا میں خوش حال رکھا ہے اس طرح آخرت میں بھی رکھے گا - یہ تو بجا ہے - اس کی شان کریمی بیشمار رحمتوں اور برکتوں کا مخزن و معدن ہے - مگر اس کے احکام بجالانا ضروری ہے ان سے پیچھے ہٹنا یقیناً عذاب سے قریب ہونا ہے - جو شخص دنیا میں رنج و مصیبت میں ہوتا ہے اور ہر حالت میں تسلیم و رضا پر راضی ہوتا ہے وہ ایک بندہ ہے - ان پر خدا کی مہربانی ہے - تسلیم و رضا کی صفت اللہ تعالیٰ کی آزمائش پر سر جھکانے کا لازمی نتیجہ دین اور دنیا میں کامیابی و راحت ہے - اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں نے اسی کی وجہ سے بڑی بڑی کامیابیاں اور عزت و نیکنامی حاصل کی ہے -

در اصل مذہبی فرائض ایسے ہیں جن سے روگردانی کے بعد بھی آپ دلائل سے دوسروں کو قایل نہیں کر سکیتں یہ ایسی کمی ہے جس کو آپ کچھ دنوں بعد خود ہی محسوس کرنے لگیں گی - اگر آپ نماز نہیں پڑھتیں تو اس کے لئے کوئی معقول عذر پیش نہیں کر سکتیں یا روزہ رکھنا دشوار محسوس کرتی ہیں تو بیماری یا کمزوری کا عذر کر کے اسے ہرگز نہیں ٹال سکتیں - اللہ تعالیٰ کے پانچوں احکام میں ایسی ایسی باتیں پوشیدہ ہیں - جن سے ہمارا ہی فائدہ ہے اگر ہم ٹھیک ٹھیک کچھ چاہیں تو کبھی منھ نہ موڑیں گے - پس ہمیں چاہئے کہ بچپن سے - بچوں کی تعلیم میں عام علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی خیال رکھیں اور مادی ترقیوں اور نمائشوں کی ظاہر کامیابی سے متاثر ہو کر اپنے فرائض کو نہ بھول جائیں -

بہر حال نماز پڑھنا فرض ہے اور بہنوں کو چاہئے کہ نماز کو ان حیلوں سے ٹالنے کے بجائے اس کی پابند بننے کی کوشش کریں - خدائے پاک سب مسلمان بھائیوں بہنوں کو پابندی نماز کی توفیق بخشے - (آمین)

روز محشر کہ جان گداز بود اولیں پرسش نماز بود

استفسارات

خواتین اور حضرات کے اصرار پر ذیل کا کالم کھولا جاتا ہے جو پابندی سے ہر مہینہ وقف رہے گا، جوابات اور استفسارات شہاب کے دفتر پر بھجوائے جائیں کسی استفسار کا جواب طویل ہو تو وہ مضمون کی شکل میں شائع ہوگا۔ جس پر لکھا جائے۔ بجواب استفسار اس طرح ضرورت مندوں کے لئے کافی معلومات فراہم ہوسکیں گے۔

۱۔ یہ روایت کہاں تک صحیح ہے کہ جنات بلیوں کے بھیس میں نظر آتے ہیں اور یہ توہم ہم میں کب سے پیدا ہوا۔ بلی میں کیا خوبی ہے کہ جنات نے اس کا چولا پسند کیا۔

رضیہ احمد

۲۔ ذیل کی غزل مطلوب ہے جس کا ایک شعر ہے۔ ؎

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں کھلونے دے کے سمجھایا گیا ہوں

ارمان

۳۔ دنیا کے آثار قدیمہ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز کھنڈر کہاں کے ہیں اور اسی طرح مناظر قدرت میں کہاں کے منظر دلچسپ ہیں۔ جاوید

۴۔ رصد خانہ کی بنیاد سب سے پہلے کس نے ڈالی۔ امیر عالم

۵۔ فارسی شاعری کی ابتداء کس کے دور میں ہوئی۔ سلیم الدین

۶۔ لغات عرب کا پہلا مدوّن اور فن عروض کا موجد کون ہے۔ اختر حسین

۷۔ اڑن کھٹورے سے کیا مراد ہے۔ ہماری کہانیوں میں اس کا ذکر کیوں آتا ہے۔

بلقیس عثمان

۸۔ غض بصر پر براہ کرم تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔

نزہت

موت

ساجدہ

دنیا ہے ہی ایسا مقام۔ جب آئے ہیں تو جانے کے لئے۔ زندگی کی منزل موت ہے۔ اسی کے متعلق فانی مرحوم کہہ گئے ہیں ؎

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا! زندگی کیا ہے فقط خواب ہے دیوانہ کا

اور اقبال زندگی پر نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

قرآن حکیم میں ہے "عقلمند لوگ اس میں (دنیا) سے اتنا ہی حاصل کرتے ہیں جتنی انہیں ضرورت ہو لیکن غافل انسان ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور ان ہی چیزوں پر زندگی صرف کر دیتا ہے جو اس کے کبھی کام آنیوالی نہیں ہیں" اور یہ کہ

"دنیا کی زندگی کی زینت تو مال دولت اور اولاد ہے لیکن نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں اپنے پروردگار کے لحاظ سے خوب اور انجام کے اعتبار سے بہترین ہیں"

آخرت کے انجام سے بے خبر لوگوں کے لئے کتنی اچھی تنبیہہ ہے۔ قرآن حکیم کی ہر راہ کھلی ہوئی ہے۔ لیکن ہم غفلت کی وادی میں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ چیزیں ہمارے کسی کام آنیوالی نہیں ہیں اسی کو حاصل کرنے کی جد و جہد ہی ہمارا عین مقصد ہوتا ہے ——— کیا صرف اس لئے کہ اس کو بھی ایک دن اپنے ساتھ دفن کر دیں ———؟

ہم کو باخبر رہنا چاہیئے کہ دنیا آزمایش و عمل کا میدان ہے۔ کیونکہ "خدا کا مقصد دنیا میں انسان کو بھیجنے کا یہ تھا کہ آزمائے۔ ان میں اچھے عمل کرنے والا کون ہے" جب یہ میدان ہماری گذرگاہ کے لئے منتخب کیا گیا تو اس کی شاہ راہ سے لاعلمی ہماری جہالت ہے ——— دارین کی کامیابی کی دو چیزیں ہیں۔

خدا سے محبت نفس سے عداوت۔

خدا کی یاد اور اپنی حقیقت

جب یہ دل لامکان کا مکان بن جائے گا تو دنیا کی محبت کس گھر میں رہے گی؟ جب نفس کی عداوت ہمارا شیوہ رہے تو برائی کو پناہ لینے کی جراءت کیسے ہوگی؟ ——— اقبال کے اکثر اشعار میں "خودی" کی تربیت اور اس کو بیدار کرنے کی تلقین ہے۔ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

دنیا سے اتنا بھی بیزار ہو جاؤ کہ زندگی ہی دو بھر نظر آنے لگے۔ سکندر اعظم نے بستر مرگ پر اپنی ماں کو تاکید کی تھی کہ کسی ایسے گھر کا چراغ اس کے گھر میں جلایا جائے جہاں موت واقع نہ ہوئی ہو - لیکن کیا یہ ممکن تھا؟ ــــ جب تمام دنیا کے گھروں میں ڈھونڈھا گیا تو کسی گھر سے بھی ایسا چراغ دستیاب نہ ہو سکا ــــ یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو ــــ لیکن حقیقت یہ ہے کسی انسان کا دل درد سے خالی نہیں ہوتا - اور صبر کے سواء یہاں کوئی چارہ نہیں ــــ مسلمان خدا کا فرمانبردا بندہ مصیبت میں بھی راحت محسوس کرتا ہے ۔

مولیٰ سے بڑھ کر کوئی درگذر کرنے والا نہیں ــ لیکن ــــ اس کی شان فیاضی کو دیکھ کر ہی ہم کہتے ہیں کہ ؎

غفور جان کے تجھ کو گناہ کرتے ہیں

وہ خود اس کا طالب ہے کہ "میرے دربار" میں ایک عاجز بندہ آئے اور میں اُسے نہ بخشوں"

غزل

جمیلہ خاتون صاحبہ کلکتہ

شاعرہ وہ ہوں کہ جس دم وجد میں آتی ہوں میں
سرحد ادراک سے آگے نکل جاتی ہوں میں

بیخودی سے ہوش کے عالم میں جب آتی ہوں میں
عالم امکاں کو راز شوق سمجھاتی ہوں میں

جب تصور میں تیری تصویر کو پاتی ہوں میں
رفعتوں سے بھی دو عالم کے گذر جاتی ہوں میں

شان رفعت میری پرواز تخیل کو نہ پوچھ!
نور بن کر شب کو تاروں میں سما جاتی ہوں میں

اللہ اللہ فکر کی میرے فلک پیما شیاں
جب سلجھ جاتا ہے عقدہ خود الجھ جاتی ہوں میں

تیرے جلوؤں کی فراوانی کا کیا کہنا ــــ مگر
اپنی چشم شوق سے خود ہی چھپی جاتی ہوں میں

آنکھ میں ہے کچھ نمی سی رنگ ہے چہرے کا زرد
اس پشیمانی کے صدقے خود ہی شرماتی ہوں میں

ڈھونڈتی ہوں ساحل امید بحر عشق میں
نامرادی کا برا ہو ڈوبتی جاتی ہوں میں

کچھ خبر بھی ہے تجھے او زینت بزم جمال
انجمن کی انجمن لے کر اڑی جاتی ہوں میں

بڑھ رہی ہیں آج شوق ناز کی بیتابیاں
اپنے مرکز کی طرف خود ہی کھنچی جاتی ہوں میں

دل ہے اور الفت کے طوفان حوادث اے قمر
موج کی مانند ہر ساحل سے ٹکراتی ہوں میں

رجسٹرڈ آصفیہ
3238
REGD. M.
۴۹۶

محمودیہ مشین پریس چارمینار میں چھپ کر دفتر شہاب بیرپورہ سے شائع ہوا

شہاب

(مرتبہ)

محمد عبدالرزاق بسمل

قیمت سالانہ (۸ر)

جلد ۱۵ امرداد سنہ ۱۳۵۶ف م جون سنہ ۱۹۴۷ء نمبر ۹

یورپ سے

نواب شمشید یار جنگ بہادر

سیلوائے ہوٹل لندن ——(۲۱)—— ۲۰ اپریل ۴۷ء

مولانا بسمل - سلام مسنون السلام -

سردی بڑھ گئی ہے - صبح کا وقت ہے - حکومت نے کوئلہ کی قلت کی وجہ سے سنٹرل ہٹنگ کی مسدودی کا حکم دے رکھا ہے - دو روز سے آفتاب کا دیدار نہیں ہوا - آج بھی اس وقت دس بج رہے ہیں آفتاب برآمد نہیں ہوتا - ہندوستان میں رہنے والے ہماری حالت پر رشک کر رہے ہوں گے اور ہم ہندوستان میں رہنے والوں پر ہنس رہے ہیں کہ آفتاب کی قدر ہے کیا اہالیان لندن سے کوئی پوچھے کہ آفتاب کیا رتبہ رکھتا ہے -

اچھا سنو تمہیں اس سے کیا مطلب کہ لندن والے کس مصیبت میں مبتلا ہیں اس سال کی سردی اور برف باری کا حال تمہیں شہاب کے نامہ نگاروں سے نہیں تو دوسرے اخبار کے تاروں سے ضرور ہو گیا ہوگا - یہ تو تھی قدرت کی ستم ظریفی جنگ کا ردعمل یہ ہوا کہ کوئلہ کمیاب ہو گیا - سردی کی شدت کوئلہ کی قلت - کپڑے کی نایابی - غذا کا فقدان - ان سب پر وزیر فینانس کا موازنہ کہ "تنباکو" کی قیمت میں دوہرے سے زیادہ اضافہ - برائے نام گرم ہونے کا خیال بھی جاتا رہا - ڈیڑھ شلنگ کو جو سگریٹ (۲۰) ملتے تھے اب (۳) شلنگ ۴ پنس کو مل رہے ہیں - مگر بسمل زندگی سیکھو تو اہل لندن سے ایجیٹیشن یہاں بھی ہوتے ہیں مگر جہاں مفاد قومی مد نظر ہو ان نیک بختوں کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی -

پرسوں مسٹر ٹرنچ جو حیدرآباد میں صدر المہام رہ چکے ہیں سے ملاقات ہوئی تھی کہہ رہے تھے میں نے نیا موازنہ جاری ہونے سے سگریٹ پینا ترک کر دیا ہے - اس طرح ہزارہا خوش حال اشخاص نے بھی ملک کی حالت کا خیال کرتے ہوئے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے - پوسٹر شائع ہو رہے ہیں - اخباروں میں مضامین آرہے ہیں کہ ملک کے مفاد کے لئے تنباکو کم کر دیجئے - سگریٹ ہولڈر میں پیا کیجئے - آہستہ آہستہ کش لیجئے -

آخر تک چلانے کی کوشش کیجئے - صرف اس لئے کہ اسّی فیصد تنبا کو امریکہ سے آتا ہے اور معاوضہ میں ڈالر دینے ہوتے ہیں -

غرض بھائی صاحب قوم اپنے وقار کو نباہ رہی ہے - بھر حکومت کو شکست ہونی مشکل ہی نہیں بلکہ محال نظر آتی ہے - اس لئے عوام سب بہتر حکومت سے خوش ہیں اور ہر شخص یہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ کی راشننگ نے ہمیں اس قدر فائدہ دیا ہے کہ بیان سے باہر ہے ورنہ ہماری زندگیاں محال تھیں -

راشننگ میں امیر - غریب - سب برابر ہیں - ہر شخص کو ضروریات زندگی کا سامان اتنا مل جاتا ہے کہ کچھ بچ جاتا ہے - البتہ اصراف نہیں ہوتا -

کل ڈاکٹر گگے نے مجھے اور ڈاکٹر واگھرے صاحب کو شام میں اپنے مکان پر بلکہ زیادہ صحیح (اپنی بیوی کی رہائش گاہ پر) دعوت دی تھی - ڈاکٹر گگے حیدرآباد میں رہتے ہیں ان کی بیوی دس بارہ سال سے لندن میں ہیں - میں اور ڈاکٹر واگھرے صاحب دونوں چھ بجے شام کے ٹیوب ریلوے سے روانہ ہوئے - چالیس منٹ میں اسٹیشن پہنچے - ڈاکٹر گگے نے اسٹیشن سے اون کے گھر تک کا راستہ ڈاکٹر واگھرے صاحب کو کافی دقت تک سمجھایا - اور ڈاکٹر واگھرے صاحب نے میرا اطمینان کر دیا تھا کہ میں بخوبی واقف ہو چکا ہوں اور لندن میں پہلے بھی آچکا ہوں - مجھے سب معلوم ہے - ہم نے اس رہبر کے ساتھ آنا قبول کر لیا تھا - خیر صاحب اسٹیشن پہنچے - ڈاکٹر صاحب نے اپنی نوٹ بک نکالی اور راہ نمائی شروع کی نوٹ بک میں جو تحریر تھی وہ صرف اس قدر تھی - رائٹ - لفٹ - رائٹ - لفٹ - یعنے سیدھے جانب مڑئے - بائیں جانب گھومئے - بازو پلٹئے - بائیں بازو وارادہ کیجئے - آخر میں سیدھے جانب رخ کیجئے - تیسرا مکان مکان مقصود اور مقام محمود ہے -

اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی قواعد پریڈ کی مشق شروع ہوئی - جہاں راستہ مڑتا ڈاکٹر صاحب نوٹ بک نکالتے - اپنا سیدھا بایاں پہلے دیکھ لیتے اس کے بعد بادہ پیمائی شروع ہو جاتی - پریڈ ختم ہو چکی - کافی راستہ طے ہو چکا - مگر ڈاکٹر گگے کے کہے ہوئے الفاظ دو منٹ کا راستہ ہے کے معنی سمجھ میں نہیں آئے - یا خدا لندن میں دو منٹ بھی یہاں کے جاڑے کے راتوں کی طرح دراز ہوتے ہیں کہ اس وقت جب ہم راہ نوردی

کر رہے ہیں۔ ساڑھے سات بج چکے ہیں اور ابھی شاید ہم دو گھنٹہ تک اور بھی بڑھتے
چلے جائیں تو شام تو شاید ہو جائے رات نہ ہوگی۔ جب ڈاکٹر واگھرے صاحب کی نوٹ
بک ختم ہو چکی تو اون کی آنکھ کھلی اور یہ خیال آیا کہ محلہ کا پتہ بھی ڈاکٹر گے نے لکھوا دیا
تھا وہ کسی سے پوچھنا چاہئے۔ مگر بسمل صاحب آپ کو یقین نہ آئے گا مگر یہ واقعہ ہے کہ
بستی ہے۔ مکانات ہیں۔ اون میں انسان بستے ہیں مگر راستے سنسان ہیں۔ شاذ و نادر کوئی
بوڑھا خراماں خراماں چہل قدمی کرتا نظر آتا ہے۔ جاگتے ہو ساڑھے سات کا وقت
ہے۔ اہل لندن پابند وضع۔ اہل لندن چاہے رات کے ۹ بجے ہوں مگر رات کا کھانا
ساڑھے سات بجے کھا لیں گے۔

غرض راستہ ناپتے۔ رائٹ۔ لفٹ کرتے ہوئے اوسی طرح واپس ہوئے۔ راستہ
میں ایک موٹر کچھ خراب ہو گئی تھی اور دو حضرات اوس کی درستی میں مصروف تھے۔ ہم نے ان
سے دریافت کیا اون میں سے ایک راستہ تبلاتے ہوئے تھوڑی دور تک ہمارے ہمراہ آیا
اور راستہ سمجھا کر واپس گیا۔ لندن میں بالعموم مضافات لندن میں خوش اخلاق لوگ
ہیں۔ خیر میں نے ڈاکٹر گے کا ذکر اس ضمن میں شروع کیا تھا کہ یہاں کے غریب اشخاص
اس حکومت سے ہمیشہ خوش ہیں اور جب تک غریبوں کی کثرت ہے اس حکومت کو کچھ
تردد نہیں ہے۔

مسز گے نے اپنا مکان جو نہایت چھوٹے چھوٹے تین کمروں ایک حمام ایک باورچی خانہ
پر مشتمل تھا۔ ہمیں تبلایا۔ نہایت چھوٹی سی جگہ اوس میں تمام ضروریات موجود۔ گرم
پانی کا بھی انتظام تھا۔ رفریجریٹر بھی۔ ہاٹ کیس بھی۔ اور ہر چیز مکان کے ساتھ کرایہ
میں شریک تھی۔ ملازم کوئی نہیں۔ ملازم کا لفظ تو لندن میں معنی ہی نہیں رکھتا۔ مسز گے
کا بیان تھا کہ راشننگ سے ہر چیز مل جاتی ہے اور واجبی قیمت دینی پڑتی ہے۔ ہم کو کسی
چیز کی تکلیف نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔ کپڑے کی کسی
قدر تکلیف ہے مگر وہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ البتہ راشننگ سے اسراف کی روک ہو گئی ہے۔

تو سنا بسمل صاحب آپ نے ہندوستان میں متمول حضرات خوش اقبال نہ ہوئے
ہوں ورنہ اب تو چرچل صاحب بھی اپنے وزارت کے خواب نہیں دیکھ سکتے۔ خدا جانے
میں نے کیا لکھا ہے 'وحی' میں اصلاح کفر ہو جائے گا اور میں بھی تخلقو بہ اخلاق اللہ'

کے مصداق اپنے کلام کی موتراشی یعنے "اصلاح" نہیں دل چاہتا۔ اب آپ کسی کے سمجھانے ناسخ و منسوخ کے متعلق قیاس آرائی نہ فرمایئے کہ ما اول من قاس ابلیس، کبھی بالمشافہ تمہیں سمجھائیں گے۔ تمہارا شہید

میگھ راجہ

عکاس

(ایک روایتی افسانہ)

(۱)

کہتے ہیں اگلے زمانہ میں ایک راجہ نہایت نیک اور خدا ترس تھا جس کی ہمدردیاں غریبوں کے ساتھ مشہور تھیں اور اس کی حسین و جمیل لڑکی آٹھ پہر سہیلیوں کے جھرمٹ میں مصروف رقص و تماشا رہتی اور ہر وقت نئی نئی تفریح سوجھتی اگر عیب تھا تو راج ہٹ، تریا ہٹ، چاند سورج بھی زمین پر آجائیں تو وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آتی۔
ایک روز کا ذکر ہے راجکماری نے اپنی سہیلیوں کو ایک عام تقریب میں مدعو کیا جس کی تیاریاں کئی مہینوں سے ہو رہی تھیں۔ تقریب کا دن آیا۔ سہیلیاں ایک ایک کرکے آنے لگیں ہنسی مذاق۔ چہل پہل سے محل میں ایک ہنگامہ تھا۔ اور اب کوئی دم میں تقریب کا افتتاح ہونے والا ہی تھا کہ دھواں دھار بارش ہونے لگی۔ راجکماری کو اپنی بزم درہم برہم ہوتے دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ جل کر کہنے لگی "میگھ راجہ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے کہ محفل ستیاناس ہو گئی۔ اگر آنا ہی تھا تو رات بارہ بجے بعد آئے ہوتے" وقت کا تقاضا یا دعا کا اثر کہ بارش قطعاً موقوف ہو گئی اور بڑی رات گئے رباب و چنگ نغمہ و رنگ کا دور دورہ رہا اور سہیلیاں رخصت ہونے لگیں۔ راجکماری بھی تھکی ماندی اپنا تمدتار لباس اتار کر پھولوں کی سیج پر پہنچ گئی۔ ابھی کچھ آنکھ لگی تھی کہ شانہ پکڑ کر کسی نے ہلایا یہ چونک اٹھی دیکھا کہ ایک حسین نوجوان پلنگ سے لگا کھڑا ہے۔ حیرت گھبرائی۔ نوجوان نے اس کی گھبراہٹ کو تاڑ لیا۔

نوجوان۔ گھبرائیے مت راجکماری میں کوئی چور نہیں ہوں۔

راجکماری۔ تم پھر ہوتے کون ہو۔ جو اتنی رات گئے آنے کی جرأت کی۔

نوجوان۔ تم ہی نے تو مجھے بلایا ہے۔

راجکماری۔ میں نے بلایا ہے!!؟

نوجوان۔ ہاں شام میں جبکہ بارش ہونے لگی تو تم نے ہی کہا تھا کہ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے آنا تھا تو رات کو بارہ بجے آئے ہوتے۔

راجکماری - میں نے تو آج تک تمہاری صورت نہیں دیکھی پھر بلاتی ہی کیوں۔ آخر تم ہو نے کون ہو، کوئی اتا پتا تو بتاؤ۔

نوجوان - میں میگھ راجہ ہوں۔

راجکماری - میگھ راجہ !! میگھ راجہ تو انسان نہیں، بلکہ وہ دیوتا ہوتا ہے۔

نوجوان - ہاں میں دیوتاؤں سے ہوں - اور تم سے ملنے کے لئے انسانوں کا روپ دہارا ہے۔

راجکماری - خاموش ہوگئی - اس طرح آمدورفت کا سلسلہ جاری ہوا - ہر روز کوئی رات کے بارہ بجے آتا اور صبح صبح رخصت ہوتا - یوں دونوں میں محبت بڑھتی گئی بجز سہیلیوں کے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور چار مہینے نہایت لطف و مسرت میں گذر گئے -

(۲)

ایک روز میگھ راجہ نے راجکماری سے کہا کہ چار مہینے سے میں برابر آرہا ہوں - کل میری روانگی کا دن ہے - پھر آٹھ مہینے بعد تمہاری درشن اور سیوا کو آؤں گا - البتہ اس عرصہ میں میری خیریت تمہیں ایک کوے کے ذریعہ معلوم ہوتی رہے گی - جب تمہارے محل کے بالکونی پر کوئی کوا بیٹھے تو اوس کو وہی کھانا دکھانا وہ اتر آئے گا - اوس کے گلے میں تمہیں میری خیریت کی چھٹی بندھی ہوئی ملیگی - اس طرح ہم دونوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی - اگر تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ میں بھیجدوں گا - راجکماری نے افسردہ دلی سے جواب دیا کہ تمہارا انتظار ہی میرے لئے کافی ہے - اگر ایسا ہی تحفہ بھیجنا چاہتے ہو تو ایک ایسی ساڑی جو مٹھی میں آسکے اور ایسی چولی جو ناخن میں سما سکے بھیجدینا

پھر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے - راجکماری اپنی سہیلیوں میں دن گذارنے لگی - روزآنہ بالکونی پہ کوے کا انتظار ہونے لگا - چنانچہ ایک روز کوا بالکونی پر بیٹھا دکھائی دیا - سہیلیوں میں خوشی اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی - فوراً کوے کو بلوایا - اور نہایت شوق واشتیاق سے پارسل کھولا - پلوس سے ایک خطرناک سانپ نکل کر بھاگ گیا - سہیلیاں خوف وہراس کے مارے ڈر گئیں جب حواس بجا ہوئے تو قیاس آرائیاں ہونے لگیں - جتنے منھ اتنی باتیں - کسی نے راجہ کو خود غرض - کسی نے بیوفا - کسی نے جھوٹا ٹھیرایا -

کسی نے سانپ بھیجنے کا یہ مقصد اخذ کیا کہ راجہ اپنے راستہ سے راجکماری کو ہٹانا چاہتا ہے
ان باتوں اور اس عمل سے راجکماری کے دل کو سخت ٹھیس لگی اس نے اپنے دل میں عہد
کر لیا کہ اگر آئندہ راجہ آئے تو وہ کبھی نہ بولے گی۔ واقعہ یہ تھا کہ راجہ کا تعلق ایک بدصورت
کالی گوالن سے تھا۔ اور وہ کوے کے ذریعہ گوالن کو بھی پیام بھجوایا کرتا تھا جس دن راجہ
نے ساڑی چولی بھجوائی تھی کوتے کو راستہ میں گوالن کا مکان ملا وہ سستانے کے لئے کچھ دیر
ٹھیر گیا ادھر گوالن نے ہمیشہ کی طرح کوتے کے گلے میں چٹھی تلاش کی اور جب پارسل ملا اور
اس کو شوق سے کھولا تو تحفہ کے ساتھ ایک چٹھی بھی تھی پڑھ کر بھڑک اٹھی۔ خوب !!
ادھر مجھ سے محبت جتاتا ہے اودھر مُوا دوسروں سے دل لگاتا ہے اچھا ٹھیر تجھے تیرے دغا
بازی کی ایسی سزا دوں کہ تری آشا پر پانی پھر جائے۔ چنانچہ راستہ سے اس پتھر کو ہٹانے
کے لئے ایک سانپ رکھ دیا کہ وہ راجہ کے منظور نظر کو ڈس لے اور اس طرح اوس کا بدلہ ملے۔

(۳)

آٹھ مہینے کے بعد راجہ حسب وعدہ نہایت بے تاب آیا۔ راجکماری نے صورت دیکھتے ہی
منھ پھیر لیا وہ حیران تھا۔ منتیں کیں اور عاجزی۔ خوشامد کیا۔ لاکھ لاکھ طریقہ سے سمجھایا
اور منایا لیکن راجکماری روٹھی ہی رہی۔ راجہ مجبور ہو گیا۔ اب اوس نے ڈرایا یاد
رکھو اگر تم نہ مانو گی تو میں ایسا قحط نازل کروں گا کہ تم اور تمہاری رعایا دانہ دانہ کو محتاج
ہو جائے گی اور میں اس وقت جوار تقسیم کروں گا اس وقت تو تم لینے آؤ گی اور بات
کرو گی۔

راجکماری نے تب بھی کوئی جواب نہیں دیا

راجہ نے کہا کہ اتنی دھوپ پھیلاؤں گا کہ زمین تپنے لگے گی اور میں اس وقت
چھلیاں تقسیم کروں گا۔ تب تم چھلیاں مانگنے آؤ گی۔ اس وقت تو بات کرو گی۔ پھر بھی
بات نہ کی۔

راجہ نے کہا میں پانی اور قحط سالی سے اتنا پریشان کروں گا کہ رعایا قطرے قطرے کو ترس
جائے گی اس وقت تم بھی پانی کی دعا مانگنے کے لئے آؤ گی نا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ راجہ
جل بھن کر چلا گیا۔ دوسرے ہی دن سے قحط اور خشک سالی کے آثار شروع ہو گئے رعایا
پریشان ہو کر راجکماری کے دروازے پر جمع ہونے لگی۔ اس کے والدین نے اپنے پاس جو کچھ تھا

رعایا کو تقسیم کر دیا حتیٰ کہ خود بھی محتاج ہو گئے اور عام رعایا کے ساتھ میگھ راجہ کے دروازے پر جوار مانگنے کے لئے آنے لگے۔ لیکن راجکماری اپنے ہٹ پر قایم رہی۔ دھوپ کی شدت سے سبھوں نے جا جا کر چپلیاں لیں مگر راجکماری پھر بھی نہ گئی۔

مجبور ہو کر رعایا نے پانی کی دعایئں مانگیں مگر پانی نہ پڑا۔ ستارہ شناساؤں نے یہ بتایا کہ جب تک راجکماری دعا نہ مانگے اس وقت تک پانی نہ پڑیگا نہیں اب رعایا نے راجکماری کو گھیر لیا۔ عاجزی مصیبت۔ مجبوری لاچاری کی داستان سنائی اور دعا پر آمادہ کیا۔ سبھوں کی پریشانی سے مجبور ہو کر اوس نے دعا کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ایک پردرد دعا میگھ راگ میں چھیڑا۔

پانی دیو جی نیلی پا کھریا | تم ہمارے راجہ ہم تمہاری پرجا
بادل گھر کر آئیں | گھٹے ساگر بھر جائیں
گور گر وچر کر کھائیں | پانی دیو جی نیلی پا کھریا

اس کے ساتھ ہی گھنگھور گھٹائیں چھائیں اور آناً فاناً میں وہ رت بدلی کہ چھاجوں پانی برسنے لگا۔ ندی نالے ایک ہوگئے۔ رعایا کی جان میں جان آگئی۔ کھیتی باڑی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چونکہ دھان کٹنے اور کھیتوں میں غلہ اگنے کو ابھی عرصہ تھا اس لئے راجہ کی داد و دہش جاری تھی۔ لوگ برابر اوس کے دروازے جاتے اور جوار مانگ لاتے۔ محلہ کی ہمسایہ بڑھیا ایک دن اپنی راجکماری کو تنہا دیکھ کر پوچھا بیٹیا سب کے سب جوار کے لئے گئے ہیں لیکن تم کیوں نہیں گیئں۔

راجکماری۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بھیک کی جوار لوں زندہ ہی کتنا رہنا ہے فاقہ کر کے مر جاؤں پر راجہ کے دروازے پر ہرگز نہ جاؤں۔

بڑھیا۔ تیرا ہٹ اچھا نہیں بٹیا۔ راجہ بڑا دیالو ہے وہ اپنے پرجا پر کس قدر مہربان ہے کہ غریبوں کی اب تک مدد کئے جا رہا ہے۔ حال ہی کی بات دیکھو کہ لوگ پانی پانی کو ترس گئے۔ سبھوں نے دعا مانگی کچھ نہ ہوا لیکن ایک پتری نے ایسی دلسوز گیت میں دعا مانگی کہ راجہ کو بھی رحم آگیا وہ بارش ہوئی کہ میں نے اب تک نہیں دیکھی۔ ایسے راجہ کے پاس جانے میں ہٹ نہ کرنا چاہئے۔ کسی دن جاؤ اور جوار دیکھو جو کچھ ملے لیتی آؤ۔

راجکماری۔ نانی تم نہیں جانتیں کہ یہ راجہ کتنا پاکھنڈی ہے یہ سب قحط۔ دھوپ

جلتے بوجھتے ہم پر لایا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ راجہ ایک عرصہ پہلے میرے پاس چار مہینے تک برابر آتا جاتا رہا ایک دن وہ کہنے لگا کہ میں کل جا رہا ہوں۔ آٹھ مہینہ بعد پھر آؤں گا اور میری خیریت اس عرصہ میں ایک کوے کے ذریعہ معلوم ہوتی رہے گی۔ چنانچہ وہ رخصت ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد کوے کے ذریعہ ساڑی چولی بھیجنے کے بدلے ایک ناگ سانپ بھجوایا تاکہ مجھے ڈس لے اس لئے میں نے اپنے من کو بچن دیا ہے کہ اگر وہ اب کے آئے تو میں کبھی نہ بولوں گی۔ اب اماں تم ہی بتاؤ کہ میں ایسے پاکھنڈی۔ دغاباز۔ بیوفا سے کیوں بات کروں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ راجہ درحقیقت 'میگھ راجہ' ہے اور میرے بات کرنے کے لئے ایسے ایسے ڈھونگ رچا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی بوڑھیا زمین پر لوٹ پوٹ گئی۔ راجکماری حیران تھی کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ دیکھتے دیکھتے بوڑھیا نے ایک حسین نوجوان کا روپ دھار لیا اور راجکماری ڈر کر پیچھے ہٹ گئی کہ یہ تو وہی میگھ راجہ ہے۔ راجہ آگے بڑھ کر راجکماری سے لپٹ گیا اور نہایت منت سماجت سے کہنے لگا کہ تم نے جو کچھ کیا وہ سب درست ہے میں سمجھ گیا کہ یہ کرتوت اوسی گوالن کے ہیں جس نے جل کر مجھے دکھ پہنچانے کو سانپ بھجوایا تھا۔ میری رانی مجھے شما کرو اور میرے من کے مندر کو برباد نہ کرو۔ میری آشا تو تم سے ہے۔ جب اس حقیقت سے پردہ اٹھ گیا تو راجکماری اور میگھ راجہ کی بڑے دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ راجہ راجکماری کو ہمیشہ کے دکھ وغیرہ سے بچانے کے لئے آکاش پر لے اڑا۔ جس کو تم "میگھ رانی" کہتے ہیں وہ حقیقت میں ہمارے دیس کی "راجکماری" ہے۔

عربی شاعری میں رزم نگاری

جناب محمد یحییٰ صاحب صدیقی
ایم - اے - ایچ - سی - ایس

اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ عربی شاعری کا آغاز کب ہوا۔ البتہ جنگ بتوش سے کچھ پہلے یعنی ظہور اسلام سے تقریبًا سوا سو سال قبل ہم عربی شاعری کو ارتقائی مدارج طے کرتے اور عوام میں مقبول ہوتے ہوئے پاتے ہیں۔ اوس کے بعد کلیب کی وفات اور ظہور اسلام کے درمیانی سو سال کے عرصہ میں یہ نہ صرف اپنی انتہائی معراج کو پہنچتی ہے بلکہ اس میں زوال کے آثار بھی شروع ہوجاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ ابتداءً شاعر جو کچھ کہتا تھا وہ اپنے لئے۔ اپنے خاندان کے لئے۔ اپنے قبیلے کے لئے کہتا تھا۔ اسے نہ کسی کا ڈر تھا نہ صلہ کی تمنا۔ اسی لئے اس کے کلام میں سادگی تھی۔ بیباکی تھی۔ حقیقت نگاری تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ شاعر کو ایک مقام حاصل تھا۔ اتنا بلند کہ "جب لوگوں کو معلوم ہوتا کہ فلاں قبیلہ کا ایک فرد شعر کہتا ہے تو قرب وجوار کے دوسرے قبائل جمع ہوکر اس قبیلہ یا خاندان کو مبارک باد دیتے۔ ضیافتیں ہوتیں۔ رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتیں اس لئے کہ شاعر ان کی عزت کا محافظ۔ ان کے نیک نام پر حرف نہ آنے دینے والا ان کے کارناموں کی یاد تازہ اور ان کا نام زندہ رکھنے والا سمجھا جاتا تھا"

شاعر کا یہی بلند مقام شاعری کے زوال کا باعث ہوا، اس لئے کہ رفتہ رفتہ شاعر کو اپنانے کے لئے امراء اور رؤسا نے اس کی سرپرستی شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بے باکی۔ اس کی فطری صاف گوئی۔ اس کی حقیقت نگاری۔ اس کی انا جو اس کے کلام میں جاری وساری رہتی تھی ختم ہوگئی۔ اور اس کی جگہ تصنع۔ خوشامد اور چاپلوسی نے لی۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ظہور اسلام کے بعد فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ایک طرف دوسری زبانوں سے مل کر عربی وہ نہ رہی جو پہلے تھی دوسری طرف عربوں کا طریقہ زندگی بدل گیا۔ اب وہ صحرا کے رہنے والے وحشی نہ تھے بلکہ شہروں کے رہنے والے مہذب اور شائستہ لوگ تھے۔ ان کی زندگی کے نظریے بدل چکے تھے ایسی صورت میں کیسے ممکن تھا کہ وہ شاعری جس نے صحرا میں جنم لیا۔ اور پروان چڑھی۔ شہر کے نامانوس ماحول میں پنپ سکتی بعض لوگوں نے اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کی مگر چونکہ ان کو صحرائی زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا

اس لئے انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر بنی امیہ کے خاندان کے خاتمہ کے ساتھ صحرائی شاعری جو حقیقی عربی شاعری تھی ختم ہو گئی۔

عجیب بات یہ ہے کہ گو اس دور میں جنگ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی شخصی ہو یا قبائلی عربوں کا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ اور ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ ایک تو قوم جنگجو اس پر جذبہ خودداری اس قدر شدید کہ ذراسی بات پر مشتعل ہو جائے اور اس اشتعال کو صرف انتقام ہی فرو کر سکتا تھا۔ انتقام بھی کیسا جو فرد سے گھرانے۔ گھرانے سے خاندان اور خاندان سے سارے قبیلہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ پھر جو جنگ چھڑتی تھی دنوں اور مہینوں نہیں بلکہ برسوں چلتی تھی۔ مرنے والے اپنی اولاد کو ورثہ میں چاہے کچھ دیں یا نہ دیں جنگ ضرور دے جاتے تھے۔ اور ان کا فرض ہوتا تھا کہ اس جنگ کو جاری رکھیں شعرا نے ان جنگوں کا ذکر بھی کیا ہے اپنے قبیلہ کی فتوحات کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنے حلیفوں کا بڑے خاص انداز میں ذکر کیا ہے۔ مگر ضمناً رزمیہ شاعری کو کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں تھی۔ شاعری کی صرف دو ہی قسمیں تھیں یعنی قصائد اور قطعات قصائد عام طور پر تغزل سے شروع ہوتے تھے۔ جس کو اصطلاح میں تشبیب کہتے ہیں تشبیب میں شاعر ان مقامات کا جہاں وہ اپنی معشوقہ سے ملا۔ اپنی معشوقہ کے حسن وجمال وصال وفراق کا اور لذتوں اور مصیبتوں کا ذکر کرتا ہے۔ پھر شاعر گریز کرتا ہے۔ گریز میں وہ اپنی سواری وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد اصل موضوع شروع ہوتا ہے۔ جس میں یا تو اپنی تعریف ہوتی ہے۔ یا اپنے قبیلہ کی یا کسی دوسرے کی۔ یا جنگ کے کچھ مناظر ہوتے ہیں۔ ہجو ہوتی ہے۔ یا التجا ہوتی ہے یا ہدایت ہوتی ہے۔ آخری خاتمہ کے چند شعر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سات قصائد میں جو ہم تک پہنچے ہیں اور جن کو معلقات کہا جاتا ہے۔ صرف دو قصیدے ایسے جو عمرو بن کلثوم اور عنترۃ العبسی کے کہے ہوئے ہیں۔ ہم کو جنگ کا ذکر ملتا ہے۔ عمرو بن کلثوم کہتا ہے۔

جب ہم لوگوں کے خلاف جنگ کی چکی چلانا شروع کرتے ہیں تو وہ یوں گرنا شروع ہوتے ہیں جیسے چکی میں پس کر غلہ آٹا ہو جاتا ہے۔"

"اے عمرو سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ہتھیاروں نے بہت سے ایسے ہاتھوں کو تھکا دیا ہے جنھوں نے اس کی کوشش کی کہ انہیں نرم کر دیں۔ جب ہتھوڑے اس سے

ٹکرائے تو نیزہ سخت ہوگیا - اور ہتھوڑے پکڑنے والے کی طرف لوٹ گئے اور بنانے والے کی گردن اور پیشانی زخمی ہوگئی"

ان اشعار میں جس کا مطلب ابھی بیان کیا گیا ہے - نیزہ سے مراد قبیلہ کی جرات و بہادری ہے - اسی وجہ سے قصاید رزمیہ میں نہیں کہے جاسکتے - بیانیہ بھی نہیں کہہ سکتے ڈرامائی بھی نہیں ہیں -

یہ صرف شاعر کی زندگی - اس کے ماحول - اس کے گھوڑے اور اونٹ جنگل کے وحشی جانوروں - میدانوں اور سبزہ زاروں کی تصویریں ہیں جو شاعر نے اپنے ذاتی علم اور تجربہ کے بعد انتہائی چابکدستی کے ساتھ کھینچی ہیں - اور ان کو ایک دوسرے کیساتھ اس طرح ملادیا ہے کہ ان سب پر شاعر کی انا - اس کی محبت اور نفرت اس کی جرات اور بیباکی حاوی ہے۔ ان تصویروں سے نہ صرف شاعر کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے بلکہ ان میں عربوں کی زندگی کا پہلو بھی ہم کو دکھائی دیتا ہے - ان کا تمدن - ومعاشرت ان کے اخلاق وعادات ان کی اچھائیاں اور برائیاں - ان کے میلانات ورجحانات ان کے مشاغل اور دلچسپیاں ان کی لڑائیوں کا حال - لڑائیاں جو جذبۂ انتقام کو تسکین دینے کے لئے لڑی گئیں - ان سب کا اندازہ ہمیں ان قصاید کو پڑھکر ہو جاتا ہے - اسی لئے کہا جاتا ہے کہ " الشعر دیوان العرب " اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے -

قطعات میں عام طور پر لڑائیوں کا ذکر ہے - مگر ساتھ ہی ساتھ اخلاقیات - ہجو - سخاوت - ومروت وغیرہ بھی ملتے ہیں - ان قطعات کے ایک مجموعہ کا نام حماسہ ہے - جو دس ابواب پر مشتمل ہے - پہلا باب حماسہ کا ہے - حماسہ کے معنی ہیں طاقت جرات - استقلال - سختی وغیرہ بالفاظ دیگر وہ تمام صفات جو عربوں کے نقطہ نظر سے ایک بہادر انسان میں ہونے چاہئیں - اور اسی باب میں رزمیہ اشعار ملتے ہیں - یہ باب کتاب کے تقریباً نصف حصہ پر مشتمل ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ سارے کے سارے پیش کئے جا سکیں - چند اشعار کا مطلب نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے - مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اصل کی روانی جوش وخروش اور انداز بیان پیش کرنے سے میں قاصر رہا ہوں - لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربوں کی رزمیہ شاعری کس قسم کی تھی - سالی بن شبیان الننند اپنے ایک خط میں جو اس موقع پر لکھا گیا تھا جب کہ اس کا دوست حارث اپنے بیٹے بجیر کے قتل

قتل ہو جانے کے بعد اس جنگ میں جو بنی تعلب اور بنو زحل میں عرصہ سے چل رہی تھی اور جس سے حارث ایک زمانہ تک بے تعلق رہا تھا شریک ہوا۔

"صبح کے وقت ہم ایک غصہ ور شیر کی طرح اپنے دشمن پر جھپٹے اور ضرب پر ضرب پہنچانے شروع کئے۔ اس طرح ہم نے دشمن کو اور زیادہ ذلیل کر دیا اور ان کا غرور خاک میں ملا دیا"

معفر بن علیہ نے جو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ایک پڑوسی قبیلہ کا گلا چرانے گیا تھا۔ اور جس پر اس قبیلہ کے افراد نے حملہ کر دیا۔ اس پر فتحیاب ہونے کے بعد بسلامتی گھر پہنچنے پر کہتا ہے۔

جب سہیل کے دامن میں ہمیں دشمنوں نے گھیر لیا اور ہمیں دبانا شروع کیا انھوں نے کہا۔ تمہارے لئے دو ہی راہیں ہیں کوئی ایک پسند کر لو۔ یا تو بھالوں سے چھد جاؤ یا قیدی بن جاؤ۔ ہم نے کہا۔ لڑائی کے بعد یہ حشر تمہارا ہوگا کہ لوگ زمین پر پڑے ہوں گے اور پھر نہ اٹھ سکیں گے۔ لیکن ہمیں بھی معلوم کہ اگر ہم لوٹ کے حملوں سے ڈر جائیں تو کتنی زندگی باقی رہیگی۔ انجام اتنا دھندلا ہے کہ دکھائی نہیں دیتا۔ ہم جنگ میں گھس پڑے۔ اپنے لئے جگہ بنالی۔ ہمارے سیدھے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں۔ میری تلوار کی دھار ان کا حصہ بن گئی۔ اور جہاں میرا ہاتھ پڑا وہ میرا حصہ ہو گیا"

تابط شرا کے ماموں کو بدمل نے مار ڈالا اور انتقام کا فرض تابط شرا پر عاید ہوا اس موقع پر تابط شرا نے جو قطعہ کہا ہے اس کے چند اشعار کا ترجمہ ہے۔

بہت سے سپاہی دن بھر سفر کرتے رہے۔ رات کو بھی انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور صبح کے قریب ٹھیرے۔ ان میں سے ہر ایک جنگ کے لئے تیار تھا۔ ہر ایک کے پاس تیز تلوار تھی جو جب میان سے نکالی جاتی تھی بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ ہم نے دشمن پر اچانک حملہ کر دیا جب کہ وہ سو رہے تھے اور وہ منتشر ہو گئے۔ ہم نے ان سے انتقام لیا اور دو گھرانوں میں سے بمشکل چند افراد اپنی جان بچا سکے"

چند متفرق اشعار کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

وقت نے جو مواقع دئے تھے ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے میں نے گھوڑے کو تیار کیا۔ گھوڑا جو تیز رفتار اور مضبوط ہے تلوار سنبھالی جو خود اور زرہ کو دو ٹکڑے کر دیتی ہے۔ نیزہ لیا جو جب میں اسے نشانہ لینے کے لئے تانتا ہوں تو لچکنے لگتا ہے۔

ایک غصہ میں بھرے ہوئے خطرناک دشمن سے تو کیا توقع کر سکتا ہے کیا تو ادھر ادُھر ہر طرف اپنے لوگوں کو خاک و خون میں لتھڑا ہوا نہیں دیکھتا۔ ان ہاتھوں نے اور اس نیزے نے ان کا یہ حشر کیا ہے۔

کیا تو نے مجھے تلوار اور نیزہ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے اور اپنی تلوار کو انسان کے خون سے رنگین ہوتے نہیں دیکھا

میرے نیچے ان پر حملہ کر جو حملہ کرتا ہے۔ وہی ہماری بہترین حفاظت کرتا ہے اور دشمن کو ہماری طرف سے مسلسل ضربات کا تحفہ دیدے۔

غزل

منغنی تبسّم

حسنِ معصوم ہے کیا؟ دیدۂ حیراں کیوں ہے؟ | سب سہی دل میں مگر درد فراواں کیوں ہے؟

وہ نگاہیں تو پشیمان ہوئی جاتی تھیں! | پھر مرے دوش پہ یہ بارِ صد احساں کیوں ہے؟

ہاں وہ ماضی، مرا ماضی، میرا اندھا ماضی | اب مرے حالِ دلِ زار پہ خنداں کیوں ہے؟

کیا کسی شاعرِ مینوش سے ناتا ٹوٹا۔؟ | اک اداسی سی سرِ محفلِ رنداں کیوں ہے؟

میری تقدیر ہی پھوٹی، مری قسمت ہی خراب! | دل میں پھر آس کی اک شمع فروزاں کیوں ہے؟

وہ تبسم! ہاں وہی شاعرِ غمگین مزاج
آج احساس کی کلفت سے گریزاں کیوں ہے؟

"ہمارا بادشاہ"

جناب حکیم حلمیؔ آفندی

ماہ تاباں مہر رخشاں ہی ہمارا بادشاہ
بادشاہوں میں نمایاں ہی ہمارا بادشاہ
پارسی - انگریز - ہندو - سکھ مسلماں اور سب
کہہ رہے ہیں شاہ عثماں ہی ہمارا بادشاہ

"ایک ہے"

باغباں اپنا کروڑوں میں نمایاں ایک ہی
سیکڑوں گل ہیں مگر حلمیؔ گلستاں ایک ہی
اکبری دربار ہی دربار سلطان العلوم
شاہ کی نظروں میں ہندو اور مسلماں ایک ہے

"رعایا حضور کی"

ہو خضر کی سی عمر خدایا حضور کی
تعریف میں بیاں کروں کیا حضور کی
دل سے عزیز چیز سے بڑھکر خدا گواہ
پیاری حضور کو ہے رعایا حضور کی

"آباد باد"

شاد باد اشاہ عثماں شاد باد
از غم و رنج و الم آزاد باد
از وجود پاک تو شاہِ دکن
حیدرآباد دکن آباد باد

خضر کی سی عمر ہو یا رب ہمارے شاہ کی
واسطہ دیتا ہوں میں خون شہ مظلوم کا
میر عثمان علی خاں کے ہیں کل چودہ حروف
خسرو ذیجاہ بھی ہے چاردہ معصوم کا

"اقتدار"

تاج اپنا ہے تاجدار اپنا
شہر اپنا ہے شہریار اپنا
آصفی تیغ کی قسم حلمیؔ
ہاتھ اپنے ہے اقتدار اپنا

غزل

جناب مسلم

چارۂ دردِ جگرم آرزوست | چارہ گرِ سیم تنم آرزوست

جور و ستم ہا کہ تو کردی بمن! | باز ہماں جور و ستم آرزوست

رندی و بدمستیٔ عہدِ شباب | باز بہ پیرانہ سرم آرزوست

وصلِ بتاں گرچہ گناہے بود | بارِ خدا ایں گنہم آرزوست

پارہ شدہ دامنِ صبر و حیا | سیم برِ پردہ درم آرزوست

سر بسرِ دار زدن مدعاست | دیدہ نہادن بقدم آرزوست

رایتِ اقلیمِ سلیماں کجاست | ایکہ ترا خیل و حشم آرزوست

رو بخرابات ز صدق و صفا | ہاں اگرت مجلسِ جم آرزوست

ہم نفسا خواہشِ مسلم مپرس

کعبۂ جاں کوئے صنم آرزوست

خودکشی

(افسانہ) جناب رشید قریشی ایم۔ اے

"اس افسانہ میں کوئی بات مبہم یا ناقابل فہم نظر آئے تو اُسے سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ میرا مطلب قطعی وہ نہ ہوگا جو سمجھ میں آئے گا۔"

اخبار کے دفتر میں رات کے گیارہ بجے تک کام کرنے کے بعد ایاز اپنے گھر کے راستہ پر چل پڑا۔ گرمیوں کی ٹھنڈی راتیں تھیں۔ فٹ پاتھ پر فقیر اور دکانوں کی سیڑھیوں پر بےگھر غریب مزدور سو رہے تھے۔ چمن کی باڑھ کے بازو سے چلتے ہوئے، ٹھنڈی اور خوشبودار ہوا کے جھونکوں نے ایاز کے بجھے ہوئے دل کو اکسا دیا۔ اُسے اپنی موجودہ زندگی سے نفرت سی ہونے لگی۔ شام کے پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک۔ کام۔ کام۔ کام۔ اور اجرت صرف (۳۰) تیس روپیے۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔ اُسے اس کتے کی حالت پر رشک ہونے لگا جو چمن کے گیٹ کے آگے اگلے پنجوں پر سر رکھے سو رہا تھا۔ ایاز کے قدموں کی آہٹ پاکر کتے نے سر اٹھایا اور بھونکنے لگا۔ ایاز نے اس سے پہلے کئی دفعہ اس کتے کو دھتکارا تھا لیکن آج وہ مسکین بلّی کی طرح سر جھکائے چپ چاپ آگے بڑھتا رہا۔ ہرے بنگلہ کے قریب اسے گلی میں مڑنا پڑتا تھا۔ ایسا ہی ایک ہرا بنگلہ اس کے خیالوں کی دنیا میں آباد تھا۔ ایک تنگ کمرہ میں رہتے ہوئے بھی وہ سوتے جاگتے اپنے اس ہرے بنگلہ میں، بڑے ٹھاٹ کی زندگی گذارا کرتا تھا۔ موڑ کے قریب پہنچ کر جب اس نے اوپری منزل کے دریچے پر نظر ڈالی ایسے خلاف معمول کچھ روشنی نظر آئی۔ سبز پردہ میں سے سرخ روشنی، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح برس رہی تھی۔ وہ دریچے کے نیچے کھڑا ہو گیا اور گردن اونچی کئے دیکھتا رہا۔ چوڑا دالان، جنگلیں، چمن! اور اس کی سوکھی آنتوں میں اینٹھن شروع ہو گئی۔ "قصہ چہار درویش" میں اس نے ایک شہزادی کو گھائل کرنے کے بعد صندوق میں بند کر کے، کھڑکی سے نیچے پھینکنے کا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے یقین سا ہونے لگا کہ وہ واقعہ سچا تھا۔ اتنے میں کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کمرہ کے اندر دوڑ بھاگ مچی ہو۔ اِدھر اُدھر کی چیزیں گر رہی ہوں۔ ایاز کا دل ہلنے لگا۔

اس کے پاس اگر اڑنے والا گھوڑا ہوتا۔ وہ اسی وقت کھڑکی کے راستہ اندر کود پڑتا اور اس جھنکار والی شہزادی کو مصیبت سے چھٹکارا دلاتا۔ لیکن وہ تو چلنے میں بھی لڑکھڑانے لگا تھا، بھوک، تھکن اور چوڑیوں کی جھنکار، ایاز کو اپنی بے بسی پر اتنا طیش آیا کہ وہ دانت پیس پیس کر دعائیں مانگنے لگا کہ آج اگر اس حسین اور نازک جسم کا ایک ایک حصہ کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک دیا جاتا رہے تو بھی وہ چپ رہے گا۔ پتھر کی طرح۔ بیل کی طرح چیخ کی طرح چبھتی ہوئی ایک آواز اُسے سنائی دی۔ اب جو آگے بڑھنے لگا۔ تو دیکھ لیجئے اس گلدان کو آپ کے سر پر دے ماروں گی۔ "ہاں" ایاز کے تن بدن میں آگ بھڑکنے لگی۔ کاش گلدان کی جگہ ایک تیز دودھاری تلوار رکھی ہوتی۔

گلدان سے کیا ہوگا! وہ تشویش ناک اضطراب کے عالم میں دریچہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ گلدان کو بھی اگر پوری طاقت سے استعمال کیا جائے تو حملہ آور کچھ دیر کے لئے بیہوش تو ہو جا سکتا ہے!! لیکن یکایک کمرہ کی روشنی گل ہوگئی۔ ایاز کی آنکھیں جھپکنے لگیں اور سرگوشیوں کی آواز نے اس کے دل کو پرزہ پرزہ کر دیا۔ اس نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک سریلے قہقہے نے اس کے کھولتے ہوئے دماغ کو آگ دکھادی وہ دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا اپنے کمرہ میں جا پہنچا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی وحشت کم ہوئی۔ دستی نے پلنگ کے نیچے کھانے کے برتن دیکھے وہ خالی تھے۔ بیوہ پڑوسن شاید آج پھر مالک مکان کے ہاں پُرسہ دینے کے لئے چلی گئی تھی۔ مالک مکان کی بیوی کو انتقال کئے چھ مہینے سے زاید ہو گئے لیکن بیوہ پڑوسن نہ کمرہ کا کرایہ دیتی ہے نہ پرسہ دینے سے باز آتی ہے۔ خدا مرحوم کو دوبارہ زندگی عطا فرمائے۔

ایاز نے خالی برتنوں کو ٹھوکر لگائی اور دھم سے اپنے بستر پر گر گیا۔ اندھیرے غار کی طرح بھوک اپنا منھ کھولے اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس غار کے اندر سینکڑوں حسین لڑکیاں چھم چھم ناچ رہی تھیں۔ لیکن موڑ کے ہرے بنگلہ میں روشنی گل ہوگئی تھی۔ اس کا ہرا بنگلہ بھی منہدم ہو چکا تھا۔ کھنڈر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کی پری آنکھوں کے بند ہونے کے باوجود اڑ گئی۔ وہ سوچنے لگا —— گلدان! قہقہہ!! —— پھر! ہی۔ ہی۔ ہی۔ ایاز نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور اُٹھ کر قندیل سلگایا۔ قندیل کی پھیکی روشنی میں اس نے دیکھا دیوار سے لگی ہوئی جاپانی عورت کی تصویر ہنس رہی تھی۔

پھولدار فراک سے سرخ روشنی پھوٹ رہی ہے۔ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح۔ اور وہ کہہ رہی ہے "آگے بڑھو گے تو —" ایاز نے قندیل کی روشنی تیز کرتے ہوئے کمرہ کا دروانہ بند کر دیا اور جاپانی عورت کی تصویر کو دیوار سے اتار لیا۔

جب وہ اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تو اس کا جسم ایک نڈھال غنودگی کے جھولے میں بھڑکی ہوئی آگ پر ٹھنڈی پھواریں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کمرہ کی دیواریں اس کی طرف سرکی جا رہی ہیں — دھیرے دھیرے اسے خبر نہ ہوئی کب ان دیواروں نے اسے جکڑ ڈالا۔ پیس ڈالا !! وہ سو رہا تھا۔ مردے جس طرح سوتے ہیں۔

غزل

جناب عرشی ابوہو پالی

پھر ایکبار وہی شوخیِ تبسم ناز
ادائے برہمی دوست تیری عمر دراز

نہ غمگسار ہے اپنا نہ کوئی چارہ ساز
ہر ایک سمت سے آتی ہے انکی ہی آواز

کبھی نوازش بیجا، کبھی تغافل ناز
سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسم حسن مجاز

یہ کس کی یاد نے چھیڑا ہے میرے دل کا ساز
تمام عالم امکاں ہے گوش بر آواز

مریضِ غم کی ترے ہاتھ ہے الٰہی شرم
ابھی سے دل کا یہ عالم ہے اور رات دراز

نگاہ پھیرے ہوئے ان کو ہو گئی مدت
شکست دل کی مگر اب تک آتی ہے آواز

یہ آنکھ آج جو اک اشک کو ترستی ہے
اسی میں تھے کبھی پنہاں فسانہ ہائے راز

مرے غرور محبت کی خیر ہو عرشی
جھکی جھکی نظر آتی ہے پھر نگاہ ناز

غزل

جناب حافظ غلام محمد حسین صاحب حافظ ناظم عدالت نظام آباد

کچھ ایسی دریچ سے ظہور جمال یار ہوا　　نظر ملی بھی نہیں تھی کہ دل شکار ہوا

گرائی اوس نے ہی گھبرا کے اپنے رخ پہ نقاب　　نظر سے میرے تقابل ہزار بار ہوا

نہ کچھ بہار سے مطلب نہ کچھ خزاں سے غرض　　خزاں رسیدہ کو کیا۔ موسم بہار ہوا

گنہگاروں کے زمرہ میں دیکھکر مجھ کو　　بگڑ کر بولے کہ اس کا بھی اب شمار ہوا

اس انجمن میں حواسوں کے پڑ گئے لالے　　جفا و جور کا شکوہ تو درکنار ہوا

ہماری کم نگہی تھی اوسے نہ دیکھ سکے　　وہ پردہ پردہ سے ہرچند آشکار ہوا

گلہ میں کس سے کروں اپنی تیرہ بختی کا　　غم والم میں نہ سایہ بھی غمگسار ہوا

غرض کے ایک ہی حالت پہ زندگی گذری　　نہ میں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار ہوا

یہ رنگ حافظ شیراز فکر کرنے سے

جہاں میں حضرت حافظ کا اعتبار ہوا

"ادب برائے تجارت"

جناب احسن علی مرزا صاحب

سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس میں فحش نگاری پر بحث کرتے ہوئے عصمت اور منٹو کو ترقی پسند مصنفین کی صف سے نکال باہر کیا تھا اور اس کے بعد سے ابتک ایسے تمام نقاد اور ادیب جو فی الحقیقت، ادب کے نئے رجحانات سے واقف، اور ایک ایسے صالح ادب کی تخلیق کے جویا ہیں جو ہماری بدلتی ہوئی ضرورتوں اور تہذیبی قدروں کا ساتھ دے سکے، جو ہماری معاشرتی، معاشی اور سیاسی بدحالی پر ایک کاری ضرب لگائے، جو عوام اور ان کے تقاضوں کی ترجمانی کرسکے۔ غالباً، اس امر پر متفق نہیں، کہ نت نئے لکھنے والے، آج اپنے افکار و اذہان سے جو گندے نقوش منظر عام پر لارہے ہیں اس کی "سٹرانڈ" ہماری ادبی روایتوں کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ یہ نہ تو ترقی پسند ادب ہے اور نہ "ادب برائے ادب" کا ترجمان۔

"فحاشی اور عریاں نگاری" کا یہ اسلوب، ادب کی دیگر اصناف میں اس کثرت سے نظر نہیں آتا، جتنا افسانوں میں اختتام مارچ ۱۹۴۷ء کے ایک نو مولود ماہنامہ میں چند افسانہ نویسوں کی تراوش فکر قابل ملاحظہ ہیں جن کا اقتباس بھی ہمارے دانست میں فحاشی کو اور نمایاں کرتا ہے۔ اور ایسے افسانوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ رومان پسندی ہے۔

مذکورہ افسانوں کے پڑھنے والے بتائیں کہ یہ گراں قدر "ادبیات عالیہ" ملک کیلئے اور ہمارے ادب کے لئے کس قدر فائدہ مند ہیں۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے سماج کا ہر شعبہ، فوری تغیر کا محتاج ہے اور جنسی مزاج ہماری سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے جارہا ہے، کیا میں ان محترم افسانہ نگاروں سے پوچھ سکتا ہوں کہ انھوں نے یہ سب کچھ لکھکر، کونسی ادبی خدمت انجام دی؟ اور کیا فحاشی کی ان منھ بولتی تصویروں نے پڑھنے والوں کے جنسی ہیجان میں یک گونہ اضافہ نہیں ہوا؟ رستے ہوئے پھوڑوں کے پیپ اور لہو کو، آپ کانچ کی انتہائی خوبصورت گلاسوں میں سر بازار فروخت کر رہے ہیں۔ بے روک ٹوک۔ اور بغیر جھجکے ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ، بھوکے، ننگے، بلبلاتے اور تڑپتے ہوئے عوام، موقتی آسودگی کے لئے ان رنگین جاموں کی دل آویزی کو

پیش نظر رکھتے ہوئے، آپ کا سارے کا سارا مال خرید لیں، لیکن کیا کسی طرح بھی آپ کی یہ گندم نمائی اور جو فروشی، قابل درگذر کہی جا سکتی ہے جس کے نتیجہ میں آپ کے خریداروں میں سے ہر ایک، اپنے دل، جگر اور دماغ پر لاتعداد زخموں کو ابھرتا ہوا محسوس کرے؟

میرا خیال ہے کہ ہمارے ان لکھنے والوں نے، گھٹیا قسم کے فرانسیسی اور انگریزی افسانوں کے "ناکام سرقے" کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کی انگریزی دانی بھی ایک بحث طلب سوال ہے، لہذا ان کی اس تمام ہا وہو کو "ان کی مجرمانہ ذہنیت" کا ایک پرتو ہی کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی سماج میں عورت کا تصور، نفسی خواہشوں کی آسودگی سے کچھ اس طرح ملوث کر دیا گیا ہے کہ ہم اس کی صحیح عظمت، اور اس کی ٹھیک معاشرتی حیثیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جو آنکھیں اسے بند حمام میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھتی ہیں، کاش وہ اپنے ہی نسل کو پروان چڑھاتے، ماں باپ، بھائی بہن، شوہر اور گھر کے ہر شخص کی خدمت کرتے، میدان جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول، انقلابات میں مردوں کے دوش بدوش، گولی کھانے کے لئے سینہ تانے ہوئے بھی دیکھ سکتیں ——— !!

تب ہی اُن کے اعصاب، اس جنسی کشمکش کے کرب سے نجات پا سکتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے پورے معاشرہ کی تار و پود کچھ اس طرح بکھر گئی ہے کہ عصمتوں کا سر بازار نیلام، بالاخانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ وغیرہ وغیرہ، کوئی عجیب اور غیر معمولی واقعہ نہیں معلوم ہوتا ——— تاہم ہمیں اپنی صلاحیتوں اور اپنے قلم سے ان اداروں کی مزید ہمت افزائی کا حق تو نہیں پہنچتا! ہمیں حقیقتوں پر بےلاگ تنقید و تبصرہ کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ ہم ان افعال و اعمال سے نفرت کے جذبہ کو تیز تر کر دیں۔ یہ سب کچھ، جو ہوتا چلا آ رہا ہے، اسے یک لخت بند ہو جانا چاہئے اور یہ صرف اسی صورت جب کہ ہم اس کے اصلی اسباب و علل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور پھر اپنی مجوزہ راہ پر بےخوف و خطر گامزن ہو جائیں۔ ہمارے ہی دور کے بہت سے ادیبوں نے اپنے ایقانات کی سلامتی و بقاء کے لئے دنیا کے ہر عیش و آرام کو اپنے آپ پر حرام گردانا۔ جیلوں اور بندی خانوں کی صعوبتیں جھیلیں، اور پھانسی کے تختہ پر بھی، امن و اطمینان سے، آزادی، حریت اور مساوات کے گیت گائے۔ بیشک ان کے لئے، ہم اپنے سر جھکا لیتے ہیں۔ لیکن ان قابل احترام اور طاقتور

ہستیوں کا نام لیکر، تہذیب وتمدن میں گندگی پھیلانا، ادب کے نئے میلانات پر کیچڑ اچھالنا،
سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے۔

ہمارے ان تمام کرمفرماؤں نے جو اب تک نئے ادب کی آڑ میں، اپنے گندہ اور نفسی
جذبات کی آسودگی کا سامان بہم پہنچاتے رہے۔ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، کہ ان کی ذہنی
تراوشیں ردّی دان کی زینت بن سکتی ہیں اور بس!! اگر فی الواقعی وہ نئے ادب سے
خلوص رکھتے ہیں، جو انھیں اپنی راہ بدلنی ہوگی ——— اردو ادب، اپنی کم عمری،
اور اپنے پرستاروں کی غفلت، بہت ہی بے بضاعت ہے۔ سائنس، فلسفہ، نفسیات،
معاشیات، اور دوسرے علوم کی بہت سی کتابیں، ہماری زبان کے حیطہ اثر میں شامل نہ ہوسکیں،
اور یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تخلیقات، دوسری زبانوں کے مقابلہ میں، فخر سے پیش نہیں
کرسکتے اور نہ ہی اس (۸۰) فیصد طبقہ کو جدید نظریات حیات سے بہرہ مند کرسکتے ہیں جو تعلیم
کی ہنگامی اور اپنی معاشی پراگندگی کے سبب، انگریزی یا دوسری غیر ملکی زبانوں سے نابلد ہے۔

معترضین میں بہت سے ایسے حضرات ملیں گے، جو میری اس تحریر کے جواب میں کالی
مذاق کا رونا روکر چپ ہورہیں گے، ان ہی محترموں میں غالباً، اُس رسالہ کے مدیر صاحب
بھی شریک ہوں گے، جس میں وہ افسانے شائع ہوئے ہیں، جن کے چیدہ چیدہ اقتباسات
بھی پیش کرنے میں مجھے تامل رہا ہے۔

ان افسانوں کے متعلق قابل قدر مدیر کی رائے بھی سنتے چلئے:۔

"..... رضوی کی "شرارت" ناقابل فراموش ہے۔ ایک ایک سطر پڑھنے کے
لایق ہے اور ان کی جذبات نگاری پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے"

درست صد فیصد درست ——— جذبات نگاری کی انتہا، جانے کس دن
پوری قوم کو شفاخانہ سعادت منزل کے در پر پہنچا دے۔ لیکن اس سے مدیر معزز کو کیا واسطہ
ان کا پرچہ تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔

آخر میں، میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ملک کے تمام لکھنے والوں کو، ایسے بیہودہ نویسوں
کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانا چاہئے تاکہ ہماری تہذیب اور ہمارا ادب، ان نفسی
اور بیہودہ الجھنوں کی دستبرد سے محفوظ رہ سکے۔

یاسمین (عثمانیہ)

فطرت نسوانی

(جناب م - ز صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد)

درحقیقت یہ مضمون سید امتیاز علی صاحب کا ہے کتابت
کی غلطی سے گزشتہ مہینہ (م - ز) لکھا گیا تھا -

آج تک تو عورت کا شمار کم از کم انسانی زمرے میں تو تھا - لیکن اب م - ز صاحب کے مضمون سے پتہ چلا کہ جس طرح کہ جانداروں میں جنس حقیقی اور غیر حقیقی کی ترکیبیں ہوتی ہیں عورتوں کی بھی اسی طرح دو قسمیں ہوتی ہیں - ہوں گی صاحب! عورتیں جو ٹھیریں - فاتر العقل - ناقص العقل - کمزور - جاہل اور نہ جانے کیا کیا -

م - ز صاحب نے عورت کا جو کردار پیش کیا ہے وہ حقیقی عورت کا ہے اور میں جو کردار پیش کرنیوالی ہوں وہ غیر حقیقی عورت کا ہوگا - سمجھ گئے نا آپ ؟

ہاں تو سنئے "غیر حقیقی عورت" وہ ہوتی ہے - جس کا ہر انداز مرد سے مختلف بلکہ متضاد ہوتا ہے جو اپنی حماقتوں سے آئے دن اپنے ہی پیر پر آپ کلہاڑی مارتی رہتی ہے لاولد ہونے کی صورت میں شوہر کی دوسری شادی خود ہی کروا کے اپنی خانہ بربادی کرتی ہے - لیکن شوہر کے جھوٹ موٹ کے وعدوں پر اعتبار کرکے اپنا سرمایہ حیات تک لٹا بیٹھی ہے تو کبھی کہیں شوہر کی ڈھونگ آمیز بیماری سے پریشان ہوکر بلاپس وپیش وہ مہر جس کے لئے مدتوں تکرار ہوتی رہی تھی - آن واحد میں معاف کرکے اپنی نادانی کا ثبوت دیتی ہے -

ہر روپ میں آپ دیکھیں گے کہ عورت کبھی اپنی حماقتوں سے باز نہیں آتی - بہن کے روپ میں وہ کبھی بھائی کے لئے اپنا ترکہ چھوڑنے کے لئے تیار نظر آئیگی تو بیٹی کے روپ میں باپ کی دوسری شادی کرنے پر آمادہ - گو ماں کی موت کے آنسو ابھی خشک نہ ہوئے ہوں - اسے تو ہر حال میں ہر حیثیت میں قربانیاں --- ارے توبہ - حماقتیں کرنا ہی آتا ہے - جی ہاں --- یہ سب حماقتیں نہیں تو اور کیا ہیں - کہاں کا ایثار - اور کیسی قربانی - اس ترقی یافتہ زمانہ میں ان الفاظ کو زبان پر بھی نہ لائیے - ورنہ آپ کی "مہذب" اور "خود غرض" دنیا اس کو آپ کی ناقص العقلی اور حماقتوں ہی سے تعبیر کریگی - سمجھیں آپ ؟

نہ جانے گراہم کس رو میں کہہ گیا - عورت مرد کی فطرت سے زیادہ بلند ہے - عورت کائنات کی ایک مستقل حقیقت ہے -

م - ز صاحب کو اس کا یقین کامل ہے کہ " ماضی و مستقبل عورت کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے - گذری ہوئی محبت کو وہ محض ایک افسانہ سمجھ کر بہ آسانی بھول سکتی ہے - لیکن مرد ہمیشہ کو اپنے ماضی کو ساتھ رکھتا ہے - اور وہ کسی سے دوبارہ محبت نہیں کرتا

جی ہاں ! بالکل صحیح ؛ بجا فرماتے ہیں آپ ! اس کا کھلا اور بین ثبوت یہی ہے کہ بیوی کے انتقال کے فوراً ہی بعد شوہر عقد ثانی کر لیتا ہے اور بیوی غریب خواہ پندرہ برس کی لڑکی ہی کیوں نہ ہو ساری عمر یونہی مرحوم شوہر کی یاد میں گذار دیتی ہے - بعض دفعہ تو والدین عقد ثانی کے لئے مجبور کرتے کرتے عاجز آجاتے ہیں -

جی ہاں ! یہ وہی عورت ہے جس کی سرشت میں " محبت کو محض ایک افسانہ سمجھ کر بھول جانا " داخل ہے -

---

ہاں یہ اس کمزور سرشت کا نتیجہ ہے جو مرد کی بڑی سے بڑی غلطیوں کو معاف کر دیتی ہے زندگی بھر جفائیں سہتی رہتی ہے - لیکن کبھی کسی کے آگے حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی . . . . یہ سب عورت کی کمزوریاں اور حماقتیں نہیں تو اور کیا ہیں . . . . . مرد . . . . صاحب فہم - ہوشیار مرد کبھی ایسی بھول نہیں کرتا - وہ اپنے ارادے ، اپنے مقاصد میں حائل ہونے والی عورت کو کچل کر رکھ دیتا ہے - عورت کی ایک معمولی سی لغزش کو درگذر کرنے کے لئے وہ حشر تک تیار ہیں -

کیوں نہ ہو آخر عقلمند پڑھا لکھا مرد جو ٹھہرا -

م - ز صاحب کا ایقان ہے کہ عورت میں نہ کشش روحانی ہے اور نہ سحر جسمانی "

نہ جانے وہ کونسا منتر تھا جو نپولین جیسے فاتح اور مغرور شہنشاہ کو جوزیفائین کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا - جانے وہ کونسا سحر تھا جو سیزر کو کلیوپٹرا کے عشق میں مبتلا کر دیا - نہ معلوم وہ کونسی طلسمی قوت تھی جو ایڈورڈ ہشتم تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور ہو گئے . . . . شاید کوئی طلسمی قوت ہو گی . . . . کوئی غیبی . . . یا محض عورت کا مکر و فریب ہو گا . . . سحر جسمانی سچے قلبی تاثرات . . . . ؟ ناممکن . . . . . ؟

نہ جانے رسکن کو عورت سے اتنی عقیدت کیوں ہے۔ کہتا ہے "عورت اپنے شوہر اور اسرار دنیوی کی ملکہ ہوتی ہے۔ اس کے سامنے دنیا اور زمانہ تاج اور عصائے شاہی سر تسلیم خم کر دیتے ہیں"

ایڈیسن کو جانے کیوں اسقدر اعتماد ہے کہتا ہے ——

" لوگ کہتے ہیں بیوی کو اپنے دل کا بھید ہرگز نہ بتانا چاہئے۔ لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ اگر بیوی لایق ہو تو سوائے اس کے اپنے دل کا بھید کسی کو نہ بتانا چاہئے۔ کیونکہ خاوند کا دلی دوست بیوی سے بڑھکر اور کوئی نہیں۔

"عورت اور روحانی قوتیں" ایک مضحکہ خیز خیال ——

جتنے بھی پیغمبر اور اولیاء اللہ گذرے سب کے سب مرد ہی تھے۔ اگر عورت میں روحانی قوت ہوتی تو وہ بھی پیغمبر ہوتی۔ بزرگ ہوتی ... ٹھیک ہے نا .....؟

یہی ایک مثال اس کے روحانی قوتوں سے محروم ہونیکی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

کیا روحانی قوتیں صرف ریاضت ہی کی حد تک محدود ہیں۔ انتہائی مصائب و پریشانی کے عالم میں بھی دامن صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا، افلاس کی سخت سے سخت تکلیفیں برداشت کرنا، انتہائی جسمانی و روحانی تکالیف سہنا —— یہ سب کیا ہیں.....

شاید یہ بھی عورت کی متضاد طبیعت کا ایک رخ ہے۔ شاید ....

لیکن ان مشاہیر سے خدا سمجھے۔ یہ ہر وقت عورت ہی کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ ساری عمر انسانی زندگیوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن کبھی مرد کی تعریف نہ کی ... کبھی تو کی ہوتی ..... آخر ....

بلزاک کی عورت پرستی دیکھئے کہتا ہے "عورت انسان اور فرشتہ کے مابین ایک مخلوق ہے"

سر جان لیک کو جانے کسی روحانی معاملہ میں بیوی سے مدد ملی جو یوں معترف ہے کہ "اچھی بیوی صرف دنیاوی باتوں ہی میں مدد نہیں دیتی بلکہ اس سے روحانی معاملوں میں بھی مدد ملتی ہے" ملی ہوگی اسے اوروں کو تو نہیں ملتی۔ ... یا شاید اس کو بیوی سے محبت زیادہ ہوگی جو یوں ساری دنیا کی عورتوں کی تعریف میں رطب اللسان ہو گیا...

.. جان۔ ایس۔ بی۔ والیس کی عقیدت یقیناً قابل تاسف ہے۔ عورت سے یوں مخاطب ہے" اے عورت! کائنات کو معطر کرنیوالی عورت! تیری تخلیق سے قدرت کا

منشاء یہی تھا کہ مرد کو روح کی گہرائیوں سے باخبر کردے - چنانچہ ابتدا میں تو ایسا ہی کرتی لیکن زمانہ نے تجھے تیرے حقیقی راستہ سے ہٹا کر تجھے تباہ و تاراج کردیا اور آج تو اس ہیرے کی مانند ہے جو خاک میں مل گیا ہو "

مالی یربی کی ستم ظریفی تو دیکھئے - کس مزے سے کہتا ہے -

" فطرت ممکن ہے مرد کی تخلیق سے پشیمان ہو لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ عورت کی تخلیق سے نادم ہو "

نغمۂ دل

(جناب عرشی حیدرآبادی)

محبت کے نغمے سناتا چلاجا — زمانہ کو بیخود بناتا چلاجا
جہاں تک بنے غم اٹھاتا چلاجا — نگاہوں سے پردے ہٹاتا چلاجا
حوادث کو ٹھوکر لگاتا چلاجا — ہر اک زخم پر مسکراتا چلاجا
جفاؤں کو ان کی بھلاتا چلاجا — محبت کی دنیا بساتا چلاجا
کہاں تو کہاں حادثات زمانہ — قدم اور آگے بڑھاتا چلاجا
یہ مانا گلستاں میں ہیں خار و خس بھی — مگر ان سے دامن بچاتا چلاجا
ملے گی بقدر تمنا ملے گی — مگر تشنگی کو بڑھاتا چلاجا

کبھی تو انھیں آئیگا رحم عرشی
ابھی سے غم دل سناتا چلاجا

---(۹)---

یاد فرحت

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء یوم جمعہ کی سہ پہر مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مکان میں حسب معمول "اردو مجلس" کا جلسہ تھا۔ حکیم مقصود علی خان صاحب المخاطب نواب مقصود جنگ بہادر نے آغا حشر کاشمیری کے متعلق ایک دلچسپ مضمون سنایا۔ شعرا نے اپنے کلام سے حاضرین کے ذوق سماعت کی تواضع کی۔ مرزا صاحب نے بھی اپنا تازہ کلام جو غالب کی غزل کے جواب میں لکھا تھا مزے لے لے کر سناتے رہے۔ خوب خوب داد حاصل کی۔ اس وقت کس کو معلوم تھا کہ یہ چہکتا ہوا بلبل پُر لطف باتوں سے ہنسانے والا دوست، اردو کا نامور مزاحیہ نگار، دو دن کے بعد ہی "مرحوم" بن جائے گا۔ جمعہ کا جلسہ برخاست ہوا، شنبہ کا دن گذرا۔ یکشنبہ کے اخبار میں نظر آیا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ چل بسے جس وقت مجھے اخبار ملا۔ غالباً اس وقت وہ دفنائے بھی گئے تھے۔ افسوس رہا کہ میت میں شرکت سے محروم رہا۔ خیر سیوم میں شریک ہوا۔ فاتحہ پڑھی، قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائی جا رہی تھی اور میں عالم تصور میں مرزا صاحب سے ہم کلام تھا۔ مرزا صاحب کہہ رہے تھے۔ ہم نے اپنے استاد نذیر احمد کی کہانی لکھی اور دنیائے اردو میں ان کو ایک مرتبہ پھر زندہ کر دیا۔ سلیم مرحوم کی وصیت پوری کر دی۔ اب ہماری سیرت کی باری ہے۔ کون لکھے گا۔ میں نے کہا کوئی مزاحیہ نگار ہی اس کو پورا کر سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی اس کی تکمیل کریں گے۔

بہر حال مزاحیہ نگار دنیا کا فرض ہے کہ وہ اپنے تاجدار اپنے رہبر کی سیرت نگاری کا فرض ادا کریں۔ یہاں میں صرف اپنے تعلقات کی حد تک کچھ صراحت کروں گا، مرحوم کی اردو خدمات، ان کے اخلاق و عادات، ان کے سرکاری خدمات وغیرہ کے متعلق ایک مبسوط مقالہ تیار ہو سکتا ہے، طلبہ جامعات کے لئے یہ اچھا موضوع ہے۔

کچھ سے کوئی تیس بلکہ پینتیس سال کا عرصہ ہوا ہوگا جب کہ مستقر بلدہ کو ریل نہیں تھی، اور نہ ریلوے بس کا وجود تھا، البتہ ایک خانگی کمپنی کی لاریاں ہفتہ میں دو مرتبہ چلا کرتی تھیں۔ عابد روڈ کے قریب ان لاریوں کا اسٹیشن تھا، ایک صبح بن

اپنے ایک دوست کو جو بیدر میں ملازم ہو کر جا رہے تھے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ لاریوں میں شوفر کے بازو کی سیٹ اچھی سمجھی جاتی تھی۔ ایک سیٹ پر ایک سرخ و سفید اونچے لمبے پورے مغل نے قبضہ کر لیا تھا۔ سرخ ترکی ٹوپی، سلک کی شیروانی، علی گڑھ فیشن کا پاجامہ زیب تن تھا۔ معلوم ہوا، اسپشل مجسٹریٹ ہیں، مرزا فرحت اللہ بیگ نام ہے۔ نواب ذو القدر جنگ کے رشتہ دار ہیں۔ نہایت متدیّن، بے لاگ، منصف مزاج، پولیس سے نہ ڈرنے والے، اپنے اور غیر کی رعائت نہ کرنے والے، دودھ کو دودھ پانی کو دودھ سے الگ کرنے والے عہدہ دار ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد میری کتاب "دکنی میں اردو" شایع ہوئی، اور رسالہ اردو کے مطالعہ کا زیادہ شوق ہوا، اس میں پہلے پہل مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام نظر آیا جو "مولانا نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی" کے روپ میں جلوہ گر ہوئے تھے مرزا صاحب کے مضامین اس کے پہلے مرزا ام نشرح کے نام سے رسالہ نمایش حیدر آباد میں شائع ہوا کرتے تھے مگر یہ مضامین میرے دیکھنے میں نہیں آئے۔ اس لئے پہلی مرتبہ اسی مضمون سے میں نے مرزا صاحب کے قلم کی روانی دیکھی تھی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ کب اور کہاں مجھے نیاز حاصل ہوا، حیدر آباد میں مرزا صاحب کا خاندان عرصہ سے متوطن ہے اور ہمارے خاندانی افراد سے بھی مراسم تھے۔ اس طرح مرزا صاحب مجھ سے ایک حد تک واقف تھے۔ دکنی میں اردو کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر گویا واقف ہو گئے تھے گو مجھے ان سے نیاز مندانہ شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔

اس کے چند ماہ بعد ہی پائیگاہ کمیشن کی معتمدی کی حیثیت سے مرزا صاحب دفتر دیوانی و مال میں قدیم اسنادات سے مواد حاصل کرنے آنے لگے اور چونکہ میں یہاں اسی کام پر متعین تھا۔ اس طرح مرزا صاحب سے زیادہ ملاقات ہو گئی۔ مرزا صاحب نے جو معلومات فراہم کئے تھے اور اس کے لحاظ سے جو رپورٹ مرتب فرمائی وہ تاریخی مواد کے لحاظ سے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس ہے اس کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ معلوم ہوگا اردو کے مزاحیہ نگار ادیب کو تاریخ کی موشگافی اور تاریخی استدلال میں کس طرح دست رس حاصل تھی۔ اور ان کو ایک قابل نکتہ رس

مورخ بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی زمانہ میں میں یورپ چلا گیا۔ واپسی کے بعد میرے مضامین شمالی ہند کے معیاری رسالوں میں شایع ہونے لگے، اور مرزا صاحب کے مضامین بھی آتے تھے، اس طرح فرحت اللہ بیگ صاحب میری ادبی خدمات سے واقف ہوتے گئے، اب یہ معمول ہو گیا وہ اپنے مضامین کے مطبوعہ حصے مجھے ضرور عطا فرماتے اور میں اپنی ہر نئی کتاب موصوف کو تحفۃً پیش کرتا۔ اس طرح مرزا صاحب کے مضامین کے ساتوں حصے میرے پاس ہیں اور "میری شاعری" اور انشاد کے عنوان سے جو مقالات شائع فرمائے تھے وہ بھی موجود ہیں۔

مرزا صاحب کا تخاطب "ارے میاں ہاشمی" سے ہوتا تھا۔ میرے کام کی ہمیشہ انھوں نے ہمت افزائی فرمائی اور میری خدمات پر اظہار پسندیدگی فرماتے تھے، میری خواہش پر انھوں نے "مقالات ہاشمی" کا پیش لفظ قلمبند فرمایا۔ اس میں میرے متعلق جو صراحت ہے وہ اس لئے درج کی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے مرزا صاحب میرے کام کو کس نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

> "میرے دوست سید نصیر الدین ہاشمی صاحب ان لوگوں میں ہیں جو سارے دن دفتر کا کام کرنے کے بعد بھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ گھر پر بھی کچھ نہ کچھ لکھتے ہی جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت کچھ لکھ چکے اور چھپوا چکے ہیں، انھوں نے صرف ایک ہی مضمون کو لیا ہے، اور اسی دائرہ میں اپنی کوششوں کو صرف کر رہے ہیں، ایسے ہی لوگ کچھ کر جاتے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے کارنامے کچھ رہ جاتے ہیں، بھلا دنیا میں وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں جو دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ چلاتے ہیں اور اس لوٹ میں بے جوڑ اور انمیل جو مال بھی ہاتھ لگے اس کو کباڑی کی دکان کی طرح اوپر تلے جما کر پبلک میں پیش کر کے ادیب ہونے کے دعویدار ہوں"

مرزا صاحب کے علم و فضل ان کے اردو خدمات کے مقابل میری کوئی حیثیت نہیں۔ مگر موصوف نے ہر وقت میری خدمات کی ستائش فرمائی ہے، اور ان کے خیالات اس اقتباس سے بھی معلوم ہوسکتے ہیں، میری جو وقعت ان کے دل میں تھی وہ اس سے واضح ہوسکتی ہے۔ ادہر آخری زمانہ میں وہ مضامین لکھنا ترک کرچکے تھے، اور اردو کے معیاری رسالوں کی فرمایش پر بھی انکار کرتے تھے۔ میں نے گزشتہ نمایش مصنوعات ملکی کے موقع پر نشر کرنے کے لئے مضمون کی خواہش کی، موصوف نے فرمایا میں سخت لکھوں گا۔ کیا اس کو نشر کروگے۔ میں نے کہا آپ جو مضمون لکھیں گے وہ حرف بحرف مکمل نشر ہوگا۔ غرضکہ ادھوں نے میری فرمایش کی تکمیل میں آٹھ دس صفحے کا مضمون قلمبند کردیا۔ میرے خیال میں غالباً موصوف کا یہ آخری مضمون تھا۔

اگر مرزا فرحت اللہ بیگ ایک نکتہ سنج ادیب تھے تو ساتھ ساتھ وہ بلند خیال شاعر بھی تھے، ایک طرف وہ اردو کے باکمال مزاحیہ نگار تھے تو اس کے ساتھ ہی وہ ماہر فن تنقید نگار بھی تھے اگر مورخ کی حیثیت سے ان کو درجہ دیا جاسکتا ہے تو اس کے ساتھ وہ افسانہ نگار بھی تھے۔ بہر حال ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ اور ان پر ہر جہتی لحاظ سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں۔

"قنوطیت اور رجائیت"

نسرین بی۔ اے (حیدرآبادی)

مسرت ایک لامتناہی قہقہہ کا نام نہیں اور نہ اظہار غم کا واحد ذریعہ صرف آنسو ہیں۔ دنیا میں بعض ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ہمیشہ مسکراتے ہیں لیکن ان کا دل روتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جن کے چہروں پر شادمانی کے آثار تک نہیں ہوتے اس کے باوجود وہ مطمئن اور مسرور رہتے ہیں یوں تو رنج و راحت سے کسی کو نجات ملی ہے اور نہ ملیگی۔ زندگی کے تانے بانے غم اور مسرت ہی سے مل کر بنے ہیں تاہم زندگی کے متعلق ہر شخص کا زاویہ نگاہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ دنیا کسی کے لئے جنت بن جاتی ہے تو کوئی اسے جہنم بھی بنالیتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ بہتر سے بہتر دنیا جو پیدا کی جاسکتی تھی وہ ہماری دنیا ہے جہاں انجام کار نیکی بدی پر غالب آئیگی۔ ان لوگوں کو رجائیت پسند کہتے ہیں۔ یہ امید کے پرستار ہوتے ہیں اور ہر معاملہ میں خوش آیند انجام کی توقع رکھتے ہیں۔ دنیا ان کے لئے جنت ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا بدترین مقام ہے اور ہر شئی دلیل شر ہے یہ قنوطی کہلاتے ہیں ان کے خیالات پر یاس کا رنگ چڑھا ہوتا ہے ان کا خیال ہے کہ ہر معاملہ کا انجام مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی ہمتیں ہمیشہ پست رہتی ہیں۔ اسی لئے وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ دنیا ان کے لئے جہنم ہے۔

عام انسانوں کے خیالات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے طبائع کا میلان یا تو قنوطیت کی طرف ہوتا ہے یا رجائیت کی طرف۔ قنوطیت پسندوں کا عقیدہ ہے کہ کشمکش حیات کا انجام نفی پر ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام اچھی چیزیں فریب کے سوا کچھ نہیں اور زندگی ایک ایسا کاروبار ہے جو نفع سے یکسر خالی ہے اور جس میں انسان کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

یاس کا پرستار امید کے پرستار کا یوں مضحکہ اڑاتا ہے کہ وہ بے سہارا امیدوں کا سہارا لے کر خواہش کرتا ہے اور اس کی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں۔ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھتی ان کے حصول میں جو تگ و دو کرنی پڑتی ہے وہ انجام کار لاحاصل ثابت ہوتی ہے خواہشات اور امانیوں کا یہ بوجھ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ افکارات کی شدت عقلی توازن بگاڑ دیتی ہے اور

جب ایک بڑی خواہش پوری ہوتی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ بار ہلکا ہو گیا مگر اس کی تکمیل کے ساتھ ہی کئی ایسی چھوٹی چھوٹی خواہشات موجود ہوتی ہیں جو اس وقت تک تحت الشعور میں چھپی ہوئی تھیں اس طرح انسان کو لامحدود خواہشات سے نجات نہیں مل سکتی۔ ابتداء سے انتہا تک وہ کسی نہ کسی خواہش کے پیچھے ناشاد و ہراسان دوڑتا پھرتا ہے اس لئے اس دنیا میں وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ بالفرض اگر خواہشات کی تکمیل ہو جائے تو بھی جیسے خواہش پوری ہو جاتی ہے زندگی میں وہ ہلچل باقی نہیں رہتی اور جدوجہد کے اختتام کے ساتھ ترقی بھی رک جاتی ہے۔ اگرچہ انسان کو کچھ دیر کے لئے آرام ضرور ملتا ہے لیکن اس میں سیر ی پذیری کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو بالآخر ناقابل برداشت جمود میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انسان زندگی سے بیزار ہو کر تنوع اور تبدیلی کی خواہش کرتا ہے اور اس خواہش کی وجہ سے پھر نئی نئی تکالیف کا آغاز ہوتا ہے۔ زندگی میں ایک طرف جمود ہے تو دوسری انتہا پُرالم۔ ہر لحاظ سے انسان مصیبت میں مبتلا ہے۔

قنوطیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ انسان کسی ذریعہ سے بھی زندگی کی مصیبتوں کو کم نہیں کر سکتا چاہے وہ کتنا ہی ذہین اور عقلمند کیوں نہ ہو علم اور تجربہ بھی الم سے نجات نہیں دلا سکتا۔ کیونکہ ہر ارتقائی منزل پر پہنچنے کے بعد احساسات اور بھی نازک اور شدید ہوتے جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ پودے بھی دکھ درد کا احساس رکھتے ہیں جانوروں میں بھی یہ حس موجود ہے لیکن انسان ان سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے اسی لئے اس کو سب سے زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔ انسانوں میں بھی عقلمند بیوقوف سے زیادہ حساس ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو علم۔ عقل اور تجربہ کی روشنی میں دیکھ کر اس کی حقیقت سے باخبر ہوتا ہے۔ چونکہ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے اس لئے اس کو تکلیف زیادہ ہوتی ہے لمحۂ الم اگرچہ مختصر ہوتا ہے لیکن جو تاثرات وہ چھوڑ جاتا ہے وہ روح کے لئے تازیانہ بن جاتے ہیں اور زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔

اس طبقہ کی نظر میں زندگی کبھی نہ ختم ہونیوالی ایک کشمکش ہے جس میں ہر نوع اپنی بقاء کی خاطر وقت اور جگہ کے لئے دوسروں سے برسر پیکار ہے۔ بقائے دوام کی یہ کوشش بھی ناتمام رہ جاتی ہے اور ہر چیز فنا کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش کی انتہا پر پہنچ کر انسان محسوس کرتا ہے کہ دولت۔ عزت۔ محبت اور ناموری سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی وہ خوش

نہیں رہتا۔ اس کے دل میں ایک پھانس کھٹکتی ہے۔ یہ کھٹک لازوال ہے اور اس سے کسی کو چھٹکارا نہیں لہٰذا یہ دنیا جہنم سے بھی بدتر ہے اور رہنے کے قابل نہیں۔

ان کے بالکل برعکس زندگی کی مصیبتوں پر قہقہہ لگانے والے رجائیت پسند ہیں۔ امید سے کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے وہ قبل از قبل ہی ہمت ہی نہیں ہارتے بلکہ ہمیشہ اچھی توقع رکھتے ہیں وہ زندگی کی بازی لگانے سے نہیں ڈرتے بلکہ بسا اوقات بازی لگا کر ہار جاتے ہیں لیکن ایک کامیاب کھلاڑی کی طرح مطلق اثر نہیں لیتے۔ وہ صرف محسوس کرنا ہی نہیں جانتے بلکہ علم اور عقل کی روشنی میں سوچنا بھی جانتے ہیں رجائیت پسندوں سے مراد وہ سطح بیں نہیں ہیں جو لاابالی طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اور جو نہس بول کر عیش و عشرت میں دن گزار دیتے ہیں بلکہ ایسے لوگ مراد ہیں جن کی زندگی عقل سلیم کی رہنمائی میں بسر ہوتی ہے۔ ان پر اگر کوئی مصیبت آتی بھی ہے تو وہ اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اپنی مصیبت کو اس سلسلہ الم کی ایک کڑی سمجھتے ہیں جو تمام انسانوں کی تقدیر میں لکھا گیا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز ان کے نزدیک مصلحت سے خالی نہیں۔ یہاں تک کہ وہ الم کو بھی انسانی زندگی کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ غم روح کو جلا دیتا ہے اور بغیر غم کے خوشی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ الم سے رجائیت پسندوں کو بھی نجات نہیں مل سکتی مگر وہ اپنی آہوں کو بے اثر اور آنسوؤں کو بے قیمت نہیں سمجھتے بلکہ انہیں پلکوں پر آنے سے پیشتر ہی دل کی گہرائیوں میں جذب کر لیتے ہیں۔

قنوطیت دراصل ایک بیماری ہے وہی لوگ قنوطی ہوتے ہیں جن کا جسم کمزور اور ذہن بیمار ہوتا ہے اور جنہیں آرام کرنے و سوچنے کے لئے ضرورت سے زیادہ وقت ملتا ہے جن کی زندگی میں جمود ہوتا ہے اور جو حرکت و عمل سے دور رہتے ہیں۔ انسان اگر اپنے پیدائشی فرائض کی کماحقہ تکمیل کرے تو سیری پذیری کی کوئی ایسی کیفیت ہی پیدا نہیں ہوتی جو بیکاری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بیکاری انسان کے لئے سب سے بڑی بیماری ہے جس میں زہریلے خیالات سطح ذہن پر رینگتے رہتے ہیں۔ دنیا سے بیزارگی اور دنیا کو ترک کر دینے کی خواہش صرف ان ہی لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو زندگی کی فطری راہ سے انحراف کرتے ہیں۔ نوجوان بہت جلد توقعات باندھ لیتے ہیں اور وہ بھی اتنی زیادہ کہ ان کا لازمی نتیجہ ناکامی اور مایوسی ہوتا ہے۔ اس جواری کی طرح جو ایک ہی بازی میں اپنا سارا سرمایہ لگا دیتا ہے

قنوطی بھی کسی ایک جذبہ پر زندگی کی ہر دوسری قیمتی سے قیمتی چیز بھی قربان کر دیتے ہیں اور پھر ایک مرتبہ ٹھوکر کھانے کے بعد اپنی بقیہ زندگی جذبات سے عاری ہو کر انتہائی بیزارگی کے عالم میں گزار دیتے ہیں وہ رفتہ رفتہ خبطی۔ شکی۔ تنہائی پسند اور حساس ہوتے جاتے ہیں وہ عملی زندگی کی جدو جہد اور انسانوں سے دُور بھاگتے ہیں اور مسرت کو کچل ڈالتے ہیں۔ دراصل دیکھا جائے ان کی بیزارگی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بیزار رہتے ہیں کشمکش حیات کی الجھنوں میں گرفتار ہو کر وہ غلط قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے ہی ہاتھوں تباہی کے اسباب پیدا کر کے اس کا سارا الزام ماحول پر ڈالتے ہیں۔ ہر صحیح الدماغ اور سن شعور کو پہنچا ہوا شخص زندگی کے فطری حدود کو بلا اعتراض قبول کر لیتا ہے اور اپنی کوشش سے اپنے لئے سامان عیش و انبساط فراہم کر لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دنیا نہ تو جنت ہے اور نہ جہنم بلکہ انسان کو اختیار ہے کہ وہ اِسے جنت میں تبدیل کر لے یا جہنم بنا دے۔ زندگی کی عملی جدو جہد میں کئی قسم کی تکالیف کا سامنا ضرور ہوتا ہے مگر انہیں تکالیف کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی۔ محبت۔ ایثار اور اس قسم کی بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن سے انسان کو مسرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا ہے۔

قنوطی خواہشات کی تکمیل کو مسرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور چونکہ ہر خواہش پوری نہیں ہوتی اس لئے انسان رنجیدہ رہتا ہے لیکن خواہشات کی تکمیل میں درحقیقت کوئی مسرت نہیں بلکہ مسرت صرف اس کے حصول کی جدوجہد میں پوشیدہ ہے جب وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے۔

ہر ذی عقل انسان کو چاہئے کہ وہ قنوطیت سے حتی الامکان پرہیز کرے۔ علم اور عقل انسانی الم کو کم کرنے میں امداد دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صاحب علم و عقل نسبتاً حساس ہوتے ہیں اسی لئے انہیں تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے مگر الم کے ساتھ ساتھ انہیں مسرت بھی اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔ مزید برآں ہر قسم کی مسرت الم کے عارضی التواء سے پیدا نہیں ہوتی۔ آرام۔ تحفظ۔ تنہائی وغیرہ یقیناً اس قسم کی مسرتیں ہیں جن کی قدر و قیمت کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہم ان سے محروم ہو جاتے ہیں لیکن محبت۔ حکومت۔ دوستی کھیل وغیرہ کا شمار اس قسم کی مسرتوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کا ہر معمولی سے معمولی فعل بھی

کچھ نہ کچھ مسرت کا حاصل ہوتا ہے۔ اگر انسان زندگی کی عملی جد و جہد سے منہ موڑ لے تو اس پر جمود کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور یہ جمود انسان پر سب سے بڑی لعنت ہے زندگی مختصر اور جد و جہد سے پُر ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے کشش رکھتی ہے۔ حرکت ہی میں برکت ہے دنیا میں صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو صحیح معنوں میں رجائیت پسند ہوں۔

اب آپ اپنا تجزیہ کر کے یہ فیصلہ خود ہی کر لیں کہ آپ رجائیت پسند ہیں یا میری طرح ایک قنوطی ——

دلرُبا خواب

سُلطانہ

نغمہ سحر کا سریلا شور، پرندوں کی ہم آہنگی کے ساتھ جاگ اٹھتا۔ نسیم مست خرام کی بہتی ہوئی خوشبو نیلگوں روشنیوں میں مل کر پھیل جاتی۔

کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر یہ چمکدار نقطہ جگمگایا کرتا۔ نیز خوشنما روشنی افق کے سرمگیں کناروں پر پھیل جاتی۔ چاند کی سفید روشنی میں مکمل مل کر بھی وہ سنہری اور تیز چمکیلا ستارہ اسی طرح چمکتا چلا جاتا صبح کی دلہن اپنے دامن پھیلا کر رات کے خوابناک سکون پر چھا جاتی۔ نسیم نو بہار کوئی دلربا خواب دیکھ کر ہلکی سی انگڑائی لیکر جاگ اٹھتی۔ خمار آلودہ نگاہوں میں دلآویز خوابوں کی رنگین یاد سے باریک سنہری خوابیدہ جذبات بیدار ہو جاتے۔ میخانہ تخیل میں جام مسرت لبریز ہو کر چھلک جاتا۔ تبسم خیز وادیوں میں کسی دلفریب خواب کی تعبیر مسکراتی اور زندگی کی فضاؤں میں روح پرور اور دلنواز نغمے گونج اٹھتے۔ خوش کن خیالوں کا دلربا تصور کائنات میں ہلکی سی کیف پرور ہلچل مچا دیتا۔ خوشگوار ہواؤں میں لہراتی ہوئی سرخ گلاب کی لچکدار شاخوں میں ناز آفریں شگوفے مچل جاتے۔

پو پھٹی سمندر میں چاند ڈوب گیا۔

بقیہ صفحہ ۱۷ "۔۔ ارے واہ اتنی ہمت کر کے پھر پیچھے ہٹ رہی ہو۔ بس جی چلو ہاں چھوڑ بھی دو" میں نے بھی ایک مرتبہ کس کے آنکھیں بند کیں نہ جانے کیونکر انگلی کو جنبش ہوئی ایک زوردار آواز کے ساتھ ہی منہ عارف بھائی کی طرف تھا اور آنکھیں بند تھیں گھبرا کر پوچھا "لگی؟" عارف بھائی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "چلو چلو بس لگ گئی" کیا معلوم گولی کدھر گئی اور ڈبہ کدھر تھا۔ اس حادثہ کے بعد تھوڑی دیر بیٹھی ٹھنڈا پانی پیکر گھر کا راستہ لیا گھر میں یہ ماجرا سنایا۔ سب حیران تھے اور میں ان سب سے زیادہ حیران۔ کیا میں بھی بندوق چلا سکتی ہوں؟

دُور چلی جاؤنگی

جمیلہ بیگم (کلکتہ)

ہاں چلی جاؤں گی ـــــ میں دور چلی جاؤں گی
اس وسیع اور بلند چرخ و ستاروں سے بھی دُور
وادی نور کے پرحسن نظاروں سے بھی دور
گلشن و مہر کے سر سبز بہاروں سے بھی دور
مضطرب نغمے میری ساز پہ یوں لرزاں ہیں
آج میں دور ـــــ بہت دور چلی جاؤں گی

ہے نہ شکوہ مجھے قسمت سے نہ ان سے ہے گلہ
یہ تو تقدیر کی خوبی ہے مٹائے نہ مٹا
میرے قسمت کے نوشتے ہیں کہ سینے پہ یہ داغ
جس کو رفتار زمانہ بھی فنا کر نہ سکا
جب کبھی یاد مجھے آتی ہے ماضی کی بہار
مضطرب نغمے تڑپتے ہیں میری بربط میں

ہاں کبھی ساتھ میرے ہمدم و دمساز بھی تھا
ہاں کبھی پاس میرے دوست بھی ہمراز بھی تھا
آج میں تشنہ ناکام ہوں برباد سہی
دور عشرت میں خزاں دیدہ و ناشاد سہی
مجھ کو مایوس نگاہوں سے نہ دیکھ اے گردوں
ساز پہ نغمے نہ ہوں نالہ و فریاد سہی
آہ و نالے ہی نکلتے ہیں میری بربط میں

دیکھ مغموم نگاہوں میں تمنا کا لہو
اور یہ خوں میں ڈوبی ہوئی اشکوں کی جھڑی
میری خوں گشتہ تمناؤں میں مجبور کی آہ!
تار بن بن کے بگڑتے ہیں میری بربط میں

میری گم گشتہ مسرت کی یہ سرحد تو نہیں؟
میری خون گشتہ امیدوں کی یہی حد تو نہیں؟
کیا یہی حدِ مسرت ہے نظر بد تو نہیں؟
مضطرب نغمے میری ساز پہ لرزاں ہیں ہاں چلی جاؤنگی --- اے دور چلی جاؤنگی

ٹوٹے ہوئے ستارے

۱۔ ن۔ ج۔ صاحبہ۔ آپ کے طویل گرامی نامہ کا تفصیلی جواب دیدیا گیا ہے شہاب کے غائبانہ ہمدردوں کیلئے بجز دعائے خیر کے ہم اور کیا دعا کرسکیں گے۔ جن کی فطرۃ ہے۔

اس خطا پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

۲۔ س صاحبہ۔ آپ کی فرمایش ہے کہ پرچہ کا ٹائٹل رنگین ہو۔ کیا آپ لفافہ کے حسن و خوبی سے مضمون بھانپ لینا چاہتی ہیں؟ موجوں سے کھیلنے والے کبھی دریا میں غوطہ لگاکر موتی کی بھی تلاش کریں اس لئے عرض ہے "ظاہری رنگ پر نہ جائے کوئی"

۳۔ ن۔ س۔ صاحبہ۔ آپ نے کسی خط کا جواب نہ دیا یہ آپ کے اپنے اخلاق کا مظاہرہ ہے ورنہ

"ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی"

۴۔ محمودہ صاحبہ۔ جی ہاں جن پر دیوتاؤں کا سایہ ہوتا ہے وہ پرچہ نکالنے کی بدعت میں گرفتار ہوتا ہے۔ اس لئے کہا تھا کہ خدارا آپ بھی کسی پرچہ کی قریب ہوتیں تو اس وقت قدر ہوتی ان مشکلات کی سے

کٹی کچلی گئی پیسی چھنی ۔ تب یہ گی گندھی مہندی   جب اتنے دکھ سہے تب جا [illegible] قدموں لگی مہندی

۵۔ جمیلہ صاحبہ۔ شکریہ آپ کی بہن دیویوں کا جو اشتہار [illegible] مشورہ دیتی ہیں مگر اس کی خبر نہیں کہ مشتہر رہا ہو اور رسایل کو وہ دوں نہیں سمجھتے حالانکہ اخبار کی زندگی ایک روزہ ہوتی ہے اور پھر وہ ردی فروش کے نذر ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے ماہنامہ ہمیشہ زینت میز بنا رہتا ہے کہ وقت پر اپنی ضرورت کا اشتہار دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ تو بتائے اس کھلی حقیقت کو کون سمجھائے

ہم سے یہ ممکن نہیں کہ دکان دکان اس کے لئے دریوزہ گری کریں۔

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے۔

گھر داری

شفیقہ بانو (نجیب آباد)

ہونا تو یہ چاہئے کہ گھر کے تمام اخراجات عورتوں کے ہاتھ میں ہوں —— عورت مشکل سے ہزار میں ایک ایسی فضول خرچ نکلیگی جو شوہر کی - یا باپ بھائی کی کمائی بے دریغ پانی کی طرح بہادے - لہذا یہ طے شدہ امر ہے کہ عورت صحیح معنوں میں منتظم ہے - ایک منتظم کو اگر گھر کے جملہ انتظام سے محروم کردیا جائے تو نتیجہ بربادی کے سوا اور کیا ہوگا —؟ بہت سی لڑکیاں ماں باپ کے ہاں بھی دست نگر رہتی ہیں جن پر ماں باپ کا گھر تو عارضی ہوتا ہے اور اس وقت لڑکی کا بچپن ہوتا ہے جس چیز کی حاجت ہوئی رو دھو کر پوری کرالی - لیکن جب صحیح معنوں میں گھر کی مالک بن جاتی ہے تو یہ بات بہت دکھ پہنچاتی ہے - شوہر کا اپنے ہاتھوں سے گھر چلانا - خود با اختیار بنا کر رہنا - بیوی کو خرچ نہ دینا بہت تکلیف دہ طریقہ ہے ——

یہ تو نہیں کہتی کہ سب بدنصیب عورتیں اس طریقے پر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں لیکن یہ ضرور کہونگی کہ ہندوستان کی بے شمار بہنیں اس دائمی عذاب میں مبتلا ہیں ——

شوہر خواہ وہ تجارت پیشہ ہوں یا دفتر میں ملازم - ہر حال میں یہ بہت بڑی بات ہے کہ شوہر صاحب تو خرچ اڑائیں اور بیوی دھیلہ دھیلے کو منہ تکے —— یہ بھی کوئی معقول زندگی ہوئی؟ بعض وقت تو یہ گھریلو کشمکش جانکنی سے بدتر ہو جاتی ہے - مثلاً بچے پیسے مانگ رہے ہیں - بیوی نوکر سے فرمارہی ہیں -

ارے منگو —— او منگو جائیو! دوڑ کے میاں سے دو آنے لادیجیو —— ننھے میاں رو رہے ہیں ——

ارے ہاں - دیکھ لکڑی کیلئے ایک روپیہ لے آ - کہنا اس وقت ہنڈیا کیلئے بھی نہیں ب جانا کمبخت —— ایک آنہ پانوں کے لئے مانگ لا ——

" اے کیا کروں - تانگہ والا چلا رہا ہے جا جلدی کر میاں سے بارہ آنے لے آ - غرض ایسی ایسی ... ضرورتوں کو مانگنے پر بیویاں نوکروں کو دوڑاتی رہتی ہیں اور میاں اپنے دفتر ... بیٹھے شیر کی طرح دھاڑ کرتے رہتے ہیں -

بعض وقت گالیاں بھی عنایت فرما دیتے ہیں۔ نوکر اکثر اس بیہودہ رہن سہن سے گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ گھر کی برکت غائب۔ باہر کے تمام آدمیوں کو رفتہ رفتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہاں میاں صاحب کوڑی کوڑی کو گھر کی بیوی کو محتاج بنائے رکھتے ہیں —— تعریف یہ کہ بیویاں شکایت کرتی ہیں کہ یہ ذلت ہم سے نہیں اٹھائی جاتی تو حکم حاکم یہ ہوتا ہے تم پھوڑ ہو۔ بدسلیقہ ہو۔ گھر چلانا نہیں آتا۔ میں اگر اپنے ہاتھ سے خرچ نہ اٹھاؤں تو گھر میں فاقوں کا بازار گرم ہو جائے وغیرہ وغیرہ ——

اب کون کہے کہ عورت کو سب سے بڑی کوفت پہنچانی ہو تو خرچ بند کر لو۔ خود خرچ اٹھاؤ ——

اگر اس غریب کا دو چار روپیہ کی چیز کو دل چاہے تو بس دل مار کر بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ——

خود خرچ کرنے میں صرف یہی نقصان پہنچتا تو خیر۔ لیکن سب سے زیادہ اس طرز عمل کا اثر مستقبل پر پڑتا ہے۔

عورت کے دل میں کوئی گنجائش نہیں رہتی وہ اس محتاج قسم کے خرچ کو اپنی سخت توہین سمجھتی ہے۔ جیسے کسی نے ہزاروں جوتے لگا دئے ہوں۔

جو لڑکیاں عورتیں میکہ کی طرف سے خوشحال ہوتی ہیں وہ وہاں سے کچھ مدد لے لیتی ہیں اکثر چپ چاپ جل جل کے رہ جاتی ہیں۔ عورت کے پاس صرف گھر داری کا ہی تو شغل ہے جب مرد یہ بھی خود لے لیں تو پھر باقی ہی کیا رہ گیا ——؟

موجودہ دور میں بعض بہنوں کو یہ شکایت بہت ہے کہ وہ محتاج زندگی گزارتی ہیں اور کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔ بظاہر تو یہ معمولی سی بات ہے لیکن اس میں شک نہیں گھروں کا سکون غائب ہو کر بے اطمینانی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

عورت بدمزاجی بھی پیسہ پیسہ کو محتاج ہو کر زیادہ کرتی ہے۔ گھر کی رانی کو اب تو گھر کی ناک سے بھی کم اختیار رہ گیا۔

استفسارات

۱- آب حیات سے کیا مدعا ہے اور پھر خضر اور سکندر کے کیا واقعات ہیں۔ عبدالرحمن

۲- کیا دنیا میں سیمرغ کا کوئی وجود ہے۔ پھر کیوں ہمارے قصہ کہانیوں اور مشرقی لٹریچر میں اس کا ذکر آتا ہے۔ ——— حسن شریف

۳- پارس پتھر، بھی ہمارے افسانوں تک ہی ہے یا وہ اپنا کوئی درجہ رکھتا ہے۔ کیا کوئی ایسا واقعہ آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے ——— اقبال احمد

۴- الف لیلیٰ، کس عہد کی تصنیف ہے اور اب تک اس کا کن کن زبانوں میں ترجمہ ہوا۔
منیرالدین

۵- طلسم ہوش ربا، جیسے ضخیم جلدوں کے لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی اس سے ہمارے ادب میں کیا اضافہ ہوا ——— احمد محی الدین

۶- ہمارے یہاں شادی بیاہ میں جو رسوم ہوتے ہیں اس کی ابتدا کس عہد میں ہوئی۔
زہرہ

۷- سنتے ہیں کہ اس کی نمائش کے موقع پر جہاں کلب کا شامیانہ نصب کیا گیا تھا وہاں زمانۂ قدیم میں تارامتی پیٹا متی کا حمام تھا۔ براہ کرم کوئی بھائی یا بہن اس کے واقعات لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں ——— صبیحہ بیگم

۸- مجھے صفیہ نقوی بمبئی کا پتہ درکار ہے ——— حمیدہ بانو

۹- آم کے بہترین اچار کا نسخہ جو صحیح اوزان کا مطلوب ہے اور وہ کتنے عرصہ تک رہ سکیگا
ایک ضرورت مند

۱۰- عورتوں کو کیوں ناقص العقل کہا جاتا ہے جب کہ وہ مردوں کے دوش بدوش اس وسیع دنیا میں کام کر رہے ہیں۔ کیا یہ مردوں کی زیادتی نہیں ہے ——— ؟
جمیلہ

راشن کارڈ

ن ۔ ا ۔ بیگم

ریڈیو کے میٹھے بول سے اپنے اوقات کو شیریں بنا رہی تھی کہ گھر میں تیز تیز باتوں کی آوازیں آئیں ۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ " راشن کارڈ " کھو گئے ۔ گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی ۔ ہر طرف دوڑ دھوپ تھی ۔

امی نے جو مجھے آتے دیکھا نہ جانے کب کی بھری بیٹھی تھیں برس پڑیں کہ اس کو نہ گھر کی فکر نہ کسی چیز کی احتیاط کا خیال ۔ یہ پہلی اور اوس کی کتابیں اور گانا بجانا ۔ آخر میں کب تک ان بکھیڑوں میں پھنسی رہوں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں ۔ میں نیچی نظریں کئے پند و نصیحت کے تلخ گھونٹ پیتی گئی اور ادھر ریڈیو سے خواتین کے پسندیدہ ریکارڈ کا ہلکا ہلکا سا نغمہ بلند ہو رہا تھا ۔

امی چلی گئیں اور میں جلی بھنی کمرہ میں پہنچی تو ایک المناک صدا کانوں میں پہنچی ؎

" دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا "

کتنی سچی حقیقت ہے " دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا " دنیا میں غریب کا زندہ رہنا ہی ایک جرم ہے پھر آرام ۔ کتنی ان ہونی بات ہے ۔ آرام تو امیر کے لئے مقدر ہے " دنیا میں امیروں کو آرام ہی ملتا ہے ۔"

غریب تو ایک مجبور ۔ لاچار ہستی ہوتی ہے جس کا دوسرا نام صبر ہے جو ٹکے ٹکے سے محتاج ۔ کپڑوں سے عاجز ۔ سخت و سست کو شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارنا پڑتا ہے ۔ جس کو لب کشائی کی اجازت نہیں ۔ غربت محتاجی سے نہیں ہوتی بلکہ ایک طرح کی مجبوری غربت کہلاتی ہے لڑکیاں اپنے بزرگوں ماں باپ ۔ بھائی ۔ بہنوں کے مقابلہ میں غریب ہی ہیں وہ سب کچھ کہیں لیکن یہ بیچاریاں جواب دیں تو بدتمیز ۔ منہ پھٹ ۔ میں اسی تخیل میں الجھی ہوئی تھی کہ ماں کا یہ الزام کارڈ اوس نے مجھے دئے ہیں ۔ تن بدن میں ایک آگ ہی تو لگ گئی ۔ لیکن کیا کرتی ۔ موڈھا خانہ سے سنگھار ۔ کتابوں کا المارہ تک دیکھ ڈالا تو بہ کیجئے جو کارڈ ملے ہوں ۔ کمرہ تک پہنچی تھی کہ یہ مژدہ سنا کہ کارڈ مل گئے بے اختیار میری زبان سے نکلا کہاں تھے ۔ جی بیگم صاحبہ کے پاندان کے نیچے ۔ امی کی باتیں میرے دماغ میں گھوم گئیں کہ ہم لڑکیوں میں نہ احتیاط کا

مادہ ہے اور نہ سلیقہ کا۔

کارڈ تو مل ہی گئے مگر آج تک یہ معمہ حل نہ ہوسکا کہ پاندان کے نیچے چھپا رکھنے میں کونسا سلیقہ اور احتیاط مدنظر تھی۔

بزم کہکشاں

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کمبخت تیرا چاہنے والا نکلا

نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے
داستاں اپنے جبہہ سائی کی

ایسا بھی اتفاق مجھے بارہا ہوا
اون سے ملا ہوں اون کا پتہ پوچھتا ہوا

نہ گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من!
بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

سادگی - بانکپن - اغماض، شرارت شوخی
تونے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

تم سے کچھ کہنے کو تھا بھول گیا!
جانے کیا بات تھی کیا بھول گیا

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اوس نے کہا تھا
کیا اُس نے کہا تھا مجھے یاد نہیں

منزل کو گلہ ہے میری بے راہ روی کا!
یاں جنبش پا بھی میری آزاد نہیں ہے

کس منھ سے کروں وادیٔ غربت کی شکایت
گھر جب سے چھٹا ہے مجھے گھر یاد نہیں ہے

دل پر داغ کا ہم حال کہیں کیا تم سے
پھول دیکھا ہے کبھی لالۂ صحرائی کا؟

افتادہ رہنے دی تھی زمین دل کی اس لئے
امید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے

تونے ٹانکے جو دئے تھے وہ مگر ٹوٹ گئے
آہ پھر خون ہر اک زخم جگر دیتا ہے

یک سبزہ بے نمک نہ بود در دیار ہند
گویا کہ ہند را بہ نمک آب دادہ اند

ترا گاہے گریبانے نہ شد چاک
چہ دانی لذت دیوانگی را

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشاں ہوں میں

سہیل یمنی

ہم نے بندوق چلائی !

فاطمہ قاضی عبدالغفار

عجیب بات ہے! عجیب؟ کیا مطلب؟ بس اپنی اپنی طبیعت ہی تو ہے!..... اگر مجھ کو کسی قسم کے دھماکوں کی آواز ناگوار معلوم ہوتی ہے یا صاحب فرض کر لیجئے کہ ہم ڈرتے ہیں تو اس میں عجیب بات کی تو کوئی بات ہی نہ ہوئی..... ڈرنا کوئی بزدلی نہیں سچ تو یہ ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو ڈرتے دیکھا ہے اور ہم بیچارے!! ہم کو تو اپنی بہادری کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ جناب دعویدار ذرا سی کھٹ پر اچھل پڑتے ہیں۔ میں تو صرف دھماکے ہی کی آواز پر اچھلتی ہوں اب.... چاہے وہ دھماکا بندوق کا ہو یا کسی پتھر کے پھٹنے سے پیدا ہوا ہو یا ہوا کے زور سے دروازے آپس میں ٹکرائے ہوں۔

.... بہرحال غرض دھماکے سے ہے اور اس سے مجھ کو بہت ڈر معلوم ہوتا ہے اور یہ خوف انتہا کی دیواروں کو توڑ کر نہ جانے کہاں جا پہنچا ہے۔ ابھی تک تو صرف خیال ہی سے ڈر معلوم ہوتا تھا مگر اب تو کمبخت خواب میں بھی دھماکے سنائی دیتے اور جب خوابی دھماکوں سے گھبرا کر آنکھ کھلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا جانکنی ہو رہی ہے۔

دھماکے کے ڈر نے اکثر دلچسپیوں سے محروم کر دیا ہے اور نہ جانے ان موئے دھماکوں میں کیا رکھا ہے کہ کھیل تماشا تو بعد میں ہوگا پہلے بے وجہ دھماکوں سے ادھی جان نکال دیں گے حد تو یہ ہے کہ دولہا میاں بھی بغیر دھماکوں کے دولہن بیگم کو گھر لاتے ہوئے شرماتے ہیں!! بیچاری دولہن سوئی وہ بھی ادھ مری ہی پہنچی ہوگی سسرال.....!! اکثر گھر کے سامنے سے باراتیں گذرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بارات کے باجے سے ہر چھوٹے بڑے کو دیکھنے کا شوق ہو جاتا ہے غرض سب ہی چھت پر چڑھ کر دولہا میاں کے درشن کرتے ہیں دل ہمارا بھی چاہتا ہے آخر دل ہی تو ہے!! اور وہ بھی زندہ!! ہر ایک کو چھت کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر نہیں صاحب وہاں تو جیسے باراتیوں کو ضد ہو ہم سے! وہ زوردار دھماکا ہوتا ہے کہ ہم جہاں تھے وہاں اور ہاتھ کانوں پر لیجئے اتنا بڑا بورڈ ٹنگ گیا "بارات دیکھنا منع ہے" اور وہ بھی صرف ہمارے لئے۔ ایسے کہاں کا مانا دل ہے کہ بے چین ہے اور یہاں یہ حالت کہ ایسے تیز [illegible] کہ دھماکا نہ ہو جائے وہ دھماکے کی آواز

کانوں میں پہنچ جائے۔ اب تو اپنی جان گویا ہتھیلی پر ہے دل کو لاکھ سمجھاتی ہوں کہ کمبخت مان جا میرا کہنا، یا رات دیکھنے کی ضد نہ کر اگر وہاں گیا تو تیری خیر نہیں"۔ غرض اس طرح زندگی گذر رہی ہے۔

امی جان خریداری کے ارادے سے باہر نکلتی ہیں تو گڑگڑا کر کہتی ہوں دیکھئے غبارے نہ لائیے گا لیکن غبارے ضرور بچوں کو تقسیم کئے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ ابا جان شامت بھی آجاتی ہے خدا جانے یہ بچے آپس میں مل کر کیا طے کرتے ہیں کہ ہم بالکل دھماکے کو بھولے کسی کام میں مصروف ہیں کہ اچانک کان کے پاس زوردار دھماکا ہوا، اچانک حادثہ کا ظاہر ہے ہم پر کیا اثر ہوگا۔ دوسرے دھماکے کے لئے ابھی کان تک ہاتھ نہ پہنچے کہ دوسرا اور پھر تیسرا غرض یکے بعد دیگرے تین چار دھماکے ہوگئے۔ یہاں اوسان خطا اور بچے اپنا کام کر یہ جا وہ جا!!
جب ہوش بجا ہوئے تو گھر میں ایک بھی غبارہ نظر نہ آیا۔

اس قسم کے سیکڑوں حادثات کا ہم کو آئے دن شکار ہونا پڑتا ہے ایک روز بھائی جان بیٹھے لڑائی کی خبریں سنا رہے تھے کہنے لگے "بلقیس سنبھل بیٹھو اب ہندوستان پر دو چار دن میں حملہ ہونے ہی والا ہے بس پہلا گولا اسی گھر پر گرے گا" اب تو ہم ختم ہوگئے۔ تمام دن خیالی دھماکوں سے دماغ پریشان رہا۔ رات کو دیر سے آنکھ لگی۔ دیکھا واقعی دشمن نے حملہ کردیا ہے دھماکوں کا بازار گرم ہے۔ ان کی آوازوں سے بچنے کے لئے ہم نے کانوں میں اس زور سے انگلیاں ڈالیں اور کان کے سوراخ کو بند کرنے میں پوری طاقت اس طرح صرف کردی کہ انگلیاں کان کے پردوں کو پھاڑتی ہوئی دماغ کے پردوں کو چیرتی ہوئی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی دونوں انگلیاں غالباً دماغ کے بیچ کے حصہ میں پہنچ کر آپس میں مل گئیں۔ مگر خدا بچائے کہ دھماکوں کی آواز ان سب حالتوں کے باوجود بند نہ ہوئی چیخ کر آنکھ کھول دیں دیکھا تو دونوں ہاتھ کانوں پر تھے جسم ٹھنڈا پڑا تھا اور ابا ٹھنڈا پانی پلاکر حواس درست کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن یہاں تو جیسے نیند بھی دھماکوں سے ڈر کر بھاگ گئی تھی کہ ہم نے دعاؤں ہی میں صبح کردی۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے ہماری ایک دوست کی نئی نئی شادی کا زمانہ تھا شوہر نامدار سرکاری میں ظاہر ہے کہ ان کے یہاں دھماکوں کا مکمل انتظام ہوگا بندوقیں بھی ہونگی اور نشانہ بازی بھی کرتے ہی ہوں گے۔ ایک روز شام کو جو ہماری شامت آئی تو ملنے نکلے۔ دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دیکھا آپ خیر سے اپنی بیگم کو نشانہ بازی کی مشق کرا رہے ہیں۔ جی چاہا الٹے پاؤں پلٹ آؤں

مگر عارف بھائی دیکھ چکے تھے شکاری کی نظر جو ٹھیری!! اب جان کی خیر کہاں۔ پکڑے گئے۔ اور بری طرح
پھنے کہنے لگے "تم بھی بندوق چلاؤ"۔ الہٰی توبہ ان کا جملہ پورا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یہاں ایسا معلوم ہوا کہ جیسے
چاروں طرف سے بم کے گولے گرنے لگے بہت کوشش کی کہ عارف بھائی پر کمزوری کا اظہار نہ ہو مگر گو ان سب
وہ بھی ایک استاد ٹھیرے فوراً ہی ہماری کمزوری کو تاڑ گئے نہایت متانت سے فرمایا "ڈر نکالنا چاہیے
آؤ چلو سامنے والے ڈبہ پر نشانہ لگاؤ"...." یعنی اب کیا کروں کہہ رہی ہوں کہ بھئی کچھ باتیں کیجئے
ابھی ہم گھر سے آرہے ہیں کچھ دیر بعد دیکھا جائیگا مگر وہاں کچھ اثر نہیں اصرار بڑھتا رہا اور ایک مرتبہ
بندوق اختر کے کاندھے سے منتقل ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آگئی۔ سردیوں کا زمانہ اور ہم پسینہ میں
اس طرح تر گویا مئی جون کی گرمی ہو۔ اب تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا.... آگیا سیکڑوں بندوقیں اور
ڈبے نظروں کے سامنے گھومنے لگے اور اب میں نے التجائیں شروع کردیں اب تو بھنس ہی چکے تھے۔
التجاؤں کا کوئی اثر نہ پاکر دل پر پتھر رکھکر ارادہ کرلیا کہ اب بندوق چلاکر ہی چھوڑوں گی مگر آخر کیسے۔
نہ دل قابو میں نہ ہاتھ پیر! نہ دماغ ٹھکانے!! دل میں سوچتی الہٰی کس عذاب میں پھنس گئی نہ جانے آج
کس کا منھ دیکھا تھا کوئی کانا بھی تو راستہ میں نہیں ملا۔ کہیں تیسری کا چاند تو نہیں دیکھا.... مگر نہیں
جناب ان میں سے ایک بات بھی نہ ہوئی تھی پھر نہ معلوم کیا گناہ کیا تھا جس کی آج اتنی بڑی سزا۔ خیر بکرے
کی ماں کبتک خیر مناتی بندوق کو لرزتے ہاتھوں سے کاندھے پر رکھی نہ جانے کون سے شانے پر تھی یاد نہیں۔
عارف بھائی لے اپنے ہاتھ سے کوئی انگلی میرے گھوڑے پر رکھدی خود پیچھے کھڑے ہوگئے کہنے لگے "اب دباؤ
گھوڑا" میں نے بھی سوچا جتنی جلدی یہ قصہ ختم ہو اچھا ہے اور انگلی کو جنبش دی مگر وہ بھی جیسے شل
ہوگئی ہو جیسے اس میں کبھی حرکت کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی کمبخت کی جان نکلی ہوئی تھی!! نہ جانے کس کوشش
سے ایسی تھوڑی بہت جان آئی ہم نے ہمت دکھاتے ہوئے کہا "چھوڑتی ہوں عارف بھائی؟" جواب ملا
"چھوڑ دو"۔ ہم نے ہمت کی مگر انگلی ابھی تک مردہ تھی پھر کہا "ہاں عارف بھائی اب چلاتی ہوں"؟ جواب آیا
"ہاں ہاں بھئی کیا نکاح قبول کروا رہی ہو؟ بس ہمت کر جاؤ" مگر اب بھی ہمت جواب دے رہی تھی
پھر کہا "ہاں تو دیکھئے اب کی مرتبہ چلا ہی دوں گی"۔ عارف بھائی نے کہا "ہاں یقینی! شاباش ہوجائے
دھماکا" اف خدا یہ دھماکا جیسے دماغ پر ہتھوڑے چل رہے ہوں ہمت پھر باندھی اور کہا "ہوں عارف
بھائی" جواب "ہوجائے" "ہاں تو ہوں" "یہ ہاں ہوں کیا بس اب دھم ہونا چاہیے"۔ یہاں تک
پہنچتے پہنچتے جیسے سانس پھول گیا اور ہمت پھر ٹوٹنے لگی عاجزی سے عارف بھائی سے رحم کی درخواست
کی۔ شکاری اگر رحمدل ہوجائیں تو پھر کیا؟ کہنے لگے (بقیہ مضمون ملاحظہ ہو صفحہ ۳۶)

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲
3238
REGD. M.N.D.

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپکر دفتر شہاب دبیرپورہ سے شائع ہوا

شہاب

مرتبہ
محمد عبدالرزاق بسمل

قیمت سالانہ (ص)

جلد (۱۵) شہریور ۱۳۵۶ف م جولائی ۱۹۴۷ء نمبر ۱۲

کوڈی کنال

جناب محشر - ایم، اے

جنھوں نے ہل اسٹیشن میں اپنے ایامِ گرما بسر کیے ہیں وہ واقف ہیں کہ درحقیقت کوڈی کنال فردوس بر زمین ہے اس کا شمار دنیا کے بہترین ہل اسٹیشن میں ہوتا ہے جس کی بلندی (۷۰۰۰) درجۂ حرارت سال تمام میں (۶۵) کشمیر اور اوٹی سے زیادہ موسم خوشگوار اور رنگین رہتا ہے۔

رنگ ہے بو ہے ہوا ہے آب ہے ٭ آب بھی بہتا ہوا سیماب ہے
ابر کے ٹکڑوں سے ٹکراتا ہوا ٭ آسماں پر کرۂ برف آب ہے
اس زمین کے رفعتوں کا ہے یہ حال ٭ ہر ستارہ کرمک شب تاب ہے
مرغزار و وادی و کوہ و دمن ٭ جس طرف اٹھی نظر شاداب ہے
باوجود قرب و نزدیکی یہاں ٭ مہر تاباں دوسرا مہتاب ہے
گرمیٔ جذبات رنگیں کے سوا ٭ گرمیٔ مہر تپاں نایاب ہے
رشک جنت صورت باغ ارم ٭ ہر نظارہ اک حسین سا خواب ہے
چومنے رخسار گرم کوہسار ٭ گیسوے ابر سیہ بے تاب ہے
ساقیٔ فطرت ہے یاں ساغر بکف ٭ آبجو بہتا ہوا مےئے ناب ہے
آبشاروں سے رواں ہے سلسبیل ٭ قلقل مینا صداے آب ہے
شام کے خاموشیوں کے ساز کو ٭ صبح خنداں دشنۂ مضراب ہے
خواب نازِ لیلیٔ شب کے لئے ٭ نرم سبزہ بالش کمخواب ہے
انبساط کیف کی افراط بھی ٭ مستیوں میں ڈوب کر پایاب ہے
دیکھیے جس کو ہے اک تصویر شوق ٭ ہر طرف مسرور شیب و شباب ہے
کوہساروں کا تسلسل چار سو ٭ سبزۂ انگشتر نگیں تالاب ہے
مہ وشان مشرق و مغرب کے جوق ٭ یہ نظارہ اور کہیں کمیاب ہے
کشتیوں میں مہ جبینوں کے ہجوم ٭ شعلۂ جوالہ سطح آب ہے
ان کے ملبوسات کی رنگینیاں ٭ جن سے پیدا اور آب و تاب ہے
سیکڑوں جلوے ہیں تسلسل زنظر ٭ گر نظر کو دیکھنے کی تاب ہے
[illegible] کی دنیا مگر ٭ پھر بھی احساس جہانِ خواب ہے

فطرت نسوانی

سید امتیاز علی صاحب

(یاسمین صاحبہ کا مضمون پڑھنے کے بعد)

یاسمین صاحبہ کو اس کا یقین ہے کہ "مرد ایک سے دوسری دفعہ محبت کر سکتا ہے اور خیال ہے کہ خود پہلی محبت کو آسانی سے بھول کر دوسری شادی کر لیتا ہے" یعنے یہ کہ وہ مرد بیوی کے انتقال کے بعد فوراً ہی عقد ثانی کر لیتا ہے"۔ ہاں ـــ! بجا فرماتی ہیں۔ "وہ مرد دوسری شادی بیوی کے انتقال کے بعد کر لیتا ہے۔"

لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ کیوں ـــــــ !!؟؟؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے عورت کو خانہ داری کے زیور سے آراستہ کیا ہے جس سے مرد محروم ہے اس لئے مرد دوسری شادی کرتا ہے۔

عورت شمع محفل نہیں چراغ خانہ ہے اگر عورت چراغ نہ ہوتی تو گھر لو زندگی کا جنازہ نکل جاتا ... ـــــ!!

ـــ: عورتوں کو امور خانہ داری کے انصرام میں پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ مرد گھر کے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے۔ بلکہ اکثر باتوں میں جن کا تعلق امور خانہ داری سے ہے وہ عورتوں کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ امور خانہ داری کا انصرام اور بچوں کی نگہداشت اس کے پسندیدہ مشاغل ہیں"۔!

اس لئے وہ ان ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ مرد دوبارہ محبت نہیں کرتا۔ اگر کرتا بھی ہے تو وہ محبت حقیقی محبت نہیں ہوتی بلکہ انسانی و اخلاقی فرض ہے! جو محبت کا پارٹ ادا کرتا ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

(میڈم ڈی اسٹیل) نے انسانی فطرت کا قریب سے مطالعہ کیا ہے! کہتی ہیں!!

"محبت مرد کی زندگی کا حادثہ ہے عورت کی زندگی کا خلاصہ ہے"۔

(وکٹر ہیوگو) لکھتا ہے!! احساس۔ محبت۔ صبر اور ایثار عورت کی کا خلاصہ ہے

اس لئے کائنات کی تمام حقیقتوں پر ہزاروں پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔
انسان سمجھتا ہے کہ ہر پردے میں کوئی راز لطیف پنہاں ہے۔
یہ بھی ایک دھوکا ہے فطرت نے ہر تکلیف دہ حقیقت کو رنگینیوں میں چھپا رکھا ہے
ورنہ کائنات کی مصلحتیں رائیگاں ہو جاتیں۔ عورت پر اسی لئے رنگینیوں کے ہزاروں
حجاب ڈال دیئے گئے ہیں کیونکہ وہ کائنات کی اہم ترین حقیقت ہے اور اسی لئے
مہلک ترین بھی۔

حجاب نسوانی میں مضمر ہے کہ عورت اپنے حسن و کشش کا پورا احساس رکھتی
ہے وہ خود اپنی سحر کاریوں کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن رموز حسن کو عریاں کرنا
نہیں چاہتی اس لئے وہ حجاب و تغافل کا پردہ رنگین ڈالنا چاہتی ہے

یہ مسلّم ہے کہ تخلیق کائنات میں عورت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔
مقصد تخلیق صرف آدم تھے۔ حوا کو ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں جنہوں نے
مقصد خلافت کی تکمیل کی۔ مرد ایک ہستی مطلق ہے۔ لیکن عورت۔ عورت ہی
ہے عورت کی یہ فطرت ہے کہ جس امر کی ممانعت کی جائے۔ اس کی طرف لامحالہ
دوڑتی ہے۔

شجر ممنوعہ کی طرف پہلا قدم حوا نے بڑھایا ہوگا۔ آدم کو محبت نے مجبور کر دیا
کہ حوا پر نافرمانی کا الزام اور اس کی سزا عاید نہ ہو۔ اس لئے انھوں نے ارتکاب جرم
میں تعجیل کی۔ شیطان علم النفس کا ماہر ہے۔ اس نے عورت کی نفسیات سے باخبر ہو کر شجر
ممنوع کی ترغیب دی ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کو گمراہ کر دینے سے مرد خود بخود گمراہ
ہو جائے گا۔ لیکن وہ گمراہیاں جن کی ذمہ دار حسن نسوانی کی لطافتیں ہوں ان ہدایتوں سے
بہتر ہیں جو خشک فلاسفی انسانوں کے وعظ و تلقین سے حاصل ہو سکیں۔ بظاہر محبت کو ریاکاری
سے تعلق نہیں۔

مرد کی دیوانہ وار محبت میں ریاکاری درکنار معاشرت کے آداب ظاہری کے
برتنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ اس کا جنون ہی اس کا سرمایہ محبت ہے لیکن عورت
حصول مقصد کے لئے اپنی فطرت سے ہمیشہ فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ حتیٰ کہ محبت کے
ایسے خود فراموش جذبے میں وہ اپنی فطری ریاکاری کا دامن نہیں چھوڑتی

اس کی محبت پر بھی اس کی فطرت غالب رہتی ہے۔ عورت کے تمام ذریعہ جنوں سے
محبت کے مقاصد کی تکمیل ہو سکے اس کی بیہوشی میں بھی وہی ہوتے ہیں جو اس کے ہوش
و حواس کے عالم میں اس کے ہر خیال اور اس کے ہر عمل کے معاون ہیں۔ محبت کی دیوانگی
میں اس کی فطری حرکتیں بھی مکر و فریب کے سائے میں رہتی ہیں۔

"انجام نیک کے لئے ہر تدبیر جائز ہے"

اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عورت کی یہ فریب کاریاں اسے شرع محبت
کی مجرم بنا دیتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ہر عورت کی محبت میں ایک سلیقہ شعار وارفتگی
تھی یہ بھی فطرت نسوانی کی اہم ترین مصلحت ہے ورنہ وہ بے ہوش محبت کرنیوالے
کے ہاتھ سے دنیا کا شیرازہ ایک لمحہ میں بکھر جاتا۔ ہمیشہ ہر مجنوں کی بے ہوشیوں
کی تلافی ہر لیلیٰ نے کی۔

اگر کوئی دنیا کے تکلیف دہ حقائق اور زندگی کے خطرناک واقعات سے
عاجز آ گیا ہو تو اسے فوراً حسن نسوانی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اگر حقائق کے
اعتبار سے دیکھا جائے تو عورت کی کوئی مستقل ہستی ہی نہیں۔ وہ دنیا کا بہترین دھوکا
ہے۔ اس لئے خطرناک ترین بھی۔ لیکن اس کے خطرات حقائق کے خطرات سے
لطیف تر ہوتے ہیں اس لئے خطرات انسانی آسانی سے برداشت کر سکتی ہے
سب سے زیادہ گمراہ تو وہ انسان ہے جو حقیقت سمجھ کر اس کی طرف جھکتا ہے
ناکام وہی انسان ہوتا ہے جو غلط فہمی میں مبتلا رہ کر عورت سے محبت کرتا ہے
محبت ایک افسون شباب ہے اور عورت محض فریب حیات۔ یہ دونوں طلسم
زندگی کو غیر دلچسپ واقعیت سے محفوظ کر دیتے ہیں۔ اور یہی ان کی اصلی خوبی ہے
ورنہ محبت بھی دھوکا ہے۔ اور عورت بھی۔ محبت عورت کو حقیقت آشنا بنا دیتی ہے
بے وقوف انسان اس جملے کا مفہوم یہ سمجھتا ہے کہ حسن و محبت ہی میں حقیقتیں
مضمر ہیں یہ کسی حیثیت سے صحیح نہیں۔ بلکہ صحیح مفہوم بالکل اس کے برعکس ہے
چونکہ حسن و محبت زندگی کا سب سے بڑا دھوکا ہے اس لئے جو انسان اس دور
سے گذر کر صحیح دل و دماغ لے کر نکل آیا اسے دنیا کا کوئی فریب گرفتار نہیں کر سکتا
اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کے احساسات بیدار ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ بیداریاں کامیابی سے نہیں بلکہ محبت ناکام سے بیدار ہو سکتی ہیں۔ ایک کامیاب محبت جس میں انسان کو یاس و ناکامی اور کشمکش کی منزلیں درپیش نہ آئی ہوں اور مسلسل اسے نشاط و سرور کی کیفیتیں میسر رہی ہوں اس کے دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے مسحور اور حقائق سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ پھر اس کے لئے کوئی امید نہیں وہ ۱۵۹. ابد تک حقائق سے محروم رہیگا:-

---

(یہ سلسلہ صفحہ ۱۶) دوسروں کا مشورہ قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے یہ لوگ شراب بہت پیتے ہیں جوانی تو دیوانی مشہور ہے، اس عمر میں جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے۔ جوانی اور لڑکپن کے اتصال کا دور ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا اسی زمانہ میں نمایاں دماغی تغیرات ہوتے ہیں عام خیالات میں اسی زمانہ میں ضبط نفس اور قوت استدلال میں اضافہ ہوتا ہے اسکولوں اور دوسرے نصب العین کی نشو و نما ہوتی ہے یہ تمام امور جذبۂ خلل اندازی کی روک تھام کرتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ مزاحمت کو قوتیں کافی قوی نہ ہوں یا جلدی ان کا نشو و نما نہ ہو تو ان صورتوں میں جبکہ رجحان دماغی کجروی کی طرف ہوتا ہے یہ رجحان شدید تر ہو جاتا ہے۔

اس زمانہ میں عادات میں تبدیلی ہوتی ہے نئی تحریکات ہوتی ہیں نئے تجربات کی خواہشات اور مواقع پیدا ہوتے ہیں، سابقہ اقتدار کے خلاف بغاوت کی ذہنیت کام کرنے لگتی ہے اور ان تمام کے مشترکہ اثر سے ارتکاب جرم کی طرف میلان ہوتا ہے۔

ایک گروہ اور ہے جس کے متعلق ماہرین میں اختلاف ہے کہ آیا یہ گروہ کند ذہن کی تعریف میں آتا ہے یا اس سے مختلف ہے جو ماہرین اخلاقیات کو علیحدہ صفت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ان کو حمقاء اخلاق کہتے ہیں اور جو اخلاقیات کو دماغی نفسیات کا تابع مانتے ہیں وہ کند ذہن گروہ میں ان کو شامل کر لیتے ہیں اس گروہ کے افراد کو اس کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ جس سوسائٹی میں یہ ہیں اس کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے۔

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ کثرت شراب نوشی سے دماغی نقص واقع ہوتا ہے اور اس دماغی نقص کی وجہ سے لوگ کیوں اتنی کثرت سے شراب پینے لگتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلسل استعمال سے یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ چونکہ بآسانی مل جاتی ہے یا موروثی عادت سے یا خراب ماحول کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کیونکہ تجربہ اس کے خلاف ہے نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صورتوں میں ان وجوہ سے عادت ضرور ہوتی ہے مگر اسباب کو کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری وجوہ بھی ضرور ہیں بعض کا خیال ہے کہ دماغی نقص اس کا سبب ہے بعض صورتوں میں یہ بھی ایک وجہ ہوتی ہے لیکن اسکو کلی عمومیت نہیں دی جا سکتی زیادہ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک قسم کی دماغی کشمکش اس کا اصلی سبب ہے۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲)

ٹوٹے ہوئے تارے

ا ۔ محترمی خواجہ محمد عبداللہ صاحب اختر بی ۔ اے شملہ سے لکھتے ہیں۔ "آپ نے استفسارات کے تحت نہایت مفید مضامین کی دعوت دی ہے میرے لئے اس میں کوئی نہ کوئی موضوع خامہ فرسائی کے لئے نکل آئے گا۔"

اور بھی حضرات توجہ فرمائیں تو کئی مفید مضامین پر روشنی اور معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے تین مہینے سے یہ سلسلہ جاری ہے آپ نے پہل کر کے دوسروں کو بھی دعوت نگارش دی ہے دیکھئے اور کون کون حضرات توجہ فرمانے والے ہیں ایسے بہت سے استفسارات رکھے ہوئے ہیں جو باقساط شائع ہوں گے۔ یہ استفسارات فوری توجہ کے مستحق ہیں کیوں کہ مستفسر کو اپنے جواب کا بے چینی سے انتظار ہوا کرتا ہے۔

خواجہ صاحب کا جواب انہیں صفحات میں کسی جگہ بعنوان "غض بصر" نظر سے گذرے گا۔

ایک مشہور افسانہ نویس لکھتے ہیں "عرصہ ہوا میرا دل بجھ گیا ہے۔ بے حسی کی مہک تلے ایک مبہم دھڑکن کا کچھ احساس ہوتا ہے باقی کچھ نہیں۔ اب تند ہواؤں سے کوئی شعلہ بھڑکتا ہے نہ ٹھنڈے جھونکوں سے لہرانے کی ترنگ اٹھتی ہے۔ زندگی کے ایک دشوار گذار راستہ پر چلا جا رہا ہوں۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو پکارنے والوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ آگے بڑھتا ہوں ٹھوکریں، نشیب و فراز اور پست ہمتیاں، واپسی اور فرار ساری تھکی ہوئی امیدوں کو اپنے ساتھ گھسیٹ رہا ہوں۔ اور یہی میری زندگی کی تلخ کامیاں تھیں جنہیں میں آپ سے چھپا رکھنا چاہتا تھا اب اظہار کئے بغیر چارہ نہیں ورنہ میری لاجوابی کو آپ نجانے کن کن باتوں پر محمول کریں ...... اختر الہ ہے۔

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں ÷ اب وہ رعنائی خیال کہاں

ایک مختصر سا افسانہ سرانجام ہو سکا شہاب کے لئے بھیج رہا ہوں۔ آئندہ بھی آپ کو ضرورت پڑے مجھے لکھ بھیجئے میں جس حال میں رہوں گا آپ کی خدمت کے لئے دل کا کوئی نہ کوئی گوشہ نکال لوں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میری افسانہ نگاری کا سرچشمہ وہی میرے احساسات ہیں

میری افسانہ نگاری صرف اپنے لئے ہوتی ہے اور کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔ گمنامی اور کسمپرسی کے اندھیرے میں اپنے دل کی مشعل جلائے بیٹھا ہوں۔ اس کی روشنی نہ صرف میرے لئے ہے۔ دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ دنیا والے ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ نئی نئی کرنوں کے اجالے ان کے راستوں پر بچھے ہوئے ہیں۔ مجھے اندھیری تنہائیاں پسند ہیں۔ میں جواب اپنے آپ کو جانے لگا ہوں یہی میرے لئے بس ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی۔ لیکن آپ کی ذرا سی کوشش آپ کو سینکڑوں نوخیز اور بھڑکیلے افسانہ نگاروں سے تعارف کرا دیں گے۔ اپنے پرچے کو نئے تقاضوں کا ہم آہنگ بنائیے رجعت پسند اور ماضی کی یادگاروں کو ان کے حال پر چھوڑتے جائیے۔ مجھ سے جو افسانہ نگار ہے نئی راہ کے تازہ قدم قافلہ میں مجھے شریک نہیں ہونے دیتا۔ میں کیا کروں میں اسے چھوڑ کر اکیلا رہ جاؤں گا۔ اس لئے جہاں ٹھہرا ہوا ہوں وہیں ٹھہرا رہتا ہوں اگر اس قافلہ کو منزل نہ ملے اور وہ لوٹے تو مجھے اپنے ساتھ لے لے۔"

حوادث سے مقابلہ کر کے زندگی کو خوشگوار بنانا خود ایک زندگی ہے۔ آپ ابتدا ہی میں اتنے مایوس کیوں ہیں؟ اگر زندگی میں آسانیاں ہوں تو پھر جینا ہی دشوار ہو جائیگا۔ اس لئے آپ کو کشمکش میں اپنا آپ مستقبل بنانا چاہیئے۔ اپنے احساسات ہی بہترین افسانہ ہو سکتے ہیں بجائے اس کے کہ دوسروں کے احساسات کو افسانہ کی شکل دیجائے۔ دنیائے افسانہ نگاری آگے بڑھ گئی ہے تو بڑھنے دیجئے آخر قدامت پسندی کا بھی تو کوئی ترجمان ہونا چاہیئے جب کہ سب کے سب ترقی پسند ہو جائیں تو باہمی تقابل کیونکر ہو سکے گا۔ وہ دور دور نہیں جبکہ تیز گام قافلہ اپنی سرعت رفتار کو پہونچ کر دہیا پرانی ڈگر پر واپس آجائے۔ آپ لکھئے جب فرصت ملے کم از کم ایک فرد تو ایسا ہے جو آپ کے نگارشات کا ثنا خواں ہے۔

۴۔ اس خطا پر تو نہ مارئیے کہ خطاوار ہی نہ تھا۔ پھر یہ آپ شہاب کے موقوفی کا کیوں نوٹس دیتے ہیں اگر وہ آپ کے پسند نہیں ہے تو چھوڑ دیجئے۔ مگر جھوٹا الزام قابل پذیرائی نہیں ہو سکتا کہیں یہ مطالبہ چندہ کی سزا تو نہیں ہے۔

"غضِ بصر"

شہاب بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۷ء میں محترمہ نزہت آرا نے "غضِ بصر" کے متعلق استفسار فرمایا ہے۔ اس کا مذکور قرآن (۲۴/۳۰) میں ہے اور دونوں مرد اور عورت کے لئے ایک ہی ہدایت ہے کہ "قل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم" اور "قل للمؤمنٰت یغضضن ابصارہم"۔ یعنے اے رسول مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو ہدایت کرو کہ اپنی نظروں میں سے خاص نظریں بند رکھیں۔ غض، کے معنے ہیں پوشیدہ رکھنا۔ یا روکنا۔ پابند کرنا۔ یہ قرآن کی بے مثل بلاغت ہے کہ ایسی بات جسے کھلے لفظوں میں بیان کرنا حیا اجازت نہیں دیتی ایسے لفظوں میں ادا کی ہے جو حیا کے مناسب ہیں یہ ظاہر ہے کہ یہ نگاہیں کیا ہیں؟

ملاقی دل سے دل کو ہے براہ راست خاموشی
جو محرم ہے زباں کا وہ نگہ سے کام لیتا ہے

اگرچہ یہ آیت منجملہ ان آیات کے ہے جو پردہ کے متعلق ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنکھیں بند کی جائیں یا ان پر نقاب ڈال لیا جائے۔ اصل میں وہ خیالات ہیں جن کی ترجمانی یہ خاص نگاہیں کرتی ہیں انہیں دل میں جگہ نہ دینی چاہیئے۔ چونکہ خیالات حواس کے ذریعہ دل میں پیدا ہوتے اس لئے ہدایت ہے کہ ان کی حفاظت کرنی چاہیئے اسلام میں پردہ اسی حد تک ہے جس سے بے حیائی کا سد باب ممکن ہے۔ اس کے متعلق مزید ہدایات (۲۴/۳۱) بھی ہیں کہ جس طرح نگاہیں جذبات کا خاموشی سے اظہار کرتی ہیں اسی طرح طرز گفتگو بھی ایسی باتوں کی طرف اشارۃً توجہ دلاتی ہے اگرچہ صاف لفظوں میں نہ کہی جائے مگر جن کے دل میں روگ ہے وہ کچھ اور توقع کرتے ہیں۔ اس لئے ہدایت ہے کہ جوبات کسی نامحرم سے کبھی دبی زبان میں نہ کہیں کھری کھری کہیں اور پاکدامن عورتوں کے شایاں یہی ہے کہ وہ ایام جاہلیت کے عام رواج کے مطابق بناؤ سنگار کرکے کھلے بندوں اٹھلاتی نہ پھریں۔ اور نہ اپنی زینت کی چیزوں زیورات وغیرہ کو نامحرموں کے سامنے کھلا رکھیں۔ پردہ کے متعلق تو قرآن میں بھی کچھ ہدایات ہیں۔ اس سے

زیادہ سختی جو کچھ ہے وہ مردوں کی طرف سے ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری ان ہی پر ہے
مثلاً گھر کی چار دیواری میں بند رکھنا یہہ سزا قرآن نے (۲۴) ایک خاص قسم کی بے حیا عورتوں
کے لئے تجویز فرمائی ہے جو لوگوں کے گھروں میں اسی غرض کے لئے آتی ہیں پاک دامن ناکردہ
گناہ عورتوں کو اس طرح بند رکھنا ظلم ہے۔ اور ایسا پردہ جس کا اثر ان کی صحت
پر پڑھتا ہے یا ان کو کسی معینہ قومی یا ملکی کام سے مانع ہے قطعاً ناجائز ہے۔ عورت
ایک محترم ہستی ہے اور جہاں وہ ہو "حرم" ہے جہاں سوق وحدل ممنوع ہے وہ قوم
ذلیل ہے جس قوم کی عورتیں ذلیل ہیں۔ کیونکہ وہ اولاد کی پرورش و تربیت ذلت میں
کرتی ہیں عورتوں کے حقوق ایسے ہی مردوں پر ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر، اور
مردوں کو بے حیائی سے روکنے والی عورتیں ہی ہیں اور مرد قوام ہیں جو ان کا جان و مال
عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہہ ایک مستقل موضوع ہے۔ پردہ کے متعلق یہی کافی ہے

سنہری روشنی کی تلاش میں

(جناب سعید رضی)

(ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما کی
ایک نظم سن کر)

جب پُرخطر وادیوں میں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر بہنے والے دریا کی طرح میں مصیبتوں میں اپنا راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہوں تو میرے دل سے اندیشوں کے سارے بھوت، سارے کانپتے ہوئے سائے، تاریکی کی ساری پرچھائیاں دور ہٹ جاتی ہیں۔ میں آگے ہی کو بڑھتا جاتا ہوں کیوں کہ مجھے سنہری روشنی کی تلاش ہے جو ہر صبح مشرق کے ماتھے سے پھوٹتی ہے۔

چلتے چلتے جب اندھیری رات آنے کو ہوتی ہے تو پھر مجھ میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ میں شفق دیکھنے کے لئے وادی سے اوپر چڑھ آؤں۔ مجھے یہ جلد ہی غائب ہو جانے والی زرد روشنی بے چین کر دیتی ہے اور آنے والی پہاڑ سی رات کا تصور میری روح پر چھانے لگتا ہے۔ اس سمے چٹانوں کو سونا مل مل کر نہاتے ہوئے ایک نظر دیکھ کر میں سر جھکائے چل پڑتا ہوں۔

— اور جب قدم اُٹھاتے اٹھاتے میری ہمت جواب دینے کو ہوتی ہے اور تاریکی ہی تاریکی سے میں ہر طرف سے گھر جاتا ہوں، ٹٹول ٹٹول کر، تنہائی کا بوجھ اُٹھائے مجھے اونچے نیچے اوبڑ کھابڑ راستے پر گزرنا ہوتا ہے تو تم جانتے ہو میرا دل کیوں بیٹھ نہیں جاتا۔ میں ہمت کیوں نہیں ہار جاتا، مایوسی سے سر ٹکرا ٹکرا کر ختم کیوں نہیں ہو جاتا؟ — رات کے تیز سناٹے میں سنسان ستاروں کی مدھم روشنی مجھے چٹانی راستہ سجھائی دیتی ہے۔۔

پھر میں اندھیرے کو چیرتا ہوا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، راستہ ٹٹولتا ہوا بڑھتا ہوں، بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں تو ہمت جواب دے جانے تک، جب میرے پاؤں کے آبلے پھوٹ پھوٹ جاتے ہیں آخرکار چٹانوں کی چوٹیاں صبح کی سنہری روشنی کے تاج پہنتی نظر آتی ہیں

میرے سارے آبلے پھول بن جاتے ہیں، اور میں تھکن کو کچھ دیر کے لئے بھلا کر راستے سے پرے گر تا پڑتا کسی چٹان پر چڑھ جاتا ہوں اس وقت مغرب میں رات کے مونس سفر ستاروں کا آخری کارروان ڈوبتا نظر آتا ہے۔ اور افق پر مشرق میں دور حد نظر پہ سنہری روشنی کا حباب سا نظر آتا ہے۔ پھر میں وادی میں اتر کر پہاڑی پگڈنڈی پر اسی روشنی کی سمت تیزی سے بڑھتا جاتا ہوں، بڑھتا جاتا ہوں۔ اور جب میرے انگ انگ جواب دے جاتے ہیں تو میں وفور مسرت کے مارے تھک کر کسی پتھر پر بیٹھ جاتا ہوں اور سر جھکا لیتا ہوں ——— آہ! مشرق کی سحر آگیں سنہری شفق ——— سدا آورش:—

مجھے دفعتاً احساس ہوتا ہے میری منزل تو کہیں نہیں، اور اسی پر اسرار روشنی کی ایک جھلک دیکھنے اس کے قریب پہنچ جانے، اس کو پالینے کے لئے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور پھر سر جھکائے چل پڑتا ہوں ——— چلتے چلتے سوچنے لگتا ہوں کہ شفق کو کبھی پا سکوں گا۔؟؟

(بسلسلہ صفحہ ۱۶) دوسری نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی، استعمال کرنے والے کو جرائم کی طرف مائل کرتا ہے کیونکہ نشہ آور اشیاء کا زیادہ استعمال دماغی اختلاط کا باعث ہوتا ہے اور اس اختلاط کے سبب سے دماغ میں نقص پیدا ہوتا ہے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ کہ جن لوگوں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ہر قسم کے جرائم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو صرف جرائم خلاف مال کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بعض جرائم خلاف جسم انسانی کے پھر ان میں سے بھی بعض معمولی جرائم پر اکتفا کرتے ہیں یعنی چھوٹی چھوٹی چوریاں کر لیں جیبیں کاٹ لیں۔ مار پیٹ پر اتر آئے بعض سنگین جرائم جیسے قتل۔ ڈاکہ وغیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ بعض ایسے ملیں گے جو صرف جنسی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں بعض فحش کلامی۔ خلاف تہذیب افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور بعض صرف سیاسی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان پر قابو پانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہوں گے۔ اصلاح کے لئے بھی الگ الگ صورتیں اختیار کرنی پڑیں گی وہ طریقے خواہ کچھ ہی ہوں۔ لیکن تشدد کو بہرحال اس میں دخل نہ ہوگا کیونکہ اس قسم کے لوگوں کی اصلاح تشدد سے ہرگز نہیں ہو سکتی برخلاف اس کے اور ان کی حالت ابتر ہو جائیگی۔ آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں جو نظریہ میں نے پیش کیا ہے اسے قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ تجربات کا سلسلہ جاری ہے اور ہو سکتا ہے کہ بعد کے تجربات سے یہ نظریہ بھی غلط پایا جائے اور جرائم کی اقسام سے متعلق دوسرے ہی انکشافات ہوں اور ظاہر ہے کہ جرائم کے نظریہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اصلاح اور روک تھام کے اصول بھی بدل جائیں گے فقط

مجرموں کی نفسیات

(جناب محمد یحییٰ صاحب)

جرائم کا ارتکاب ہر ملک ہر زمانہ اور ہر سوسائٹی میں ہوتا رہا ہے اور شاید ہوتا رہے گا۔ ممکن ہے بعض خوش عقیدہ حضرات کو مجھ سے اتفاق ہو اور وہ کہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جب جرم کے نہ اسباب رہیں گے نہ ضرورت۔ مگر معاف فرمایئے میں اتنا خوش عقیدہ نہیں ہوں البتہ یہ امید ضرور رکھتا ہوں کہ شاید ایک دور ایسا آئے۔ جب جرائم کی بہتات نہ رہے اس لئے جرائم کے روک تھام کی ہر ممکنہ سعی کی جارہی ہے۔ اور وہ سعی ہے سائنٹفک اصولوں پر مجرمانہ ذہنیتوں کی اصلاح کی۔

ماہرین جرمیات کو یہ سوال ہمیشہ دعوت فکر دیتا رہا ہے کہ آخر جرائم کے اسباب کیا ہیں کیونکہ جب تک سبب کا تعین نہ ہو انسداد کے لئے کوئی اقدام بھی کامیاب نہیں ہو سکتا جس طرح کسی مریض کا کامیاب علاج کرنے کے لئے مرض کا تعین ہونا ضروری ہے اسی طرح جرائم پر قابو پانے کیلئے صحیح اسباب کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔

ابتداءً خیال یہ تھا کہ مجرم بھی عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے اور وہ بلا کسی خاص خارجی یا داخلی سبب کے جرائم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اس لئے اس کا واحد علاج یہ سمجھا گیا مجرم کو سزا دیجائے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بدل گیا اور سمجھا جانے لگا کہ انسان غربت کی وجہ سے برے ماحول کے اثرات کے تحت جہالت کے سبب بری تربیت کی بنا پر یا نشہ بازی کے باعث جرائم کا ارتکاب کرتا ہے یہ صحیح ہے کہ ان اسباب کی بنا پر بہت سے جرائم واقع ہوتے ہیں۔ لیکن صرف اسی کو اصل سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہر غریب۔ ہر وہ شخص جس کا ماحول اچھا نہیں ہے۔ ہر جاہل۔ ہر غیر تربیت یافتہ شخص اور ہر نشہ باز مرتکب جرم ہوا کرتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ لاکھوں۔ کروڑوں جاہل نشہ باز غیر تربیت یافتہ افراد باعزت زندگی گذار رہے ہیں اور بہت سے دولتمند ایسے ہیں کہ جن کا جرم ان اسباب میں سے کسی سبب کا نتیجہ نہیں ہے۔ لہذا یہ نظریہ بھی غلط ٹھیرا۔

جرم کے اسباب کے بارے میں جدید ترین نظریہ مجرمین کے نفسیاتی تجربہ کے بعد قائم

کیا گیا ہے۔ تجربہ سے پایا گیا ہے کہ مستثنیات کو چھوڑ کر بالعموم جرائم کا ارتکاب ایسے لوگ کرتے ہیں جن میں یا تو دماغی نقص ہوتا ہے یا جسمانی۔ ان نقائص سے جو اثرات رونما ہوتے ہیں انھی کو ہم مجرم کی نفسیات کہتے ہیں۔

دماغی نقص کے کئی مدارج ہیں۔ انتہائی درجہ دیوانگی ہے۔ اس نوبت پر انسان کو اپنے افعال کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا کر رہا ہے اور جو کچھ کر رہا ہے وہ بھلا ہے یا برا۔ قانون کی عائد کی ہوئی پابندیاں اس کے لئے بے معنی ہوتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں دماغی نشو و نما قطعی ہوتی ہی نہیں۔

جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے۔ اعضاء جسمانی بھی بڑھتے ہیں نہ صرف اعضاء جسمانی بلکہ ساری صلاحیتیں نشو و نما پاتی رہتی ہیں۔ ایک معینہ پروگرام کے مطابق بچہ غوں غاں کرتا۔ کھسکتا۔ چلتا۔ باتیں کرنا شروع کرتا ہے۔ اگر کسی نوبت پر کوئی صلاحیت بچہ میں پیدا نہ ہو تو والدین کے لئے پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ بعض اعضاء یا صلاحیتوں کے نشو و نما رک جاتی ہے۔ دماغی نشو و نما بھی مختلف عمروں کو پہونچکر رک جاتی ہے اگر دو سال تک نشو و نما ہو اور اس کے بعد رک جائے تو ایسے لوگ فاتر العقل یا گھامڑ کہلاتے ہیں۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی ایسے لوگوں کی دماغی صلاحیت دو سال کے عمر کے بچہ کی ہی رہتی ہے۔ ان کی حالت بھی کم و بیش مجنوں کی سی سمجھی جاتی چاہئے

تیسرا درجہ وہ ہے جس میں دماغی نشو و نما سات برس کی عمر تک تو ہوتی رہتی ہے اس کے بعد رک جاتی ہے ان کو آپ احمق سمجھ لیجئے۔ ممکن ہے یہ ان کی صحیح تعریف نہ ہو لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا لفظ بھی نہیں ہے جو ان کے لئے استعمال کیا جاسکے۔

چوتھا درجہ ان لوگوں کا ہے جن کی دماغی نشو نما (۱۲) برس کی عمر تک ہو کر رک جاتی ہے۔ ان کو کند ذہن کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ مساعد حالات میں تو معاش فراہم کر سکتے ہیں لیکن اتنے سمجھدار نہیں ہوتے کہ اپنے حالات کو ٹھیک کرسکیں یا دوسروں سے مقابلہ کرکے کامیاب ہوسکیں۔ ضرورت اسکی ہوتی ہے کہ خود ان کو بچانے کے لئے اور ان سے دوسروں کو بچانے کے لئے ان کی نگرانی کی جائے اور ان کو قابو میں رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو جرائم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں ان سے کمتر درجہ کے لوگ یعنی احمق جرائم کے ارتکاب کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہزاروں مجرموں میں کہیں ایک احمق پایا جاتا ہے

[illegible]

کی مناسبت سے ہے۔

یہ سارے نقائص دوامی اور ناقابل علاج ہیں۔ کبھی کبھی کثرت شراب نوشی سے بھی دماغی نقص واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا نقص خارج از بحث ہے۔ کیونکہ اس کا علاج ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ فاتر العقل۔ احمق اور کند ذہن کو ان معنی میں نہ لیجئے۔ جن میں روزمرہ استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ کبھی کبھی ہم آپ بھی اچھے خاصے شخص کو کسی غلطی پر گھامڑ۔ احمق کہہ دیتے ہیں۔ بلکہ ان ہی معنی میں لیجئے جن میں ماہرین جرمیات نے استعمال کیا ہے۔ ہر وہ شخص جس میں دماغی نقص ہو کم از کم بالقوہ مجرم ضرور ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے افعال کی ماہیت اور نتائج کو کماحقہٗ سمجھ نہیں سکتا۔ اس میں اپنے دماغی نقص کی وجہ سے قوت ارادہ کا فقدان ہوتا ہے اپنے افعال پر اسے پوری طرح قابو نہیں ہوتا۔ اگر ان کی معقول نگرانی اور صحیح رہبری کی جائے تو ان کو بآسانی جرائم کے ارتکاب سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن آزاد چھوڑ دیے جانے کی صورت میں یہ ہمیشہ سوسائٹی کے لئے خطرہ بنے رہتے ہیں۔

سیدھی ڈگر پر چلنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے افعال کی ماہیت کو سمجھے ساتھ ہی ساتھ اس میں قوت ارادہ اور خود پر قابو پانے کی صلاحیت بھی ہو تجربات کے دوران میں ایسے بہت سے مجرمین سے جو بظاہر اتنے سمجھ دار تھے کہ اپنے افعال کی ماہیت کو سمجھ سکیں انھوں نے ماہرین کو شبہ میں ڈال دیا کہ غالباً نقص دماغی کو جرم کا سبب قرار دینے میں انھوں نے غلطی کی ہے لیکن مزید غور و خوض سے پتہ چلا کہ ان لوگوں میں تو قوت ارادہ ہے اور نہ خود پر قابو پانے کی صلاحیت اسی وجہ سے یہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

بعض مجرم ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں دماغی نقص ہونے کے باوجود یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بعض خاص صلاحیتیں ہوتی ہیں جن سے ان کے ذہنی نقص کی تلافی ہو جاتی ہے اور وہ نہ صرف بادی النظر میں بلکہ ابتدائی تجربات میں بھی اچھے خاصے معلوم ہوتے ہیں۔ بار بار کے تجربات سے ان کا دماغی نقص ظاہر ہوتا ہے ان کے برخلاف بعض مجرم ایسے ہوتے ہیں جن میں کوئی دماغی نقص تو نہیں ہوتا۔ لیکن جو بعض صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں ان صلاحیتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بھی اس شخص کی سی ہو جاتی ہے۔ جس کے دماغ میں نقص ہوتا ہے۔

مجرمین ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن میں دماغی نقص تو نہیں ہوتا اس کے باوجود ان کی دماغی صلاحیتیں معیاری نہیں ہوتیں۔ یہ تحت الطبعی مجرمین کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق ایسے ماحول سے ہوتا ہے کہ جس میں ہر شخص کا دماغی معیار بہت بلند ہوتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ایسے لوگوں میں

احساس کمتری پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر دماغی کشمکش شروع ہو کر ارتکاب جرم کی طرف مائل کر دیتی ہے اگر ایسے لوگوں کو اس بلند معیار والے ماحول سے نکال کر ایسے ماحول میں پہنچا دیا جائے جس میں سب انہیں جیسے ہوں تو نہ احساس کمتری پیدا ہوگا نہ دماغی کشمکش ہوگی اور نہ وہ جرائم کی طرف مائل ہوں گے۔

مجرموں میں ایک گروہ مصروعوں کا ہوتا ہے علاوہ شدید اور معمولی حملہ کے صرع کی دو حالتیں ہوتی ہیں یا تو وہ "مابعد الصرع غیر ارادی حرکات" کی حالت ایسی معمولی حملہ کے بعد ہوتی ہے اور جو افعال سرزد ہوتے ہیں ان کے متعلق یہ محسوس ہوتا ہے کہ بالقصد کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا یا "مترادف المصرع حالت" جس میں دورہ ہونے کے بجائے ایک غیر شعوری حالت پیدا ہو جاتی ہے اور مختلف دماغی حالات رونما ہوتے ہیں۔ اس حالت میں جو افعال سرزد ہوتے ہیں ان سے متعلق مصروع کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ نہیں بتا سکتا کہ دورہ کی حالت میں اس سے کون سے افعال سرزد ہوئے۔

ان لوگوں سے دونوں حالتوں میں تشدد آمیز افعال کا ارتکاب عام طور پر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لوگ جنسی جرائم کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ تحت الطبعی مجرموں کی طرح ان کو بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ دوسروں جیسے نہیں ہیں اس احساس سے دماغی کشمکش شروع ہوتی ہے جو ان کو جرائم کی طرف راغب کرتی ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اپنے مرض کی وجہ سے یہ کوئی کام نہیں کر سکتے بے روزگار رہتے ہیں اور نتیجۃً افلاس کا شکار ہو کر جرائم کے ارتکاب پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مصروع کی طرح دماغی مریض ہیں جو نہ دیوانے کہے جا سکتے ہیں نہ صحیح معنی میں ناقص الدماغ لیکن بہرحال ان کی دماغی صلاحیتیں معیاری نہیں ہوتی ہیں۔ اسلئے یہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ لوگ کچھ فطرتاً جرائم کی طرف مائل ہوتے ہیں اس دماغی مرض کے شکار کئی نوعیت کے ہوتے ہیں بعض تو وہ ہیں جو باوجود ہر قسم کے سماجی اور تعلیمی مفادات حاصل ہونے کے جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں اسلئے نہیں کہ یہ تقدیر کے ہیٹے ہوتے ہیں بلکہ ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے ان کو یہ انجام دیکھنا پڑتا ہے ان میں ننگ و عار والی عزت تو ہوتی ہے مگر کچھ کر دکھانے کی مستقل مزاجی کا فقدان ہوتا ہے نہ تو ہدایت کا دامن چھوڑنے ہی ہوتی ہے نہ قوت فیصلہ۔

بعض لوگوں کو ہمیشہ سمجھ بیٹھتا ہے اور وہ بہت بڑے ... عادتاً ہر معاملہ میں پیش پیش رہنے کی کوشش کرنے اور بڑا بننے کے خود بیں ہوتے ہیں یہ ان خصوصیات کی وجہ سے عام طور پر سبھی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں میں حد سے باقی ... پیدا کر دیتی ... کوئی جنسی عارضہ نفسی یا بدایت پائی جاتی ہے۔

بعض ایسے اشخاص جو نہ تو مجنون کہے جا سکتے ہیں نہ ناقص العقل اور نہ مختل الاعصاب پھر بھی جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے دوسروں سے کمتر ہوتے ہیں اور اسی خست کی وجہ سے اوسط زندگی گذارنے کے قابل نہیں ہوتے یہ لوگ عام طور پر غیر متوازی ہوتے ہیں مزاحمت کی قوت کم ہو جاتی ہے

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲)

شاعر کی موت

(ایک سچا افسانہ)

جناب اسماعیل احمد صاحب بینائی
ایم - اے - ال - ال - بی -

جیسے بہار کی ایک صبح کسی سرسبز چمن میں گلاب کی پہلی کلی کھلتی ہے اور چاروں کونوں سے آ آ کے بھونرے اُس کے گرد پھرتے ہیں، اسی طرح بدایون شہر کے ایک شریف، متمول، زمیندار کے ہاں بچہ پیدا ہوا، اور گھر بھر اُس پر نثار ہونے لگا۔

بچپن میں حسین و جمیل نہیں تھا۔ لیکن کالی چمکدار آنکھیں، اور ہنس مکھ چہرہ رکھتا تھا، شوخ، شریر، مگر شریف۔ جوانی میں بانکا اور شکیل نہیں تھا، پھر بھی رنگ گندمی تھا، اور کھلتا ہوا، جسم اکہرا تھا، مگر بھرا اور گٹھا ہوا، قامت سیدھا تھا اور موزوں۔ مزاج و طبیعت، شوخ چشم و دل سیر، اور جذبات و افکار شاعرانہ۔ بڑھاپا دراصل آنے ہی نہ پایا، آخیر عمر میں چہرہ متین ہو گیا تھا، مزاج سنجیدہ، جسم لاغر اور نگاہ تیز تر۔

بچپن، کھیل تماشے اور لاڈ پیار میں گذرا، جوانی، مکتب کالج اور یونیورسٹی کے ہنگاموں، گھر اور باہر کی محفل آرائیوں، ایک صرف ایک دلربا اور دل نواز ہستی کے خیال و جستجو میں گذری، اور جب وہ نہ رہی تو اُس کی یاد میں، مگر وہ کیا نہ رہی کچھ نہ رہا۔ کئی برس۔ اسی سوگ میں بیٹے۔ اس کے بعد؟ شاعر طبیعت خیالی اور بے عمل، اس پر یہ غم، انتظام جائداد کا بگڑ گیا، وکالت میں دل نہ لگا، اور گھر کا خرچ رہا وہی شاہانہ، خود ناز پروردہ، بیٹا بیٹی ناز پروردہ، پھر اب کیا ہو؟ یہ سچ ہے کہ طبیعت کی موزونی نے، تعلیم نے، تکلیفوں نے دل کو گداز کر کے زبان کو اس کی لونڈی بنا دیا تھا، اور فکر و خیال کو اُس کا غلام۔ مگر کیا شاعری کی جنس بے بہا کو بازار میں لاتا، اور اُس پر بولی لگواتا، یہ ہیرا ہزار میں، یہ لعل لاکھ میں، اور یہ موتی مفت — ہرگز نہیں، یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں، قیمت ان کی نہ سو ہے نہ ہزار، نہ لاکھ، پھر معاش کی کیا سبیل ہو؟ در در جاؤں، ہاتھ پھیلاؤں؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ خداوندا یہ کیا خیالات آج ستاتے ہیں۔ تو پھر نوکری کیا؟ زمیندار کا لڑکا اور نوکری بھاتے کروں، پر یہ نہ کروں، مگر کہتے ہیں صاحب عزت بھی تو نوکری کرتے

ہیں، پھر مجھے تو ایک سیر چشم، عالی ذوق، امیر ابن امیر، رائے رایاں بلا رہا ہے۔ اچھا یہی سہی۔ چل اے دل مقلد ذرا آزمائیں۔

یہ سوچ کر دہ اتر سے دکھن آیا، اور بڑی عزت و وقار کے ساتھ زندگی کا ایک دور یہاں گذارا۔ بھیک نہ مانگی، کہیں جا کے پڑ نہیں رہا، ہاتھ پیر مارے اور روزی کمائی مگر گردش روزگار نے تو جیسے اپنی لپیٹ میں لیا، سو لیا۔

ملازمت گئی، بیٹی مری، بیوی مری، لڑکے جوان بنے۔ مگر بے روزگار رہے پھر رہا کون؟ ایک وہ خود تو وہ بھی گیا۔ یہ سب بار یکایک جو اس ناز پروردہ کے کاندھوں پر پڑے، تو زبان سے اُف نہ کی، مگر دل بجھ گیا، صحت جواب دے بیٹھی، اور اس کی جوان جولان طبیعت غم کے بے تھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔

اب جو اس شخص کو دیکھتا، حیران رہتا، باتیں اب بھی وہ ہنس ہنس کے کرتا تھا، فقرے شوخ انداز میں چست کرتا تھا، اور ملتا ملاتا تھا صاف دل اور بے شکن پیشانی سے، مگر نظر والوں سے بزبان خاموشی کہتا کہ ؎

وہ جام ہوں جو خون تمنا سے بھر چکا   یہ میرا ظرف ہے کہ چھلکتا نہیں ہوں میں

بارہ برس ——— خداوند !! اور کیسے بارہ برس۔ مصیبت و ناداری کے، بیماری آزاری کے !! کمال کی ناقدری کے، بغض کے، حسد کے، طعن و تشنیع و تعصب کے !!

میری شہرت ہے دور دور، گاؤں گاؤں، شہر شہر میرا نام لیا جاتا ہے۔ بوڑھے، بچے اور جوان میرے شعر پڑھتے ہیں، اور میں؟ .... گھر بار کو چھوڑے مسافرت میں پڑا ہوں، میں اور میرے بچے، بیمار و ناتوان ہوں، اور میں اندر اندر سلگ رہا ہوں۔ آج کے آذوقے کی ٹھیک ہے نہ کل کے رزق کا انتظام، حالانکہ دنیا میرے اشعار کو ہیرے موتی اور لعل بتلاتی ہے، اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ اردو شاعری کا خزانہ، ان سے مالا مال ہو رہا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے، مگر پھر؟ لوگ میرے ظرف اور رکھ رکھاؤ کی قسم کھاتے ہیں۔ مگر پھر؟ شاید یہ امتحان ہے۔ مراد یہ ہے کہ وضعداری میں فرق نہ آنے پائے۔ ایسا کچھ کر کے چلوں یاں کہ، بہت یاد رہوں، اچھا تو اے بے نیاز حقیقی یونہی رہے گا، اور بیشک تو ہی میرا مددگار ہے۔

اب سے جو کوئی اس زندہ درگور کا حال پوچھتا، تو ہنس کر کہتا، مالک کا شکر ہے

کہئے آپ کا مزاج کیسا ہے ...... ؟

...... کے دن صبح کے وقت، ایک جنازہ ملّا پلی کے سرکاری مکانوں سے نکالا گیا، اور خطہ صالحین کی طرف کاندھوں کاندھوں روانہ ہوا۔ چند لوگ ہمراہ تھے، چپ، خاموش، آبدیدہ، آہستہ آہستہ چل رہے تھے، اکثر کے دلوں میں اور چند کی زبانوں پر یہ شعر تھا ؎

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب ۔۔۔ کچھ فرق چاہئے تھا، موت اور زندگی میں

"کون مر گیا؟" "کب مر گیا؟" راہ گیر بڑھ بڑھ کر پوچھنے لگے، کوئی کہتا تھا کہ کون مر گیا، عرصہ سے وہ زندہ کب تھا جو آج مر گیا۔

بزم کہکشاں

دل

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا ۔۔۔ دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی ۔۔۔ ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا ۔۔۔ آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں ۔۔۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ۔۔۔ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد ۔۔۔ کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب ۔۔۔ آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب ۔۔۔ اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی ۔۔۔ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی ۔۔۔ گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا ۔۔۔ تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا

اشرف زیم

گونڈوں میں شادی

از جناب سلطان عادل خان صاحب

ضلع عادل آباد میں کاروبار کے سلسلہ میں ایک گاؤں میں جانے کا بارہا اتفاق ہوتا ہے یہ عادل آباد سے (۱۸) میل جانب شمال مغرب ہے، پہاڑوں سے گھرا ہوا ہونے کی وجہ سے راستہ بہت دشوار گذار ہے اور اسی وجہ سے وہ مقامی شکاریوں کے دستبرد سے محفوظ بھی ہے۔ چنانچہ اس گاؤں کے اطراف واکناف ہر قسم کے جنگلی جانور بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں شکار کا شوق چونکہ بہت پرانا ہے ہم بھی ہر سال نہیں تو کم از کم دو سال میں ایک آدھ دفعہ وہاں کا چکر ضرور لگا آتے ہیں چنانچہ ماہ اپریل سنہ ۴۶ء میں بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا یا تو اسے مصلحت پروردگار سمجھئے یا جانوروں کا تقاضائے زندگی ہمارے پہنچتے ہی بڑے زور و شور کی غیر معمولی بارشیں ہوگئیں اور پانی دور دور تک پھیل گیا۔ جب رنگ چمن ہی ایسا ہو تو کوئی دل کی آگ کیونکر بجھائے۔ اب شکار ملنے کی امید پندرہ دن تک باقی نہ رہی کہتے ہیں "شکار کار بیکاران است" مگر جب شکار ہی نہ رہا تو واقعی ہم بیکار ہوگئے۔ کچھ نہ کچھ مشغلہ تو ہونا ہی تھا اس لئے ایک نئی دھن سمائی کہ ہم اپنے گاؤں کے رہنے والوں کے کچھ حالات معلوم کریں۔ چنانچہ اس کام میں تن دہی سے جٹ گئے۔ اس گاؤں میں سارے کے سارے گونڈ رہتے ہیں۔ یہ وہ قوم ہے جو عادل آباد کے جنگلوں میں رہتی ہے۔ یوں تو ہم نے بہت سی باتیں معلوم کیں مگر جو چیز سب سے اہم تھی وہ ایک شادی تھی جو ہم نے تفصیلاً دیکھی، گو یہ ایک ایسی چیز ہے جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جس کی تصویر کھینچنے کے لئے قلم قاصر ہے لیکن حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اصلیت تحریر کے ذریعہ پیدا کی جائے اور پڑھنے والوں کو اس سے لطف اندوز کیا جاسکے۔

گاؤں کی آبادی کل دو سو افراد پر مشتمل ہے ان کی زبان بہت ہی گنوار قسم کی ہوتی ہے جو کسی طرح بھی کانوں کے لئے خوشگوار نہیں ہے۔ ان کے لباس بہت ہی عجیب قسم کے ہوتے ہیں عورتیں صرف ایک کپڑا استعمال کرتی ہیں عموماً یہ میل خوردہ ہوتا ہے آدھا یہ باندھ لیتی ہیں اور آدھا سینے پر ڈھک لیتی ہیں۔ مرد صرف ایک لنگوٹی باندھ

ہے سینہ کھلا رہتا ہے اور صرف خاص خاص تیوہاروں میں یہ قمیص پہنتے ہیں۔ یہ لوگ حد درجہ کثیف ہوتے ہیں۔ نہاتے بہت کم ہے اور کپڑے بس برائے نام ہی دھوتے ہیں۔ یہ تو تھا گونڈوں کا مختصر سا حال، اب آئیے اپنے مضمون کی طرف —

شام ہو رہی تھی کہ گاؤں میں ڈھول اور باجے کی آواز آئی ساتھ ہی ساتھ کچھ مدھم سی آوازیں بھی آئیں مگر جب کھانے کے بعد کوئی دس بجے کے قریب بھی باجے کی آوازیں بند نہ ہوئیں تو ایک گونڈ سے پوچھا کہ یہ غیر معمولی آوازیں کیسی ہیں۔ کیونکہ گونڈوں کا قاعدہ ہے کہ چراغ جلنے سے پہلے ہی سو جاتے ہیں

اس نے جواب دیا حضور کل کو شادی ہے۔ دل نے چٹکی لی کہ ایسے عجیب و غریب لوگوں کی رسومات بھی عجیب ہوں گی۔ ضرور دیکھنا چاہیے۔ میں نے گونڈ سے کہہ دیا کہ جب رسومات شروع ہوں مجھے بھی ساتھ لیجانا میں آخر تک شادی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہاں تو یہ بات میں بھول ہی گیا کہ اب گونڈ لوگ نوے فیصد اردو سمجھتے ہیں اور (۵۰) فیصد اچھی طرح سے اردو بول لیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گونڈ آیا اور مجھے وہ اپنے ساتھ لے گیا دوسرے دوستوں کو بھی شوق ہوا وہ بھی میرے ساتھ چلے۔ ہم پہنچے تو رسومات میں کچھ دیر تھی۔ ایک پلنگ پر ہم لوگوں کو بٹھلا دیا گیا۔ شادی کی رسومات سے پہلے کچھ باتیں اُن کی عورتوں کے متعلق بھی سن لیجئے یہ قوم اپنی عورت کو شادی کے بعد سے دیوتا کا درجہ دیتے ہیں اس سے آپ ہر چند اس کی بیوی کے متعلق پوچھئے یہ آپ کو کچھ بھی نہ بتائے گا چاہے اس کو اپنی بیوی سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی عورتوں کو نہ تو کبھی گالی دیتے ہیں اور نہ ہی سختی سے گفتگو کرتے ہیں اُن کا کام جانے اور وہ اپنی بیوی کے سامنے ایسا کھڑے رہتے ہیں جیسے کتا اپنے مالک کے سامنے۔ اگر نا اتفاقی کی بنا پر یہ اپنی بیوی سے الگ ہونا چاہتے ہیں تو آہستگی اور خاموشی سے سب باتیں انجام پاتی ہیں۔ کسی ہنگامہ شور و شغب کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان لوگوں میں بیویوں کی تعداد مقرر نہیں ہے اسی لئے وہ جتنی چاہیں شادیاں کر سکتے ہیں مگر یہ لوگ عموماً چھوڑ دینے کے بعد دوسری شادی کرتے ہیں۔

شادی سے پہلے کا سب سے پُر لطف رواج یہ ہے کہ دولہا، دولہن کو کسی موقع پسند کر لیتا ہے اور پھر موقع کی تاک میں سایہ کی طرح لڑکی کے ساتھ ساتھ رہتا ہے جہاں ایسے موقع ملا اور لڑکی اسے تنہا مل گئی وہ اسے زبردستی پکڑ لاتا ہے اور اپنے گھر میں

رکھتا ہے اور رشتہ دار شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دولہا لوگوں پر ظاہر کرتا ہے کہ ہیں شادی کا اہل ہوں اور ہر لڑکے کی شادی سے پہلے اس طرح کا ہونا لازمی ہے ورنہ لڑکے کو عمر بھر مجرد رہنا پڑے گا۔ چنانچہ ان کی شادی میں بھی یہی ہوا۔ لڑکے کا نام بھیم تھا اوس کی پہلی شادی ہو چکی تھی لیکن ناموافقت کی وجہ سے اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور بیوی نے بھی بغیر کچھ پرواہ کئے کے دوسرے گاؤں جاکر وہاں کسی سے اپنی شادی رچالی تھی۔ یہ لڑکی بیچاری، آفتوں کی ماری، دوسرے گاؤں کی رہنے والی، یہاں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئی تھی کہ لڑکے کی نظر انتخاب اس پر پڑ گئی اور ایک دن ندی کنارے جب وہ کپڑے دھو رہی تھی اور یکہ وتنہا تھی لڑکے نے اسے پکڑ لیا اور لاکر اسے پٹیل کے گھر میں رکھا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک اور پر لطف رسم یہ ہے کہ اگر لڑکے کی پہلی شادی ہے تو لڑکی کے ماں باپ کو اطلاع دی جاتی ہے نہیں تو شادی کی اطلاع لڑکی کے ماں باپ کو بعد میں دیجائے گی مگر یہ اُس وقت ممکن ہے جبکہ لڑکی کسی دوسرے گاؤں کی ہو۔ اب چونکہ اس لڑکے کی دوسری شادی تھی تو لڑکی کے ماں باپ کو اطلاع شادی کے بعد دیجاے گی۔ اطلاع کے بعد جب ماں باپ آتے ہیں تو دولہا ان کی بڑی خاطر مدارات کرتا ہے اور دونوں کو دو، دو جوڑ کپڑے دیتا ہے۔

اب تک پنڈال میں گاؤں کے تقریبًا سارے لوگ جمع ہو چکے تھے اب یہ لوگ ہاتھ میں مشعلیں لیکر گاؤں سے باہر ایک کوتاہ چھپر میں آگئے۔ پیچھے پیچھے عورتیں آئیں جن کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دیوتا کا چھپر ہے۔ ان کو کپڑے لاکر ایک پتھر کے سامنے جن پر سیندور لگا ہوا تھا رکھد یا گیا۔ تین دیئے جلائے گئے گاؤں کا پٹیل چونکہ صدر تھا۔ اس لئے وہ اُس پتھر اور کپڑوں کے سامنے بیٹھ کر منھ میں منھ میں کچھ منتر وغیرہ پڑھتا رہا۔ سارا گاؤں اس جگہ جمع تھا۔ عورتیں دیوتا کی تعریف میں گانا جانا گا رہی تھیں۔ میں نے قریب کے ایک گونڈ سے ایک مصرع کے معنے پوچھے اُس نے جواب دیا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اے دیوتا اپنا سایہ ہم پر رکھ۔ جب پٹیل نے پوجا ختم کی تو سیندور سے اس پتھر کے متصل تین خانے بنا دئے گئے اور ہر خانہ میں ایک ایک ... پھول رکھد یا گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ پھول دیوتا کی نذر تھے اور

اس پوجا کا مطلب یہ تھا کہ وہ دعا کرتے تھے کہ جو لوگ بھی ان کپڑوں کا استعمال کریں اُن پر ان کے دیوتا کی رحمت ہو۔

جب یہ رسم پایۂ تکمیل کو پہنچی تو مشعل والے آگے آگے چلے ان کے پیچھے باجے والے ڈھول شہنائی بجاتے ایک پنڈال کے سامنے آکر رُک گئے۔ یہ پنڈال خاص شادی کے لئے بنوایا گیا تھا۔ عورتیں جاکر چبوترے پر بیٹھ گئیں۔ یہاں دولہا کو بھی دیکھا بالکل نوجوان تھا۔ ابھی ڈاڑھی بھی پوری طرح نکلنے نہ پائی تھی۔ تعجب ہوا کہ یہ اس کی دوسری شادی ہے۔ پنڈال کے متصل ایک الگ کمرے میں دولہن تھی۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیوں نے اُس کو اپنے جھرمٹ میں لے لیا اور گانا شروع کیا۔ یہ گانا صرف سننے سے تعلق رکھتا تھا جس طرح ہمارے یہاں گانے والے گانے سے پہلے گنگناتے ہیں۔ اسی طرح یہ عورتیں بھی گانا شروع کرنے سے پہلے "لارے لا" کے ذریعہ سُر ملاتی تھیں اور پھر گاتی تھیں۔ یہ سماں بہت ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح ان جملوں کے معنے معلوم کروں مگر لاحاصل۔ ایک جگہ البتہ بھیم کا نام گانے میں سنا۔ میں نے اپنے ترجمان گونڈ سے پھر پوچھا کہ بھیم تو دولہا کا نام ہے گانے سے اس کا کیا تعلق، معلوم ہوا کہ دولہا، دولہن کا نام لیا جارہا ہے اور دونوں کو دعائیں دی جارہی ہیں میں نے معنے پوچھے اُس نے جواب دیا کہ دیوتا اچھے رکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر شاید الفاظ نہ ملے ہوں۔ ان دعائیہ جملوں کے پڑھنے کا بھی خاص طریقہ تھا۔ عورتوں کی پارٹی ایک طرف بیٹھ جاتی ہے اور دوسری پارٹی دوسری طرف۔ ایک بار یہ ایک جملہ گا کر پڑھتی ہے اور پھر فوراً ہی دوسری پارٹی [illegible] گاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے یہاں فلمی دوگانے ہوتے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ایک پارٹی دولہا والی ہے اور پٹیل کے گھر والے اور کچھ رشتہ دار دولہن کی طرف ہوگئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ دولہا والے دولہن کو دعائیں دیتے ہیں۔ اور دولہن والے دولہا کو۔ یہ بات ہمارے یہاں کے بالکل برخلاف ہے کیونکہ ہمارے یہاں دولہا اور دولہن والوں میں دلچسپ باہمی چشمک رہتی ہے۔ ان دعاؤں کو سُن کر ایک نئے آدمی کو بالکل یہی خیال ہوتا ہے کہ باہم سوال وجواب ہو رہا ہے۔ اس اثناء میں باجے والے بالکل خاموش تھے کیونکہ ان کو سستانے کا موقع مل گیا تھا۔

گونڈلوگ اپنی شادیوں میں خود باجہ نہیں بجاتے بلکہ پردھان قوم کے لوگوں کو بلواتے ہیں۔ یہ قوم صرف باجہ بجانے کی حد تک ہے اور شادیوں میں یہی لوگ عموماً باجہ بجاتے ہیں اگر لڑکے کا پہلا نکاح ہے تو ان کا معاوضہ ایک بیل اور کچھ روپیہ ہوتا ہے، ورنہ دس بیس روپیہ دیدئے جاتے ہیں یہ لوگ باجہ یوں ہی بجا لیتے ہیں۔

جب یہ دعائیہ جلسے ختم ہوگئے تو پنڈال کے اندر سارے گاؤں والے ایک لائین میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دولہا اور دولھے کا بھائی ان سب لوگوں سے یکے بعد دیگرے گلے ملتے ہیں اور پھر پاؤں پڑتے ہیں اس طرح وہ سارے گاؤں والوں سے مل لیتے ہیں۔ یہ طریقہ گویا گاؤں میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اگر بفرض محال دولہا کی کسی سے لڑائی ہوتی ہے تو اس موقع پر وہ سب دشمنی از خود دور ہو جاتی ہے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو دولہا کو ایک لکڑی کی چوکی پر بٹھا دیا گیا اور اب عورتوں کی باری آئی یہ عورتیں یکے بعد دیگرے دولہا کے پاس آتیں اسے سجدہ کرتیں اور پھر چھوٹی بھتیں اس طرح تقریباً ساری عورتیں ایسا کرتی ہیں کیونکہ وہ دولہا کو دیوتا کا برگزیدہ بندہ سمجھنے لگتے ہیں۔

اس رسم کے بعد سے نہانے کی رسم شروع ہوئی اس میں کچھ دیر لگتی کیونکہ پانی گرم کرنے کے لئے اسی وقت رکھا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو پھر پلنگ پر بٹھا دیا گیا اور پھر ہماری خاطر کے طور پر پردھان لوگوں نے اپنا ایک اچھا سا راگ بجا کر سنایا۔ اسی اثنا میں پانی گنگنا گرم ہو چکا تھا۔ دولہا کو پنڈال کے بیچوں بیچ ایک چوکی پر کپڑوں سمیت دو زانو بٹھا دیا گیا۔ دولہا کے بازو ہی ایک لکڑی کا بنا ہوا بت تھا۔ اس بت کے ساتھ ساتھ ایک بیل بھی تھی۔ اس سے گونڈوں کی مراد یہ ہے کہ دیوتا کو کبھی اکیلا نہ رکھا جائے اس سے وہ لوگ یہ شگون لیتے ہیں کہ دولہا اور دولہن دونوں ہمیشہ باہم مل کر اتحاد و اتفاق سے رہیں اور خصوصیت کے ساتھ بیل کے رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ دولہا دلہن بیل کی طرح پروان چڑھیں اور انہیں کسی کی نظر نہ لگے۔ اب دولہا کے اطراف پیتل کے پانچ لوٹے رکھدئے گئے اور ان لوٹوں کے سروں کو بٹے ہوئے دھاگہ سے اس طرح ملا دیا گیا کہ دولہا بٹے ہوئے دھاگہ میں گھر گیا لیکن دھاگہ دولہا کو مس نہیں کر رہا تھا۔ ایک دوسرے لوٹے سے ان پانچوں لوٹوں میں پانی ڈال دیا گیا۔ پھر پنڈا کا بیٹا کچھ منھ ہی منھ میں

پڑ بجتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے یکے بعد دیگرے لوٹے ان دھاگوں میں سے نکالنے
شروع کئے اور دولہا پر انڈیلتا گیا مگر دھاگہ کو ویسے ہی پڑا رہنے دیا گیا۔ حتیٰ کہ
پانچوں لوٹے ختم ہو گئے پھر کچھ اور لوٹے دولہا پر ڈالے گئے۔ اس غسل کے بعد پٹیل
کے بیٹے نے دولہا کے ماتھے پر سیندور ہلدی اور دوسرے مصالحہ جات لگائے جب یہ
رسم ختم ہوئی تو پٹیل کے بیٹے نے اس دھاگہ کو اس احتیاط سے دولہا کے سر پر سے نکالا
کہ وہ دولہا کے جسم کو نہ چھو سکے۔ اگر کسی وجہ سے دھاگہ دولہا کے جسم سے چھو جائے تو
بدشگونی سمجھی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شادی زیادہ دنوں تک نہیں نبھ سکیگی
جب دھاگہ نکال دیا گیا تو تھوڑا سا مصالحہ لیکر ایک تیندو کے پتے میں لپیٹ کر اسی
دھاگہ کے ذریعہ دولہا کے ڈنڈ پر باندھ دیا گیا۔ دولہا پر ایک کمبل ڈال کر اس کے
گیلے کپڑے نکال دئے گئے اور اندر دولہن کے پاس بھجوا دئے گئے۔ اب دولہا کے بھائی
نے دولہا کو گود میں اٹھا لیا اور اسی چوکی کے اطراف ناچتے ہوئے چار دفعہ چکر لگائے۔

دولہن کو بھی اندر اسی طرح نہلایا جاتا ہے گو میں نے نہیں دیکھا مگر گونڈ والے
کہا کہ بالکل وہی رسومات ہوتی ہیں جو دولہا کے نہلاتے وقت ہوتی ہیں۔ دولہا کے
گیلے کپڑے دولہن پہن لیتی ہے اور دولہن نہانے کے بعد اپنے گیلے کپڑے دولہا کو بھیجتی
ہے جسے دولہا پہن لیتا ہے۔ یہ رات کی آخری رسم تھی گو رسومات ختم ہو چکی تھیں مگر باجہ
رات بھر بجتا رہا۔

دوسرے دن صبح ہم لوگ کوئی سات بجے پٹیل کے گھر پہنچے۔ دولھے میاں ابھی تک نہیں
آئے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ آ گئے۔ باؤلی وہاں سے کچھ فاصلہ پر تھی دولہا اور
دولہن دونوں کو معہ باجے کے وہاں لیجایا گیا۔ دولہا کو تو یونہی کپڑوں سمیت کھلے طور
پر نہلایا گیا مگر جب دولہن نہانے لگی تو عورتوں نے ایک کمبل پکڑ لیا۔ دولہا دولہن دونوں
کو نہلانے کے بعد ایک ایک کمبل اڑھا دیا گیا۔ ارے توبہ ایک بات تو بھول ہی گیا
اس نہلانے کے دوران میں عورتیں بڑے زور و شور سے اپنے گانے میں لگی ہوئی تھیں
باجہ الگ کان پھاڑے ڈالتا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی گر یہ چنداں برا
نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ طبیعت میں ایک زندگی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ نہلانے کے بعد
وہ دونوں پنڈال کو واپس ہوئے۔ اب نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ پنڈال میں نہایت

قرینہ سے ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ اس پر دونوں دولہا، دولہن کو لاکر بازو، بازو بٹھادیا
گیا۔ پٹیل نے کچھ اشلوک پڑھے اور دونوں کے ہاتھوں پر دھاگے باندھے اس اثنا
میں باجے بالکل خاموش تھے اور لوگ بڑی دلچسپی سے ان رسومات کو دیکھ رہے تھے۔
ایک سوپ میں چاول لائے گئے۔ اس میں ایک پیتل کا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ پہلے
دولہا نے تین گلاس چاول الگ سوپ میں رکھے پھر دولہن نے تین گلاس چاول نکال کر
ان چاولوں میں ملادئے اس کے بعد جس طرح ہمارے یہاں کی بچیاں مٹی کو اور ٹوٹی ہوئی
چوڑیوں کے ٹکڑوں کو ہاتھ میں رکھ کر اچھالتی ہیں اسی طرح دولہا اور دولہن دونوں
نے یکے بعد دیگرے چاول اچھالے۔ پھر دولہا نے دولہن کا ہاتھ پکڑ کر اس میں کچھ چاول
رکھے اور پھر اچھالے۔ جب دولہن کے ہاتھ میں چار پانچ چاول کے دانے بچ رہے وہ
دولہا نے کھائے۔ اب جو چاول باقی بچے وہ سارے گاؤں کے گونڈوں میں تقسیم کردے گئے۔

اب آخری رسم کا آغاز ہوا۔ دولہے کو ایک گھوڑے پر بٹھاکر باؤلی پر لایا گیا
اور پھر خالی گھوڑے کو واپس بھیج دیا گیا جس پر دولہن آئی اب کی دفعہ یہاں سارا
گاؤں، عورتیں اور بچے جمع تھے۔ اب عورتوں نے پھر اپنی مناجات اور دعائیں گانی
شروع کیں۔ پٹیل نے کچھ منتر پڑھے اسی اثنا میں پردھان لوگ اپنے باجے اور نفیروں
میں مگن تھے۔ گاؤں کے سارے لوگ ایک خاص قسم کے ناچ میں مشغول تھے۔ حالت یہ
تھی کہ گاؤں کا کوئی متنفس بھی ایسا نہ تھا جو خاموش ہو۔ کوئی گا رہا ہے تو کوئی
ناچ رہا، کسی کو کچھ نہ آیا تو اس نے ڈھول پر الٹے سیدھے ہاتھ چلانے شروع کئے غرض
سب مدہوش تھے۔ یہ منظر بڑا ہی دلچسپ اور دلفریب تھا۔ اب دولہا اور دولہن کے
دامنوں کو آپس میں ملاکر باندھ دیا گیا۔ اب ناچ کا رنگ پلٹا اور گاؤں کے لوگوں
نے دولہا اور دولہن کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناچنے لگے ساتھ
ہی ساتھ یہ ایک کورس بھی گاتے جاتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ کوئی پندرہ منٹ تک ناچتے
اور گاتے رہے اس کے بعد دولہا اور دولہن دونوں کو ایک کمبل کے سائے تلے پنڈال
میں لایا گیا باجہ سامنے تھا اس کے بعد دولہا اور دولہن اور پھر عورتیں اور
اس کے بعد مرد باقاعدہ جلوس کی شکل میں پنڈال میں آکے رکے۔ دولہن مارے شرم کے
دوہری ہو ہو جاتی تھی۔ پنڈال میں پہنچتے ہی دولہن اپنی ہم عمر عورتوں کے جھرمٹ میں

چسپلی گئی - اب ساری رسومات پایہ تکمیل کو پہنچیں -

دیوتا کی پوجا تو ہو چکی اب پیٹ کی پوجا باقی تھی، دو بیلوں کو دیوتا کے سامنے لیجایا گیا وہاں پٹیل نے کچھ منتر پڑھے اور ان کو اپنے ہاتھ سے کاٹا دونوں بیلوں کے سر اور پچھلے پاؤں وہیں رکھدئے گئے اور باقی کو گاؤں لا کر ان کو پکانے کے لئے چولھے پر رکھدیا گیا - گاؤں والوں کے چہروں پر اس وقت کچھ رونق سی آگئی تھی ہر ایک شگفتہ تھا ذرا ذرا سی بات پر پنڈال ہنسی سے گونج اوٹھتا تھا - بعد میں معلوم ہوا کہ یہ موڈ گوشت کے پکنے کی خوشبو گونڈوں میں عود کر آیا تھا - افوہ دیکھئے کھانے کے ذکر میں میں ایک نہایت اہم بات تو بھول ہی گیا وہ یہ کہ دولہا اور دولہن دونوں کو دوپہر کے وقت یکجا کیا جاتا ہے یہ گونڈوں کی رسم ہے اور ہر شادی میں دولہا اور دولہن دوپہر کے وقت یکجا کئے جاتے ہیں -

کوئی تیسرے دن میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی سر پر گاگرا اٹھائے شرماتی، لجاتی، اٹھلاتی باؤلی کی طرف دھیرے دھیرے جا رہی ہے دو اور عورتیں اس کے ساتھ تھیں اس لڑکی کے کپڑے بمقابلہ دوسروں کے ذرا صاف تھے اور وہ بالکل ایک ذرا سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی میں کبھی اس چیز پر غور نہ کرتا اگر مجھے ایک گونڈ جو وہیں کھڑا تھا مجھے نہ بتلاتا - اس نے جس طرح مجھے وہ لڑکی بتائی اسے اُسی کی زبانی سنئے تو لطف آئیگا "پٹیل شادی کی چھوکری دیکھا وہ سامنے پانی کے واسطے جاتا ہے"

اِس طرح گونڈوں کی ایک نہایت ہی دلچسپ شادی اختتام کو پہنچی -

وہ عندلیب ہوں آوارہ باغ عالم میں

ملی کہیں نہ جگہ مجھ کو آشیاں کے لئے

مرے نشان سے ملتا ہے خضر کو رستہ

میں خضر راہ ہوں گم کردۂ کارواں کے لئے

نواب عزیز یار جنگ - عزیز

دولت پرست (افسانہ)

قدیر ظفر صدیقی

میں دفتر سے لوٹ کر ابھی گھر آیا ہی تھا کہ اتنے میں باجی نے مجھے میری ڈاک دیدی میں چاء پی رہا تھا اور اس لئے میں نے سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا۔ ایک کھلا ہوا دعوت نامہ تھا جس کے لفافہ پر سرخ سیاہی سے میرا نام لکھا ہوا تھا میں نے اس کو بڑی بے تابی کے ساتھ کھولا۔ ۔ ۔ ۔ "ارے یہ تو سلمہ کی شادی کا رقعہ ہے" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ میری نگاہوں میں سلمہ کی تصویر کھینچ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہی سلمی تھی جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ بہت جلد روٹھ جاتی میں اس کو چاکلیٹ دے کر منایا کرتا تھا ایک عرصہ کے لئے ہم جدا ہو گئے تھے۔ میں پڑھائی کے لئے شہر چلا گیا اور وہ گاؤں ہی میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ کرسمس کی چھٹیوں میں جب میں سکون کی تلاش میں اس کے گھر گیا ہوتا تو وہ میری بڑی ہی خاطر مدارات کرتی۔ میری کتابوں کو ترتیب دیتی۔ میرے کمرہ کی صفائی کرتی اور جب میں رات گئے تک اسٹڈی کرتا تو مجھے چاء بنا کر دیتی۔ بہرحال سلمہ کی ہستی میں میں ایک چھوٹی بہن کی کمی پوری کر لیا کرتا تھا اور وہ بھی مجھے ظفر بھیا کہہ کر پکارتی۔ اف اب کتنا تغیر ہو گیا تھا اس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بچپن کی سلمہ میں اور اب کی سلمہ میں کتنا فرق تھا۔ اب وہ خاصی بڑی تھی اور مجھ سے پردہ کرنے لگی تھی۔ رقعہ کو میں نے پھر ایک بار دیکھ کر میز کی دراز میں بند کر دیا اور خود بستر پہ دراز ہو گیا۔ دوسرے دن شادی میں جب میں اور بھیا کلب سے واپس ہو گئے تو باجوں کے سریلے نغموں میں یہ گیت صاف سنائی دے رہا تھا "آج کر لے تو جی بھر کے سنگار تو بہے جاتا ہے" میں نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا دولہا کی برات آ رہی تھی۔ میں اور بھیا بھی برات کے ساتھ ہو لئے۔ جب دولہن کا مکان آیا برات ٹھیری اور دولھے میاں کو موٹر سے اتارا گیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے نوشاہ کو اپنے تصور کے خلاف پایا۔ میں اسی خیال میں تھا کہ صاحبزادے نوجوان اور سجیلے ہوں گے لیکن ان کو دیکھ کر میرے حواس مختل ہو گئے۔ میرا خیالی محل مسمار ہو کر رہ گیا۔ دولھے میاں کوئی پچاس کے لگ بھگ تھے۔ سفید بال، خمیدہ کمر، چہرہ پہ جھریاں بڑھاپے کا ثبوت

دے رہی تھیں، جامہ وار کی شیروانی میں ملبوس تھے۔ سر پر گلابی ریشمی دستار اور پاؤں میں سنہری جوڑا تھا۔ موٹر سے اترتے ہی سلمہ کے والد نے ان کا استقبال کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر مسند پر بٹھایا۔ مہمانوں نے دولہے کی رونمائی کی اور ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں میں بھی ایک کونے میں بیٹھا ایک صاحب سے مصروف کلام رہا۔ سبھوں نے سلمہ کے والد کی کم عقلی کا رونا رو دیا اور میں اس شادی پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا لیکن اب عین وقت پر کر ہی کیا سکتا تھا۔ ایک صاحب میرے قریب ہی بیٹھے تھے جو دولہے والوں کے ساتھ برات میں آئے تھے۔ میں نے ان سے دولہے میاں کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ راجی صاحب یہ آپ کی اور میری طرح ملازم نہیں سیٹھ ہیں سیٹھ۔ لاکھوں، کروڑوں کے مالک۔ انھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا آپ انہیں نہیں جانتے۔ شہر کے مشہور تاجر " اعظم بھائی " جن کی بڑی دکان گھنٹہ گھر کے پاس ہے۔ میں ہاں ہاں کہہ کر خاموش ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر بعد قاضی صاحب تشریف لائے

دولہے کی عمر دس سال کم کرکے صرف چالیس برس اور سلمہ کی عمر دو سال زیادہ کرکے (۱۶) بتائی گئی حالانکہ وہ چودہ برس کی کمسن دوشیزہ تھی۔ مجھے بار بار سلمہ کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ بڈھے میاں کی ضعیفی اس شادی خانہ آبادی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ عمر جو نواسے اور پوتے کھلانے اور یاد الٰہی میں گذارنے کی ہو۔ بڈھے میاں کو آخر یہ کیا سوجھی تھی جو اس عمر میں ایک کمسن لڑکی کو بیاہ لے جا رہے تھے۔ وہ لڑکی جو ان کی نواسی اور پوتی کے برابر ہو وہ ان کی بیوی بنے ؟ یہ کہاں کا انصاف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یقیناً یہ ہماری سماج کی کمزوری اور لالچی والدین کی کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ عقد ہوا۔ سبھوں نے مبارکباد دی نوشہ سے بغلگیر ہوئے۔ میں بھی رسماً گلے ملا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسا میں ایک سخت چٹان سے ٹکرا گیا ہوں۔ چہرہ پر خضاب لگائی ہوئی نوکدار مونچھیں چمک رہی تھیں جو ان کے خاندانی وقار اور امارت کا پتہ دے رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ آفتاب غروب ہوا اور اس کے ساتھ ہی سلمہ کی قسمت کا ستارہ بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ آسمان پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ اب برات کی تیاریاں ہونے لگیں۔ باجے بجنے شروع ہوئے اس وقت سے زیادہ باجے موجود تھے۔ دولہا اور دولہن کی موٹریں آہستہ آہستہ چلنے لگیں۔ برات کے ساتھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ دولہے پر روشنی ڈال رہے تھے۔ چلنے والے راہ گیر

ٹھہر کر اس عظیم الشان برات اور خوش نصیب دولھے کو دیکھ رہے تھے۔ سبھوں کی زبانا
پر دولھے کی عمر ہی کا تذکرہ تھا اور چہروں پر تمسخر آمیز ہنسی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برات
آہستہ آہستہ میری نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔ میں گھر واپس ہوا اور دیر
تک اسی خیال میں ڈوبا رہا کہ ہندوستانی والدین آخر کیوں اپنی لڑکیوں کو دولت کی
بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ سیم و زر کے چند ٹکوں نے انھیں کیوں اس قدر اندھا بنا رکھا
ہے۔ جب عمر میں اس قدر تفاوت ہے تو خیالات میں بھی زبردست فرق ہوگا۔ اور آخر
یہ کیوں نہیں سوچتے۔۔ میں ان ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ نہ جانے کب نیند کی دیوی
نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

کچھ دنوں بعد سلمیٰ سے باجی کی ملاقات ہوئی۔ باجی نے کہا تھا کہ اب تو وہ منھ کھول کر
بات تک نہیں کرتی۔ کئی سوالات کرنے کے بعد ایک آدھ کا جواب دیتی ہے۔ ہمیشہ مغموم
چہرہ بنائے اپنی حالت ڈالے ایک دیوانی کی طرح کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ ۔ ۔ ۔
مجھے اس کا یہ حال سُن کر بہت رنج ہوا۔ ایک دن میں سویرے دفتر پہنچا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی
بج رہی تھی۔ میں نے رسیور اٹھایا۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی سلمیٰ بول رہی تھی۔ ذرا
جلد میرے گھر آئیے۔ صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ہو سکے تو ڈاکٹر کو بھی ساتھ لیتے
آئیے۔ یہ سنتے ہی میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں دوڑا۔ دوڑا دواخانہ گیا
اور بڑے ڈاکٹر کو لئے سلمیٰ کے گھر پہنچا۔ بڈھے میاں آخری سانس لے رہے تھے۔ سلمیٰ پاس
ہی کھڑی رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڈھے میاں کی سانس ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی
ڈاکٹر نے دل دیکھا۔ نبض دیکھی لیکن دونوں ہمیشہ کے لئے ساکت ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر نے
کہا "ہارٹ فیل ہوگیا" اس کو سن کر سلمیٰ ڈھاریں مار مار کر رونے لگی۔ میں یہ دلخراش منظر
دیکھ نہ سکا میری آنکھوں سے بھی دو موٹے قطرے نکل کر رخسار پر بہہ گئے۔ میرا دل
اس بے جوڑ شادی کے حسرت ناک انجام پر ملامت کر رہا تھا۔ میں اس سماج کو کوس رہا
تھا جو ایسی بے جوڑ شادیاں کرنا ہی اپنے لئے عین سعادت جانتی ہیں۔ سلمیٰ اپنے والدین
کی کم عقلی اور زر پرستی کا شکار ہوگئی۔ سلمیٰ سہاگن کہلانے سے قبل ہی بیوہ ہوگئی۔ کیونکہ
اس کی حسرتوں کا جنازہ تو کبھی کا نکل چکا تھا۔ چند دنوں بعد مجھے ایک خط وصول ہوا!
تحریر سلمیٰ کے ہاتھ کی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے اٹھا کر پڑھی لکھا تھا۔

ظفر بھیا۔

تسلیم۔ میں نے زندگی میں کتنے بڑے حادثہ سے مقابلہ کیا ہے۔ اس سے تو آپ بخوبی واقف ہی ہیں۔ میری زندگی میں اب سوائے رونے دھونے کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ سلمہ کی ہنسی۔ سلمہ کی خوشی اور شرارت اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔ بد نصیب سلمہ کو اپنی قسمت سے کوئی گلہ نہیں ہے کیونکہ یہ کھیل اس کی قسمت کا نہیں۔ بلکہ یہ تو وہ جوا تھا جس کو میرے والدین نے دولت کے فریب میں آ کر کھیلا تھا۔ لڑکی کی زندگی اور اس کی خوشیوں کو قربان کر کے دولت پر بھینٹ چڑھا دی۔ سلمہ کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے۔ نہ جانے ایسے کتنے اور گھرانے ہوں گے جہاں ایسے کھیل آئے دن کھیلے جاتے ہوں گے۔ افسوس ہے ایسے والدین پر جنھوں نے دولت کی ہوس میں ایسی بے جوڑ شادیاں کر کے ہندوستان کو بیواؤں کا بازار بنا دیا۔ ان کی جوانی اور حسن کو خاک میں ملا دیا۔ ان کی آرزوؤں اور ارمانوں کا خون کر دیا۔ . . . . . .

ظفر بھیا۔ آپ مرد ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ اٹھئے سماج کے اس زبردست ظلم کو ڈھانے کی کوشش کیجئے۔ میں عورت ہوں۔ مجبور ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ میرے آگے بڑھنے پر کوئی انگشت نمائی نہ کرے۔ میری زندگی کے اس زبردست المناک حادثہ کو آپ ایک افسانہ کی شکل میں لکھ ڈالیے۔ فقط

بد نصیب سلمہ

میں نے اس خط کو غور سے پڑھا۔ پڑھنے کے بعد میرے قلم سے از خود یہ افسانہ نکل گیا۔

استفسارات

۱۔ دادا کی موجودگی میں بیٹا مرجاتا ہے تو پوتا، محروم ارث قرار دیا جاتا ہے۔ شرع نے ایسا حکم کس مصلحت کی بنا پر دیا۔ بظاہر کوئی بھلائی نہیں دکھائی دیتی۔ براہ کرم کوئی صاحب اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔ عزیز احمد

۲۔ ختنہ کرنا شاید سنت ہے۔ اگر کوئی اس کے خلاف عمل کرے تو کیا وہ اہل اسلام سے خارج ہو جائے گا؟ اور سوسائٹی میں اس کی کیا وقعت رہے گی۔ اس میں کونسی مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہے۔ رسم و رواج سے ہٹ کر اس مسئلہ کی وضاحت درکار ہے۔

حیدر حسین

۳۔ انگریزی میں 'مس' یا 'مسز' لکھا جاتا ہے۔ جس سے کتخدا اور ناکتخدا کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ہم تقلید کے بندوں میں آج کل یہ بدعت کا اختراع ہوا ہے کہ عموماً اپنے نام کے ساتھ عورتیں رضیہ حمید، رفعیہ رشید وغیرہ کا دم چھلا لگا لیتی ہیں۔ براہ کرم کوئی وضاحت فرمائیں کہ ان ناموں سے کیسے اندازہ لگایا جائے کہ رضیہ حمید کی بیٹی ہیں اور رفعیہ رشید کی شریک حیات۔ غالباً یہ بھی ترقی پسندی کی کوئی شق نہ ہو۔ جس کے زہریلے جراثیم ہمارے تخیلات میں داخل ہو رہے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ہم کو اپنا مستقل کردار بنانا چاہئے۔ میں اپنے بھائی بہنوں کا ممنون ہوں گا کہ اس بدعت پر اپنے غور و فکر نتائج سے بھی اعانت فرمائیں گے۔ ضرورت ہے کہ اس کی بیخ کنی ہو اور ہمارا کردار منت غیر سے بالکل پاک و صاف رہے۔ ظہیر

۴۔ نادر شاہ کے زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے کونسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ محمد مہدی علی خان

۵۔ دعا پر مجھے عقیدہ ہے لیکن بارہا دعا مانگی شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی۔ ایک شعر بار ہے جو مانگنے کا طریقہ ہے اس طرح مانگو در کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا
وہ کونسا طریقہ دعا ہے جس کی نسبت سنا ہے "اجابت از در حق بہر استقبال می آید"
ایک دعاگو

"جنتا کے زخم"

(افسانہ)

آنسہ اختر محمود

اور آج تو اناج کا ایک دانہ بھی نہ رہا۔ پرسوں کی ایک سوکھی روٹی بچ رہی تھی وہ بھی کل تینوں بچوں کو پانی میں بھگو کر کھلا دی اور اس کی بیوی آج تین روز سے پانی پی پی کر بھوک کے ان لعنتی شعلوں کی جہنمی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پانی سے تو جیسے یہ نرگ کے شعلے اور زیادہ بھڑک اٹھتے۔ بھوک۔ بھوک۔ بھوک۔

یہی اس کی بدنصیبی کیا کم تھی کہ وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا، جس کے نصیبوں میں بدقسمتی سے غلامی لکھی تھی جو وہ ایک ایسے ماں باپ کے گھر سانس لینے کا گنہگار ہوا جن کے گلے غلامی کے ساتھ غریبی کا لعنتی طوق پڑا تھا جو نکالے نہیں نکلتا۔ شائد یہی وجہ ہو جو اسے زندگی میں ہر چیز دکاروں ملی صحت بھی جیسے اس کی ادھوری ہو۔ چار چار دن کے بعد بیمار پڑ جانے، ایسی صحت —— اوگی زندگی —— وہ اب اپنی زندگی سے اکتا نہیں تھا لیکن اس کی نوجوان بیوی کا بھوک سے سُتا ہوا چہرہ، تین چھوٹے بڑے بچوں کے مرجھائے ہوئے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح، بسورتے ہوئے چہرے اور خود اس کا اپنا پچکا ہوا پیٹ اور روٹی کے لئے مچلتی ہوئی انتڑیاں اسے ایسا کرنے سے باز رکھتیں۔ ویسے بھی زندگی لاکھ مصیبت بھری ہو پیاری ہی ہوتی ہے۔ غریب کی زندگی تو سراسر ایک ناسور ہے جو کبھی بھرنے ہی میں نہ آئے۔ اور یہ آئے دن بڑھتے ہوئے ننھوں کی تعداد جیسے ان ناسوروں کے کلبلاتے ہوئے کیڑے۔

بھوکے بچوں کے درمیان اس کی نوجوان بیوی لیٹی تھی جس کی جوانی افلاس اور بھوک کے شعلوں میں بھسم سی ہو گئی تھی وہ اپنی بڑی بڑی غم آلود آنکھیں جن میں کبھی شوخ ستارے جگمگایا کرتے تھے چھت کو یوں تک رہی تھی جیسے ابھی ابھی ٹوٹے چھپر کے کسی سوراخ سے سوکھی روٹی کا ایک ہی نوالہ اس کے سپنوں کی طرح کھلے ہوئے منھ میں آ پڑے گا۔

آج ایک ہفتہ ہو گیا۔ بخار اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ غریبی اور بیماری میں جیسے بڑا بیار ہو۔ امیروں کے محلوں میں تو دربان رہتے ہیں نا۔ وہاں پھٹکنے نہیں پاتیں۔ ان کے

تو سارے کرتا دھرتا یہی عفونت کے کیڑے ہیں جن میں وہ خون کی روانی کے ساتھ دوڑ جاتی ہیں۔ فلاس خود ایک مہا روگ ہے اور پھر یہ آئے دن کی بیماریاں زندگی کو گھن لگا دیتی ہیں۔ لیکن مرتے ہوئے بن نہیں پڑتی اور جیتے بنا زندہ نہیں جاتا۔

اس نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی۔ اس کی بیمار کھٹکی ہوئی نگاہیں اپنے بازوؤں پر پڑیں وہاں ابھی غریبی کا سبھاؤ تھا۔ غریبی کی ساری طاقت جیسے ان بازوؤں میں آکر لوٹ گئی ہو۔ تین روز کے فاقوں نے بھی ان ابھری ہوئی مچھلیوں کو کچل نہیں ڈالا۔ ابھی وہ ان کمزور بازوؤں میں ابھر ابھر کر رینگتی ہوئی زندگی کو گذارنے کی راہ بتا رہی تھی۔

ویسے تو دواخانہ بہت قریب ہے۔ اس کی اپنی ٹوٹی ہوئی جھونپڑی کے بالکل ہی پیچھے والے دوراہے پر جہاں انسانی زندگیاں۔ روتی، جھکتی، سسکتی اپنا جیون بتا رہی ہیں پر اُسے اس دواخانہ سے کیا سروکار۔ وہ انسان ہوتا نا جب۔ وہ تو ایک جانور تھا عجیب سا جانور۔ دو پاؤں والا گھوڑا۔ اسے ایک میل دور تک بھاگتی ہوئی چمکیلی سرمئی رنگ کی سڑک پر سے گزر کر جانا ہے، یہی وہ دواخانہ ہے۔ جہاں کتے، بلیوں، گائے، بھینسوں کے ساتھ اس جیسے اور بہت سے دو پاؤں والے گھوڑوں کو دوا ملتی۔

اس کا جوڑ جوڑ درد سے ٹوٹا جا رہا تھا۔ کل بخار کی حالت میں بھوکے پیٹ وہ ایک تین میل کی دوری پر رکشا میں دو بچوں کو چھوڑ آیا تھا۔ موئے پر سو درّے۔ اس کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں، اس کا جی چاہا کہ خوب زور زور سے چلائے کسی طرح تو اس درد کی اینٹھن کم ہو لیکن ہر کراہ کے ساتھ۔ ہر آہ کے ساتھ اس تڑپ میں اس اینٹھن میں بیباکی آ جاتی اور وہ کچھ دیر کے لئے نڈھال سا ہو جاتا۔

وہ بڑی تکلیف کے ساتھ کراہتا ہوا اٹھا۔ اس نے سوچا غریب کی زندگی میں آرام گھس پڑے تو کیا ہو ــــ لیکن اس کے آگے وہ سوچ ہی نہ سکا مانو اس میں سوچنے کی صلاحیت ہی نہ ہو، ٹوٹی ہوئی شیشی لیکن وہ دواخانہ جانے سے پہلے رکشا کے اڈے پر پہنچا شاید کچھ پیسہ دھیلا ہی مل جائے۔ اس نرک کی آگ کو کسی طرح بجھانا ہی تو ہے۔ غریبوں کا ان دیو تو ہا جن ہی ہوتا ہے نا اور اب غریبوں کے اس بھگوان نے بھی انہیں قرض دینے سے انکار کر دیا۔ مظلوموں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے والا بھگوان۔ اسے مہاجن کی بیوقوفی پر ہنسی آ گئی۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ خود اس کی زندگی ایک قرض ہے جو دوسروں کے

ے مہاجن سے کچھ دنوں کے لئے مانگ لایا ہے۔ جب یہ سارا سنسار ہی قرض کے سہارے چل
رہا ہے تو پھر یہ غریبی میں رینگتی ہوئی ہستیاں جن کی زندگی کی ابتدا بھی قرض اور انتہا بھی
ادھار پر ہوتی ہے قرض بنا کیسے جیئں ؟

شبنمی کو پھٹے ہوئے کرتے کی جھانکتی ہوئی جیب میں ڈال کر وہ رکشا کا سہارا لیکر
بیٹھ گیا کسی ان داتا، بھگوان کے انتظار میں جو اپنی دولت کا صدقہ چند بھوٹی کوڑیاں
اس کے پچکے ہوئے پیٹ پر دے مارے۔

بھوک کی ابھرتی ہوئی ہر لہر کے ساتھ اس کے دماغ میں باغیانہ خیالات مچل جاتے۔
پیٹ خالی ہو تو دماغ بھر جاتا ہے۔ ویسی ہی کچھ اس کی حالت تھی۔ وہ لاکھ کوشش کرتا
بھگوان کے متعلق کچھ نہ سوچے۔ بھگوان۔ سنسار کا ان داتا۔ مالک پالن ہار۔ لیکن جیسے
ہی وہ یہ سوچتا اس کے دماغ کے کسی چھپے ہوئے کونے سے ایک تیز چیخ گونج جاتی۔ بھگوان ان
داتا کیسے ہوا۔ ان داتا تو وہ مہاجن ہے جس نے کل قرض دینے سے انکار کر دیا۔ غریبوں کے
خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے والا مہاجن ہی ان کا بھگوان بھی ہوتا ہے۔ میلی سی دھوتی
سے وہ بیڑی کی تلاش کرنے لگا۔ جیسے افلاس کی ساری لعنتیں سمٹ کر اس بیڑی کے دھوئیں
میں چکراتی، آسمان کی وسعتوں میں کھو جائینگی۔

اسے وہاں بیٹھے بڑی دیر ہو گئی۔ تین راتوں کی جاگی ہوئی آنکھیں۔ یوں ہی پل بھر
کو مند گئیں کہ ایک کرخت آواز سے وہ چونک پڑا۔ ایک موٹے سیٹھ جی اپنی توند کی نامعلوم
گولائیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑے تھے وہ سوچنے لگا جانے اس توند کے پھیلاؤ میں
کتنی زندگیاں پس کر رہ گئی ہونگی۔ یہ نرم نرم توند اگر یوں ہی پھولتی اور پھیلتی رہی تو شاید
سارا سنسار اس کی لپیٹ میں آ جائے وہ ایک بار پھر چونک پڑا۔ سیٹھ جی اپنی توند کے
پھیلاؤ کے ساتھ واپس جانے والے تھے۔ اسے ایسے ہی وقت اپنے سوچنے والے دماغ
سے یکایک نفرت سی ہو جاتی جو خواہ مخواہ کی بیکار باتیں سوچ سوچ کر زندگی کے
زخموں کو اور ہرا کر دیتا۔ سیٹھ جی کی توند کے بوجھ سے جیون کے ناسوروں میں جو ذرا
بہت مرہم لگنے والا تھا وہ جاتا رہا۔

اس نے جلدی سے سیٹھ جی کو اپنے رکشا میں بٹھا لیا۔ مزدوری کی بات کئے بنا ہی۔
مالک ہے۔ جو دے دیں رکشا اٹھاتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ سیٹھ جی کو

نہیں۔ سارے سنسار کو اپنے کمزور بازؤں کے سہارے اٹھائے ہوا ہے۔ پہلے اسے چکر سا آیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رکا۔ بڑھا اور چل پڑا۔ دور تک دوڑتی ہوئی سڑک اس کے پاؤں کے نیچے سے رینگ رہی تھی۔ مالک کو جلدی تھی۔ اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ بھوکی انتڑیاں اپنا زور لگا کر بوجھل رکشا کو کھینچ رہی تھیں۔

"ابے جلدی چل۔ گاڑی کا ٹیم ہوا جاتا ہے" جیسے اسے چابک لگا۔ گھوڑا جو ہوا ہوا وہ۔ انسانی سوجھ بوجھ رکھنے والا گھوڑا جو ایک زندہ لاش کو اپنے ناتوان بازؤں پر اٹھائے بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ تپتی ہوئی سڑک اس کے بھوکے پیٹ میں مچلتی ہوئی آنتوں کو اور انقلابی ہوائیں دے رہی تھیں۔

اب تو اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے آخری زور لگایا۔ ایسا لگا جیسے ساری انتڑیاں حلق کی راہ اُبل پڑیں۔ سنسار گھومتا ہوا معلوم ہوا۔ ایک ٹھوکر لگی۔ رکشا الٹ گیا۔ سیٹھ جی کی پھولی ہوئی توند دو چار بار ابھرا ابھر کر لچک لچک گئی۔ لیکن غریب کی زندگی ہے۔ ایسی ٹھوکریں ایک دو ہی آتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ ننھی ننھی ٹھوکریں سسکتی ہوئی غریبی کو ہمیشہ کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

سیٹھ جی ان گنت گالیاں ماں بہنوں کو دیتے ہوئے اپنے کپڑوں پر سے گرد جھاڑ رہے تھے۔ کون جانے یہ گالیاں ان کی اپنی ماں بہن کے لئے تھیں۔ یا پھر سارے سنسار کی ماں بیٹیوں کو دے رہے تھے لیکن جیسے ہمیشہ لیتے ہی رہنے کی عادت ہو وہ کسی کو کیا دیگا؟

بیچ سڑک۔ پر جیتا کا رستا ہوا زخم پھوٹ بہا۔ جیون کا آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ ٹوٹی ہوئی خیشی غریب کی قسمت کی طرح دور آخر ٹوٹ کر بکھر گئی۔

پتہ نہیں کب جیتا کے ان زخموں سے بہا ہوا لہو ایک لپکتی آندھی بن جائیگا۔ بھبھکتا شعلہ ہو کر سارے سنسار کو بھسم کر ڈالے

اختر محمود ہم مشکور ہیں آپ کے اس قلمی اعانت کے بھی توقعات وابستہ ہیں کہ تعلیمی اوقات سے جب فرصت مل جائے تو شہاب کو یاد کر لیجئے کہ اوقات گذاری کا اچھا مشغلہ ہے۔

دھندلی صبح

شفیق بانو (نجیب آباد)

مئی کے شہاب میں صفحہ (۲۶) پر ایڈیٹر صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔ صبح بستر سے اٹھتے ہی کونسا کام کرتے ہیں؟ اوقات کیونکر گذرتے ہیں۔ کون کون سے مشغلے وقت گذارنے کے لئے اختیار کئے ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ ——

یہ چند سطریں گویا چند زبردست تھپڑ ہیں —— اگر لکھنے پر آؤ تو جھوٹ تہ بولا جائیگا اور اگر سچ لکھا جائے تو کئی باتیں قابل اعتراض نکل آئیں گی۔ خیر صاحب ہم تو بچپن کی کسی کتاب کا سبق دہرانے کو مجبور ہیں۔

سانچ کو آنچ نہیں

بھئی اصل بات تو یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب کو یہ حق ہرگز نہیں کہ وہ زبردستی لوگوں سے گھر کے حال چال معلوم کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ خود ہم ہی سے خوشگوار طریقے معلوم کرنا چاہتے ہیں یا پھر ان کے پاس بہت ہی فالتو وقت ہے جو گذارنا دشوار ہے —— مرد ہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتی کہ ان کو کیا کیا مشغلے اختیار کرنے چاہئیں؟ عورت ہوتیں تو نہایت آسانی سے کہدیتی کہ بھئی جب کچھ کام نہ ہو۔ وقت کاٹے نہ کٹے۔ مارے نہ مرے، راتیں پہاڑ معلوم ہوں۔ دن اجاڑ۔ تو نہایت نزاکت سے۔ نفاست سے یا تو ہاتھوں میں ان سلائیاں لے لو اور طرح طرح کے نمونے ایجاد کر دیا پھر کروشیا اور کاٹن لیلو۔ انگلی کی گردش سے نہایت پیاری پیاری بیلیں بناؤ۔ پیٹی کوٹ میں لگاؤ تاکہ باریک ساری میں انتہائی دلکش دکھائی دے —— پھر بھی وقت بچے تو اپنے پراؤں کو فضول فضول خط ہی لکھنے بیٹھ جاؤ جن کا سر ہو نہ پیر۔ مقصد ہو نہ مفہوم۔ یا پھر کھڑکی پر جا بیٹھو اپنی پڑوسن سے دنیا بھر کی ہر گفتگو کرتی رہو حتی کہ اتنی مشغول ہو جاؤ کہ تمہیں چار کا بھی ہوش باقی نہ رہے — اگر بدقسمتی سے پڑوسن نصیب نہ ہو تو اپنی ماما سے ہی باتیں کرلو — اتنی باتیں کرو کہ یا تو وہ تنگ کر چپ ہو جائے یا تم ——

تو یہ ہے یہ تو سب کچھ میں بتاتی جبکہ وہ بیچارے عورت ہوتے۔ اب تو کچھ بھی نہیں بتا سکتی اتفاق سے وہ یونہی ہنسی کا تحادیں فرماتے ہوں)۔ بھلا بلبل کو بسمل کرنے سے کیا فائدہ؟

خیر بھئی حکم حاکم مرگ مفاجات والا معاملہ درپیش ہے۔ اوّل تو خدا ہماری سی راتیں کسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے اور نہ ایسے دن۔ نہ ایسی خوشگواریاں، پھر بھی تبانے سے پہلے لکھے دیتی ہوں کہ جو کچھ میں لکھ رہی ہوں اس پر عمل کرنے کی کوشش کوئی صاحب یا کوئی صاحبہ نہ فرمائیں، ورنہ میں ذمہ دار نہیں۔ ہاں تو کیسے گذرتے ہیں ناپائیدار زندگی کے لمحات؟ سنئے! ممکن ہے سن کر یا تو سکون دل میسر ہو جائے یا دل ہی بیزار ہو جائے۔ دونوں باتیں ممکن ہیں۔

جناب عالی۔ اوّل تو کبھی کبھی میری صبح ہی نہیں ہوتی۔ جب تمام رات جاگتا سیکھ لیا تو پھر صبح کہاں؟ سارا گھر سوتا ہے۔ میں جاگتی ہوں۔ لکھنے کے سارے کام رات ہی کو کرتی ہوں۔ اپنے آرام کا خیال نہیں، بلکہ یہ ڈر غالب رہتا ہے کہ گھر کے لوگ بُرا بُرا کڑوا منھ نہ بنائیں۔ اندر کی روشنی ان کی مست نیند میں دخل انداز نہ ہو — اس کی پروا نہیں کہ گھر میں اندر خود کو کس درجہ تکلیف پہونچتی ہے۔ بستر سے اوٹھتے ہی سب سے پہلے میں اپنے دل کو بہلاتی ہوں یعنی تکیہ کے پاس ہی رکھے اخبار رسالوں کو جلدی جلدی ختم کرتی ہوں گویا آنکھ کھل جانے کے بعد دس پانچ ورق پڑھنا بہت ضروری ہیں — چاء کو دل چاہتا رہتا ہے اور میں زبردستی پڑھنے میں دھیان دیتی ہوں تاکہ بھول جاؤں۔ دو مہینہ تک نہ پینے کا عہد ہے۔ صرف لیمو کا شربت یا دودھ کی لسّی برف ڈال کر پیتی ہوں — ضروریات زندگی سے فارغ ہو کر گھر کی صفائی میں لگ جاتی ہوں نوکر کے ساتھ سانجھ دوپہر تک کاموں میں گذرتا ہے۔ کھانا کھاتے ہیں سیدھی پلنگ پر — لیٹے لیٹے پھر وہی اخبار۔ رسالے۔ کتابیں۔ کبھی دوپہر دوپہر بھر کونہ میں میز پر گذار دیتی ہوں۔ نہ بیٹھوں تو پھر یہ تمام کام میرے بدلہ کا کون کرے —— ؟

کام کرنے کی حالت میں پنکھا بھی نہیں لگا سکتی۔ کبھی ورق اُڑنے میں تو جی جلتا ہے غصہ میں بند کرکے بس یونہی کام کرتی ہوں۔ پسینہ مزدور کی پیشانی سے جیسے ٹپ ٹپ گرتے دیکھا ہے بس یونہی میری پیشانی۔ گردن سے بوندیں بہتی رہتی ہیں۔ جب زیادہ تھک جاتی ہوں تو غسل سے تھکن دور کرتی ہوں یا کچھ کھانے پینے میں مصروف۔ جس دن لکھنے پڑھنے کی ہمت نہ ہوئی تو پرانے اخبار رسالے ترتیب دینے الماری کے پاس جا بیٹھی —— بہت سارے اخبار رسالے دیکھ کر کچھ چپ سی ہو جاتی ہوں۔ معاً دل میں

آہ پیدا ہوتی ہے۔ آہ یہ دنیا؟ یہ میرا شوق؟ اور اس شوق کا انجام؟

اس کے بعد کچھ بھی نہیں سوچا جاتا۔ چپ چپ جوں کے توں فائل جھاڑ جھاڑ کر رکھتی چلی جاتی ہوں۔ ملنے ملانے کا بہت جنون تھا۔ کبھی ملنے والیوں کے ہاں خود جاتی اور کبھی بلا بھیجتی۔ لیکن دل کو اندازہ یہ ہوا کہ یہ سب محض دھوکہ تھا۔ خلوص کسی میں نہ تھا۔ اس احساس کے ساتھ ہی ایک دم گوشۂ عافیت سنبھال لی۔ اب پورا وقت صرف اپنا ہی اپنا ہے ——— جو چاہوں کروں۔ سب کو چھوڑ کر دل کو تکلیف پہنچی سو پہنچی۔ لیکن دماغ اپنے فیصلہ پر مطمئن۔

تصویریں جمع کرنے کا دیکھنے کا شوق ہے۔ لیکن مکمل نہیں ہو سکتا۔ شام کا کھانا کھا کر کبھی پڑھنے بیٹھ گئی کبھی لکھنے ——— دس گیارہ بجے سو گئی۔ سوتی کیا ہوں نیند کے ساتھ مذاق کرتی ہوں۔ نیند بڑی مشکل سے آتی ہے۔ اور کمبخت آتی کب ہے۔ جب میں اپنی کسی خاص اچھی سہیلی کے مہمان بن کر جاتی ہوں۔ وہاں چونکہ بے فکری ہوتی ہے۔ گھر کے تفکرات نہیں ہوتے نوکروں کے ساتھ دماغ کھپانے کا سلسلہ نہیں ہوتا۔ شام کو بستر بغیر کہے جادو کے زور سے تیار۔ کھانا خود بخود دسترخوان پر حاضر۔ تفریح کے لئے بہت سی جان پہچان روزانہ آجاتی ہیں۔

وہاں پر یہ سوچنا نہیں ہوتا۔ آج کیا پکے گا؟ آج کیا کھانا ہو؟ اس وقت دودھ کتنا منگائیں؟ برف کتنے سیر ہے؟ دہی کیا بھاؤ ہے؟ ترکاری کون کون سی بازار میں ہیں؟ وہاں تو صرف یہ سوچنا پڑتا ہے۔ اب ان سب کے ساتھ کیا کیا باتیں کریں؟ کہاں کہاں کی تفریح کے لئے سوچا جائے۔ کون سی تاریخی عمارت دیکھنے چلیں؟ شام کو کون سا پکچر چپکے سے دیکھ آئیں۔ کس بے تکلف سہیلی کے ہاں دھاوا بول دیں ———؟ کیا کریں کیا نہ کریں۔ کس کو بلا لیں۔ کس کو دعوت دیں۔ کون سی نئی ملنے پسند آئی۔ کس کی ہنسی دل کو سکون پہنچاتی ہے۔ کس کا رنجیدہ چہرہ پسند ہے ——— کس کی حسین آنکھوں کے پیچھے غم جھانک رہا ہے۔ کس کے ہونٹ خاموش ہیں اور دل آہوں کا ڈھیر۔ کون ہمیں زیادہ پسند کرتی ہے۔

غرض میری زندگی کے سب سے بیش قیمت دن وہی ہوتے ہیں جب میں ہزاروں میل کا سفر کر کے ملنے والیوں کے جھرمٹ میں پہنچ جاتی ہوں۔ چاہتی ہوں ایسے دن خدا سب کو

نصیب کرے۔ جی میں آفکر ات غائب۔ سکون حاضر۔ محبت ہی محبت۔ انسانوں کے لئے جیتی جاگتی ہیروئن موجود۔ پھر اور بھلا کیا چاہئے ——— ؟

یہ تو رہا موجودہ وقت کا شغل۔ جاڑوں کا کچھ اور ہی ڈھنگ ہوتا ہے ——— رات کا زیادہ وقت بنتے بناتے کٹتا ہے۔ کبھی سلائی کرتے۔ سینئے نہ تو پہنئے کہاں سے؟ کبھی پورے پورے دن شدت کی سردی میں لحاف میں چھپنا پڑ جاتا ہے۔

برسات میں کچھ اور ہی سماں ہوتا ہے۔ اب سب باتیں کہاں تک بتاؤں۔

بس بھئی اب میں کچھ بھی نہ بتاؤں گی ایک حرف بھی نہیں ——— کیا معلوم کس کو رشک آ جائے؟ خواہ مخواہ ——— اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ کیا پتہ کیا ہو۔ بھلا گھر کے مشغلے سب کچھ کیسے بتا دئے جائیں؟ ناممکن ہی سمجھو ——— خیر کچھ تو بتا ہی دیا۔ معاف کیجئے زندگی میں روزانہ ہی ایسی ہی حسین صبح و شام نہیں ہوتیں۔ جن میں میں زندگی کو بھول سمجھوں ——— انگڑائیاں لے لے کر آنکھیں نیم وا کروں۔ ایسی تلخ صبح بھی تو ہوتی ہیں جب ماضی کی دھندلی صبح یاد آتی ہیں۔

ایسی بھی تو بعض صبح آتی ہیں جو کونین سے بھی زیادہ کڑوی ہوتی ہیں۔

ہاں بھئی کبھی کبھی ایسی بدنصیب صبح بھی نمودار ہوتی ہیں جن کے دھندلکے میری قسمت سے بھی زیادہ تاریک ہوتے ہیں۔

اور ایسی صبح شام بھی میری ہوئی ہیں جو روتے روتے نڈھال کر دیں۔

ایسی راتیں بھی تو مجھ پر گزرتی ہیں جب ایک ایک منٹ ایک ایک سال کا ہو جاتا ہے۔ تمام گھر سو جائے اور میں ماضی کے خوابوں میں گرفتار۔ نہ بھول سکتی ہوں نہ بدلے لے سکتی ہوں۔ اور نہ کچھ کر سکتی ہوں۔

ایسی صبح و شام کی بھی کمی نہیں۔ جب بہت سی ہستیاں جنھیں میں بہت اپنا سمجھتی ہوں اپنا ... اعلان فرما دیتی ہیں" ہم تمہارے نہیں ہیں"۔ میں منہ تاکتی رہ جاتی ہوں ——— میرے برسوں کے تعمیر شدہ ریت کے محل آن واحد میں بڑھیا کے محل کی طرح اڑا ... اڑادھم ہو کے میرے قدموں میں آ رہتے ہیں ——— میں بچوں کی طرح پھر سے کسی خیالی محل بنانے میں کھو جاتی ہوں ——— !!

میری رفیق میز (افسانہ)

سعیدہ مہرنور کلیہ اناث

میری رفیق میز — پچھلے کئی دنوں سے میں تجھ سے دُور ہو لیا اور تو میری نگاہوں سے اوجھل ہے میرا بس چلتا تو تیرے آبنوسی وجود کی سواری میں لاد لیتی۔ بھیا کہتے ہیں کہ میری یہ شاعرانہ حرکتیں فطرت انسانی کے منافی ہیں۔ مجھے بے زبانوں سے انسیت ہے جنھیں کوئی حسِ قدرت نے عطا نہ کی ہو میرے لئے وہی بجائے خود احساس ہوتے ہیں جو کچھ نہ سمجھے میرے نزدیک سب کچھ سمجھنے والا اور جو کچھ نہ دیکھے میرے نزدیک سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ یہ میرا شخصی نقطہ نظر ہے جو جمادات، نباتات کے ہر حسین و غیر حسین منظر سے متعلق ہو سکتا ہے۔ مگر بھیا کو اس سے اختلاف ہے وہ سراسر گفتگو ہیں۔ انھیں نوک جھونک کے جھمیلوں میں مزا آتا ہے۔ بڑی بڑی گھنٹوں ہنستے بولتے رہتے ہیں اسی میں ان کی ساری لذتیں مجتمع ہیں یا پھر کہیں دلچسپی ہوتی ہے تو ریحانہ کے ساتھ تنہائیوں میں —

اس سرزمین رنگ و حسن میں میرے لئے اس سے زیادہ کوئی جاذبیت نہیں کہ یہاں فطرت پوری آزادی کے ساتھ انسانوں سے ہم کلام ہونے کے لئے بے تابہ دکھائی دیتی ہے میں نے اکثر شامیں پہاڑی فرازوں پر اوداس گذاری ہیں جہاں کے اونچے آبنوس مجھے تیری یاد دلاتے ہیں۔ میری رفیق میز

میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ مجھ پر اعتراض کرنے کا کسی کو کس طرح حق پہنچتا ہے جس طرح ریحانہ کی صباحتوں میں بھیا کو ایک انجذاب ایک اضطراب اور ایک سبک سی گدگدی ملتی ہے اسی طرح مجھے تیری آغوش میں نئے نئے خیالات دلفریب تصورات اور دلچسپ باتیں ملتی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کی کتنی چھوٹی بڑی واردات تجھ سے بیان کر دیں۔ اپنی ناکامیابیاں۔ تووں میں میں نے کتنے فلسفیانہ خیالات تجھ سے کہہ ڈالے اور تو نے خاموشی سے اپنے میں انھیں جذب کر لیا میری اچھی خاموش ساتھی۔

اب رات کے سیاہ بادل چاروں طرف سے گھر آرہے ہیں۔ ایسے میں میں اداس ایک دریچہ پر کاغذ رکھے تجھ سے باتیں کر رہی ہوں۔ یہ داستان میں بیگم افشاں کے نام بھجواؤنگی جو میرے آنے سے پہلے میری اس تحریر کو تیرے سپرد کر دیں گی۔ میری اچھی میز

کتابوں کی دنیا سے جو میں تھوڑی دیر کے لئے اکتا جاتی ہوں تو تیرا ہی آغوش مجھے سکون
بخشتا ہے میں اپنے ہاتھوں کو تجھ پہ پھیلا کر جھک جاتی ہوں کچھ دیر کے لئے بالکل ہی غافل
ہو کر۔ مجھے یاد ہے تیرے جسم پر میں نے ایک دن اپنا نیا کاڑھا ہوا غلاف اڑھایا تھا۔ یہ
میز پوش میں نے گرما کی چھٹیوں میں شروع کیا اور گرمیوں میں ختم کیا۔ اتنی طویل اور
صبر آزما مدت کے بعد جب وہ تیرے آبنوسی جسم کو ڈھانکنے لگا تو تو نے کتنی مشکور نگاہوں
سے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی بےکس فقیر کی آنکھوں میں تھوڑا
سا نقدی مل جانے سے تشکر و امتنان کے محجوب ارمان مچلنے لگتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم میری
کتنی باتوں سے تجھے اتفاق ہے اور میری ایسی کونسی باتیں ہیں جس پر تو ہنسا کرتی ہے
مگر پھر بھی تو اختلاف رائے کے زعم میں کبھی نقض امن کو روا نہیں رکھتی۔ معلوم تو ایسا
ہوتا ہے کہ میری اور تیری زندگی کا ایک تعلق ہو گیا ہے۔ تو نے صرف میرے لئے اپنے سینہ
پر قلموں، فائلوں، کتابوں، دواتوں اور شلف، پیپر ویٹ کا بوجھ سہار لیا۔ اور
ہمیشہ انہیں میری اطاعت پر اکساتی رہی، مگر اف یہ بلائیں کبھی مانی ہیں، پنسل بڑی
چلبلی واقع ہوئی ہے خصوصاً اس وقت جب میں خشک مضامین پر طبع آزمائی کرتی ہوں
تو میری انگلیوں کی نسوانی گرفت سے ہمیشہ مچل مچل کر چھوٹ پڑتی ہے اسے شاید
ایسے مضامین پسند نہیں۔ مگر ظالم یہ نہیں جانتی دنیا میں کتنے ایسے لمحے بھی آتے ہیں
جب اپنی رضی کے خلاف کہنا اور سننا پڑتا ہے۔ زندگی ہمیشہ ہمواری کی قائل نہیں اس
میں نشیب و فراز سب ہی داخل ہیں۔

میری دوات البتہ کچھ چڑچڑی ہے۔ خلاف طبیعت بات اور تشدد سے کام
لینے پر بگڑ بیٹھتی ہے اور اپنا سارا وبال میز پوش پر اتار کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ بیچارہ
میز پوش گاندھی جی کی فطرت والا عدم تشدد کا حامی۔
پیپر ویٹ کے مزاج میں کچھ بہت زیادہ شوخی ہے خدا جانے کیوں اور کب کسی
کسی طرح وہ میز سے غائب ہو جاتا ہے۔ کھڑکی سے آنے والی تیز تیز ہوا اوراق کو بکھیر
کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں پریشان ادھر ادھر ڈھونڈنے لگتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ
وہ کبھی دالان کے بالائی حصہ میں کبھی مشرقی سمت کبھی دالان کے کسی گوشہ میں۔ مختصر
یہ کہ ننھے بھائی بہنوں کی وجہ سے اس کا حال کم و بیش سوباش چندر بوس کا سا ہے۔

مگر ان مختلف فطرتوں کے یکجا رہنے بسنے کے باوجود بھی میری میز کتنی پرسکون فضا اور کتنا پر امن ماحول رکھتی ہے اور ایک ہندوستان بھی ہے جہاں دو قومیں آپس میں اتحاد قایم نہیں رکھ سکتیں۔ آزادی کی چوکھٹ پر پہنچ کر بجائے منزل میں داخل ہونے کے باہر ہی برسر پیکار ہیں۔

انسان کی فطرت ہے وہ کبھی ایک حالت کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے تجھے تیری مانوس کھڑکی کے سامنے سے اٹھا دیا۔ تیری اس سہیلی سے تجھے بچھڑا دیا جو تجھے میری غیر موجودگی میں صحن چمن کا مستانہ دلفریبیوں کے قصے سناتی اور باغ کی گھنیری کنجوں کی حسین وارداتیں بیان کرتی تھی تو اب ایک الماری کے قریب اداس پڑی ہے لیکن خدا نے تجھے صبر سے مالا مال کیا ہے۔ ایک میں ہوں کہ اپنی سہیلی سے جدا ہو کر اتنی اداس ہوں۔ پیاری نمرہ وہ کتنی شاعرانہ لڑکی ہے۔ کتنی دلچسپ۔ ایسے موسم کی معنویت میں اپنے ساتھ محسوس کر کے میں خوشیوں کا ابلتا سونا بن جاتی ہوں۔ آج وہ مجھ سے کوسوں دور ہے اپنے محبوب وطن میں۔

میز میری فلسفی دوست! تیرے سہارے میں نے علم و فن کے کتنے مدارج طے کر لئے کتنے خیالات تو نے مجھے سمجھائے۔ عالم تصور میں کتنی محفلیں تو نے میرے ساتھ ترتیب دیں۔ آج میں تجھ سے بھی دور ہوں۔ اس کھیل کود کی محفل میں مجھے تیرا سنجیدہ آغوش یاد آرہا ہے، جہاں میں نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا ہے۔ جہاں اپنے اخلاق سنوارنے کے درس لئے ہیں اور جہاں میں نے یہ سیکھا ہے کہ زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے۔ اپنے محبوب ساتھیوں میں رہ کر اور ان سے جدا ہو کر بھی ——

ریحانہ سر پر چڑھی آرہی ہے وہ کھیل کی دیوانی ہے اور بھلا بیچاری ریحانہ سے کوئی اور سنجیدہ کھیل کی فکر میں —— مجھے اب اجازت چاہیئے۔ میں پھر جب تیرے پاس ہونگی، میرے خیالات تجھے رنگینیوں میں لے پلٹنے کے لئے تیار رہیں گے، خدا حافظ

کیا سیدہ مہر نور آئندہ بھی اسی طرح کے مضامین بھجوا سکیں گی؟ براہ کرم ہر مہینہ کی پانچ تاریخ تک مضمون آجانا چاہیئے۔ غالباً آپ شہاب میں پہلی مرتبہ آئی ہیں۔

براہ کرم مضامین صاف اور خوشخط لکھیں تو غلطی نہ ہوگی۔

(گیت)

دیپک راگ

چھیڑ سہیلی پریم کی دھن میں کوئی سہانا گیت
گیت سنانا گیت

کوئی سہانا راگ کہ جس میں پریم کے ہوں انداز
کوئی رسیلا گیت سنا دے چھیڑ کے من کا ساز
شوق سے جس کو گاتے تھے بالم وہی پرانا گیت ——— گیت سنانا گیت
چھیڑ سہیلی پریم کی دھن میں کوئی سہانا گیت ——— گیت سنانا گیت

(۲)

ایسا سہانا گیت کہ جس سے من مورا لہرائے
ایسا سہانا گیت کہ جس کو سن کے جی للچائے
یا لگے گویا پیار کی لے میں آج وہ گانا گیت ——— گیت سنانا گیت
چھیڑ سہیلی پریم کی دھن میں کوئی سہانا گیت ——— گیت سنانا گیت

(۳)

ہلکی ہلکی دھیمی دھیمی مدھم مدھم تانیں!
دیپ جلے اجیارا ہووے! ہو رہیئے سب مانیں
اپنی رسیلی آنکھ سے ہم کو ایسا پلانا گیت ——— گیت سنانا گیت
چھیڑ سہیلی پریم کی دھن میں ایسا سہانا گیت

بہن رضیہ اشرف حیدر آباد

بلدیہ کور دستیہ (حجمہ سیدلیما)
آپ اور بھی گیت بھیجئے۔ بہت دنوں سے خاموش تھیں۔

رادھا کے خط اور ان کے جواب

"ن۔ج" کلیہ اناث

—— ۱ ——

نسرین !! تم سوچ رہی ہوں گی کہ کل ہی تو ملی تھی، آج خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے، پھر بھی

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

سوچتی ہوں جب کوئی بات ظاہر کرنا ہی ہے تو دیر کیوں اور پھر تم کل ہی پوچھتی تھیں "رادھا تم نے آج ہنسا کیوں نہیں، تمہاری سرمئی آنکھوں اور جھکی جھکی پلکوں میں یہ سنجیدگی کیوں سمٹ آئی ہے۔ اس خاموشی کا سبب، وجہ؟ —— میں خود نہیں جانتی مجھے کیا ہو گیا ہے ہنسی کیوں نہیں آئی پہلے تمہیں دیکھتے ہی، ایسے ہنسی آتی تھی جیسے کسی نے گدگدا دیا ہو میں خاموش کیوں ہوں! میں کیا جانوں انسان خود اپنی حالت محسوس نہیں کر سکتا ہو سکتا ہے کہ واقعات اور حالات نے مجھے بدل دیا ہو اور وہی بدلی ہوئی حالت کل تمہارے سامنے تھی جس کی وجہ دریافت کرنے کا تمہیں "بہت جلد" خیال آیا۔ لیکن تمہیں میرے بدلنے کی کیا فکر ہے ہاں بھول گئی ہوں تمہیں تو میری ہی فکر رہتی ہر وقت، ہمیشہ آہ بس بھی کر دو، بہت ہو چکیں تمہاری ہمدردیاں، تمہاری تمنائیں۔ پہلے ہی کیا کم تھیں میں تو تمہاری پیہم نوازشوں سے اس قدر سیر ہو گئی ہوں کہ اب "شکوہ کوتاہیٔ داماں" ہو چلا ہے۔ تمہیں میری فکر کرنے سے کیا ملیگا۔ اپنے قیمتی اوقات کو یوں میرے لئے ضائع نہ کرو۔ ان کا صحیح استعمال سیکھو، افسانوں کے پلاٹ سوچو، قابل دید قابل قدر ہستیوں سے رسمی خط و کتابت جاری رکھو۔ اشعار سمجھنے کی کوشش کرو۔ زندگی سے قریب ہو کر اسے دیکھو سمجھو، پھر اوروں کو بھی سمجھاؤ، اب کالج کی مصروفیات تو ختم ہی سمجھو اس وقت عذر تھا کہ "بھئی رادھا بہت پڑھنا ہے پھر باتیں کریں گے" اور اب جو وقت ملا ہے اس کو یوں ضائع بھی نہ کرو۔ تم حیران نہ ہو میں کیا کہہ رہی ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے مجھے قابل نفرین سمجھو، کیونکہ نہ میں ایک بہترین ادیب ہوں نہ ایک قابل مفکر، نہ شاعر ہوں اور نہ دوست! دیکھو تو سہی میں بھی کیسی غائب دماغ ہوں نسرین! تمہیں تو پہلے ہی علم تھا کہ میں نے اتنے سارے وقت تم سے قریب رہ کر صرف تمہارا وقت خراب کیا، میں تو اپنا دل بہلا رہی تھی، کھیل رہی تھی تم سے، وقت گذاری کر رہی تھی

کہو کیسی کامیاب ایکٹنگ رہی میری ـــــ کہ کھوٹے کو کھرا کر دکھایا۔ لیکن تم بھی بڑی اچھی قیافہ شناس ہو۔ نقل اور اصل میں تمیز کر لینا تمہارے لئے کچھ مشکل نہیں۔ دراصل اب میں ہی نہیں چاہتی کہ تمہیں اور غلط فہمی میں مبتلا رکھوں۔ تمہارے وہ متضاد خیالات جو میرے متعلق تھے انھیں اب ختم ہو جانا چاہیئے۔ سوچتی ہوں تمہیں جو پہلے چاہنے لگی تھی نا شائد اسی کی سزا ہے۔ زیادہ مٹھاس میں ویسے بھی تلخی ہی جاتی ہے۔ اس میدان میں دوڑتے ہوئے میں نے بازی جیت لینے کی ٹھانی تھی لیکن اس پہلی ہی ٹھوکر پر سنبھل جانا چاہتی ہوں۔

میں نے اس دن سوچا تھا کہ کل تمہاری دعوت میں نہ آؤں۔ پھر کیوں آگئی!! یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ کل کی طرح میں نے اپنے آپ کو کبھی تمہارے گھر چلنے کے لئے اتنا مجبور نہ کیا تھا۔ میرا مطلب نزہت سے نہیں ہے۔ وہ بیچاری تو سب سے آخر میں آئی اور سب سے پہلے چلی گئی۔ ہاں تمہیں ان کے ساتھ دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ تمہاری ان سے خوب نبھ سکتی ہے۔ تم ان سے کبھی خطوط کے جواب دیر سے ملنے کی شکایت نہ کرو گی۔ مہینوں نہ ملنے پر ان سے روٹھ نہ جاؤ گی انھیں "وقت گذاری" کا خطاب سے نہ نوازو گی۔ ایسی کبھی شکایت نہ ہو گی جیسی مجھ سے ہے۔ بھلا کل کی تمہاری دعوت میں میرا کون دوست تھا سوا تمہارے۔ میں نے اپنے آپ کو نہ صرف اس گھر میں بلکہ ساری دنیا میں اکیلا محسوس کیا بالکل تنہا مسافر نہ رہبر نہ منزل کا پتہ پھر دوڑنے سے فائدہ۔ تمہارے ڈرائنگ روم کی ساری زینت سجاوٹ جیسے مجھے طنز سے کہہ رہی تھی " راد ھا تو اکیلی ہے، تجھے کچھ نہیں مل سکتا" وہی حسین مجسمے جنھیں بار بار دیکھتے ہوئے بھی نہ تھکتی تھی اور چاہتی تھی ان خیالی پیکروں سے باتیں کروں کل مجھے دیکھ کر ٹھٹھے لگا رہے تھے۔ وہی اکسٹرا کیٹ کے بیچاری کارل مارکس کا مجسمہ جس نے سرمایہ داری کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے ہوئے اپنا جیون نبھایا وہی ٹیگور کی بڑی پینٹنگ جس کی آنکھوں میں عبودیت سموئی ہوئی تھی اور جو انسان کو انسانیت اور سچائی کی راہ بتاتا ہے۔ وہی اقبال کی بڑی سی تصویر جو خودی کی پکار تی ہوئی انسان کو اس کی برتری کی قائل کرتی نظر آتی تھی کل کہہ رہے تھے " اپنا سفر ختم کر دے رادھا آگے نہ چل سکیگی۔ آنکھیں میچ لے تو نہ دیکھ سکیگی۔ نسرین تیرے اور صرف تیرے لئے نہیں اس کی سب کو ضرورت ہے۔ ساری دنیا کو اس کا انتظار ہے وہ اپنی شہرت چاہتی ہے اسے الگ رہ کر کچھ " کرنے دے۔ تیری وجہ وہ کچھ نہ کر سکے گی۔ نزہت

ترقی اور شہرت کی راہ دکھا رہی ہے" —— اور میرے دماغ میں جیسے ہزاروں چونٹیاں رینگنے لگیں۔ واقعی نزہت تو تمہیں مجھ سے چھین کر شہرت اور بلندی کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہے —— ہاں یہ تمہیں نے کہا تھا کہ رادھا سب کی دوست نہ بنی رہ کسی ایک کی ہو جا۔ خوشیوں اور دلچسپیوں کا بٹوارہ کرنے سے بہتر ہے اسے ایک ہی مرکز پر مربوط کر دیا جائے" اور میں نے بھی یہی کہا تھا۔ پر اب سوچتی ہوں وہی خوش رہ سکتا ہے جو اپنے کو زیادہ سے زیادہ دوستوں میں الجھائے رکھے اپنی خوشیاں سب کے ہاتھوں بکھیر دے اور دلچسپیوں کا بٹوارہ کر دے۔ مجھے تم سے اب بھی شکایت نہیں۔ تم کہوگی " اتنا سارا جو لکھی ہو وہ شکایت نہ ہوئی۔ تمہیں نسرین، صرف حقیقت سے قریب تر ہونے کے لئے تمہیں یہ سب بتلانا ضروری تھا۔ میرا ایشر یاد لیتی جاؤ۔ خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو نزہت کے ساتھ ہر قدم تمہیں اس منزل پر پہنچا دے جہاں تمہاری شہرت کے ڈنکے بجیں لوگ تمہارے درشن کے پیاسے ہوں اور میں ہر ایک سے یہ سنوں کہ "نسرین کا وجود دنیا کو ایک نیا درشن دینے آیا ہے وہ ہمیں جینا سکھائے گی بھگوان اس کی رکھشا کریں" اب تمہیں دنیا کی کوئی شکتی نہیں روک سکتی۔ تم آزاد رہ کر ہر وہ کام کرو جو تمہارے ارادوں سے قریب تر کر دے۔ ہاں کسی سے دوستی کرو تو اس پر اعتبار کرنا پہلے سیکھو!

ماتا جی نے بھی دعا دی ہے۔ ہاں ابھی شیام بابو آئے تھے۔ کملا دیوی ساتھ نہ تھیں میں نے لوٹا دیا انہیں بھی بغیر ملے ویسے بھی دل نہ چاہا —— ہاں انھوں نے تمہیں پوچھا ہے اور ہنستے" کہا ہے —————— تمہاری اپنی ہی

"رادھا"

بسر پرستی خاص اعلیحضرت خسرو دکن برا خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

دور عثمانی کے وہ مستند مصنوعات جن کے مفید ہونے سے دنیا کی کوئی ہستی انکار نہیں کر سکتی

ہر جگہ ملتے ہیں

نظام ویجیٹیبل ہیر آئیل
دکن ہیر آئیل
گولڈن اسنو
دکن ٹائیلٹ پوڈر
دکن ہیر کریم

ذو الفکس تین سال کے مسلسل تجربہ کے بعد یہ تیل محض ان حضرات کی فرمائش پر تیار کیا گیا ہے جن کے بال کمزوری سے بکثرت گرتے ہیں۔ ذو الفکس لوورڈز میں از سر نو بال پیدا کرنے میں مفید ثابت ہوا ہے۔ راست ہم سے طلب فرمائیے۔ قیمت فی بوتل علاوہ اخراجات للعہ چار روپیہ بارہ آنہ مقرر ہے

مبارک ہے وہ ملک جو اپنے ہی ملک کے مفید مصنوعات سے مستفید ہوتا رہے اور قابل فخر ہے وہ کارخانہ جو ایمانداری سے دنیا پر اپنا اعتماد قائم کرے

دکن ہیر آئیل کمپنی اعظم پورہ روبرو چمن پل چادر گھاٹ حیدر آباد دکن

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب میر پورہ سے شائع ہوا

شہاب

جلد (۱۶) دی ۱۳۵۷ف م نومبر ۱۹۴۷ء نمبر (۲)

(مرتبہ)

محمد عبد الرزاق بسمل

چندہ سالانہ (ع)

قوسِ قزح

جناب فخر الدین احمد صاحب سعید، بی اے

آسمان پر آج ہے کچھ اور ہی تیاریاں
کیوں بنی ہے یہ کمان کیسی یہ رنگیں دھاریاں
یا کہ فردوس بریں کا ہے یہ باب الداخلہ
کی گئی ہیں جس پہ رنگا رنگ استرکاریاں
یا ڈوپٹے سوکھتے ہیں زہرہ و ناہید کے
رنگ کر ڈالی ہیں کس نے آسمان پر ساریاں
آسمانی محفلوں میں آج کیا تقریب ہے
رنگ تو موجود ہے لیکن نہیں پچکاریاں
کس لئے نقاش فطرت نے یہ پھر گھولے ہیں رنگ
رہ گئیں تھیں اور کیا نقاشیاں گلکاریاں
سوچتا ہوں دیکھ کر پیہم تجھے قوسِ قزح
تیرے رنگوں میں نہ جھگڑا ہے نہ ہیں طراریاں
مختلف ہیں رنگ پر سب میں ہے قرب و اختلاط
کس قدر مل جل کے رہتی ہیں یہ رنگیں دھاریاں

اور ہی ہے اس میری دنیا کا قصہ ہیں یہاں
اختلاف رنگ پر اقوام میں بیزاریاں
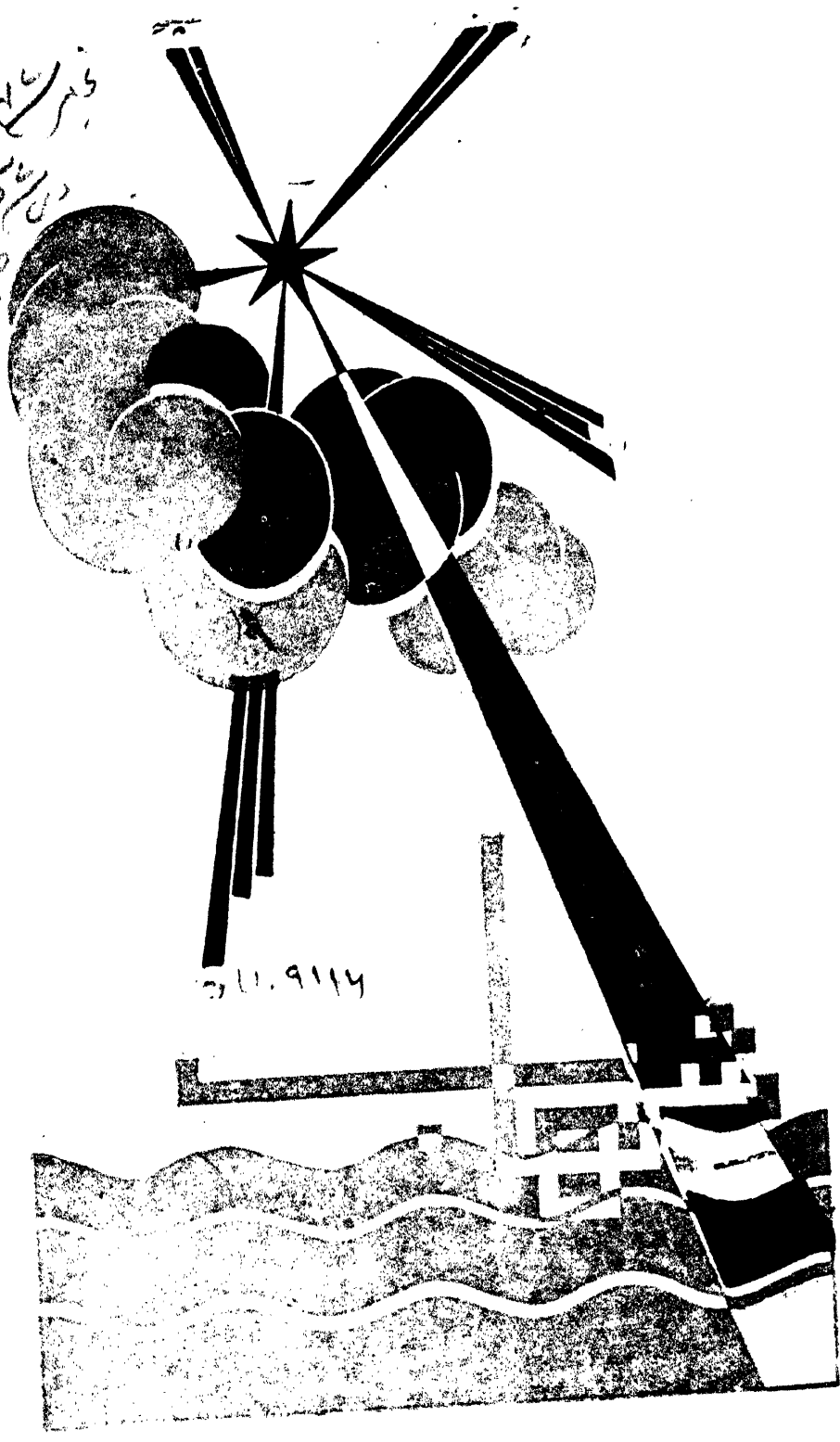
سن کی کاشت

جناب پروفیسر سعید الدین صاحب (جامعہ عثمانیہ)

شروع ہی میں عرض کیا گیا تھا کہ نباتات کی صنعتی اہمیت کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنے کے بعد چند پودوں کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ سب سے پہلے سن (شکل ۱) کا ذکر کیا جائیگا۔ سن زیادہ تر دو پودوں کے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک کارکورس کیپولیرس Corchorus capsularis ہے جس کی شمالی، وسطی اور مشرقی بنگال میں کاشت کی جاتی ہے۔ دوسرا کارکورس اولیٹوریس Corchorus olitorius ہے۔ جو کلکتہ کے گرد و نواح میں لگایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سن کی کوئی قابل ذکر کاشت نہیں کیجاتی اور نہ کیجا سکتی ہے۔ اس کی بجائے عموماً گانجے کے پودے اور انباڑہ کی کاشت کیجاتی ہے جن سے کارآمد ریشہ حاصل ہوتا ہے

اس میں شک نہیں ہندوستانی سن سے قدیم زمانے سے واقف تھے۔ لیکن اس کی تاریخ ہندوستان میں برطانوی راج سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے۔ ہندوستانی ناموں میں اس قدر گڑبڑ ہے کہ بہ یقین کے ساتھ معلوم کرنا مشکل ہے کہ قدیم مصنفین نے کن ریشے والے پودوں کا حوالہ دیا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ قدیم ہندو پات Jute سے زیادہ سن Sunn hamp سے بہتر واقف تھے اور وہ حقیقی گانجے کے پودے Cannabis sativa سے واقف تھے۔ موجودہ صدی کے اوائل میں لفظ پات کا تعین ہوا اور وہ کارکورس اولیٹورس اور کارکورس کیپولیرس کے ریشے سے متعلق تھا۔ اس کے قبل ہندوستان سے جو سرکاری رپورٹ انگلستان روانہ کیجاتی تھی انہیں Hemp fibre کا ذکر ہے جو یا تو سن Sunn ہونا چاہئے یا بان پات، پات Jute -

تہذیب و طرز معاشرت کی ترقی کے ساتھ ساتھ کپڑے کی بھی ضرورت لاحق ہوتی۔ غالباً سن سے بڑی حد تک یہ ضرورت پوری ہوئی۔ لیکن سنتے یورپی پارچہ جات کی درآمد میں جو زیادہ سہولتیں مہیا ہوگئیں تو اس صنعت کو فروغ پانے میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔

شکل نمبر (۱) پان پاٹ (سن) کا پودا

کچھ عرصہ کے بعد برطانیہ وغیرہ نے ہندوستان سے سن کی تجارت شروع کی اور ہمارے کاشت کاروں کے لیئے یہ تجارت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ تھیلوں کی تجارت بنگالی کاشتکار کے کام کا ایک اہم جز بن گئی۔ سن برآمد کیا جانے لگا اور اس سے ڈوریاں اور تھیلے تیار کئے جا کر واپس بھیجے جانے لگے۔ اس کا چستاں میں شہر ڈنڈی Dundee۔ تھیلوں کی تیاری کا مرکز بن گیا۔ ۱۸۵۵ء تک ہندوستان میں ولایتی مشینوں سے سن کے تھیلے اور دیگر اشیاء بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اسی سال اور بعد کے سالوں میں کلکتہ کے گرد و نواح میں کئی سن کی گرنیاں قائم کی گئیں۔

سن زیادہ تر بنگال کے شمالی اور مشرقی اضلاع میں اور کم حد تک وسطی حصوں میں اگایا جاتا ہے۔ سن تقریباً کسی قسم کی زمین میں بھی اگایا جا سکتا ہے۔ لیکن موسم میں وہ نہ صرف اچھی طرح نشو و نما نہیں پاتا بلکہ اس کا ریشہ بھی کارآمد نہیں ہوتا۔ زرخیز چکنی مٹی اور ریت میں اس کی بے حد کامیابی کے ساتھ کاشت کی جا سکتی ہے۔ سن کی کاشت کے بعد ان ہی کھیتوں میں دھان، دالوں اور تمباکو کی کاشت کی جاتی ہے۔ سن کی کامیاب کاشت کے لئے گرم اور مرطوب آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ شروع میں بہت زیادہ بارش نقصان دہ ہوتی ہے۔ اگر نشیبی زمینات پر کاشت کرنی ہو تو بہت پہلے سے جوتی جاتی ہے تاکہ ٹھیرا ہوا پانی خارج کر دیا جائے۔ مرتفع زمینات پر ایسی ضرورت نہیں ہوتی۔ زمین میں جتنی زیادہ چکنی مٹی ہوگی اتنا ہی زیادہ ہل چلانے کی ضرورت ہوگی۔ بالآخر بیج بونے سے پہلے خود رو بوٹیوں کو چن کر خشک کیا جاتا اور جلا دیا جاتا ہے کاشت چار یا پانچ مہینے میں تیار ہو جاتی ہے اگر پودوں کے پھولنے کے قبل ریشہ نکالا جائے تو اتنا مضبوط نہیں ہوتا جتنا کہ پھل والے پودوں سے حاصل ہوتا ہے اگرچہ آخرالذکر چمکدار نہیں ہوتا۔ فی ایکڑ تقریباً پندرہ من ریشہ حاصل ہوتا ہے لیکن یہ مقدار زمین اور موسم کے لحاظ سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔ پودوں کو ٹھیرے ہوئے پانی کے گڑھوں میں ڈال کر سڑایا جاتا اور پھر ریشہ حاصل کیا جاتا ہے۔

سن بنگال کی اسقدر اہم پیداوار ہے کہ دنیا کا ہر ایک متمدن ملک یہاں سے سن کی درآمد کرتا ہے۔ سن سے تھیلوں کے علاوہ جو اشیاء بنائی جاتی ہیں ان سے ہم سب بخوبی واقف ہیں مثلاً رسیاں، قالین، چٹائیاں، موٹا کپڑا وغیرہ۔

نیل

تجارتی نیل انڈیگوفرا ٹنکٹوریا (In digofera tinctoria) سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کے وطن کے متعلق بہت کچھ اختلاف رائے ہے بعضوں کا خیال ہے کہ وہ افریقہ کے مغربی ساحل کا پودا ہے ایک ماہر گجرات کا پودا تصور کرتے ہیں دوسرے ماہرین اس کا وطن نامعلوم بتاتے ہیں۔ کانکن (Concan) میں وہ بظاہر خودرو معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی حد تک نیل مغربی حصوں مثلاً گجرات اور سندھ میں تیار کیا جاتا تھا جہاں وہ اب شاذ ہی تیار کیا جاتا ہے تاہم اس کا مقامی نام "دگالی" ابھی تک مستعمل ہے

ہندوستانی بازار دو اثرات سے متاثر ہوا تھا۔ ایک تو امریکہ میں نیل کے میدان کا انکشاف اور دوسرے ہندوستانی تاجروں کی رنگ میں آمیزش کرنے کی معیوب عادت اس کے بعد فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی اور انگریزی نوآبادیاتی نیل کی کاشت کی طرف راغب ہوئے۔ ہندوستانی نیل کی صنعت کی ازسرنو جگانے کی پہلی کوشش چھوٹی فرانسیسی فیاکٹری کے قیام سے شروع ہوئی۔ جو کلکتہ کے نزدیک قائم کی گئی تھی۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں میں نیلام کی کاشت کے جو طریقے ہیا تقریباً کیا ہیں بنگال کے تین اہم خطوں مثلاً جنوبی بنگال، شمالی اور جنوبی بہار میں حسب ذیل طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اول الذکر دو خطوں میں آبپاشی کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ زمین میں رطوبت روک رکھنے کی قابلیت ہے۔ جنوبی بہار مثلاً پٹنہ گیا وغیرہ میں تالابوں باولیوں وغیرہ سے زمین کو سیراب کیا جاتا ہے۔ شمالی بہار میں اعلیٰ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور یہ نیل کی کاشت کا مرکز ہے۔ تخم ریزی مشین کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

(Seed Sowing) پودوں سے نیل نکال لینے کے بعد انہیں کھیتوں میں بچھاکر
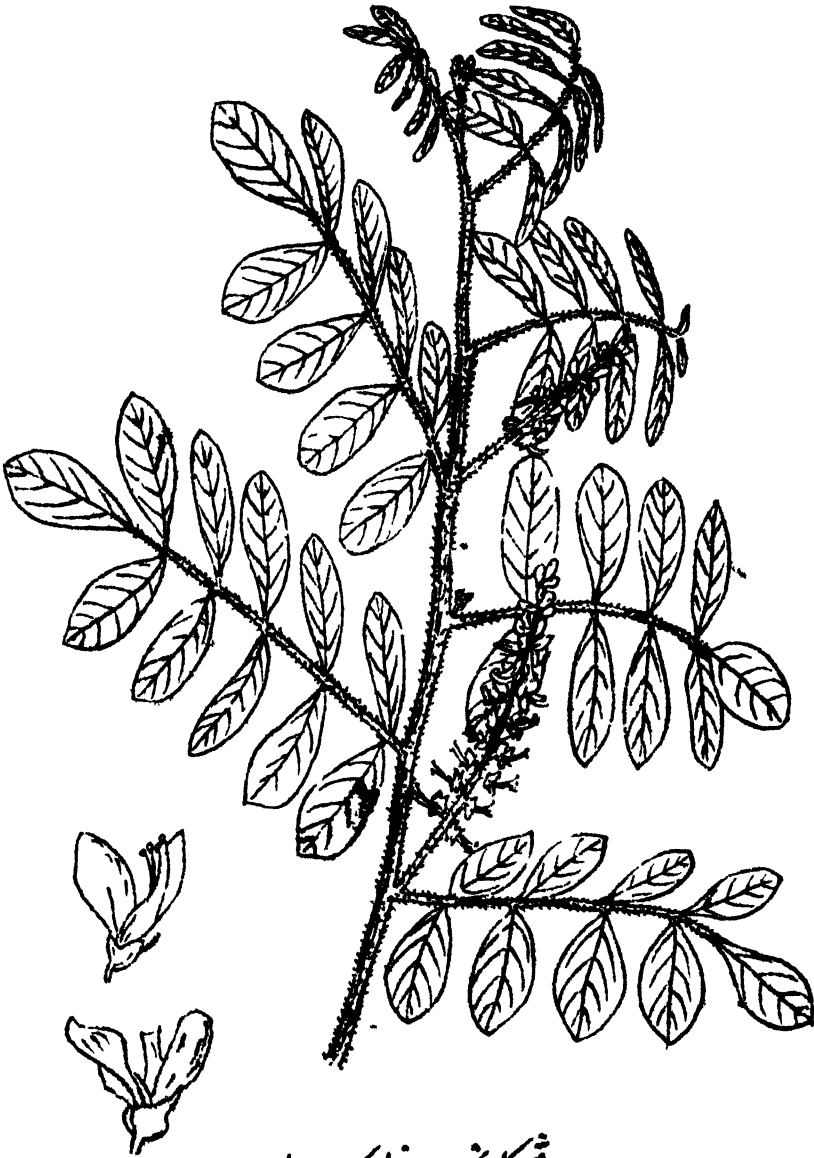
شکل نمبر (۲) نیل کا پودا

منظم طریقہ سے ڈھیر لگا دیئے جاتے اور گڑھوں میں ڈالدیتے ہیں۔ یہی کھاد کا کام دیتے ہیں۔ جب نیل کے پودے چند انچ اونچے ہوجاتے ہیں تو کھودی کی جاتی اور خودرو بوٹیاں علحدہ کردی جاتی ہیں۔ پودے زمین سے کافی بلند ہونے تک یہہ عمل کیا جاتا ہے جب پھول آنے شروع ہوتے ہیں تو سمجھیئے کہ نیل حاصل کرنے کے لئے پودے تیار ہوگئے ہیں غیر معمولی خشک موسم میں آبپاشی ضرورت ہوتی ہے۔ نیل کی کاشت ختم ہونے پر کھیتوں میں دھان کی کاشت کی جاتی ہے۔

نیل بنگال کے علاوہ شمال مغربی علاقوں اور اودھ، پنجاب، سندھ، راجپوتانہ وسطی ہندوستان، بمبی، مدراس برما اور آسام میں لگایا جاتا ہے۔ اب چونکہ کوئلہ وغیرہ سے رنگ حاصل کیا جانے لگا ہے نیل کی اہمیت بہت کم ہوگئی ہے۔ لیکن ماضی کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے اور اس بات کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے کہ جنگ کے زمانہ میں جبکہ بیرونی ممالک سے بہت سی ضروری اشیاء درآمد نہیں کی جاسکتیں ہیں اپنی پیداوار کا جائزہ لینا اور اُن سے واقف رہنا ضروری ہے۔ اس لئے اس مضمون میں نیل کا ذکر کیا گیا۔

سلام

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

دیا سجدہ میں سر سشہ نے شہادت ایسی ہوتی ہے ؏ قیامت نے کہا اُٹھ کر قیامت ایسی ہوتی ہے

علی اکبر کو جس نے رن میں دیکھا مصطفٰے سمجھا ؏ مشابہ اس کو کہتے ہیں شباہت ایسی ہوتی ہے

فرشتے ہوکے قربان رُوئے سرور پر یہ کہتے تھے ؏ جو خاصان خدا ہیں ان کی صورت ایسی ہوتی ہے

امام دوجہاں سرور امام انس وجاں ہرؓ ؏ امامت نام ہے اس کا امامت ایسی ہوتی ہے

وہ نقشہ کربلا کا ہائے جس دم یاد آتا ہے
کلیجہ خون ہوجاتا ہے حالت ایسی ہوتی ہے

نقد و نظر

از جناب عطارد صاحب

عرصہ دراز سے مولانا عبد القیوم خانصاحب تخلص باقی استاذ ادبیات اردو دار العلوم کالج کا کوئی تازہ کلام دیکھنے اور اوس سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ نہ ملا تھا شائقین شعر و ادب کو حضرت باقی کے شاگرد رشید محترمہ امتہ الکریم خورشید صاحبہ تخلص نذیر کا مشکور ہونا چاہیئے کہ انھوں استاد کی ایک تازہ غزل کو کتاب کی شکل میں زیور طبع سے آراستہ اور اپنی تشریح و توضیح سے پیراستہ کرکے شائع فرمایا۔ یہ خوبصورت چھوٹی سی (۴۷) صفحات کی کتاب انتظامی پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی ہے اور انجمن ارتقائے ادب اردو شعبہ نسوان اعظم پورہ سے بقیمت ۸/عہ مل سکتی ہے۔ مطبوعہ قیمت صرف چار آنے تھی غالباً عظمت کلام اور تشریحات مالاکلام کی مدنظر اس کو قلمزد کرکے ایک روپیہ آٹھ آنے قیمت مقرر کی گئی۔ جو حضرت باقی کے شاگردوں اور کلام باقی کے قدر دانوں کے لئے کچھ زیادہ نہیں۔ اسی کتابچہ کا نام "دو کنارے کے موتی" رکھا گیا ہے جو بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن جدت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نئی بات ہونی چاہیئے خواہ وہ کام کا ہو یا نام۔

شاگرد رشید نے اپنے "تاثرات" کو جو فی الحقیقت تشریح و توضیح کہنا چاہیئے نئے انداز میں قلمبند کرکے استاد کے ملاحظہ میں طباعت سے قبل پیش کیا اور حضرت باقی نے دست خاص سے ان الفاظ میں سند قبولیت عطا فرمائی ہو گیا کہیئے ہیں۔ "آپ کا تخئیل اور تصور آپ کی شاعرانہ کیفیت تو شاعری سے بھی آگے نکل گئیں"۔ انصاف تو یہ ہے کہ استاد نے شاگرد کے "تخئیل و تصور" کی سچی داد دی

ذیل میں ہم اپنے خیالات پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں شائقین شعر و ادب کو حقیقی لطف اسی وقت حاصل ہو سکے گا جبکہ جناب باقی کے نتائج فکر یعنی در ہائے شاہوار کو "دو کنارے کے موتی" میں میرے ان چھوٹے موتیوں کو شامل کرکے پڑھیں اگر ان چھوٹے موتیوں میں

اصلیت کی جھلک نظر نہ آئے تو مجھے معذور سمجھیں کیونکہ میں قدامت پرستوں کی صحبت کا فیض یافتہ ہوں

منکر نتواں گشت اگر دم زدم از عشق
این نشہ بمن گر نہ بود با دگرے ہست

قول

بڑھا کے حوصلۂ ناز دلبراں میں نے ❊ بنا دیا ہے محبت کو نوجواں میں نے

اس عجیب مطلع کی شاگرد رشید نے عجیب تر تشریح پورے ایک صفحہ پر ختم کی ہے! "ادہر میں ناز بردار بنتا گیا اور ادہر میرے دلبر کے حوصلہ بلند ہوتے گئے۔ حقیقتاً تو یہ ہے کہ میری اس نازبرداری ہی نے میرے دلبر کی محبت کو جوان اور شوخ بنا دیا ہے۔" معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد نے الفاظ سے قطع نظر کر کے استاد کے مقصد و منشا کو اپنے الفاظ میں ظاہر کیا مگر شعر کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ شاعر نے کسی "ایک دلبر کے حوصلہ بلند نہیں کئے" بلکہ بلاتخصیص بصیغۂ جمع "حوصلۂ ناز دلبراں" کو بڑھایا جس کے نتیجہ میں محبت جوان ہو گئی مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ محبت دلبروں کی تھی یا دل یا فلکوں کی جس پر اس عملی تحویلی کا اثر ہوا۔ غرض جو کچھ بھی ہو محبت کو جوان بنا دینا خود ایک کرامت ہے۔ شاعری میں جدت اور تخئیل کی خوبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

الجھ گئی میری آشفتگی میں بزم حیات ❊ ملا دیے ترے گیسو سے دو جہاں میں نے

شاگرد نے "بزم حیات" کو شاعر یا عاشق کی زندگی قرار دیا حالانکہ یہاں "بزم حیات" کنایہ ہے اس دنیائے رنگ و بو سے۔ مصرعہ اوّل کے صاف معنے یہ ہیں کہ میری آشفتگی و پریشان حالی میں ساری دنیا الجھ کر رہ گئی۔ دوسرے مصرعہ میں گیسو کا لفظ شاید آشفتگی کی مناسبت سے لایا گیا ورنہ دونوں مصرعوں میں کوئی معنوی ربط نہیں معشوق کے گیسو سے دو جہاں کو ملا دینا ادعائے شاعرانہ نہیں بلکہ مہمل اور بے معنے ہے۔

اب آپ ہی کی جفا آپ کے مقابل ہے ❊ وفا کا یوں ہی دیا تھا نہ امتحاں میں نے

ایک کا دوسرے کے مقابل ہونا بہ معنے حریف ہوتا ہے "آپ کی جفا آپ کے مقابل ہے" کے معنے یہ تو نہیں ہو سکتے کہ مظلوم ظالم کے سامنے ہے۔ دونوں مصرعوں میں باہم کوئی ربط بحالت موجودہ پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ آپ کی

جفاؤں پر بھی آپ سے وفا کرنے والا مظلوم اب آپ کے سامنے ہی جفا کئے جائے وہ داپنی وفا کا اسی طرح ثابت قدمی سے امتحان دیتا رہا ہے۔ مگر افسوس یہہ مطلب لفظوں سے ادا نہ ہوسکا۔

ہجوم اشک میں کچھ بھی نظر نہیں آتا ؎ ڈبو دیا ہے ستاروں میں آسماں میں نے

شاعر نازک خیال نے ہجوم اشک کو ستاروں سے اور آنکھ کے ڈھیلے کو آسمان سے شاہد تشبیہ دی ہے۔ پہلے مصرعہ میں لفظ میں ظرفیہ درست نہیں یہہ موقعہ ہجوم اشک سے کہنے کا تھا۔ آنکھ میں جب آنسو جمع ہوجاتے ہیں تو کوئی چیز صاف نظر نہیں آتی تاآں کہ آنسو ٹپک جائیں۔ مصرعہ اوّل کے معنے یہہ ہیں کہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ شعرا آنسو کو نہیں آنسو کے قطروں کو موتی سے تشبیہ دیا کرتے ہیں یہاں تو آنکھوں میں آنسو کا ہجوم ہے ابھی ٹپکنے کی نوبت ہی نہیں آئی ستارے گول نظر آتے کی وجہ اس تشبیہ کو تسلیم بھی کیا جائے تو عدم تقاطر اشک کی وجہ تشبیہ کا موقعہ ہی نہیں آیا۔ ستارے سیال شئے بھی نہیں جو ان میں کسی چیز کو ڈبوایا جاسکے۔ آسمان بصیغۂ واحد استعمال ہوا ہے لہذا یہہ فرض کرنا ہوگا کہ اشکوں کا ہجوم صرف ایک ہی آنکھ میں تھا جو کسی طرح صحیح نہیں۔ آنکھیں دو ہیں آسمان حد نظر ایک ہی ہے۔

جہاں جہاں ترے جلوؤں نے پردہ داری کی ؎ نظر اٹھائی ہے تجھ پہ وہاں وہاں میں نے

جلوے کے معنے ہیں اپنی یا اپنے حسن و جمال کی نمائش کرنی۔ یہاں تو جلوہ پردہ داری کر رہے ہیں مصرعہ اوّل میں فعل اور فاعل تو موجود ہے مگر مفعول کا پتہ نہیں۔ آخر جلوے کس چیز کی پردہ داری کر رہے ہیں۔ "تجھ پر نظر اٹھانا" اردو میں نہیں بولتے یہہ بے معنے کلمہ ہے۔

میری نگاہ نے پردے اٹھا دیئے شاید ؎ مکاں میں دیکھ لیا راز لامکاں میں نے

اس شعر میں نگاہ فاعل۔ اٹھا دے فعل اور پردے مفعول ہے مگر مصرعہ اوّل میں مفعول دوم کی جگہ خالی ہے آخر وہ کیا شئے ہے جس پر سے پردے اٹھا دیئے گئے اور پردے کس چیز سے عبارت ہے۔ "راز" کوئی مادی مرئی چیز نہیں جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مکاں میں لامکاں کو دیکھ لینا خود ایک کرامت ہے۔

نیاب

یہ آپ کس لئے مجھ سے بچاتے ہیں نظر ٭ کیا ہے جرم محبت تو مہرباں میں نے

اُردو میں "مجھ سے نظر بچانا" نہیں بولتے۔ مجرم تو خود دوسروں کی نظر بچا کر بھاگ جاتا ہے۔ ایک ہی لفظ سے شعر مہمل ہوگیا۔

جہاں ہو اوس کی تمنا، ہیں کرے سجدہ ٭ جبیں کو سونپ دیا تیرا آستاں میں نے

"اس" کا اشارہ جبین کی طرف ہے جب مشارٌ الیہ کو صرف سجدہ کرنے کی "تمنا" ہے خواہ مسجد ہو یا کنشت آستان یار ہو یا کچھ اور تو پھر "تیرا آستاں سونپ دینے" کا مقصد کیا ہے درحالیکہ پہلے ہی اوس کو یہ اختیار دیدیا گیا ہے کہ "جہاں ہو اوس کی تمنا وہیں کرے سجدہ" ایسی حالت میں نہ جدّت ہے نہ ندرت بلکہ یہ سب کچھ مہمل ہے۔

گرے گی اس پہ کسی آسماں سے برق فنا ٭ یہی سمجھ کے بنایا ہے آشیاں میں نے

"کسی آسمان" سے کون سا آسمان مراد ہے اور برق کو آسمان سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ آشیانہ بنانے کا فاعل کون ہے انسان ہے یا پرند صرف لفظ آشیان سے یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ آشیاں بنانے والا پرندہ ہے سالم شعر میں اس ایک لفظ کے سوا اور کہیں کوئی اشارہ نہیں دیکھئے غالب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم

گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر کے ایک ایک لفظ میں کیا کیا معنے پنہاں ہیں اور صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ گفتگو گرفتار شدہ دو پرندوں میں ہے۔ جس میں سے ایک طائر ہی میں گرفتار ہوا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ "برق اسی پر گرے گی سمجھ کے آشیاں بنانے سے کیا مقصد تھا اس میں کوئی شعریت تو نہیں ہے۔

چھپا چھپا کے نگاہوں سے عشق کے آنسو ٭ کیا ہے کتنے ستاروں کو رازداں میں نے

"عشق کے آنسو" عجیب ہے اس کے معنے عشق کے آنسو یا درد عشق سے ٹپکنے والے آنسو نہیں ہوسکتے۔ "کتنے ستاروں کو رازداں بنانے" کا کیا مفہوم ہے۔ یہاں یہ لفظ برائے بیت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مصرعہ ثانی استفہامیہ نہیں ہے۔ اُردو میں ایسے موقعہ پر کتنے ہی کہہ سکتے ہیں ٭

زمیں پہ اس کے سوا کیا ہے احتیاط وفا ؛ اٹھا لیا ہے لگا ہوں پہ آسماں میں نے

"زمین پہ احتیاط وفا" اور "لگا ہو تیغ آسمان اٹھا لینا"، بالکل انوکھی بات ہے لگا ہو شاید کوئی مادی ٹھوس شئے فرض کر لیا۔ لاشبہہ یہہ بے معنے شعر ہے۔

چھپا لیا کبھی آنکھوں میں حسن کون و مکاں ؛ لٹا دیئے کبھی ہاتھوں سے دو جہاں میں نے

اس نوعیت کے اشعار کو جن کے مفہوم و معنے بعید از قیاس ہوں ظرایف کہد یا کرتے ہیں کہ یہہ تصوف کا مسئلہ ہے اس کو ہر شخص سمجھ نہیں سکتا۔ لہذا ہم بھی قصور فہم کا اقرار کرتے ہیں۔ یہہ بھی مہمل شعر ہے۔

دکھا کے فصل بہاراں کو اک نظر رکھدی ؛ گلوں کی جیب میں تصویر باغباں میں نے

یہہ شعر ہے یا کوئی معمہ ہے۔ کوئی بتائے کہ گلوں کی جیب اور باغباں کی تصویر کس چیز سے عبارت ہے فاعل کوئی جادوگر یا شعبدہ باز ہی ہو سکتا ہے

یہہ کس کے حسن تصور کی شان ہے باقی ؛ نظام عشق میں دکھی ہیں خامیاں میں نے

سبحان اللہ کیسے کیسے بلند پایہ شعر کہئے "کسی کے حسن تصور کی شان نے نظام عشق کی خامیوں کو دکھا دیا"، تخیل کی بلند پروازیوں کو معنے سے کیا غرض۔ بوالہوسی اور عاشقی میں ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے۔

یہہ ہے بیسویں صدی کی ترقی یافتہ [illegible]ری کا نمونہ۔ کہاں ہیں سخن سرایان کہن اور قدر دانان فن اس جدید قسم کی شاعری کا ان سے اتباع نہیں ہو سکتا تو داد سخن دینے میں کیوں بخل کیا جائے۔

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

اُردو میں

(کنسٹرکٹ برج) پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے جو اس کے تمام مبادیات پر حاوی ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کے ذوق برج کو معیاری بنا دیگا۔

غزل

جناب مسلم

جہانِ آئینہ دارِ جلوۂ جاناں عشق است ؛ خدا خود حسنِ خود سر دفترِ افسانۂ عشق است

بشر با وصفِ آزادیِ فہم و عقل و ادراکش ؛ بدامِ حسن افتادہ است و ہم دیوانۂ عشق است

حرام آمد طلب کردن ز ساقی بادۂ احمر ؛ دو چشمِ میگسارِ او چو خود میخانۂ عشق است

ز پیرِ میکدہ پرسید رندے منزلِ حق را ؛ بگفتا گر خدا خواہی برو در خانۂ عشق است

محبت میکنم با آشنا و غیر من یکساں ؛ ہمی دانم کہ این دنیائے ما بتخانۂ عشق است

چہ نازی بر سر و سامانِ خود اے بوالہوس اینجا ؛ متاعِ دین و دنیا کمترین بیعانۂ عشق است

ز فرطِ شوقِ کامل بازیِ دار و رسن خواہم ؛ انا الحق بر لبِ من نعرۂ مردانۂ عشق است

مرا روزِ ازل مسلمؔ ہمین دولت مقدر شد

دلے دادند کو را مذہبِ یارانۂ عشق است

پھلجھڑیاں

جہان نورد

شہر کے ایک سینما ہال میں یوم اقبال منایا جارہا تھا، شام کے کوئی پانچ بجے ہوں گے کہ ہم ہال میں داخل ہوئے جلسہ کا آغاز ہو رہا تھا صدارت کی تحریک کی جارہی تھی پہلی صف خواتین سے بھری ہوئی تھی دوسری صف میں ایک صوفہ خالی نظر آیا اس پر ہم بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک خاتون تشریف لائیں پہلی صف کا ان کی نظروں نے جائزہ لیا اور پھر دوسری صف پر ان کی نگاہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ ہمارے صوفہ کے پاس آئیں اور ہم سے ہمارے صوفہ پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ ہم نے عرض کیا آپ شوق سے بیٹھ سکتی ہیں کہنے لگیں غالباً پہلی صف ہمارے لئے مخصوص تھی مگر دیکھئے ایک سیٹ بھی خالی نہیں ہے، ہم نے کہا کچھ مضائقہ نہیں آپ اس صوفہ پر تشریف رکھیں۔ ہر صوفہ پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے ہم نے اپنے صوفہ کا جو جائزہ لیا تو اس پر تیسرے آدمی کا بیٹھنا دشوار تھا کیوں کہ ہمارے صوفہ پر جو محترمہ بیٹھی تھیں وہ ذرا شاندار ڈیل ڈول کی تھیں۔ اس وقت ہمیں اپنی بھابی جان بے اختیار یاد آئیں۔ ایسے شاندار ڈیل ڈول کی خواتین کی نسبت وہ کہا کرتی ہیں کہ رنج وغم اقسام کی فکروں کی وجہ سے خواتین کو "غم بادہ" ہو جاتا ہے اور ان کے جسم پھول جاتے ہیں "غم بادہ" وہ اپنی اصطلاح میں غم کی وجہ سے موٹا ہونے کو کہتی ہیں۔ غم بادہ کی زندہ مثال وہ خود ہیں، ہمارے بھابی جان —— خدا ان کا بھلا کرے۔ عجیب غریب آدمی بس مجسم "جوا" ہیں، جوئے کی خاطر انھوں نے ساری دنیا کو چھوڑ دیا۔ بیوی بچوں کو چھوڑا، عزیزوں کو چھوڑا۔ نوکری چھوڑ دی وطن کو چھوڑا غرض کہ دین و دنیا دونوں گنوا بیٹھے۔ بھابی جان کو اللہ رکھے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں بڑا لڑکا نوکر ہو گیا ہے۔ اس وقت وہی سب کا کفیل ہے لڑکی کے بیاہ کی فکر اور شوہر کی وجہ سے انہیں جو رنج وغم اور اقسام کی فکریں ہیں ان سب نے ان کے جسم کو ذرا پھیلا دیا ہے اسی کو وہ "غم بادہ" کہتی ہیں۔ اب ہم اس فکر میں پڑ گئے کہ ہماری ساتھی خاتون کے پھولنے کی وجہ کیا ہو گی۔

اس وقت ایک پروفیسر تقریر کر رہے تھے اقبال کی شاعری پر تبصرہ ہو رہا تھا۔

اقبال کے اشعار پڑھے جا رہے تھے۔ ہمارے ہمنشین محترمہ اقبال کی شاعری سے بڑی عقیدت معلوم ہوتی تھی۔ جب ان کے اشعار پڑھے جانے لگے تو وہ جھوم جھوم کر داد دینے لگیں ان کے جھومنے سے ہمارا صوفہ بھی جھومنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اب وجد آنے کو ہے۔ اس وجدانی کیفیت میں ان کا سیدھا پنجہ ہمارے بائیں پنجہ پر بیٹھ گیا۔ ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی خاص وزنی چیز ہمارے ہاتھ پر رکھ دی گئی ہے۔ ہم اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ کے نیچے سے نکال بھی نہ سکتے تھے۔ ایک خاتون کے ہاتھ کے ساتھ ایسی بدتمیزی کیسے کی جاسکتی تھی ——! یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں ہمیں!!

کوئی پندرہ منٹ تک ہمارا ہاتھ اسی طرح ان کے ہاتھ کے زیرسایہ رہا۔ جب تقریر ختم ہوئی تو محترمہ کو ہوش آیا۔ ہمارے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے فرمایا "معاف کیجئے کہ اقبال کی شاعری میں کچھ ایسی میں کھو گئی کہ اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ پر رکھدیا" مجھ کو خبر نہیں ہوئی"۔ ہم نے کہا" کچھ مضائقہ نہیں، ایک معمولی بات کے لئے آپ کیوں معافی جاہ رہی ہیں"! دل ہی دل میں ہم محترمہ کی محویت کے قائل ہو گئے کہ کتنی عقیدت ہے ان کو اقبال اور ان کی شاعری سے!! مگر اس تقریب میں ہمارے ہاتھ کی گت بن گئی۔ مسلسل دبا رہنے سے خون کی روانی رک گئی اور وہ سُن ہو گیا۔

جلسہ کی کارروائی جاری تھی اب ایک نظم پڑھی جارہی تھی۔ ہمارا خیال پھر ہماری بھابی جان کے "غم بادہ" کی طرف ملٹا۔ رہ رہ کر اس خاتون کے حالات معلوم کرنے کا خیال ہمیں ستا رہا تھا اگر واقعی کسی صدمہ کی وجہ سے وہ بھول گئی ہیں تو بھابی جان کا "غم بادہ" بالکل برحق ہے۔ اب سوال ان سے دوستی بڑھانے کا تھا اس وقت جو نظم پڑھی جارہی تھی اس کی داد بھی وہ خوب جی کھول کر دے رہی تھیں اور اشعار کو دہرا رہی تھیں ایک نیا خیال ہمارے دل میں اس وقت یہ آیا کہ محترمہ ضرور "شاعرہ" ہیں یہ بات پوچھیں کیسے؟ جلسہ کی کارروائی میں کچھ وقفہ ہوتے ہی ہم نے آہستہ سے کہا "اقبال سے آپ کو خاص عقیدت معلوم ہوتی ہے"۔ کہنے لگیں "اقبال کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ بڑی ریاضت کے بعد میں نے ان کو اب کچھ سمجھا ہے"۔ ہم نے پوچھا غالباً آپ شعر بھی کہتی ہوں گی"؟ جواب دیا "ہاں کچھ ایسے ویسے ٹوٹے پھوٹے شعر کہہ لیتی ہوں"۔ جب تخلص کی نسبت دریافت کیا تو فرمایا "سوگوار"! اب تو ہم سوچنے ہماری بھابی جان کے

ہوئی آئیں ایسا معلوم ہوا کہ وہ ہماری گفتگو سن رہی تھیں آتے ہی بھائی جان کہہ کر ہم سے لپٹ گئیں۔ ان دونوں نے ہمیں کچھ ایسا جھنجوڑا کہ سارا جسم دکھنے لگا جب یہ جوش خروش کم ہوا تو ہمارے چچا جان نے فرمایا۔ بی بی کس دھن میں ہو کھانے کا وقت گذر رہا ہے۔ تمھارے بھائی جان کو کھانا کھلا ئیے بغیر جانے نہ دینا" ہم نے دل ہی دل میں کہا۔

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

بی بی نے کچھ ایسے خلوص اور اصرار سے ہمیں کھانے کے لئے مجبور کیا کہ انکار زباں سے نکل ہی نہ سکا۔ بی بی دوڑتی ہوئی اندر چلی گئیں کوئی آدھے گھنٹے بعد باہر نکل کر کہا "چلئے خاصہ تیار ہے"

اس مکان میں ہر چیز سلیقے اور قرینے کی تھی کھانے کے کمرے میں جب ہم سب داخل ہوئے بی بی سے زیادہ بھاری بھرکم ایک خاتون نظر آئیں۔ یہ تھیں ہماری چچی جان! چچا نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ ہم نے ادب سے سر تسلیم خم کیا ہمیں بڑے پیار سے گلے لگا لیا اور ایک سے اکیس ہونے کی دعا دی۔ ہم نے عرض کیا چچی جان مہنگائی کے اس زمانہ میں اگر اکیس بچے ہمیں ہو جائیں تو ہمارا اور ان کا کیا حشر ہوگا"! چچا جان نے قہقہہ لگایا بی بی تو ملے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔ چچی جان نے صرف مسکرا دیا اور فرمایا میاں اپنے بندوں کا اللہ رزاق ہے۔

آدمی کیوں نہ بھروسہ کرے اس کے در کا
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کا

چچی جان کی زبان فیض ترجمان سے یہ شعر سن کر ہمیں چچی جان کے شاعر ہونے کا یقین ہونے لگا۔ شعر سنا کر فرمایا "اپنے بندوں کو اللہ کبھی نہیں بھوکا رکھ سکتا" شاید آپ نے بنگال کے قحط کا حال نہیں سنا۔ ارشاد ہوا "وہ ان کے اعمال کا نتیجہ تھا" اتنے میں چچا جان منہ ہاتھ دھو کر دسترخوان پر آگئے۔ ہم اور ہماری بہن نے بھی منہ ہاتھ صاف کرلئے اور چچا جان کی "بسم اللہ" کے ساتھ ہم سب نے کھانا شروع کیا۔ کھانے بڑے مزیدار تھے خوب سیر ہو کر ہم نے کھایا۔ چچی جان کے حسن انتظام کی ہم نے تعریف کی تو چچا نے فرمایا سارا انتظام تمھاری بہن کرتی ہے۔ پکاتی بھی اچھا ہے یہ دم کے مرغ

اور لیطی کے روسٹ اسی نے بنائے ہیں یہ کباب اور روسٹ واقعی بڑے لذیذ تھے
بادام کا حلوہ اور امرت پھل بھی خوب تھے۔ یہ بھی بی بی نے بنائے تھے ایک ترقی
پسند خاتون میں یہ صفتیں دیکھ کر دل سے دعائیں نکلیں کہ بی بی کی "سوگواری" خوشگوار
زندگی میں تبدیل ہو جائے۔

کھانا ختم ہوتے ہی ہم سب ملاقات کے کمرے میں آگئے۔ چچا نے بی بی سے ریڈیو چلانے
کی فرمائش کی دکھن ریڈیو سے حسب معمول فرمائشی ریکارڈوں کا پروگرام چل رہا تھا۔
بی بی ریکارڈوں کا طویل پروگرام چل رہا تھا۔ بی بی ریکارڈ کے ساتھ گنگنانے لگیں تو
چچا نے فرمایا "گاتی کیوں نہیں شرماتی کیوں ہو"۔ ریڈیو کی آواز کم کر کے بی بی نے اس کے
ساتھ گانا شروع کیا۔ آواز بڑی رسیلی اور سریلی پائی ہے۔ کوئی آدھا گھنٹہ یہ شغل ہوتا رہا
ہم نے چچا کا شکریہ ادا کیا کہ بڑے مزیدار کھانے کھلائے اور اس کے ساتھ روح کو
بھی شاد کام کیا۔ یہ سن کر فرمایا۔ میاں تم نے بی بی کا ناچ نہیں دیکھا۔ اللہ خوب ناچتی
ہے" بی بی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ آج کل ناچنا عیب نہیں سمجھا جاتا شرماتی کیوں ہو، اپنے
بھائی سے تکلف کیسا! ہمیں بی بی کا ناچ دیکھنے کا اس لئے بھی زیادہ اشتیاق تھا کہ
دیکھیں اس ڈیل ڈول کے ساتھ وہ ناچتی کیسا ہیں۔ کچھ شرماتی لجاتی وہ اندر گئیں اور گھنگرو
پیروں میں باندھ کر نکلیں گراموفون پر کسی فلم کے گانے کا ریکارڈ "چلے چلے مورے راجہ"
بجنے لگا اور بی بی ساری کے پلو سے کمر باندھ کر کھڑی ہوگئیں اور نرت کے ساتھ گانا اور
ناچنا شروع کیا۔ واقعی بڑی باقاعدگی سے تال پر بی بی کے پیر اٹھتے تھے ناچتے ناچتے
ایک عالم بے خودی بی بی پر طاری ہونے لگا۔ در و دیوار سے بی بی کے گانے اور گھنگرو
کی آواز آنے لگی بڑی پھرتی اور خوبصورتی سے وہ ناچ رہی تھیں۔ ناچتے ناچتے جب
وہ ہمارے قریب آئیں ایک پائی سے ٹکرا گئیں ان کا توازن قائم نہ رہ سکا اور دھڑام
سے وہ ہم پر گر گئیں اس وقت ہم بی بی کے "نازک بوجھ" کو اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھے
اس لئے مع کرسی کے فرش پر چت ہو گئے۔ چچا اور چچی نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ چچا ہم
دونوں کی مدد کو آئے۔ بی بی کو ہم نے بڑی احتیاط سے اٹھایا۔ خدا کا شکر انھیں
کہیں چوٹ نہیں لگی۔ ہماری ایک انگلی بری طرح مجروح ہوگئی ٹوٹتے ٹوٹتے بچ گئی۔ ہم نے
کہ سب کا شکریہ ادا کیا۔ جب جانے لگے تو چچا ہمیں موٹر تک پہنچانے آئے اور فرمایا

ہفتہ میں ایک دفعہ ہم ضرور آیا کریں اور بی بی کا جی بہلایا کریں کیونکہ اکثر وہ اداس اور مگین رہتی ہیں کوئی چھ مہینے ہوتے ہیں کہ بی بی کے ماموں زاد بھائی کا انتقال ہو گیا ہے یہ ان کے منگیتر بھی تھا اسی کے غم میں بی بی نے اپنا تخلص سوگوار رکھ کر درد انگیز اشعار کہنا شروع کئے اور آئے دن اس کی جدائی میں گھلتی جا رہی ہیں۔ آخر میں چچا جان نے کہا کہ بی بی کے منگیتر کی صورت ہم سے بہت ملتی جلتی تھی اب بی بی کا غم غلط کرنے کی یہی ایک تدبیر ہو سکتی ہے کہ ہم اکثر بی بی سے ملتے رہیں۔ ہم اپنی بھابی جان کے نظریہ کے قائل ہو گئے کہ رنج و غم سے "غم بادہ" پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے خواتین کے جسم پھول جاتے ہیں۔

غزل

جناب سید محمد حسینی صاحب (بآنی)

جاتا ہے کوئی عشق کی دنیا لئے ہوئے ✿ یا دل میں تیرا داغ تمنا لئے ہوئے

ہر اشک چشم یاس میں طوفان کا رنگ ہے ✿ ہر قطرہ اپنے ساتھ ہے دریا لئے ہوئے

فصل بہار آئی ہے گلشن ہے میکدہ ✿ ہر گل ہے آج ساغر صہبا لئے ہوئے

مجھ کو جنون وحشت درماندگی نہیں ✿ پھرتا ہوں میں آپ کا سودا لئے ہوئے

عبرت یہ پوچھتی ہے دم نزع باربار ✿ اے جانے والے جاتا ہے کیا کیا لئے ہوئے

بیٹھا کلیجہ تھام کے اللہ کی قسم ✿ اُٹھا تو درد دل کا سہارا لئے ہوئے

بآنی اسی کو کہتے ہیں معراج زندگی

داغ جبین ہے خاک کف پا لئے ہوئے

رُوح کے یہ دریچے

(تاثیر)

(جناب سعید رضی صاحب)

ان دریچوں میں کیا وہ بڑا سا دریچہ مجھے کبھی بھلائے بھول سکتا ہے! — میں نیچے فرش پر اس دریچے کے سامنے کوئی کتاب زانو پر دھرے بیٹھا باہر کا منظر دیکھا کرتا! تم میز پر دنیا و مافیہا سے بے خبر لکھ رہے ہوتے۔ کبھی کبھی میری اور تمہاری نگاہیں ایک لمحے کے لئے چار ہوتیں اور تم مسکرا دیتے اس وقت تمہارا چہرہ کھویا سا نظر آتا، جیسے تمہارا جسم تو یہاں میں موجود ہے مگر تمہارا دل بے طرح ماضی کی پُر پیچ وادیوں میں کسی کھوئے کھوئے سے لمحے کی طرح بازو پھیلائے ہوا اُڑا چلا جا رہا ہے۔ بظاہر تو تم سامنے میز پر رکھے ہوئے پیتل کے مٹیالے رنگ والے سینوں کو دیکھتے ہوئے تھوڑی کے نیچے قلم ہاتھ کی ڈھیلی گرفت میں رکھے نہ جانے کیا کیا سوچتے جاتے۔ اور پھر یکایک تمہاری آنکھیں دمک اُٹھیں —— وہ آنکھیں جن کی جھکی ہوئی سیاہی مائل پتلیاں ہمیشہ کھوئی کھوئی سی نظر آتیں، جیسے ان میں انجانے خوابوں کا عکس پڑ رہا ہو — اور تم پھر نئے جوش کے ساتھ سر جھکا کر صفحوں کے صفحے لکھتے چلے جاتے......

میں تمہیں منہمک دیکھتے دیکھتے آخر تھک جاتا تو اس دریچے کے چاروں پٹ کھول دیتا —— اس دریچے میں نیچے سلاخیں تھیں اور اوپر کا حصہ کھلا رہ جاتا تھا — اور پھر میں چپ چاپ کسی اور ہی سوچ میں گم ہو جاتا۔

کیا تمہیں وہ سہانی صبح یاد ہے جب تم نہا دھو کر آئے تھے اور ناشتہ کئے بغیر ہی لکھنے کی میز پر —— اسی کھڑکی کے قریب ہی —— کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے تھے؟ اور پھر تم نے مجھے بیٹھے رہنے کے لئے کہہ کر بتایا تھا کہ تمہاری برسوں کی عادت تھی بغیر ناشتہ کئے جو بیٹھ جاتے تو پھر دوپہر کے کھانے تک نہ اُٹھتے! میز کی دراز ایک دو بار کھول کر کاغذ تم نے لکھنے کے لئے نکالے تھے اور پھر زور سے دراز بند کر کے لکھنے میں محو ہو گئے تھے —— اور میں تم سے کس قدر قریب مگر خیالی دنیا میں بھٹک رہا تھا۔ اس دریچے کے اور سامنے کے مکان کے صحن میں سے ایک گوشہ نما

ابھرنے والے پیپل کے پیڑ کا ایک حصہ چھا گیا تھا۔ اس کے پتوں کی مدہم پھڑپھڑاہٹ فضا کو ایک سرمدی سکون عطا کئے دے رہی تھی۔ تیز ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی اور محلے میں کہیں قریب ہی ڈھولک بج اٹھی تھی اور گجراتی لڑکیاں کوئی پرسوز گیت گاتی تھیں ۔۔۔ بہار کا گیت، زندگی کا گیت، آوارہ اڑتے ہوئے بادلوں کا گیت، ویرانے کا گیت، پیپل کی اس اونچی پھننگ پر چمکدار چکنے چکنے پتوں کے ایک جھنڈ کو دیکھتے دیکھتے میں خوابوں کی کسی اور ہی دنیا میں کھو گیا تھا۔ اور اس وقت خدا کے بارے میں تمہارا ایک استدلال میرے ذہن میں رینگ رہا تھا ــــــ

میں سوچ رہا تھا شائد تمہارا کہنا غلط نہیں: نیچر ہی کا عظیم حسن سب کچھ ہے؛ اور آپ کی عظمت و رفعت میں سرمدی حسن کا پہلو نکلتا ہے۔ پیپل کا وہ بڑا درخت اور ہوا کا لمس پا کر آہستہ آہستہ ہل اٹھتے اور پھر ساکت ہو جانے والے اس کے وہ صنوبری وضع کے پتے مجھے کسی اور ہی عظمت کا احساس بلکہ یقین سا دلا رہے تھے۔ میری نظر میں کتنی وسعت پیدا ہو گئی تھی ــــــ کون جانتا ہے کائنات کی اسی روح کا نام خدا نہیں ہے؟ ــــــ یا جب بلندیوں میں نگاہ الجھ کر رہ جاتی ہے، جب ہمارا خیال پر لگا کر وسعتوں میں اڑتا ہے تو یہ احساس دل کو کس قدر اطمینان اور سکون بخش دیتا ہے کہ زندگی کا راز بس یہی بلندی ہے ــــــ اسی رفعت میں پنہاں ہے ــــــ اوپر نیلا نیلا آسمان ہو اور اس میں آزادی سے اڑنے والے پر مدہوں اور انسان پہروں بیٹھا انھیں دیکھتا رہے کیا یہی عظمت یہی رفعت، یہی سربلندی کا احساس، ہماری ذات کا یہی پھیل کر ماحول پر محیط ہو جانا ہی خدا کا تصور نہیں دیتا ہے؟

پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی سنسناہٹ تیز تر ہو گئی تھی۔ پیپل کا وہ پیڑ ہواؤں میں اپنے ساتھ مجھے بھی سرپٹ اڑائے لئے جا رہا تھا۔ آسمان کے نیلگوں شفاف ماتھے پر ڈراؤنے بادلوں کے ٹکڑے بڑھ آئے تھے۔ پھر تیز ہوا بادلوں کے ان سست ساتھیوں کو اڑائے گئی تھی۔ میری آنکھیں نہ جانے کیوں بوجھل ہو گئی تھیں۔ اور مجھے محسوس ہوا تھا جیسے ابھی ابھی موسلا دھار بارش ہوئی ہے۔ اور پھر مجھے خبر بھی نہ تھی کہ یہ محض شدت احساس کی وجہ سے التباس ہوا تھا ــــــ بارش کی ترچھی گرنے والی لڑیاں دریچے پر آبی موتیوں کی چلمن سی تان کر نیچے زمین میں جذب ہو گئی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے تصور میں وہ بارش سامنے کے مکانوں، انگوٹھی، کوٹھوں، نالیوں میں سے

ریلوں کی شکل میں تیزی سے بہ نکلی تھی ـــــ پھر وہ تیز بارش کتنی جلدی تھم گئی تھی - اِ کا دُکا دغیرہ درخت سے ٹپکتا معلوم ہوتا - اور پھر سنہری دھوپ پیپل کے پتوں کو اُٹھا لگا رہی تھی اور جیسے دھل دھلاکر یہ پتے دریچے کے چوکھٹے سے آڑی ترچھی لکیریں بنا بناکر نیچے گرنے لگے تھے ـــــ پھر یہ سب خواب بکھر گیا تھا کیونکہ شاہد تم نے لکھتے لکھتے رُک کر مدھم سی آواز میں پکار اٹھا: شیامے !"

میں ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا ، گاؤ تکیے کا سہارا لئے میں اونگھ گیا تھا - کتاب میرے زانو سے پھسل کر بند ہو گئی تھی پھر کتاب میں نے ہاتھ میں لے کر کہیں سے کھول لی تھی - اور اس پر بے توجہی سے نظریں جما دیں تھیں - میں نے تمہاری آواز سنکر بھی تمہاری طرف نہیں دیکھا تھا ، کیونکہ میں جانتا تھا تمھیں ابھی بہت لکھنا ہے ! اور تم لکھتے لکھتے شل ہو جانے والے ہاتھ کی انگلیاں چٹخاکر، قلم ہاتھ میں لے کر پھر تیزی سے لکھنے لگے ہو - مجھے تمہارے قلم کی مدھم سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی - نہ جانے کیا بات تھی ، اس وقت میں اتنا جوش کیوں تھا ـــــ مجھے محسوس ہوا تھا - جیسے میں وہیں دفن ہو گیا ہوں اور مسرت اور سکون ساری فضا پر چھا گئے ہیں . . . .

SPAKCE

کون بتا سکتا ہے میرا وہ خواب کب پورا ہوگا ؟ ـــــ جیسے وہ کامران زندگی کی انتھک جد و جہد میں حصہ لیتے رہے ہو ، اور اس تمام تگ و دو میں ، میں تمہارے ساتھ رہا ہوں اور پھر میں مرجاتا ہوں ـــــ نہیں ، ہئیت تبدیل کر لیتا ہوں = میرا جسم کہیں دفن ہوتا ہے - لیکن میری روح برابر تمہارے ساتھ ہوتی ہے - میں عظیم سکون اور کامل اطمینان میں بدل جاتا ہوں پھر وہی دریچہ ہوتا ہے اور پیپل کا وہی بڑا پیڑ -

ـــــ اور تم میری طرف دیکھے بغیر کہ میں کہیں تمہارے قریب ہی ہوں آہستہ سے ـــــ لکھتے لکھتے رک کر ـــــ جیسے اپنے آپ کسی خیال کے آنچل سے گنگنا اٹھتے ہو ـــــ مدھ شیامے ! ـــــ آج میرے آنسوؤں میں یاد کسی کی مسکرائی !

" ـــــ " اور میں کانپ کر ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیتا ہوں . . . .

عورت کا دل

(افسانہ)

(جناب سلطان عادل)

عورت کا دل ایک ایسا بحر بے کراں ہے جس میں غوطہ لگانے والے انسان ابد تک بھی [illegible] وہ ایک [illegible] کی گہرائیوں میں بسنے والے خیالات کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کوئی نہیں جانتا کہ عورت [illegible] اس وقت وہ کیا سوچ رہی ہے۔ ظاہرہ چہرے پر سکون اور شگفتگی کے [illegible] دل میں جذبات اور احساسات کا ایثار۔ دنیا میں ایسے کئی واقعات رونما ہوتے [illegible] بات کی شہادت دیتے ہیں کہ عورت کبھی بھروسہ کے قابل نہیں۔ اسکی ظاہرہ باتوں پر [illegible] کسی منٹ بھی اپنا فیصلہ بدل سکتی ہے وہ اپنی مکاری کو ہنسی اور شگفتگی کے دلفریب پردہ [illegible] چھپانے کی عادی ہوتی ہے۔ عورت جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو دنیا کی کوئی [illegible] اپنے ارادہ سے نہیں روک سکتی۔ عورت صرف ارادہ کرتی ہے اور [illegible] ہوں وہ حق بجانب اور درست بھی ہے کہ نہیں"۔

یہ [illegible] میرا دوست شاہد مجھ سے کہہ رہا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ یہی وہ شاہد ہے جو صرف دو برس [illegible] کے گن گایا کرتا تھا اور اب دل شکستہ ہونے کے باعث ہر ایک سے یہی کہتا کہ عورت [illegible] بھروسہ نہ کرو وہ بیوفا ہے۔

شاہد میرا [illegible] ساتھی اور کلاس سیٹ تھا چونکہ ساتھ ساتھ پڑھتے بی اے تک چلے آئے تھے اس وجہ [illegible] اور بھی پائیدار ہو گئی دوستی بھی ایسی کہ جہاں ایک کا پسینہ گرے دوسرا اس کی جگہ [illegible] بہانے تیار ہو جائے۔ جب ہم دونوں بی اے پاس کر کے نکلے تو شاہد کے والد نے ایک [illegible] عہدہ دار ہونے کی وجہ سے شاہد کو جنگلات میں نوکری دلا دی تھی اور [illegible] ٹریننگ کے لیے بھجوا دیا گیا خوش قسمتی سے شاہد کی نوکری بھی دہلی کی ہو گئی [illegible] بھی تجارت شروع کر دی اور اللہ کے فضل سے وہ ایسی چلی کہ میں اوس شہر کے متمول لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ کاروبار کے سلسلہ میں مجھے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا ایک دفعہ میں بمبئی گیا ہوا تھا خیال تو یہ تھا کہ چار دن میں میں واپس

آجاؤں گا مگر بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر مجھے وہاں کوئی پندرہ دن کے قریب لگ گئے
جب میں واپس ہوا تو شاہد کا ایک خط آیا ہوا رکھا تھا بہت ہی مختصر سا خط تھا وہ لکھا تھا۔
امتیاز بھائی! تسلیم۔ ایک خوش خبری سنانی ہے جو آپ کو آنے کے بعد ہی بتلائی جائیگی
آپ اس خط کو دیکھتے ہی فوراً ڈیرہ ڈوں کے لئے چل پڑیئے۔ فقط آپ کا شاہد۔

چھٹی کی تاریخ دیکھی ۱۲ ار کو لکھی ہوئی چھٹی آج مجھے کوئی ۲۵ تاریخ کو ملی تھی
پھر بھی میں نے سامان پیک کیا اور ڈیرہ ڈوں کو روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن سے میں نے سیدھا
شاہد کے گھر پہنچا شاہد باہر گیا ہوا تھا۔ خیر میں نے گھر میں اطلاع کروائی شاہد کی والدہ نے
اندر بلوا لیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں اسی اثنا میں شاہد بھی آ گیا۔ مجھے دیکھتے
ہی دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ کہو کب آئے۔ اچھے تو ہو تاخیر کی وجہ اور نہ جانے
کون کون سے سوالات وہ مجھ سے پوچھ گیا۔ میں وہاں بھلا کیا جواب دیتا میں نے
کہا باہر چلو بھئی سب باتوں کا جواب مل جائیگا۔ اُن کی والدہ سے رخصت ہو کر باہر آیا
میں نے سنجیدہ صورت بنا کر شاہد سے پوچھا بھئی جو خوشخبری تم نے اٹھا رکھی ہے لاؤ وہ ہمیں
بھی سنا دو آخر کب تک ترساؤ گے اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا بھیا بات تو کچھ بھی
نہیں البتہ میری رسم ۱۶ تاریخ کو خلیری بہن ذکیہ سے ہو چکی ہے میں یہ چاہتا تھا کہ اس
تقریب میں تم بھی شریک رہو اور پھر کہنے لگا امتیاز اب تمہیں جانے تھوڑے ہی دوں گا
پرسوں وہ لوگ پھر آ رہے ہیں پہلے اپنی ہونے والی بھابی کو تو دیکھ لو پھر جانے کی باتیں کرنا
پھر ذکیہ کے حسن کی تعریف جو اُس نے شروع کی تو ہمیں معلوم بھی نہ ہوا کہ چار کب بج گئے اور آنتوں
کی قلابازیوں نے شاہد کو اپنی محبوبہ کی تعریف سے باز رکھا۔ میں نے شاہد کو مبارکباد دی
اور وہ دن باتوں باتوں میں گذر گئے۔

تیسرے دن شاہد کی خالہ اور ذکیہ لاہور سے آ گئیں جب شاہد اندر جانے لگا تو
تو اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ ہی رکھا اور اندر پہنچتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ چونکہ یہ میرے
جگری دوست ہیں اس لئے ان سے پردہ کرنے کی کسی کو ضرورت نہیں ہے۔ میں نے
شاہد کی خالہ کو سلام کیا اور بیٹھ گیا اتنے میں وہ ماہ خوش خرام جس کی تعریف میں شاہد
رطب اللسان تھا بھی آئی جوں ہی میری نگاہیں اس پر پڑیں میرے جسم میں ایک بجلی سی کوند گئی
وہ واقعی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی وہ ایسا مجسمہ معلوم ہوتی تھی جیسے

دست قدرت نے خاص احتیاط کے ساتھ تراشا ہو اور جس میں حسن کی ساری خصوصیت سمو کر رکھ دی گئی ہوں اس کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا تو غالب کے اشعار کی محبوبہ جیتی جاگتی اور زندہ حالت میں جلوہ افروز ہو گئی ہو۔ اس وقت وہ شلوار پہنی ہوئی تھی اور اور یہ خیال ہوتا تھا کہ اللہ نے شلوار اسی ارضی حور کے لئے عالم وجود میں بھجوائی ہے وہ میری وجہ سے بہت خاموش اور سنجیدہ تھی مگر میں نے غور کیا کہ اس کی آنکھوں میں شاہد کی محبت جھلک رہی ہے اور اس کی نظریں عموماً شاہد کے چہرے پر گڑی رہتی ہیں تھوڑی دیر بعد میں باہر آگیا اور جب شاہد بھی باہر آگیا تو میں نے اس سے پوچھا بھئی یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ وہ ایک حور ہے جو بجائے بہشت جانے کے بھٹک کر زمین پر چلی آئی ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ تمھیں اتنا ہی چاہتی ہے جتنا کہ تم اُسے چاہتے ہو یا نہیں شاہد نے جواب دیا کیا کہتے ہو بھائی وہ تو مجھے اتنا چاہتی ہے کہ شاید میں بھی اسے اتنا نہ چاہتا ہوں اور پھر اس نے اپنے قصے بیان کئے بالآخر مجھے یقین کرنا پڑا کہ ان دونوں میں ضرور کوئی مافوق الفطرت جذبہ کار فرما ہے جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں گویا یک جان دو قالب ہوں۔

مجھے شاہد کے اصرار کی وجہ سے کچھ دن اور رک جانا پڑا۔ اسی اثنا میں ذکیہ کا بھائی لطیف بھی آگیا یہ بی۔ اے کا امتحان دیکر علی گڑھ سے آرہا تھا۔ اب کیا تھا ہم چاروں تھے اور شاہد کی موٹر اور کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا اور زندگی کا لطف اٹھایا جاتا اور کبھی کسی وجہ سے کوئی پروگرام نہ بن سکتا تو ہم لوگ ایک املی کے درخت کے نیچے جو مکان سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ ٹھاٹھ سے گاؤ تکئے لگا کر بیٹھ جاتے اور خوب برج کھیلتے ذکیہ اور شاہد ہمیشہ پارٹنر رہتے اور میری قسمت میں تو لطیف صاحب کی پارٹنری لکھی تھی۔

اس طرح دن بڑی تیزی سے گذر گئے آخر روانگی کا دن آہی پہنچا اور مجھے بادل ناخواستہ ان سے رخصت ہونا پڑا۔ شاہد اور ذکیہ کی باہمی محبت کو دیکھ کر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کچھ دنوں کے اندر اندر مجھے ان کی شادی کا رقعہ ملے گا۔

ایک دن میں صبح کی ڈاک دیکھ رہا تھا کہ شاہد کا خط نکلا اس میں لکھا تھا "دو یار تم کو ذکیہ کی محبت کے متعلق شبہ تھا ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ جس سے ذکیہ کی محبت کے متعلق تمہیں اندازہ ہو جائے گا یہ واقعہ حسب ذیل ہے۔

چھٹیوں کے بعد ذکیہ لاہور چلی گئی اور دل لگا کر پڑھنے لگی۔ کیونکہ اس سال اُسے ایف اے کا امتحان دینا تھا۔ ایک دن کالج میں ایک لڑکی نے مذاق میں اُس سے کہہ دیا۔ "ذکیہ باجی کس خیال میں ہو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ شاہد سے تم شادی رچاؤ گی۔ معاف کرنا شاید تم کو معلوم نہیں کہ شاہد کی شادی میری نند سے ہونے والی ہے اور بات چیت بھی مکمل ہو چکی ہے۔" اتنا سنا تھا کہ ذکیہ کی حالت غیر ہو گئی جب وہ گھر پہنچی تو اس کو ۱۰۴ بخار تھا ڈاکٹر آیا اس نے دیکھ کر کہا کہ دل کو بہت زبردست صدمہ پہنچا ہے اور اب اس کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔ مجھے فوراً تار دیا گیا۔ میں دوسرے دن پہنچا۔ ذکیہ مجھے پہچان نہ سکی میں اس کو پکارتا اور وہ جواب میں صرف ہنس دیتی دوسرے دن جب اس کی حالت قدرے درست ہوئی تو اس نے مجھے مبارک باد دی اور کہا "یہ ثریا کی نند مبارک ہیں" عجیب مخمصہ میں پھنسا ہوا تھا کہ یہ کیا بات ہے۔ میں نے پوچھا ثریا کون اور تم کس چیز کی مبارک باد دے رہی ہو۔ ذکیہ جواب دینے کے بجائے منہ چھپا کر رونے لگی اب میں سمجھ گیا۔ میں نے اسے تسکین دی اور یہ یقین دلایا کہ ذکیہ۔ شاہد تمہارا صرف تمہارا ہے اور کسی دوسرے کا نا قیامت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میری اس تسکین سے ذکیہ کو بہت فائدہ ہوا اور وہ آٹھویں دن بھلی چنگی تھی۔ میں واپس آگیا تو سنا امتیاز بیچاری کی یہ حالت ہو گئی تھی صرف ایک مذاق کی بات سن کر اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہت جلد ہماری شادی کی تاریخ معلوم ہو جائے گی اچھا اب رخصت۔ فقط۔ تمہارا "شاہد"!

اس خط کو دیکھ کر مجھے شاہد کی قسمت پر رشک آنے لگا اور میں نے اُسے دل ہی دل میں مبارک باد دی۔ اتفاق کی بات کچھ دنوں کے بعد مجھے کاروبار کے سلسلہ میں ڈیرہ دون جانا پڑا۔ اسٹیشن سے میں سیدھا شاہد کے گھر پہنچا شاہد میری اس غیر متوقع آمد سے بہت خوش ہوا کیونکہ اس کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ بس میری ہی کمی محسوس کر رہا تھا۔ ذکیہ اور لطیف کے علاوہ ایک اور صاحب تھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شاہد کے مصور دوست اعظم ہیں۔ گو یہ مصور تھے مگر خود اللہ تعالیٰ کی مصوری کے کامل نمونہ تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ دونوں دوستوں میں اتنا فرق ہو سکتا۔ شاہد تو ایک خوشنما نوجوان اور انتہائی

تندرستی کا نمونہ اور قبلہ سراپا ہڈیوں کے پنجر اس کی حالت یہ تھی کہ ظ لم سگریٹ سے سگریٹ سلگاتا تھا اور سوائے اس کو سونے کے وقت کے باقی تمام وقت اس کا منہ ریل کا انجن بنا رہتا تھا۔ جب کبھی اعظم، شاہد کے بازو کھڑے رہتے تو میرے ذہن میں فوراً وہ مصرع گھوم جاتا،،

"پہلوے حور میں لنگور خدا کی قدرت،،

وہ اتنے پہلوان تھے کہ اگر شاہد ان کی ناک پکڑ لیتا تو شاید وہ فوراً بغیر کسی پس وپیش کے عدم آباد کا ٹکٹ کٹا لیتے۔ میں نے جب ان سے پہلی دفعہ مصافحہ کیا تو بخدا ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ میں کسی نے سخت اور کھردری لکڑی رکھدی ہو۔ مجھے شاہد کی انتہائی سادہ لوحی پر تعجب ہوا کہ وہ کسی طرح اس بھلے مانس سے دوستی پر آمادہ ہوا۔ اعظم کبھی ہمارے کسی کھیل میں شریک ہوتا اور نہ کسی طرح کے مذاق سے دلچسپی رکھتا تھا صرف اس کا کام یہ تھا کہ وہ اپنی تصاویر میں محو رہے۔ اُس کی تصاویر بھی بس معمولی سی ہوتی تھیں۔ شاہد اسی وقت تک اس کا دلدادہ رہا جب تک کہ اعظم سے اس کو قرب حاصل نہ ہوا تھا۔ مثل مشہور ہے دور کے ڈھول سہانے مگر جب وہ شاہد کے یہاں آگئے اور اُن کی تمام خصوصیات روز روشن کی طرح آشکارا ہوگئیں اس وقت سے شاہد بھی اس سے بیزار نظر آنے لگا۔

اب کے دفعہ بھی سب لوگ جمع تھے اسی طرح کے پروگرام بنتے اور زندگی کا لطف اٹھایا جاتا۔ ہم لوگ چاروں تاش کھیلتے اور مصور اپنی مصوری میں مصروف رہتا۔ اسے ہمارے کھیل سے اور ہم لوگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس طرح کئی دن گذر گئے۔ اس دوران میں ہم نے محسوس کیا کہ ذکیہ اعظم کی مصوری میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ رفتہ رفتہ ذکیہ کو بھی مصوری کا شوق ہوگیا اور وہ اب بجائے ہمارے ساتھ تاش کھیلنے کے اعظم سے گھنٹوں مصوری پر باتیں کرنے لگی اس نے اعظم سے کہا کہ وہ اُسے بھی مصوری سکھا دے۔ اعظم بھی اب تندھی سے تصاویر بنانے لگا کیونکہ اُسے ذکیہ میں ایک پرخلوص دوست مل گیا تھا اب ذکیہ بھی مصوری سیکھنے لگی اور اُس نے اعظم سے خواہش کی کہ وہ اُس کی تصویر بنائے۔

اعظم بھی اب بجائے دل فریب مناظر اتارنے کے ذکیہ کے فوٹو مختلف زاویوں سے اتارنے لگا۔

ہم لوگ عموماً اعظم کا مذاق اُڑایا کرتے تھے لیکن اب ذکیہ مصور کی طرفداری کرنے لگی اور لطیف سے کبھی کبھی لڑ بھی جاتی تھی۔ شاہد ان سب چیزوں کو دیکھ رہا تھا غور کر رہا تھا اور ان کڑوے اور جانکاہ گھونٹوں کو نہایت بشاشی سے نوش جان کر رہا تھا۔ آخر ایک دن اعظم نے اپنے جانے کا اعلان کر دیا۔ سب لوگوں کو اُس کے جانے کی خبر سن کر ایک دلی مسرت ہوئی۔ لیکن اس وقت انتہائی مایوسی ہوئی جب ذکیہ نے اعظم سے وعدہ لیا کہ آیندہ مہینہ میں اعظم ضرور لاہور آئے۔

اعظم کے جانے کے بعد ذکیہ نے شاہد میں دلچسپی لینا یک لخت چھوڑ دیا اور وہ بہت کم شاہد سے بات کرتی نظر آتی تھی اور کبھی کرتی تھی تو وہ بھی صرف رسمی اور تکلفانہ۔ اُن کی داستان عشق کبھی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھی شاہد نے ذکیہ سے اُن کی شادی کے متعلق بہت کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن ذکیہ بار بار ٹال گئی۔ آخر کار ذکیہ اور لطیف لاہور چلے گئے۔ مجھے کاروبار کے سلسلہ میں ڈیڑہ دو ماہ ہیں کئی دن لگ گئے لیکن اس اثنا میں کوئی بھی خط ذکیہ کا نہ آیا شاہد پریشان تھا کہ یہ کیا قصہ ہے شاید ذکیہ بیمار ہوگئی ہے جو اس نے خط نہیں بھیجا اور وہ لاہور جانے کا بار بار ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن ایک دن لاہور سے ایک لفافہ آیا۔ یہ ذکیہ اور اعظم کی شادی کا رقعہ تھا۔ شاہد کی آرزوں اور تمناؤں کا خون کرنے والا ایک حقیر سا کاغذی پرزہ اگر شاہد کے کسی عزیز کی موت کی خبر آتی تو شاید اسے اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا کہ اُسے اس رقعہ کو دیکھ کر ہوا۔ وہ محل جو ذکیہ اور شاہد تعمیر کر رہے تھے اور جو مکمل ہونے کے قریب تھا آناً فاناً میں قسمت کی ستم ظریفی سے ڈھ گیا۔

اب شاہد کے لئے زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ اس انتہائی صدمہ سے اُسے ٹائیفائڈ ہوگیا وہ اچھا تو ہوگیا لیکن اس کی وہ حالت نہ رہی جو پہلے تھی جبڑوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں تھیں جن کی وجہ سے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور وہ اب

زندہ درگور تھا۔ کیونکہ اس کی امنگیں اسی وقت مرچکی تھیں۔ جب اس کے پاس زکیہ کی شادی کا رقعہ آیا تھا اب اس کے لبوں پر عورتوں کی بے وفائی کا چرچا رہتا ہے۔ کوئی سمجھاتا ہے تو اپنی داستان بیان کرتا ہے اور پوچھتا ہے اب تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ عورت پیدائشی بے وفا ہی ہے۔ اور رسنگی شاید اپنے اس قول پر کہاں تک حق بجانب ہے یہ ناظرین خود تصفیہ فرما سکتے ہیں ۔۔۔

"حیا برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا"

جواب استفسار

ہندوستان میں فارسی کی تدریس جس میں اہل ہند نے بھی برابر کا حصہ لیا۔ بادشاہ سکندر لودھی کے عہد میں عمومیت سے شروع کی گئی اور اس کے بعد ترقی کرتے کرتے فارسی تقریباً پورے ملک میں پھیل گئی۔ ہندوؤں نے بھی اس میں کافی دستگاہ حاصل کی اور ان میں سے کائستھ طبقہ خاص طور پر پیش پیش رہا۔ امتداد زمانہ کہیے یا غیر ملک کے فارسی زبان نے ہندوستان میں آکر ہندوستانیت اختیار کی۔ بعض کائستھ حضرات نے تو فارسی میں بہار کر دی "تلا کچھوا" و "خام سبزی" ترجمہ کر دیا۔ "بیمار" کا استعمال عام کر دیا "قریب المرگ"۔ خلاصہ یہ کہ ایسے کلمے استعمال کرنے لگے "مشکور" کا غلط استعمال بھی کر دیا۔ غرض کہ انہی میں "آمد و رفت" بھی داخل ہے جو یقیناً اہل زبان کے لئے پہلے بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے۔ رفتن و رفت کے معنے قریب قریب ایک ہی ہیں۔ مگر محل استعمال میں دونوں کے اس طرح سے فرق ہے جس طرح اردو میں "چلے جاتے" اور "جانے" کے استعمال میں فرق ہے۔ گویا "رفتن" کے معنے "جانا" کے ہونگے اور "رفت" کے معنے "چلے جانے" کے ہوں گے۔ چنانچہ حافظ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

حافظا خلوت نشین دوش بمیخانہ شد   از سر پیماں برفت با سر پیمانہ شد

"برفت" سے مراد یہاں "برگشت" ہے جس کے صاف معنے عہد سے ہٹ جانے کے ہیں۔ "واللہ اعلم" جو اپنی سمجھ میں آیا وہ پیش کر دیا۔ ایک محدود علم کا آدمی بس اسی قدر اپنے علمیت یا عالمیت کی ناکام کوشش کر سکتا ہے۔

ابرار حسین

معاونین کی توجہ کیلئے

معاونین کرام یقین کریں کہ ہر مہینہ پرچہ نہایت احتیاط سے ڈاک کیا جاتا ہے اگر کوئی پرچہ نہ ملے تو اندرون (۱۵) تاریخ مکرر طلب کریں اس کے بعد دفتر میں پرچہ کا ملنا ذرا مشکل ہی ہے ۔ عموماً ڈاک خانہ کی وجہ سے محض معاونین کو شکایت کا موقع ملتا ہے ۔ یاد رکھیئے ۔ کہ چندہ لے کر پرچہ کا نہ بھیجنا ایک بدترین اخلاقی کام ہے اور شہاب اپنے دامن کو ایسے دھبہ سے محفوظ رکھنا چاہیئے ۔

پرچہ کے اجراء کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک میں اُردو ادب کا ستھرا مذاق پھیلائے اور اپنے معاونین کو وقت پر پرچہ پہنچائے اگر یہ نہ ہو تو پرچہ کے اجراء سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ اپنے اوقات کو کسی مفید کام میں صرف کرے ۔ اس لیئے ہم مکرر عرض کرتے ہیں ۔ کہ اپنے مسلک سے ہٹنا نہیں چاہتے ۔ اور آپ اوس کی نسبت کبھی بھولے سے بھی خیال نہ کیجئے کہ وہ ایسے بدترین اخلاقی جرم کا مرتکب ہوگا ۔

ڈاک خانہ کی بدنظمی سے پرچہ متاثر ہو رہا ہے اور اس کا انتظام ہمارے دسترس سے باہر ہے اندہم اس شکایت کی تلافی مکرر پرچہ بھیج کر برابر کرتے چلے آئے ہیں اور جب ہی تو آج (۶) سال سے وہ زندہ ہے ۔ اور انشاء اللہ ہمارے جیتے جی زندہ رہے گا ۔ اس لیے آپ ہمارے ساتھ تعاون کیجئے اور ہمارا ہاتھ بٹایئے :

اور جب کبھی تبدیل پتہ کی ضرورت ہو تو کم از کم ایک ہفتہ قبل دفتر کو مطلع کیجئے تو باعث تشکر ۔ کیونکہ تبدیل پتہ سے اطلاع نہ دینے کی وجہ سے پرچہ کے تلف ہونے کا امکان اور آپ کو شکایت کا موقع باقی رہتا ہے ۔

غزل

از عرشی بھوپالی

اُن کی نظر کا کوئی اشارہ ضرور ہے
دل کو شکست کھا کے جو اتنا غرور ہے

ہاں ہی تھی تباہ کہ تھی زندگیٔ عشق
میرا قصور ہے نہ تمہارا قصور ہے

یہ کون پاس سے مرے ہو کر گذر گیا
نظروں میں روشنی ہے نہ آنکھوں میں نور ہے

اللہ رے اعتماد کہ ان کے بغیر بھی
ہر وقت اک خمار ہے ہر دم سرور ہے

اللہ تیرے ہاتھ ہے میرے جنون کی شرم
اب تک تو ہاتھ دامن رنگیں سے دور ہے

یہ تیر، یہ کسک، یہ چبھن بے سبب نہیں
دل میں چھپا ہوا کوئی نشتر ضرور ہے

یہ طرز گفتگو یہ ملاقات سرسری
اللہ ان کو حسن پہ کتنا غرور ہے

ان کا خیال ان کی تمنا ہے ان کا غم
کیا کیجے عشق پھر بھی اگر ناصبور ہے

بوجھل ابھی سے پائے تجسس ہے کس لئے
اے دل ابھی تو بارگہِ ناز دور ہے

عرشی وہ جا رہے ہیں نظر مجھ سے پھیر کر
ہر ہر قدم پہ شیشۂ دل چور چور ہے

دھندلے نقوش (افسانہ) آمنہ یسین

وہ رات بڑی ہی اداس تھی دور پہاڑوں اور درختوں کے پیچھے سے چاند کا چہرہ نظر آرہا تھا جو بالکل پژمردہ اور ایک خزاں رسیدہ پھول کی طرح کمہلایا ہوا تھا۔ جانے کیوں آج اس کے چہرہ پر اس قدر حسرت برس رہی تھی کہ اس کی وجہ ساری کائنات پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ تاروں کی روشنی بھی آج ماند پڑ گئی تھی اور وہ کسی ٹوٹے ہوئے ہار کی موتیوں کی طرح بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بھی اکثر ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔

صبوحی اپنے بستر پر لیٹی اس منظر کو بڑے ہی غور سے دیکھ رہی تھی اس کی نگاہیں چاند کے زرد چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اور بیمار صبوحی کا چہرہ بھی آج اس کی پھیکی چاندنی میں معمول سے زیادہ زرد اور اداس نظر آ رہا تھا بالکل اسی چاند کے چہرہ کی طرح زرد۔ وہ سوچنے لگی۔ آج اسے بیمار ہوئے تین سال ہو گئے اور اس طویل عرصہ میں اس کی تکلیف دہ اور وحشت زدہ راتوں میں یہ چاند اور یہ جھلملاتے ہوئے تارے ہی تو اس کے غمگسار رہے۔ رات کے سناٹے میں جب وہ خاموشی سے اکتا جاتی تو انھیں تاروں سے اپنے دل کا حال کہتی اور چاند کی زرد روشنی میں اپنی زندگی کی داستان پارینہ کے اوراق کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ ایک قسم کا سکون محسوس کرتی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنی ساری تکلیفیں بھول جاتی۔ چاند جب بہار پر ہوتا اور چاندنی سے کائنات کا حسن نکھر جاتا تو اس کو اپنی زندگی کی حسین گھڑیاں یاد آ جاتیں لیکن جب چاند کی بہار ختم ہو جاتی وہ باسی ہو جاتا اس کا چہرہ زرد ہو جاتا تو۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگتا کہ دنیا میں صرف وہی ایک دکھی نہیں ہر ایک کی زندگی میں تلخ تجربات رونما ہوتے ہیں۔ ہر بہار کے بعد خزاں آتی ہے۔ اور اس کا دل چاہتا کہ چاند کبھی غروب ہی نہ ہو۔ یوں ہی اس کی آنکھوں کے سامنے رہے وہ ہمیشہ اس کو تکتی رہی —— جوہی کے پھولوں کی بیل جو اس کے دریچہ کے سامنے تھی ہمیشہ ہری بھری رہے اور سال کے بارہ مہینے پھول کھلتے رہیں تاکہ اس کے تھکے ہوئے دماغ کو فرحت پہنچے۔

صبوحی نے کروٹ بدلی، شدت پیاس سے وہ بیتاب ہو رہی تھی "پانی" ایک خفیف آواز کمرہ کی فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ـــ کوئی جواب نہ ملنے پر پھر وہی آواز کمرہ کی محدود فضا میں گونج کر رہ گئی "پانی" ـــ اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ صبوحی کا دل صدمہ بیچارگی سے بھر آیا اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کیا سب سو رہے ہیں کوئی اس کا مونس اور ساتھی نہیں۔ مجبور آ کر وہ بہ مشکل اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے گلاس اٹھایا اور صراحی سے پانی انڈیلنا شروع کیا۔ لیکن گلاس ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چھن۔ چھن۔ چھننا۔ صبوحی عالم تخیل سے بیدار ہوئی۔ اور فرش پر کے بکھرے ہوئے گلاس کے ٹکڑوں پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی۔ اس کا شیشہ دل بھی تو اسی طرح چکنا چور ہو چکا تھا۔ وہ آپ ہی مسکرا دی۔

صبوحی۔ بی بی پانی لے لو۔

تم اٹھ گئیں آپا۔ صبوحی پانی پی کر لیٹ گئی۔ آج اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے آپا! وہ کہنے لگی تم جانتی ہو میں اپنی آخری منزل پر پہنچ چکی ہوں۔ موت و حیات کی کشمکش سے میری روح بہت جلد آزاد ہو جائیگی۔ میرے دکھ درد سارے دور ہو جائیں گے اور میں ابدی نیند سو جاؤں گی۔ جب تم مجھ کو جگا سکو گی آپا! اور آپا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بی بی آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔

تمہیں بری لگتی ہیں باتیں لیکن آپا تھوڑی دیر بعد میرا بھی وہی انجام ہوگا جو اس گلاس کا ہوا میری زندگی ایک چراغ سحری کی طرح بے نور ہے اور ایک ہوا کے جھونکے کی منتظر ہے۔ بجھنے سے پہلے شمع ایک بار بھڑکتی ہے میں اس وقت تمہیں بحال نظر آ رہی ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ میں اب اچھی ہو گئی ہوں بلکہ یہ سمجھو کہ میری زندگی کے یہ آخری لمحات ہیں۔ آپا کپڑے میں منھ چھپائے ہوئے روتی ہوئی باہر چلی گئی اور صبوحی آنکھیں میچ لیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک قسم کا نور چھایا ہوا تھا۔ اس کی بینائی مدھم ہو چکی تھی۔ اسے معلوم ہو چکا تھا وہ چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ چنانچہ وہ پچھلے واقعات کے تصورات میں گم تھی جن کے نقوش اب کافی دھندلے ہو چکے تھے۔ وہ انھیں اجاگر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

عزیز اس کا عزیز خانہ زاد بھائی غریب ماں باپ کا شریف بیٹا اور احسان پھوپی زاد بھائی۔ امیر والدین کا جاہل بیٹا۔ دولت کے نشہ میں چور۔ اپنے حسن پر مغرور ـــ

بے بہرہ۔ دنیا کے نشیب و فراز سے بیگانہ۔ دل پھینک۔ عورت کا دیوانہ۔ کتنا بڑا
فرق تھا دونوں میں وہ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ بچپن میں بھی جانے کیوں صبوحی
احسان سے بات کرتے ہوئے گھبراتی۔ کیونکہ ماں کے لاڈ نے اس کو حد سے زیادہ بدتمیز
بنا دیا تھا۔ کبھی صبوحی احسان کے ساتھ آجاتی تو وہ اس کی کلائی کو اس زور سے پکڑ کر
موڑ دیتا کہ کئی دن تک وہ درد سے بے چین رہتی، وہ رونے لگتی وہ خوب قہقہہ لگاتا
گڑیوں کو توڑ موڑ کر پھینک دیتا۔ صبوحی اپنے امی ابا سے شکایت کرتی تو وہ مسکرا کر
خاموش ہو جاتے اور وہ اپنا سا منہ لئے واپس آجاتی وہ مجبور ہو کر اپنے ننھے ننھے ہاتھ
اٹھا کر خدا سے دعا مانگتی کہ احسان اس کے گھر سے چلا جائے۔ آخر اس کی معصوم دعائیں
رنگ لائیں۔ احسان گھر سے چلا جاتا تو وہ خوشی میں ناچنے لگتی۔ برخلاف اس کے عزیز
جب کبھی اس کے گھر آتا تو اس کے دل کی کلی کھل جاتی۔ وہ ہر وقت عزیز کی ضیافت میں
لگی رہتی۔ نئی نئی قسم کے میٹھے بنانے کا حکم دیا جاتا اور ان میٹھوں کو عزیز کو کھلا کر وہ اس
قدر مسرور ہو جاتی جیسے اس کو ساری دنیا کی بادشاہت مل گئی ہو۔ بلکہ اس سے بھی
زیادہ۔ محبت ایک ایسا چیز ہے جس کو جس زاویہ نگاہ سے چاہیں دیکھیں اور
اپنے اپنے نظریہ اخذ کریں۔ لیکن آج کل محبت ایک کھیل اور نفسانی خواہشات کے پورا
کرنے کا ایک مہذب ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ جوں ہی کسی افسانہ میں محبت کا نام آتا ہے
پڑھنے والے پہلے ہی سے اس کا قیاس کر لیتے ہیں کہ انجام کیا ہوگا — لیکن یہ ناممکن ہے کہ
ان کا قیاس ہمیشہ ٹھیک نکلے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس سلجھے ہوئے مسئلہ میں
الجھ کر رہ جاتے ہیں اور کچھ سمجھ نہیں سکتے۔ یہ محبت ہی تو ہے جس کی وجہ دنیا میں یکجہتی
میل ملاپ قایم ہے۔ ورنہ آج کسی کو کسی سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور نہ ان میں انسانیت
ہوتی کیونکہ محبت انسان کو حقیقی معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق بنا دیتی ہے۔ بندہ خدا
کی بندگی اسی وقت کرے گا جب کہ اس کو خدا سے محبت ہو اور اس کا ہر اصول مانے گا۔ عزیز
جس قدر غریب تھا اسی قدر خود دار بھی۔ اور دنیا سے بے نیاز۔ بچپن کے معصوم کھیلوں
میں بھی وہ بہت کم دلچسپی لیتا۔ صبوحی قسم قسم کے کھلونے لا کر اس کے سامنے ڈال دیتی۔
عزیز بھیا۔ یہ دیکھو میری گڑیا کیسی بھولی ہے اور وہ جواب میں صرف مسکرا دیتا۔ جانے کیوں
اس کا دل نہ چاہتا کہ ان کھلونوں کو دیکھے اس کو اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوتا اور وہ

فوراً وہاں سے بھاگ جاتا۔ باغ کے ایک کنج میں جا چھپتا تاکہ کوئی اس کو نہ ستائے۔ تنہائی اس کو بہت پسند تھی کیونکہ تنہائی میں وہ ایک قسم کا سکون محسوس کرتا۔ عزیز بھیا آپ بڑے خراب ہیں۔ صبوحی نے آخر اس کو ڈھونڈ ہی نکالا میری گڑیا ——

عزیز نے جملہ کو کاٹتے ہوئے کہا اور تم بھی تو ایک گڑیا ہو۔ ننھی سی معصوم بھولی بھالی بھئی مان بھی جاؤ۔ اب کی بار ضرور کھیلیں گے۔ تمہارے ساتھ اور پھر اس نے صبوحی کو گود میں اٹھا لیا اور اس قدر گدگدایا کہ ہنستے ہنستے وہ تھک گئی۔ اس کے گال گلاب کی طرح سرخ ہو گئے۔ بالوں کی ربن کھل کر سیاہ بال ماتھے پر بکھر گئے۔ تب عزیز نے اس کو چھوڑ دیا اس کے چہرہ پر کی شرارت کافور ہو چکی تھی اور وہ پہلے کی طرح سنجیدہ تھا۔

صبوحی! میں بڑا خراب ہوں نا تمہارے بال بکھیر دئے تمہیں خوب ستایا کیوں خفا تو نہ ہوئیں۔ عزیز نے اس کے بالوں میں ربن باندھتے ہوئے کہا۔ صبوحی کی نظریں ایک بار اٹھیں اور پھر جھک گئیں — اور عزیز کو ایسے محسوس ہونے لگا آج دنیا میں اس سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج صبوحی کو خوب ستائے اور کوئی اس کو بلانے نہ آئے۔ صبوحی کا ہاتھ پکڑے وہ گلاب کی بیلوں کے پاس پہنچا۔ پھر ایک گلاب کی کلی توڑ کر اس کی ربن میں لگا دی۔ صبوحی کے فراک پر بھی گلاب کی ایسی ہی کلیاں بنی ہوئی تھیں وہ مسکرا دی اور عزیز بھی مسکرا دیا۔ انھیں مسکراتا دیکھ کر غنچے بھی مسکرانے لگے ڈالیاں جھومنے لگیں اور صبوحی بھاگ گئی۔ عزیز تھوڑی دیر تک ایسے ہی ساکت کھڑا رہا وہ کچھ سوچ رہا تھا جانے کیا اس کی نظر ایک خوبصورت تتلی پر جو ایک پھول کا رس چوس رہی تھی اسے خیال آیا کہ صبوحی تتلیوں کو بہت پسند کرتی ہے اور وہ دوڑ کر اس تتلی کو پکڑ لیا۔ بعض اوقات اس کو گھنٹوں ان حسین تتلیوں کا تعاقب کرنا ہوتا لیکن وہ برابر تعاقب کرتا رہتا اور جب تک پکڑ نہ لیتا دم نہ لیتا صبوحی ان تتلیوں کو دیکھ کر ایسے کھل جاتی جیسے بھنوروں کی چھیڑ سے غنچہ۔ گرما کی حسین چاندنی راتوں میں وہ گھنٹوں ہری ہری گھاس پر بیٹھے کہانیاں سناتے یہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ حسین دور تھا۔ نہ انھیں دنیا کی زبان کے چلنے ہونے کا ڈر تھا نہ عزیزوں کے طعنوں کا۔ عزیز کی ماں کو اپنی بہن کے ہاں زیادہ رہنا پسند نہ تھا چند دن رہ کر وہ واپس ہو جاتیں اور ان کے جاتے وقت صبوحی کو بہت تکلیف ہوتی

وہ عزیز سے وعدہ لیتی کہ وہ ہفتہ میں ایک بار ضرور آئے۔ احسان اگر کبھی صبوحی کو عزیز کے ساتھ دیکھتا تو اس کا دل جل جاتا۔ صبوحی۔ اب اپنی عمر کے دوسرے دور سے گذر رہی تھی ایک خطرناک راستہ پر چل رہی تھی جس میں قدم قدم پر خار ملتے ٹھوکریں لگتیں —— اب وہ عزیز سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی —— ہر وقت کسی سوچ میں رہتی۔ کئی دنوں سے وہ عزیز کے سامنے نہیں گئی تھی۔ اور عزیز نے بھی آج تک اس کے کمرہ میں قدم نہ رکھا تھا۔ لیکن احسان تھا کہ بغیر پوچھے ہی کمرہ میں گھس آتا مختلف طریقوں سے اس کو چھیڑتا۔ ایک دن وہ اپنے کمرہ میں دریچہ کے پاس کھڑی کچھ سوچ رہی تھی کہ احسان دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوگیا۔ اور نہایت ہی بے تکلفی سے صبوحی کے شانوں پر سے پکڑ کر اپنی طرف پلٹانا چاہا۔ صبوحی تڑپ اٹھی۔ یہ کونسی حرکت حرکت تھی آپ کی صبوحی نے غصہ سے کہا اور احسان صرف مسکراتا رہا۔ آپ کو ہنسی آرہی ہے ایسی ذلیل حرکتیں کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔ کونسی ذلیل حرکت کی میں نے۔ احسان تب غصہ سے بے قابو ہوکر کہا میں ذلیل ہی تو ہوں۔

آپ کو میرے ساتھ ایسی چھیڑ چھاڑ نہ کرنی چاہئے۔ اور ہاں کیونکہ صرف عزیز میرے ساتھ ایسی چھیڑ کر سکتا ہے۔ احسان نے طعن سے کہا۔ آپ عزیز کو کیوں الزام دیتے ہیں —— احسان نے ایک طنز آمیز قہقہہ لگایا اور دیکھ لونگا کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ صبوحی صوفہ پر گر گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا خوب روئے اور پھر وہ اتنا روئی کہ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ شام ہوگئی وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی خادمہ نے آکر کہا کہ بی بی آپ کی خالہ جان آئی ہیں چائے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے لیکن اس نے خادمہ کو سمجھا دیا کہ وہ جاکر کہدے کہ سب چائے پی لیں اور اس کی کمرہ میں بھیج دیں۔ صبوحی کے کمرہ کا ایک دروازہ باغ میں کھلتا تھا وہ اٹھی اور باغ میں آئی کہ منہ ہاتھ دھولے۔ عزیز اسی پرانے کنج میں بیٹھا کچھ دیکھ رہا تھا۔ جونہی صبوحی کا یہاں سے گذر ہوا۔ عزیز کو دیکھ کر ٹھٹھک رہ گئی۔ عزیز تصویر حیرت بنا صبوحی کو دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ صبوحی کی آنکھیں رونے سے سوجھ سی گئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن بمشکل صرف صبوحی یہ کہہ سکا۔ صبوحی گویا چونک پڑی۔ آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا وہ بغیر کچھ کہے کے فوراً واپس ہوگئی اور عزیز جانے کتنی دیر تک یونہی کھڑا رہا صبوحی کو

اپنی خالہ سے بہت پیار تھا۔ جاتے وقت صبوحی نے بڑے ہی اصرار سے کہا کہ وہ یہیں رہ جائے لیکن خالہ نے بھانجی کو سمجھا دیا کہ وہ دنیا کے نشیب و فراز سے ابھی واقف نہیں۔ چند دن بعد عزیز کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ نے عزیز کو اور زیادہ سنجیدہ بنا دیا۔ صبوحی کی ماں نے خود جا کر اپنی بیوہ بہن کو اپنے گھر لا کر رکھ لیا عزیز کو یہ ناپسند تھا۔ وہ دن رات وہ جستجو علم میں مصروف رہتا۔ ہمیشہ کچھ کھویا کھویا سا کسی سوچ میں غرق نظر آتا۔ یہاں تک کہ کسب معاش اور زندگی کے گذرنے کے خیال نے اوس کو کتابوں کا کیڑا بنا کر رکھ دیا۔ وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کو کچھ نہ معلوم تھا وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ اور اوس کی ماں دوسروں کی روٹی کھا رہے ہیں اور وہ کب اس قابل ہو جائے گا کہ اس گھر سے فوراً نکل جائے۔ صبوحی کو وہ بالکل ہی بھول گیا تھا اور دیکھا جائے تو وہ اس کی زندگی میں داخل ہی کب ہوئی تھی۔ عزیز اب پہلا سا معصوم نہ تھا بلکہ زندگی کی تلخیوں نے اس کے دل کو بجھا دیا تھا اور وہ اب کافی تجربہ کار ہو گیا تھا اس کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ زندگی کیا ہے۔ امتحان ہوا اور وہ ایم۔اے میں درجہ اول سے کامیاب ہوا۔ خالہ نے کامیابی کی دعوت کی اور عزیز کو پھول پہنائے جائیں یہ بھی طے پایا۔ عزیز کب راضی ہونے والا تھا۔ لیکن خالہ کے کہنے پر مان گیا صبوحی آج پھر بچپن کی طرح شوخ بن گئی تھی اور سارا انتظام سنبھالے ہوئے اس نے بھی عزیز کے لئے ایک خوبصورت ہار بنایا تھا جو سب میں اچھا تھا۔ آج اس نے اچھے کپڑے بھی پہن رکھے تھے۔ دعوت کے ختم ہوتے ہی سب دوستوں نے پھول پہنائے وہ ایسے ہی سیدھے خالہ کے پاس آیا اور اماں اور خالہ نے اپنا اپنا ہار ڈال دیا عزیز پھولوں سے ڈھا ہوا اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ ہر ایک کی نظر لگ رہی تھی۔ جونہی وہ صبوحی کی طرف بڑھا۔ صبوحی نے فوراً اپنا ہار اوس کے گلے میں ڈال دیا صبوحی عزیز فوراً ہی اپنے کمرے کی طرف چلے گئی۔ تاکہ عزیز اوس کے چہرہ کو دیکھ کر اوس کی دل کی حالت کا اندازہ نہ لگا سکے۔

محنت زیادہ کرنے کے باعث۔ یوں بھی اس کی صحت پہلے سے خراب رہتی تھی لیکن دوسرے دن اچانک اس کو بخار آ گیا۔ اور ڈاکٹروں نے ٹائیفیڈ تجویز کیا۔ عزیز کی ماں بے انتہا پریشان تھی۔ صبوحی انھیں تسلی دیتی رہتی۔ اکثر فرصت کے اوقات وہ عزیز کے کمرہ میں بھی جا بیٹھتی۔ کیونکہ اس کو اس کا احساس تھا کہ عزیز اکیلا رہے رہے

کہیں اپنی زندگی سے اکتا نہ جائے۔ وہ اس سے نہایت سنجیدہ مسائل پر گفتگو کرتی رہتی اور وہ دونوں کئی گھنٹوں تک اسی قسم کی بحث میں الجھے رہتے۔ عزیز یہ دیکھ رہا تھا کہ صبوحی اس کی علالت کی وجہ کچھ اداس اور پریشان رہتی ہے۔ چنانچہ جب ایک دن شام کی تفریح کے وقت وہ اس کے پاس آگئی اور تفریح کو جانے سے انکار کر دیا۔ عزیز نے بڑی ہمت کرکے پوچھا۔ یہ آپ میری خاطر اپنا وقت کیوں خراب کرتی ہیں۔ آپ تفریح کے لئے کیوں نہیں گئیں۔ میں تو اب اچھا ہوں۔ صبوحی نے نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں وہی کام کرتی ہوں جو اپنے نزدیک مناسب سمجھتی ہوں۔ پھر اس نے جھک کر عزیز کے سرہانے رکھی ہوئی کتاب کو اٹھا لیا۔ اور یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔ ہر صفحہ پر اس کو ایک نئی قسم کی تتلی چسپاں ملی اور درمیان میں ایک ربن اور ایک گلاب کی کلی۔ اس کو سب کچھ یاد آگیا۔ وہ ماضی کے تصور میں گم ہو کر رہ گئی۔ کتاب سامنے کھلی رکھی تھی اور جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ عزیز کہنیوں کا سہارا لئے اٹھ بیٹھا۔ آج بڑے دنوں بعد اس کو ایک شرارت سوجھی، ایک کاغذ کا پرزہ موڑ کر صبوحی کے کان میں داخل کر دیا اور وہ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ کان کا جائزہ لینے لگی۔ عزیز کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اور صبوحی نے معاملہ کو سمجھتے ہوئے کہا، بڑے شریر ہیں آپ۔ اور عزیز نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ میں وہی کرتا ہوں جو مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر صبوحی سے کتاب لے رہا تھا کہ احسان آگیا۔ لیکن صبوحی کو دیکھ کر فوراً چلا گیا۔ جانے کیوں صبوحی پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ اس کے چہرہ پر وحشت برسنے لگی، عزیز کے اصرار کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اپنے کمرہ کی طرف چلی آئی۔ راستہ میں ڈرائنگ روم تھا۔ یہاں احسان اور صبوحی کے والد کی گفتگو ہو رہی تھی۔ احسان کہہ رہا تھا۔ صبوحی کے کیرکٹر پر مجھ کو شبہ ہے۔ چچا جان وہ ایک رقاصہ کی طرح عزیز کا دل بہلا رہی تھی۔ صبوحی کے باپ یہ سن کر غصہ سے کانپ گئے۔ کہاں ہے وہ۔ احسان نے کہا "ہو گی وہیں یا اپنے کمرہ میں" میں دیکھ آتا ہوں اور صبوحی فوراً اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد احسان آیا اور اس کو دیکھ کر چلا گیا صبوحی سر سے پیر تک لرز رہی تھی۔ اس کی رگوں کا خون منجمد ہو گیا تھا وہ جانتی تھی اس کا باپ کس خونخوار طبیعت کا مالک تھا۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے اس کا باپ معہ احسان کے کمرہ میں داخل ہوا۔ صبوحی نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ ان سرخ غصہ سے بھری آنکھوں کو نہ دیکھ سکے

"تم اب کہاں گئی تھیں تو عزیز کے پاس، صبوحی نے کہا" اور وہاں کیا ہو رہا تھا" صبوحی خاموش رہی۔ بتاؤ صبوحی۔ اب بھی خاموش رہی۔ ایسے نہ بتاؤ گی اور کسی کا زبردست ہاتھ اس کے گال پر اس زور سے پڑا کہ خون اتر آیا اور پھر دوسرا ہاتھ دوسرے گال پر بھی اسی زور سے۔ اب بھی نہ بتاؤ گی۔ اس کے باپ کی غصہ سے بھری ہوئی آواز آئی صبوحی کیا بتاتی کیسے بتاتی وہ خاموش رہی۔ اب کی بار اس پر ہنٹر سے مار پڑی۔ صبوحی کو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چوٹیں اس کے دل پر پڑ رہی ہیں۔ چچا جان بس کریئے۔ احسان نے ہاتھ روک لیا۔ اور پھر کمرہ سے باہر لیکر چلا گیا۔ کیونکہ ایک ہنٹر صبوحی کے گلے پر اس بری طرح پڑا تھا کہ وہاں سے خون ایک سیلاب کی طرح بہے جا رہا تھا۔ صبوحی درد سے تڑپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اسانس بڑی تکلیف سے چل رہی تھی رک رک کر مسلسل ہچکی کی وجہ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ ماں اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے صبوحی نے ذرا سی بھی آواز اس لئے نہیں نکالی تھی کہ کہیں عزیز اس کو سن نہ لے اور اس کا دل تڑپ اٹھے۔ لیکن اس کی سسکیوں کی آواز عزیز تک پہنچ ہی گئی اور پھر خادمہ کے ذریعہ اسے پورے حالات معلوم ہو گئے۔ اس کا خون نہایت ہی سرعت سے رگوں میں دوڑنے لگا۔ اس کے جسم میں ایک نہ معلوم سی قوت آگئی۔ آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو گئیں وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ احسان عزیز کو دیکھ کر کچھ گھبرا گیا۔ عزیز نے سامنے ہی پڑا ہوا ہنٹر اٹھایا اور اب وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے کے احسان کو مارنے لگا۔ احسان بچنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کچھ عجیب طرح مجبور ہو گیا تھا۔ صبوحی کے باپ نے بمشکل اس کو قابو میں لایا۔

عزیز۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ تمہیں کچھ ہوش ہے۔ اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔

میں بھی جانتا ہوں گھر آپکا ہے اور کسی نہ کسی دن ضرور نکل جاؤں گا۔ لیکن یہاں سے خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔ عزیز نے کہا۔

گستاخی نہ کرو۔ فوراً نکل جاؤ۔ اور عزیز چلا آیا۔ اسی وقت اس نے اپنا سامان یکجا کیا۔ ایک کار کرایہ پر لی اور ایک دوست کے گھر جا رہا۔ تعجب اس بات کا تھا کہ بخار اسی دن سے نارمل ہو گیا تھا۔ عزیز گھر سے نکلتے وقت ایک دفعہ صبوحی کے ہاں گیا

لیکن آنچل میں منہ چھپائے ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی- چنانچہ وہ صرف یہ کہکر واپس ہوگیا کہ "میں بہت جلد آرہا ہوں" خلاف توقع بہت جلد عزیز کو معقول خدمت مل گئی- چند دن سے وہ ایک رقاصہ کے ہاں جانے لگا تھا اور رقاصہ اس کی محبت میں اپنا سب کچھ ہار چکی تھی عزیز نے عزیز نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اگر کوئی خواہش کرے تو وہ اسے ضرور پورا کرے گی

عزیز کو گھر سے گئے ایک ماہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ صبوحی کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں- احسان بہت خوش تھا اور صبوحی سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو کر رہ گئی تھی- عزیز بھی خوش تھا اپنی بنائی ہوئی اسکیم پر جب وہ غور کرتا تو اسے محسوس ہوتا وہ ضرور کامیاب ہوگا- عزیز نے رقاصہ کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ دلہن بن کر مکاری سے احسان کی موٹر میں بیٹھ جائے اور صبوحی کو اس کے حوالہ کردے- لیکن رقاصہ یہ نہ چاہتی تھی وہ ہر وقت عزیز کو تکتے رہنا چاہتی تھی پھر اسے اپنا وعدہ یاد آتا- آخر محبت کی خاطر وہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کو عزیز کو کامیاب بنا کر رہی- اور ہر کام اس قدر ہوشیاری سے کیا کہ کسی کو پتہ نہ چل سکا کیا ہو رہا ہے- صبوحی کو پہلے ہی سب باتوں سے آگاہ کر دیا گیا تھا جوں ہی صبوحی عزیز کی موٹر میں سوار ہوئی وہ سیدھا اسٹیشن پہنچا اور کشمیر کی ٹرین میں سوار ہوگیا - جونہی ریل حرکت میں آئی عزیز نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر دلہن کا گھونگٹ الٹا صبوحی کی کچھ عجیب حالت تھی- اور عزیز مسرت سے پاگل ہوا جارہا تھا رقاصہ احسان کے ساتھ چلی گئی- اور پھر اس کو خوب ناچ نچایا- دل بھر کر اس کو لوٹا احسان نے صبوحی کے گم ہونے کا بہت افسوس تھا لیکن رقاصہ نے اس کو شراب کا خوگر بنا دیا تاکہ وہ سب کچھ بھول جائے اور ہوا بھی یہی- اب احسان کو صرف شراب سے کام تھا اور عورت سے چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو-

صبوحی اور عزیز کشمیر پہنچ گئے- ایک سال تک وہ یہاں کی رنگینیوں میں گم رہے نشہ محبت میں سرشار رہے- اس کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے عزیز فسادات میں قتل ہوگیا اور صبوحی زندہ درگور ہو کر رہ گئی- آج اسے بیمار ہوئے تین سال ہوئے تھے اور وہ آج ہمیشہ کے لئے دنیا کو چھوڑ کر عزیز کے ہاں جا رہی تھی صبوحی اذان کی آواز پر اٹھ بیٹھی- پھر وضو کر کے نماز میں مشغول ہوگئی- اور جب آخری سجدہ میں گئی تو پھر سر نہ اٹھا سکی- رقاصہ اور احسان عزیز کی تلاش میں یہاں پہنچ چکے تھے-

ٹھیک اسی وقت یہ صبوحی کو تلاش کرنے آئے وارڈ میں وہ نہ تھی۔ آیا نے بتایا باغ میں گئی ہیں اور جب وہ باغ میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا صبوحی نماز میں مصروف ہے لیکن بہت دیر تک انتظار کے بعد بھی جب وہ سجدہ سے نہ اٹھی تو احسان نے بہن کہتے ہوئے اس کو اٹھانا چاہا۔ احسان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان لوگوں نے صبوحی کو عزیز کے بازو ہی دفنایا۔ اور پھولوں کی چادر چڑھا کر واپس ہوگئے۔ اس وقت فرشتے تک ان کی قبروں پر پھول ڈال رہے تھے۔۔

بزم کہکشاں

دل

حضرت اکبر الہ آبادی

دل میرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا — میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

شان محبوبی صانع کا نشاں رکھا ہے یہ — ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا

درفشانی نے تیری قطروں کو دریا کر دیا — دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا

دلا کر جھوٹی امیدیں دلوں کا خون کرتے ہو — نہ یہ طرز ادا اچھی نہ یہ شوق جفا اچھا

جوانی چھن گئی حسرت رہی باقی ستانے کو — عروس دہر ہم نے دل لگا کر تجھ سے کیا پایا

موت کے عشووں کے آگے ناز منطق کچھ نہ تھا — دل کو مذہب کے قدم پر سر کو دھرنا ہی پڑا

رہ طلب میں ہے بس مقدم شکستہ دل اور چشم پرنم — نہیں موثر کچھ اس میں ہمدم امیر ہونا غریب ہونا

یہ دھوم دھام کیسی شوق نمود کیسا — بجلی کو دل کی صورت آتا نہیں تڑپنا

بڑھنے تو ذرا دو اثر جذبۂ دل کو — قائم نہیں رہنے کا یہ انکار تمہارا

دل ہی دل میں ہو لئے مست مئے منصور ہم — شرع میں رخنے کا خطرہ تھا نہ خوف دار تھا

طریق عشق میں مجھ کو کوئی کامل نہیں ملتا — گئے فرہاد و مجنوں اب کسی سے دل نہیں ملتا

حسن نے ناز کئے عشق کی تکمیل ہوئی — نہ نظر آپ کی سمجھی نہ میرا دل سمجھا

وہ شعلۂ شوق کا سینہ میں مشتعل نہ رہا — تری نظر نہ رہی وہ میرا وہ دل نہ رہا

بھرا ہوا جو ذوق سے ہو خدا کی یاد اس میں شوق دل ہو — وہاں کے جلوؤں کا پوچھنا کیا مکیں ایسا مکان ایسا

مرسلہ طالب

ایک عجیب تمنا

اختر محمود

کوئی مجھے بتائے اس دل کو کہاں پھینک آؤں۔ لوگ زندگی کے ہاتھوں نالاں ہیں تو میں اس دل کے ہاتھوں پریشان۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تنگ آگئی میں تو اس کی روز روز کی خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں سے۔ اللہ جانے اس ذرا سے دل میں نت نئی آرزوئیں پیدا ہی کیوں ہوتی ہیں—؟ اور پھر یہ انوکھی خواہش جانے دل کے کس کونے سے ابھری۔ لوگ سنیں گے تو احمق، پاگل سب ہی کچھ تو کہہ ڈالیں گے۔ کوئی دوست کی آرزو میں مرتا ہے تو یہاں دشمن کی خواہش میں دم نکلا جا رہا ہے۔

اتنے بہت سارے دوست رکھتے ہوئے ایک دشمن کی آرزو —— حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن کوئی کیا جانے دوستی کے ان مسکراتے ہوئے رنگین پھولوں میں کانٹے ہی کانٹے چھپے ہیں۔ جھوٹی ظاہرداری اور دلفریب دھوکوں کی آڑ میں یہ آجکل کے دوست ہماری زندگیوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ ان کی دوستی محض دھوکے کی ٹٹی۔ چار دن کی چاندنی جس کے بعد اندھیرا ہونا لازمی۔ ان کی جھوٹی ظاہرداری کا جھل مل جھل مل کرتا پردہ ہماری آنکھوں پر پڑ جاتا ہے اور ہمیں ان کی اور ساتھ ہی اپنی ساری برائیاں اچھائیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ ہم اندھے ہو جاتے ہیں۔ یہ دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے والے دوست۔ ان سے تو کہیں اچھا وہ ہمارا دشمن ہے جو اپنی دشمنی کے پردے میں ہمیں جھوٹے رکھ رکھاؤ اور ظاہرداری کے نظر فریب دھوکے دیکھنے سے آنکھیں مل جاتی ہیں۔ تو کس قدر مٹھاس ہے نا اس ذرا سے لفظ میں جیسے سارے جہان کی شیرینی اس کے چار حرفوں میں سمٹ آئی ہو۔

کسی ساکن ندی میں ذرا سی کنکری پھینک دو تو لمحہ بھر کے لئے ان گنت معصوم جیں تڑپ اٹھتی ہیں۔ سوئی ہوئی ندی کھلکھلا پڑتی ہے کہ اس کی خاموش رواں دواں زندگی میں آخر حرکت تو پیدا ہوئی۔ لیکن ایک ذرا سی کنکری کتنی دیر مچھلیوں کو پریشان رکھتی۔ سکون پھر ندی پر چھا گیا۔ بار ساکن ہو گئی مسکراہٹیں مٹ گئیں۔ پھر

ہی خاموش اور ساکن ندی تھی جس کی تہہ میں ہزاروں طوفان مچلنے کے لئے مضطرب - بالکل یوں ہی میری اپنی خاموش بہتی ہوئی زندگی میں کتنے ہی دشمن آئے اور ایک ہلچل مچا کر پلٹ گئے - بہت جلد ان کی ساری دشمنی نے دوستی کا روپ پھر لیا - دشمنی کی آڑ میں دوستی کرنے والے دوستی کے پردے میں کانٹے چھپانے لگے - اور پھر یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی - اللہ میرا بھی کوئی دشمن ہو - میرا اپنا دشمن - جو سچ مچ میرا اپنا دشمن ہو - جس کے دل کی گہرائیوں میں مجھے ستانے کا جذبہ تڑپتا ہو - جس کی دشمنی کے دھندلکوں میں غضیلی محبت کی چھوٹی جگمگاہٹیں نہ ہوں ——— اور جس میں میرے دل کی دھڑکنوں میں چھپی ہوئی محبت کے جواب میں نفرت بھری دشمنی ہو اور میں اپنا سارا وجود، اپنی ساری زندگی اسے دے ڈالوں گی - اور اس کے بدلے وہ مجھے ستانے، درد پہنچانے، تکلیف دیکر تڑپانے کی اپنی ساری توجہیں میرے لئے صرف کرے - جانے وہ لوگ کیسے ہوتے ہیں جو محبت کا جواب محبت سے چاہتے ہیں — دیکر لینا - تھوک کر چاٹنا - کس قدر ذلیل حرکت - ایسے لوگوں کے پاس اپنے ستانے والوں، نفرت کرنے والوں کے لئے دعا سے زیادہ بد دعائیں ہوا کرتی ہیں - لیکن یہاں تو ہر سانس کے ساتھ یہ دعا

جیتے رہیں الٰہی میرے ستانے والے

نکلتی ہے - افسوس تو اس کا ہے میرا کوئی دشمن، دشمن نہ رہا - لیکن کوئی بھی مجھے اپنے دوست عزیز نہیں - یہ بات نہیں - مجھے اپنے سارے دوست پیارے ہیں - لیکن وہ بہت زیادہ جو کبھی کبھی دل میں ایسے نشتر چبھو دیتے ہیں - جن کی کھٹک مدتوں تڑپائے رکھتی ہے - جلن، سوز، تڑپ، بے چینی، بے قراری ہی سے تو ان کی زندگی عبارت ہے -

یوں ہی ایک بار مجھے بھی زندگی کی گہرائیوں میں ایک دشمن مل گیا - میں خوش ہو گئی چلو اچھا ہوا - اب زندگی معلوم ہو گی - ہمیشہ سہارا ڈھونڈنے والی روح کو ترقی کی کٹھن منزل پر چلنے کے لئے ایک سہارا مل گیا - یہ ہمارے دشمن بے نیاز ہوتے ہیں جو اپنی دشمنی کے دلفریب، جھگڑوں میں ہمارے لئے ترقی کی راہیں ہموار کرتے چلے جاتے ہیں - بالکل انجانے ہی میں اس کٹھن راہ کے وہ سارے روڑے جو ان گامزن ما جو

ترقی کی- اس منزل سے اس منزل تک دوڑتے چلے جاتے ہیں کھوئی کھوئی سی بے ربط زندگی میں ایک ربط پیدا ہو جاتا ہے - دشمن کے پانے ہی میں نے بھی اطمینان کا گہرا سانس لیا بے مقصد زندگی کا ایک مقصد تو نکل آیا - اب تو میری زندگی واردات سے یکسر خالی نہ رہے گی - دشمنی کے جھگڑے ہوں گے - نفرت کے دھندلکے ہوں گے اور حقیقت کی تلخیاں بھی- جس قدر دشمن کی طرف سے سختی کا اظہار ہوتا آزار و تکالیف پہنچائی جاتیں، خوش ہوتی اور اس طرف سے پہنچائے ہوئے ہر آزار کو ایک تازیانہ سمجھکر آگے بڑھتی لیکن میری قسمت - میرے ہر دشمن کی دشمنی بہت جلد دوستی سے بدل جاتی اور ہر وہی جھوٹی تعریفیں، اور خوشامد کی باتیں جس پر آپ ہی آپ جھنجھلاتی دل ہی دل میں جل اٹھتی ہوں - لیکن ابتک دشمن کو پالینے کی آرزو، آرزو ہی رہی، کسی نے کہا دل میں کچھ نہ ہونے کے بدلے آرزو کی تڑپ، اس کی چبھن کا رہنا ہی اچھا ہے - اللہ کس قدر دلفریب ستم ظریفی ہے یہ بھی کہ دے جاؤ اپنے کو دھوکا اور فریب جانتے بوجھتے ہوئے بھی۔

یوں ہی میرے دشمنی بن بن کر بگڑتے اور دوستوں کی خواہش نہ ہونے پر بھی دوست بڑھتے ہی جا رہے ہیں - دشمن بھی کچھ سوچے بغیر دوست بن جاتے - اب تو اپنی اس بیکار سی زندگی سے نفرت سی ہو چلی ہے جو میرے ہر دشمن کو بگاڑ کر دوست بنائے جاتی ہے لاکھ کوشش کرتی ہوں ان دوستوں ہی میں کوئی دشمن ڈھونڈ لوں - دکھاوے کی محبت کرنے والے دوست جن کا باطن کچھ، ظاہر کچھ اور ہوتا، مل جاتے لیکن دشمن، میرا عزیز ترین دشمن، بے سہارا روح کا سہارا دشمن کہیں نہ ملا - اور جو کہیں ملا بھی تو بہت جلد اس کی دشمنی دوستی سے بدل گئی اور میں بدستور تڑپتی رہتی ہوں - ایک دشمن کے لئے - جانے کیسے ملے، کیسے ملے میرا دشمن ——— ؟؟

استفسار

ذیل کے اشعار اور جملہ کے معنی بوضاحت بیان کیجئے تو باعث تشکر۔

۱- احسان ہوگا آپ کا دیدیجئے ہمیں ابجد کے دائرہ سے نظیرہ عراق کا

۲- ز تجنیس و ز تحریف و ز تخلیف زروئے یار خواہم صد مشرقی

۳- در ما ورجہ خانۂ ما خاک نیست اکنیشم

ہماری بے بسی

نجمہ یحییٰ صدیقی

(اپنی پیاری بھابی جان کی پہلی برسی پر)

میں آج دن بھر یہی سوچتی رہی کہ تم سے چھٹے پورا سال ہوگیا سال بھر سے تمہیں نہ دیکھ سکی۔ پچھلے سال چاند کی یہی تاریخ تھی۔ ایسی ہی بھیانک شام تم اپنے سفر کا آغاز کرنے والی تھیں اور ... ہم گو چاہتے تو نہ تھے تمہیں اپنے سے جدا کردیں لیکن نہ جانے کیوں ... ہم بے چوں بلی سے تمہارے سفر کا ضروری سامان ٹھیک کر رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ تمہیں اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپا لیں تمہیں جانے نہ دیں۔ مگر خدا جانے کیوں اپنی مرضی کے خلاف ہم تمہیں الوداع کہنے پر آمادہ تھے۔ تمہاری جدائی کا خیال سوہان روح تھا۔ ہمارے قلب مضطرب تھے اور آنکھیں غمناک ..... پھر بھی نہ جانے کونسی طاقت تھی جو ہمیں تمہیں بھیجنے پر مجبور کر رہی تھی.... آہ !! نہ جانے کیوں..... اور تم...... تم نے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جانے کا تہیہ ہی کر لیا تھا۔ تمہارے لبوں پر گویا کسی نے مہر سکوت لگا دی تھی۔ تم خاموش تھیں اور پرسکون ... ہمارے دلوں کا حال ہمارے چہروں سے عیاں تھا۔ تمہیں بخوبی معلوم تھا کہ ہم کتنے بے چین تھے کتنے ملول تھے اس وقت۔ لیکن آہ !! پھر بھی نہ جانے کیوں تم اپنی عادت کے خلاف ہمارا دل دکھانے پر تیار تھیں..... تم..... تم نے تو اتنی بے مروتی کبھی نہ برتی تھی.... میں مانتی ہوں تمہارا جانا بےحد ضروری تھا لیکن ایسا بھی کیا تم نے ہماری تشفی کے لئے زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا.... تم نے اپنا سرخ لبادہ پہن لیا جس میں تم ایک نئی نویلی دلہن سے کم نہ لگ رہی تھیں۔ گویا تمہارے سفر کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ ہمارے نالے۔ ہماری آہ و زاریاں سب بے سود ثابت ہوئیں اور تم..... آخر ہمیں تڑپتا چھوڑ کر چلی گئیں... .... اور لوگ کہتے ہیں شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ..... لیکن یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ہم سے یوں بے اعتنائی برتو ...... نہیں .... نہیں ... کبھی نہیں ...! ہم پھر ضرور ملیں گے۔

ٹوٹے ہوئے تارے

۱۔ اس جرم پر کہ شہاب نے آپ کے مضامین شائع نہیں کئے پرچہ موقوف کرنے کی دھمکی دی ہے۔ "چشم ما روشن دل ما شاد" مگر یاد رکھئے کہ ایسے ہی ۔۔۔۔ دیگرے بھی آئے ہیں ۔ اور مسالہ سابقہ ہے۔ یہاں سوال بیع و شری کا نہیں ہے بلکہ ذوق ادب کا ہے۔ آپ کے مضامین اگر قابل اشاعت ہوتے تو ضرور درج کئے جاتے لیکن جب کوئی مضمون ہی طلانہ ہو تو اس کی ذہنیت کیا فرماتی ہیں آپ؟

۲۔ فاطمہ نسرین ۔ ایک عرصہ سے آپ خاموشی ہیں آخر کیوں۔ آپ کے چند مضامین کسی ادارہ کے توسط سے مل گئے مگر ہم تو دستِ غیر سے حاصل کرنے میں شہاب کی توہین سمجھتے ہیں اس لئے راست مضمون بھجوائیے۔

۳۔ آپ افسوس نہ کیجئے آپ کے مرسلہ خریدار نے وی پی ۔ واپس کردی، بالکل ٹھیک کہا تھا آپ نے کہ شہاب کا مرید اون کو بناؤں گا جن میں ذوق اور صلاحیت ہو ورنہ خریدار بنانا گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر دینا ہے۔

۴۔ آپ کی بیگانہ وشی اور طرز کرم قابل ستائش نہ سہی لیکن میں تو الٹی تعریف، داد ہی سمجھتی ہوں کیونکہ خود داری بھی تو کوئی چیز ہے باوجودیکہ آپ سے خفا ہوں لیکن پھر بھی آپ کے "طرز کرم" کی فریاد آپ ہی سے کرتی ہوں۔"

آپ طرز کرم کی فریاد کر رہی ہیں میں طرز تغافل کا ماتم مگر جب جواب ہی نہ ملے اور مضمون ہی نہ آئے تو میری گلہ مندی غلط نہ ہوگی۔ سر پھوڑنے کو جی چاہے اور پتھر نہ ملے تو کسی ایسی کی مجبوری پر غور کیجئے۔ پتہ ہی معلوم نہ ہو تو جواب کہاں بھیجا جائے۔ حافظ شیرازی نے کہا تھا ۔ صبا اگر گذرے افتد بکشور دوست بیار نفحہ از گیسوئے معنبر دوست

یہاں اب نہ وہ صبا ہے جس کے ذمہ پیامبری رہتی تھی اور نہ وہ گیسوئے دوست ہے کیونکہ صبا آوارہ اور دوست گیسو بریدہ ہے

۵۔ جمیلہ بیگم آپ پھر ایک عرصہ سے خاموش ہیں غالباً دنیائے شعریت میں محو ہیں لیکن ہم تو آپ سے نثر کے خواہاں ہیں۔ نظم اونہیں دیجئے جو شاعر ہیں اور اوس کی رنگینیوں میں گم کردہ راہ یہاں نثر کا موتی سے سلک تیار کرنے کی فرصت نہ ہو تو وہ نظم میں کیا تنظیم پیدا کر سکتا ہے۔ بھیجے کوئی اچھا اور دلچسپ مضمون ؟

3238
REGD. M. N. [illegible]
رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب ڈبیر پورہ سے شائع ہوا

شہاب

مرتبہ
محمد عبدالرزاق بسمل

قیمت سالانہ (عہ)

جلد (۱۶) بہمن ۱۳۵۷ف دسمبر ۱۹۴۷ء نمبر (۳)

رباعیات

جناب فخرالدین احمد سعید بی، اے عثمانیہ

گمنام نہ ہو، نام چمکتا دیکھو ؛ ہاں حوصلہ و ہمت دریا دیکھو
دنیا میں جو آئے ہو تو کچھ پھولو پھلو ؛ منبع کیا دیکھتے ہو ڈلٹا دیکھو

ہے ہاتھ میں انساں کے جو چاہے عزت ؛ کیسی ذلت، کہاں کا سوال نکبت
ماحول کو بدلو تو بدل جاؤ گے ؛ سرگرم جو بدل جائے تو سر ہے دھیوت

فرد

اللہ رے خوف قید نہ پھر پاس آئی برق ؛ جب سے بنا لیا ہے نشیمن قفس نما

فرد

پھونکتے پھونکتے تھک گئے صور اسرافیل ؛ ضعف نے حشر میں بھی گور سے اٹھنے نہ دیا

نظم قدیم

جناب مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم

(اس کا پہلا حصہ مجلہ طیلسانین کے شمارہ ۲ جلد (۱۰) میں شائع ہوا ہے)

عادل شاہی سلطنت سلطنت بہمنیہ کے عروج و زوال اور دکن میں پانچ سلطنتوں کے قیام کے وجوہ و اسباب کا تذکرہ "عہد سلف"[1] میں نظم بند کیا گیا ہے یہاں یہ اشارہ کافی ہے کہ ان پانچ سلطنتوں میں بھی اصول و ضوابط سلطنت وہی تھے جو بہمنی سلطنت کے تھے سوسائٹی اور معاشرت کے وہی آئین قائم تھے جو پہلے سے موجود تھے۔ تمدنی لحاظ سے بیجاپور بڑھا ہوا تھا۔ اس کی عظمت و شان بلند تھی۔ نزاکت اور خوبی میں بیجاپور نے گویا نئے روایات قائم کئے۔

مدرسہ بیجاپور احمد نگر کے مدرسہ کے بعد بیجاپور کا مدرسہ قائم ہوا ۹۷۴ھ میں علی عادل شاہ نے افضل خاں وزیر کی تحریک سے یہ مدرسہ بنالیا۔ دربار اکبری کی مشہور شخصیت ملا فتح اللہ شیرازی کو ایران سے اولاً اسی مدرسہ کی پروفیسری کے لئے بلایا گیا تھا چالیس ہزار ہنز زادراہ کے طور پر بھیجے گئے تھے۔ ملا فتح اللہ نے دو تین سال بیجاپور میں ٹھیر کر وہاں سے گولکنڈہ پھر دربار اکبری میں چلے گئے۔ مدرسہ میں سو طلبہ تھے۔

افسوس ہے کہ مدرسہ بہت جلد برخاست ہوگیا۔ (خیر المجالس ص ۹۲)

ادبی اور علمی ترقی نصرتی اور ہاشمی وغیرہ شعراء زبان دکنی ہیں۔ اس کے علاوہ خود فارسی زبان کی ترقی بھی جاری تھی۔ ظہوری بیجاپور کا مداح ہے۔ بقول شبلی دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی قدر دانی اور فیاضی نے بیجاپور کو ایران کا ٹکڑا بنا دیا تھا۔ ظہوری اور ملک قمی اس کے دربار کے ملازم تھے۔ اور اکبری کشش بھی ان کو دہلی اور آگرہ نہ کھینچ سکی۔

ظہوری کا کلام دراصل اس زمانہ کی بیجاپوری سوسائٹی کا آئینہ ہے۔ تکلفات اور نفاست ترفہ کا اثر شاعری پر بھی پڑا۔ اگرچہ حالی نے ظہوری کی نسبت لکھا ہے کہ اہل زبان اس کے کلام نظم و نثر

---

[1] مولف مرحوم کی تالیف جو طبع ہو چکی ہے۔ جو کتب خانہ سید محمد باغ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

دونوں کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک عرصہ تک اس کا اقتدار مسلّم رہا۔ جب تک وہ معاشرت برقرار رہی اس کا طوطی بولتا رہا۔

صائب کا شعر ہے کہ ؎

صائب نداشتیم سر و برگ این غزل ؎ این فیض از کلام ظہوری بما رسید

شبلی بھی اگرچہ منکر ظہوری ہیں۔ لیکن تسلیم کرتے ہیں کہ "قصیدہ کا ایک خاص طرز عرفی نے قائم کیا۔ جس کی کوئی تقلید نہ کرسکا۔ ظہوری طالب آملی اور حسین ثنائی نے بھی اس صنف کو کچھ کم ترقی نہیں دی" (شعر العجم جلد ۳ صفحہ ۲۲)۔ فیضی بھی ظہوری کی رنگین طبع کا معترف ہے۔ درحقیقت فارسی شاعری کے دور جدید کی ابتدا ظہوری سے سمجھنی چاہیئے۔ البتہ عرفی اور نظیری نے خامی دور کی۔

چناں آفاق گر از ملک معنی ؎ کہ مدفلکش از قم تا دکن بود

ابو طالب کلیم نے بھی جس کو شبلی نے صحیفہ شاعری کا اخیر ورق قرار دیا ہے۔ بیجاپور کی خاک چھانی تھی۔ کلیم کا ایک قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں بھی ہے۔ ایک قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ میں جاسوسی کے شبہ میں پکڑا گیا اور قلعہ شاہ درگ میں قید رکھا گیا۔

مذہبی آزادی ہندوؤں سے قطع نظر عیسائیوں کو بھی مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کو اجازت تھی کہ اپنے تبلیغی کاروبار بھی چلائیں۔ چیناپور میں ایک عیسائی مشن تھا۔ مدگل رومن کیتھولک فرقہ کا بہت بڑا مرکز تھا۔ فرقہ سینٹ زیویر کا ایک قدیم گرجا ہے جو ۱۵۲۳ء میں بنا ہے اور علی عادل شاہ نے ۱۵۵۷ء میں اس کو گرانٹ دی تھی۔ سیڈوز ٹیلر نے اس کو تمام ہندوستان میں سب سے قدیم گرجا لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اندرون ملک کے لحاظ سے یہ ہو ورنہ سواحل پر بہت پہلے سے گرجا موجود تھے۔

نئے شہروں کی آبادی عادل شاہی دور میں قدیم گوگی[1] کے قریب نئی گوگی بنائی گئی۔ پرانی گوگی پہلے یوسف عادل شاہ کا مستقر تھا اور اسی تعلق

---

[1] اسی جگہ قاضی محمود بحری کا مزار ہے جنکے والد مرشد جہانگیری علاقہ مدراس کے قاضی تھے اور پھر گوگی میں آئے۔ قاضی محمود بحری عالمگیری دور کے ہیں۔ من لگن دکھنی زبان میں ان کی تالیف ہے۔

سے محاگوگی ہوگئی۔ گوگی قدیم میں ایک مسجد سلطان فاطمہ ۵۶۰ فٹ مربع ایسی ہے جس میں کوئی ستون نہیں ہے۔ گوگی جدید میں اربعہ مساجد ۴ مسجدوں کا مجموعہ ہے۔ ایک مسجد کے نیچے دو مسجدیں اس کے چھت پر اور ایک نیچے کی مسجد کے بازو ہے۔ یہ مسجد سلاطین بیجاپور کی تعمیر کردہ ہے۔ شاندار اور انوکھی عمارت ہے۔ (رپورٹ ضیاء الحسن)

بیجاپور کے قریب شاہ پور آباد تھا۔ جو بجائے خود شہر اور تجارت گاہ تھا۔ ابراہیم ثانی کے زمانہ میں اس کی آبادی ۹ لاکھ نفوس بیان کی جاتی ہے۔ ابراہیم ثانی کے عہد میں زیر انتظام شاہ نواز خاں نورس پور بسایا گیا۔ جس کا نام فارسی شاعری کے تعلق سے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ملک عنبر نے اسے تاراج کر دیا۔

رفاہ عام رفاہ عام کے کاموں میں مسجدیں۔ سرائے اور تالاب نیز باؤلیاں بے شمار تیار ہوئیں چنانچہ مصطفیٰ خاں لاری کی سرائے۔ تالاب سلطان بیگم واقع محمد پور۔ جو بچاس ہزار ہن کے صرفہ سے ۱۰۱۲ھ میں تعمیر ہوا۔ رائچور کی خاص باؤلی ۹۰۹ھ بہ اہتمام احمد بن محمد بنڈہ باؤلی ۱۰۱۱ھ شکر باؤلی ۱۰۱۲ھ ڈرن بنڈہ باؤلی (۹۹۰ھ) کا تذکرہ بشیر الدین نے کیا ہے مشہور بیجاپور کی جامع مسجد شاہ پور کا تالاب اور کارنجہ (واٹر ورکس) کشور خاں کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔ سگر کی مسجد یادگار زمانہ ہے اور بجز جامع مسجد گلبرگہ کے اپنا جواب نہیں رکھتی ستونوں اور دروں کی انتہا نہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک محرابیں ہی محرابیں ہیں۔ ۷۵ کمانیں ہیں۔ اسمٰعیل عادل شاہ کے زمانہ میں تعمیر ہوئی۔ اس کا جامع مسجد ہونا مسلم ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گلبرگہ کی جامع مسجد دراصل جامع مسجد تھی۔ جسکے نمونہ پر یہ بنائی گئی ہوگی۔ ۹۳۱ھ

آب رسانی بیجاپور میں بھی آب رسانی کا انتظام اسی طرح معقول اور عمدہ پیمانہ پر تھا جیسا کہ اس دور کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں ۲ فرسخ سے شہر میں نہر لائی گئی اور قلعہ کے قریب ایک بڑا حوض جسے کارنجہ کہتے ہیں بنا کر اس میں پانی پہونچایا گیا۔ جہاں سے تمام شہر میں آب رسانی ہوتی تھی۔ اورنگ آباد میں گویا بیجاپور وغیرہ کی ہی تقلید کی گئی غرض بیجاپور میں پانی وافر مقدار میں نہایت شیریں نفیس اور جتنا چاہتا شہر میں آتا تھا۔ آب رسانی کے انتظام کی تکمیل محمد عادل شاہ اول کے زمانہ میں ہوئی۔ البتہ ابتداء علی عادل شاہ کے زمانہ میں ہوئی۔ بشیر الدین نے اپنی کتاب میں آب رسانی کے متعلق کافی تفصیلات بیان کئے ہیں۔ اس زما

کے انجنیروں میں ملک صندل کا نام آتا ہے - جو ابراہیم کے روضہ کا بھی بیان کیا جاتا ہے -

آب رسانی کے انتظامات اب بھی کھنڈروں کی صورت میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ملدرگ کا "پانی محل" مشہور ہے - ۱۰۲۲ھ یا بقول شفیق ۱۰۲۳ھ میں اس کی تکمیل ہوئی - عمارت قابل دید ہے - ۲۲ گز کا ارتفاع ہے - ندی کو روک کے ایک بند بنایا گیا ہے - اور بند کے اندر کئی کمرے بنائے ہیں - درمیان میں پانی محل ہے - جس کے اوپر سے ندی بہتی ہے اور دوسری طرف جا کر باہری پر سے نیچے گرتی ہے - کمرے نہایت وسیع اور مرتفع ہیں - جب چادر گرتی ہے تو محل کے اندر عجیب لطف آتا ہے - ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانہ کی یہ یادگار ہے -

عادل شاہی حکمرانوں نے اپنی فوج پر بھی بہت توجہ کی تھی۔

فوج اور توپ خانہ

ان کا توپ خانہ بھی بہت قابل لحاظ تھا - بشیر الدین نے تفصیل سے توپوں کا حال لکھا ہے - لنڈے قصاب کی توپ - ملک میدان سے بڑی ہے ۹۵۶ھ میں علی عادل شاہ اول کے وقت یہ توپ تیار ہوئی اس کا طول ۲۱ فٹ ۔ انچ لکھا ہے - وزن ۴۷ ٹن - اسی طرح حیدر برج کی توپ - تیر اور بھی توپیں ہیں - توپوں کی تر دھی زیادہ کی گئی - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی طبعی ذہانت نے توپ سازی میں بھی ترقی کا راستہ نکال لیا - یہ یاد رہے کہ توپ سازی ترکوں سے سیکھی گئی تھی -

مختلف مقامات پر عادل شاہی دور کی توپیں موجود ہیں گلبرگہ اور ملدرگ میں بھی یہ موجود ہیں - ملدرگ میں دو توپیں تلنبے کی ہیں جو تین سو برس کی ہیں -

بشیر الدین نے لکھا ہے کہ ملدرگ میں ایک پر نیڈہ برج ہے جس پر سے کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قلعہ پر نیڈہ سے جھنڈیوں کے ذریعہ باتیں ہوتی تھیں ص ۸۷ ۵

علی عادل شاہ کی فوج کے آگے وہ علم جو کربلائے معلی سے لائے گئے تھے - بجائے نشان کے رہتے تھے (بشیر الدین ص ۵۷۵) فوج میں تعزیہ داری جو ہوتی تھی اس کی ابتدا یہیں سے ہوتی تھی۔

دفتری نظم و نسق

فارسی دفتر برخاست اور اس کے عوض ہندی یا جیسا کہ بشیر الدین نے لکھا ہے مرہٹی دفتر قائم کیا گیا (بشیر الدین جلد اول ص ۴۰) برہمن دفتروں میں مامور کئے گئے - عادل آباد (رہیر اپور) میں جو کتبہ ہے اس میں دریا جی المخاطب ضابطہ خاں نائب شہر احسن آباد درج ہے - علی ہذا کدم راو گورنر بنکاپور کا نام بھی تاریخوں میں آتا ہے - گویا اہم عہدے بھی اب ان لوگوں کو دیے جانے لگے -

واضح ہو کہ کوکن اور مرہٹہ علاقہ جو ساحل پر ہے اس کا کچھ حصہ نظام شاہیوں کے قبضہ میں تھا اور کچھ حصہ عادل شاہ کے اقتدار میں تھا۔ نظام شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد کوکن کا کل علاقہ عادل شاہ حکومت کے اقتدار میں آگیا۔ محمد عادل شاہ کے زمانہ میں ملا احمد نائتیہ کو اس علاقہ کی حکومت سپرد تھی۔ پونا اور سوپا دو پرگنے شاہو بھونسلہ کو جاگیر میں دیے گئے تھے۔ سابجی کا تعلق اولاً نظام شاہی دولت سے تھا اور اس کے بعد شاہجہاں کے زمانہ میں مغلیہ حکومت سے فرار ہو کر عادل شاہ کا نوکر ہوا تھا۔ زمینداروں کے طور پر اس نے اس علاقہ میں توطن اختیار کیا۔ [illegible] کی جانب [illegible] کو متعین کیا گیا تھا۔ محمد عادل شاہ کے فوت ہونے کے بعد ملا احمد نائتیہ کو [illegible] چلا آیا۔ اس پر سابجی نے [illegible] کو خالی پاکر شورش برپا کی اور تمام قلعوں پر اقتدار قائم کرلیا۔ عادل شاہ اپنی غفلت کی وجہ سے قابو نہ پا سکا۔ افضل خاں اور رستم خاں دھوکہ سے مار ڈالے گئے۔ اس طرح مرہٹہ حکومت مستقلاً آغاز ہوئی۔

مختلف قوموں کا میل جول اسلامی اور ہندووانی دکنی امتزاج کا اثر صرف ان چیزوں تک محدود نہ تھا بلکہ اس نے سوسائٹی اور اشرافیہ پر [illegible] اثر قائم کیا جو تفصیلی تحقیقات کا محتاج ہے۔

احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت

نئے شہروں کا آباد کیا جانا۔ احمد نگر نظام شاہ حکمرانوں نے دولت آباد کی تسخیر کے خیال سے چند بار اس پر حملے کئے۔ لیکن جب معلوم ہوگیا کہ اس پر فتح پانا دشوار ہے تو اس نے یہ تدبیر مناسب سمجھی کہ بغیر [illegible] دار الحکومت اور دولت آباد کے مابین ایک نیا شہر بسا کر وہی مستقر حکومت قرار دیا جائے۔ اس طرح موقع حاصل رہے گا کہ ہر سال غلہ وغیرہ بہم پہنچانے کے زمانہ میں حملہ کرکے برباد کر دینے کی کوشش کی جائے اور اس طریقہ سے قلعہ والے عاجز ہو جائیں۔ اسی خیال سے احمد نگر بسایا گیا ۹۰۰ھ میں جو دو تین سال میں اس قدر آباد ہوگیا کہ وہ دعوی برابری وہمسری با بغداد و مصر می نمود۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعمیرات کا کام ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ [illegible] قلعہ کی تعمیر

متعلق اس کے کتبہ سے ظاہر ہے کہ ۹۸۵ھ میں احمد آقا نے تعمیر کرایا ۔

سررشتہ کوتوالی نظام شاہیہ کے زمانہ میں بعہد صلابت خاں مدارالمہام مرتضیٰ نظام شاہ نے مرہٹواری میں چوری اور دزدی کے انسداد کے لیے خاص انتظام کیا تھا ۔ خواجہ عنایت اللہ وغیرہ کے ماتحت خاص جمعیت اس غرض سے تعینات تھی تاکہ ہر وقت ملک میں دورہ کیا کریں اور دزدی کا انسداد کریں ۔

توپ خانہ برہان نظام شاہ کے پاس زبردست توپ خانہ موجود تھا ۔ چلپی رومی خاں توپ خانہ کا کمانڈر تھا ۔ شولاپور کے محاصرہ میں اس توپ خانہ نے بہت کام کیا ۔ اس بنا پر رومی خاں کی تعظیم اور تکریم بڑھ گئی ۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ "در جمیع از فرنگ ہم پیشہ" "رومی خاں بودند" سے مراد غالباً یورپین ہیں ۔

رام راج کے مشہور مقابلہ میں بھی اس نظام شاہی توپ خانہ نے بڑا کام کیا ۔ بیجاپور کی مشہور توپ "ملک میدان" پر یہ کتبہ ہے "علی محمد بن حسن رومی ۔ ابوالغازی نظام شاہ خادم اہل بیت رسول اللہ"

بشیرالدین احمد نے اس سلسلہ میں جو امور قلمبند کئے ہیں ان سے واضح ہے کہ "ملک میدان" کا نشانہ دور نہیں چلسکتا تھا یہ توپ گولہ باری کے کام میں نہیں آتی تھی ۔ بلکہ تھیلیوں میں پیسہ ڈال کر توپ میں بھر کر دشمن کی دو بدو آئی ہوئی فوج پر چلاتے تھے ۔

تلی کوٹ کے معرکہ میں اس توپ سے بھی کام لیا گیا تھا اور اس سے رام راج کی فوج میں صفوں پر صفیں الٹ گئی تھیں ۔ یہ توپ احمدنگر میں ڈھالی گئی تھی اور وہ مقام اب بھی موجود ہے جہاں اس کو ڈھالا گیا تھا ۔ ڈھالے جانے کے بعد یہ توپ پرینڈہ میں لاکر قلعہ پر چڑھائی گئی ۔ وہاں سے فتح پرینڈہ کی یادگار میں بیجاپور لائی گئی ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس سانچہ کی دو توپیں بنائی گئی تھیں ۔ دوسری توپ کا نام "کڑک بجلی" تھا ۔ یہ توپ بھی تلی کوٹ کو گئی تھی ۔ مگر وہ دریائے کرشنا یا بھیما میں غرق ہو گئی ۔

اودسہ کے قلعہ میں بھی توپیں ہیں ۔ ایک توپ آٹھ فٹ لانبی ہے ۔ اس کا دہانہ دس انچ ہے اس توپ پر کندہ ہے کہ "ابو الغازی شاہ نظام ۔ عمل استاد محمد بن حسن رومی" "ملک میدان" جس زمانہ میں تیار ہوئی اسی زمانہ میں یہ توپیں بھی تیار ہوئی ہیں ۔

دولت آباد کے قلعہ پر بھی توپیں ہیں "کالا پہاڑ" توپ ۲۱ فٹ ہے ۔ "چرخ دھاں"

توپ جس کا طول ۱۹ فٹ ہے ۔ بیجاپور کی ملک میدان ان کے لگ بھگ ہے ۔ یہ توپ منگل سنگھ کی ڈھالی ہوئی ہے ۔

بشیر الدین احمد نے ٹیورنر سیاح کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دولت آباد کے قلعہ میں کثیر تعداد عمدہ توپوں کی موجود ہے ۔ جن کے گولہ انداز انگریز یا ہالنڈی ہیں ۔ ایک ڈچ انجینیر ۱۵ یا ۱۶ سال سے ملازم تھا ۔ وہ ہر چند اپنے ملک کو جھول رخصت جانا چاہتا تھا ۔ لیکن کسی طرح اجازت نہیں ملتی تھی ۔ راجہ جے سنگھ جو سواجی کے مقابلہ پر بھیجا گیا تھا دولت آباد پر سے گذرا ۔ یہ انجینیر راجہ سے ملنے گیا ۔ راجہ نے اس سے فرمائش کی کہ اس بلند پہاڑ پر اگر توپ چڑھائی جائے تو رخصت دی جائے گی ۔ انجینیر نے حسبِ کام کی تکمیل کر دی اور اس کو رخصت مل گئی ۔ (بشیر الدین احمد تاریخ بیجاپور ص ۷۶ جلد ۳)

تعلیمات

اگرچہ بیجاپور علمی ترقی میں احمدنگر سے بڑھا ہوا ہے ۔ لیکن بعض امور میں اولیت کا فخر احمدنگر کو حاصل ہے ۔ مثلاً مدرسہ کی بنا اولاً احمدنگر میں ہوئی اس کی تقلید ایک مدت کے بعد بیجاپور میں ہوئی ۔ اسی طرح ظہوری اولاً احمدنگر آیا ۔ ظہوری نے ساقی نامہ نظام شاہ کی شان میں کہا جس کا بیش بہا صلہ عطا ہوا ۔ (مولانا شبلی کی شعر العجم) ملک قمی اور ظہوری اولاً صلابت خاں کے دست گرفتہ تھے ۔ مورخ فرشتہ کی بھی اولاً احمدنگر میں ہی پرورش تھی ۔

شاہ طاہر کی وجہ سے احمدنگر میں علمی اثر بہت نمایاں تھا ۔ شاہ طاہر کا مدرسہ تو مشہور ہی ہے ۔ اس کو لنگر دوازدہ امام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے (عبد الجبار ص ۱۴) بہر صورت اغراض تعلیمی ہی مقصود تھے ۔ لیکن عبد الجبار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقام قلعہ کے مقابل تھا ۔ بیرون قلعہ نہ کہ اندرون قلعہ ۔ بارہ ہزار ہن کے محاصل اس کے لئے وقف کئے گئے ۔ مدرسہ کے لئے ایرانی علما طلب کئے گئے ۔ دوسرے علما کو بھی مدرسہ کے اسٹاف میں شامل کیا گیا تھا ۔ قاضی عبد النبی احمدنگری نے جامع العلوم میں لکھا ہے کہ وہ بھی اس مدرسہ میں شریک تھے ۔ اس وقت ۴۰ مدرس تھے ۔ ۲۰۰ سے زیادہ طلبہ ۔ شاہ طاہر خود بھی درس دیتے ۔ مجلسی محاکات اور اشارات کا درس ان کے ذمہ تھا ۔ قدرت نے ان کو خوش تقریر اور خوش بیان بنایا تھا ۔ ان کے درس سے لوگ لطف و مسرت حاصل کرتے (عبد الجبار ص ۹۵) اس مدرسہ کے ایک استاد سید حسن محمد مدنی نقیب زادہ کو برہان نظام شاہ نے اپنی بیٹی دی تھی ۔

بیدر کی بریدشاہی سلطنت محمد شاہ بہمنی کے بعد اس لحاظ سے کہ بہمنی بادشاہ برائے نام رہ گئے تھے بیدر کا اپنے درجے سے گھٹ جانا ضروری تھا۔ امیر برید نے ۹۳۲ھ میں بیدر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا لیکن اس سلطنت کو عادل شاہیوں اور نظام شاہیوں سے فرصت نہ ملی۔ علی برید نے بیدر کو پھر رونق دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس عرصہ میں بیجاپور۔ احمد نگر اور گولکنڈہ بہت ترقی کر گئے تھے۔ بیدر پنپ نہ سکا۔

بہرحال بہمنی اصول پر بیدر میں بھی نظم و نسق کا کام جاری تھا۔ تمدن کی بنا پر تو گویا سب کچھ ایک تھی۔ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے کام ہوا کرتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز ایک جگہ ایجاد ہوتی سب جگہ اس کی تقلید کی جاتی۔ چنانچہ توپ کا کام یہاں بھی ہوتا تھا۔ ایک توپ ۲۱ فٹ طویل ہے۔ پچرس نیلگوں زنگ ہے۔ ایسی جلا کی ہوئی ہے کہ منہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ توپ دولت آباد کی توپ اور بیجاپور کی مشہور توپ ملک میدان کے ہم پلہ ہے اس توپ پر یہ کندہ کیا ہوا ہے کہ "دیکھے از عراب علامات کارخانہ اجگاتوپ شاہی در منع به خامہ معرفت نواب ہمایوں اکرم علی برید شاہی۔ نکت فی التاریخ ۹۸۱ھ"

بیدری کام کی شہرت تو مستغنی عن البیان ہے۔

عمارت میں علی برید کا گنبد مشہور ہے۔ لاجوردی سنہری اور چینی کا کام خوب ہے گنبد کے چاروں طرف کھلی ہوئی مرتفع کانیں ہیں۔ جن میں فراغت سے ہوا کا گذر ہوتا ہے۔ اور ہوا کے زور سے کوڑا کرکٹ اڑ جاتا ہے اور مقبرہ گرد و غبار سے پاک رہتا ہے۔

اورنگ آباد اورنگ آباد ملک عنبر کا بسایا ہوا ہے۔ اس کا پہلا نام کھڑکی تھا۔ اورنگ آباد کو ملک عنبر نے اس طرح سے آباد کیا جس طرح قطب شاہیہ نے حیدرآباد کو بہ لحاظ ضرورت آباد کیا۔ شفیق نے لکھا ہے کہ :۔

"پس از انکہ غیر از دولت آباد و انکہ معدودہ بدست نظام الملک نماند ملک عنبر اول پسندیدہ بعد ازاں جنوس ازاں قلعہ دولت آباد پائے تخت نظام الملک گردانند و خود بدون قلعہ در موضع کھڑکی آبادی نمودہ سکونت گرفت"

اورنگ آباد کی جامع مسجد اور دروازہ پھڑکی وغیرہ سب ابتدائی آبادی کے زمانہ

یاد دلاتی ہے۔ یہ نہر اس زمانہ کے سررشتۂ آب رسانی کا بہترین کارنامہ ہے۔ سنہ ۱۰۲۴ء میں یہ نہر بیرون شہر سے لائی گئی تھی۔ پانچ مہینہ میں کام ختم ہوا۔ "خیر جاری" تاریخ ہے

اورنگ آباد کے پہلے نام کھڑکی کے متعلق شفیق نے صراحت کی ہے کہ:۔

"کھڑکی کہ منسوب بہ کھڑک بود و کھڑک در اصطلاح دکن سنگ لاخ را می گویند چہ زمین این معمورہ سنگ لاخ است"

اورنگ آباد کے سلسلہ میں دو ایک کی مزید توضیح بے محل نہ ہوگی گو اس کا تعلق زمانہ نظام شاہیہ سے نہیں ہے۔

اورنگ زیب جب صوبہ دار دکن تھے تو انہوں نے قلعہ ارک بنایا۔ اورنگ آباد نام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ ابتدا میں شہر میں ایک نہر جو ملک عنبر کے زمانہ میں تیار ہوئی تھی جاری تھی۔ بعد ازاں خان جہان۔ اورنگ زیب کے کوکہ نے دوسری نہر تیار کرائی۔ یہ دونوں نہریں شفیق کے زمانہ تک موجود تھیں۔ حضرت آصف جاہ نے ۱۱۴۰ھ میں ان دونوں نہروں کے علاوہ ایک اور نہر لائی۔ پیر شاہ محمود جو مشائخ اورنگ آباد میں سے تھے۔ غربی جانب سے ایک نہر اپنے تکیہ میں لائی۔ جانب جنوب شاہ علی نہری نے بھی اپنے تکیہ میں نہر جاری کی۔ معلمین چوب فروش نے پانچوا پورہ میں جو شہر سے جانب مشرق واقع ہے ایک نہر جاری کی۔

شفیق نے لکھا ہے کہ آصف جاہ کے زمانہ میں فصیل شہر تین لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی۔ مقبرہ رابعہ درانی کے متعلق لکھا ہے کہ اٹھارہ لاکھ روپیہ میں تیار ہوا۔ تو گہنڈہ اور سرائے نو کی عمارتیں ۷۰ ہزار روپے میں تیار ہوئیں۔

مضامین ہر مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک وصول ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ کتابت کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ممکن ہو مضامین صاف خط میں لکھے جائیں تو غلطیوں کا امکان باقی نہ رہے گا۔

درس ماضی و حال

جناب محمد ابرار حسین صاحب ایم، اے

تمہید یہ موضوع نہ صرف اس قابل تھا کہ اس پر تفصیلاً تاریخی و تنقیدی بحث کی جاتی بلکہ ماضی و حال کے درسیات کا ہر پہلو سے تقابل کیا جاتا تاکہ موجودہ زمانہ کے عام "طریق درس" کا جس کو "سسٹم آف ایجوکیشن" کہتے ہیں اور جو نشانہ تنقید بنا ہوا ہے مداوا بھی سامنے آجاتا۔ یہ بالعموم دیکھا اور سنا جارہا ہے کہ بلا استثنار جملہ ماہرین تعلیم موجودہ طریق درس کو ناقص بتارہے ہیں۔ ہر کمیٹی اور ہر کمیشن نے جو اس کی اصلاح کے لئے مقرر کیا گیا۔ موجودہ طریق پر نکتہ چینی کرکے اس کے تغیر کی سفارش کی۔ لیکن تغیر نے عملاً کوئی شکل اب تک اختیار نہیں کی۔ وجوہات کچھ ہوں بہرحال میں یہ ضرور عرض کرونگا کہ ان جماعتوں یا ماہرین تعلیم نے گو تشخیص مرض تو کی مگر تجویز میں پس و پیش ضرور کیا جس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ملک کے درسیات قدیم کی چھان بین نہیں کی بلکہ صرف "بے روزگاری" کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید طریق کے استقام پر درق کے ورق سیاہ کرڈالے۔ اگرچہ بیروزگاری کا نظریہ ایک حد تک صحیح ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت تھی اور ہے کہ درسیات قدیم پر بھی تاریخی نظر ڈالی چاہیئے تھی تاکہ اس سے یہ اندازہ ہوتا کہ ملک کے ضروریات کو محفوظ رکھتے ہوئے قدیم ماہرین تعلیم نے کیا ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جس کے ذریعہ سے تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم ہوتی تھی۔ عام طور پر اب بھی یہی کہا جاتا ہے کہ "تعلیم تعلیم کے خاطر" ہونی چاہیئے لیکن موجودہ حالات اور زمانہ اس کے برعکس سبق دے رہے ہیں۔ البتہ قدیم تاریخیں اس مسلک کا پتہ دیتی ہیں۔ میں اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کرونگا کہ "طریق درس" خواہ ناقص ہو یا نہ ہو لیکن طریقہ تدریس ضرور ناقص ہے جس کی وجہ سے عام طور پر تعلیمی خرابی محسوس ہو رہی ہے اس وجہ سے طریق تدریس و تعلیم تبدیلی کا مطالبہ کررہا ہے۔ جس جگہ میں طریقہ تدریس پر بحث کرونگا۔ وہاں یہ بتاؤں کہ قدیم درس تدریس کیا تھا اور اب کیا ہے اور اس تقابل میں کونسا طریق مرجح ہے مگر

اس موقع پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اچھی تعلیم کا معیار صرف اور صرف یہ ہے کہ تعلیم سے فراغت پانے والے میں افادہ کے استعداد بدرجہ اتم ہونی چاہیئے۔ جسکی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک تدریس یعنی جو علوم کہ اس نے حاصل کئے ہیں اور جس میں اس نے دستگاہ کامل پیدا کی ہے۔ ان کی تعلیم بدرجہ احسن دے سکے۔ جس سے صحیح معنوں میں طالبان علم استفادہ کر سکیں

دوسرے تصنیف قدیم تاریخیں اور تصانیف اس قسم کے افادہ کی زندہ مثالیں ہیں۔ جہاں تک مصنفین اور ان کی تصانیف کا تعلق ہے میں ان میں سے چند مصنفین کے نام مثالاً پیش کرتا ہوں۔

۱۔ چھٹی صدی ہجری میں جامع الکمالات علم علامہ ابن جوزی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ جس کی تصانیف نہ صرف ہر فن میں ہیں بلکہ کامل و مکمل ہیں۔

۲۔ تیسری صدی ہجری کا فیلسوف العرب "یعقوب بن اسحق الکندی" عام طبیعات کا وہ امام تھا کہ جس کی شہادت اس کی تصانیف آج تک دے رہی ہیں۔

۳۔ دوسری صدی ہجری کا امام الکیمیا "جابر بن حیان" اس وقت بھی تمام کیمیا دانوں کا استاد سمجھا جاتا ہے۔ تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ فن کیمیا پر اس کی تصانیف کم و بیش (۵۰۰) تھیں۔ جو آخر میں چنگیزی طوفان کے نذر ہو گئیں۔ قطع نظر ان تصانیف کے "ایڈ" کے جس کو اصطلاح فن میں تیزابہ یا تیزآب کہتے ہیں۔ اکتشاف کا سہرا اس امام کے سر ہے

۴۔ چوتھی صدی ہجری کے امام الاطباء ابوبکر رازی نے "الکحل" دریافت کر کے امام کا لقب پایا۔

۵۔ پانچویں صدی ہجری کے جامع الکمال علم الندیم نے "کتاب الفہرست" لکھ کر موجودہ دنیا کو تشریحی فہرست کے ترتیب کا سبق پڑھایا۔

۶۔ چھٹی صدی ہجری کا امام الادویہ ابن العین طب و ہیئت بالخصوص علم ادویہ کا لاثانی عالم گذرا ہے۔

۷۔ پانچویں صدی ہجری کا امام الاطباء "ابوالقاسم اندلسی" نے علم الجراحت کی تنظیم کر کے جراحی پر وہ احسان کیا جس کا جراحی کی دنیا آج گن مانتی ہے۔

۸۔ ساتویں صدی ہجری کا ماہر نباتیات ابن بیطار نباتیات کا وہ محقق ہوا ہے جس نے

اپنے ذاتی تجربہ اور تحقیقات سے جو اس نے مشرقی ممالک میں بہم کرکیں ۔ (۵۰۰) مزید ادویہ مفردہ کا اضافہ کیا ۔" اور جامع المفردات" تصنیف کرکے طب پر زبردست احسان کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہر پڑھا لکھا نہ تو مدرس ہوسکا اور نہ مصنف لیکن جو مصنف ہوا وہ کامل مصنف ہوا اور جو مدرس بنا وہ کامل مدرس بنا۔ موجودہ زمانہ میں اس خصوصیت کا فقدان ہے ۔ اور اس وجہ سے موجودہ طرز درس و تدریس نشانہ تنقید و تنقیص بنا ہوا ہے۔ بہرحال اگر زمانہ نے فرصت دی تو میں انشاءاللہ اس موضوع پر حتی الامکان تفصیلی بحث کرونگا ۔ جس میں یہ بتاؤنگا کہ مدرس کے لئے کون کونسی شرائط لازم ہیں اور مصنف کی استعداد کا کیا معیار ہونا چاہیئے ۔ مگر اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ مدرس کے لئے متعلم کی نفسیات کا مطالعہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ مقدم ہے ۔ پڑھنا علیحدہ چیز ہے اور پڑھانا یا ذریعہ تصنیف و تالیف افادہ جداگانہ چیز ہے ۔ یہ دونوں چیزیں اگرچہ اکتسابی ہیں لیکن ان کے وہابی ہونے میں شبہ نہیں ہے ۔ سلطان محمود غزنوی کا مستند مورخ ابوریحان البیرونی مرحوم جامع الکمالات عالم تھا نہ صرف فارسی اور عربی کا فاضل تھا بلکہ سنسکرت کا بھی عالم تھا اور جملہ فنون متداولہ میں کامل دستگاہ رکھتا تھا ریاضی میں جو کتاب "قانون مسعودی" کے نام سے اس نے لکھی ہے ۔ وہ کئی ہزار صفحہ کی ہے۔ موجودہ زمانہ کے جملہ مغربی اور مشرقی ریاضی دانوں کا قول ہے کہ "قانون مسعودی" میں ریاضی کے وہ اعلیٰ مسائل البیرونی نے بیان کئے ہیں جن کا سمجھنا اس ترقی کے زمانہ میں بھی آسان نہیں ہے ۔ اسی البیرونی نے ۔ نجومی، دبیر، ادیب وغیرہ کے متعلق بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ جس شخص کے پیدائش کے وقت سہم الغیب (ایک ستارہ) ہوتا ہے وہ شخص اگر طب پڑھتا ہے تو کامل طبیب ہوتا ہے سیاسیات پڑھتا ہے تو کامل سیاست داں ہوتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ نجوم کا یہ وہ حساب ہے جس کو عام طور پر فطری رجحان کہتے ہیں اس لئے اس غرض کا مقصد یہ ہے کہ طبعی رجحان کے اعتبار سے اگر انسان کی تعلیم ہو تو وہ اس علم میں دستگاہ حاصل کرسکتا ہے اور دوسروں کے لئے مفید ہوسکتا ہے ۔ قدیم زمانہ میں رجحان کا کافی لحاظ رکھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ کامل فن دان آدمی پیدا ہوتے تھے ۔ بخلاف زمانہ موجودہ کے کہ ایسا نہیں ہے چنانچہ موجودہ زمانہ کے علما ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ جو تعلیم رائج ہے وہ زیادہ

ادبی تعلیم ہے۔ خواہ وہ اسکولوں کی تعلیم ہو یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باوجود عدم ذوق کے متعلم کو مجبوراً یہی راہ اختیار کرنی پڑی ہے۔ جس میں آخر کار اس کو ناکامی ہوتی ہے۔ پس اگر اس صورت میں وہ افادہ کے لئے آمادہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ افادہ اور استفادہ اس کے لئے بے معنی الفاظ ہونگے۔ جن کو عمل سے دور کا بھی واسطہ ہوگا۔

مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر سردست روشنی نہیں ڈال سکتا ہوں اور نہ تفصیلی تقابل کر سکتا ہوں۔ جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ کچھ عرصہ ناسازی طبع نے مجھے اس کا موقعہ نہیں دیا کہ سابقہ تعلیمی تاریخوں کو تلاش کر کے ان پر پوری پوری نظر ڈال سکوں۔ دوسرے یہ کہ وہ موضوع ہے جو کافی وقت اور کاوش کا متقاضی ہے۔ اس لئے یہ قلیل وقت اور محدود اوراق اس تفصیل کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ان دو وجہوں میں درس ماضی کو سرسری طور پر بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

زمانہ ماضی سے میری مراد وہ زمانہ ہے جب کہ مشرق "مغربیات" سے بے گانہ تھا اور اپنے ہی "آفتاب" سے مستفیض ہو رہا تھا نہ کہ وہ زمانہ جبکہ مغرب "مشرقیات" کا دست نگر تھا اور نہ صرف ایجادات کے مفہوم سے ناآشنا تھا بلکہ علمی اور تمدنی شعاعوں سے بھی بے بہرہ تھا۔

"درس" وہ سہ حرفی لفظ ہے۔ جس کے معنی پڑھنے کے ہیں اس سے "تدریس" ہے جو پڑھانے کے معنے دیتا ہے۔ اس مادہ کے مشتقات مدرسہ۔ مدرس۔ اور متدرس (طالبعلم) ہیں۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ موضوع زیر بحث میں نہ صرف درسیات قدیم و جدید شامل ہیں۔ بلکہ طریق تعلیم و تعلم بھی اس کا جز لائینفک ہے اس اعتبار سے اس عنوان کے حسب ذیل چار ذیلی عنوان اور ہو سکتے ہیں۔

(۱) مدارس قدیم و جدید (۲) درسیات قدیم و جدید (۳) مدرس قدیم و جدید (۴) متعلم قدیم و جدید۔

میں یہاں صرف قدیم درسیات و درسگاہ وغیرہ سے بحث کرونگا۔ جدید عہد کے لوگ جدید سے خود مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

مدارس کے اقسام زمانہ سلف میں مدارس کے دو قسمیں رہیں ایک مکاتب دوسرے

مدارس ۔ مکاتب میں ابتدائی اور ایک حد تک ثانوی تعلیم ہوتی تھی ۔ مدارس میں طالب علم ان مدارج کی تکمیل کرکے داخل ہوتا تھا ۔ اور مختلف فنون و علوم پر عبور حاصل کرکے سند فراغت لیا کرتا تھا ۔ گویا مدارس موجودہ زمانہ کے یونیورسیٹوں کا مرتبہ رکھتے تھے جن کو سند اجازت کا حق حاصل ہوتا تھا ۔ مکاتب میں جہاں تک ہندوستان اور ایران و خراسان کا تعلق تھا ۔ فارسی میں تعلیم ہوتی تھی ۔ کیونکہ حکومتوں اور قوموں کی زبان بھی تھی ۔ ان مکاتب میں بلا استثنار ہر شخص داخل ہوسکتا تھا ۔ تعلیم عام اور صحیح معنوں میں مفت تھی ۔ البتہ یہ تعلیم بلا جبر و اکراہ تھی اسی وجہ سے لفظ بے روزگاری اس زمانہ کی لغات میں نہیں تھا تعلیم کے لئے کوئی قید نہیں تھی ۔ ہر وہ شخص جو تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا وہ زانوئے ادب تہہ کرسکتا تھا ۔ عام از این کہ وہ بچہ ہو ۔ نوجوان ہو ۔ جوان ہو یا بوڑھا ۔ بعض ممالک میں مدارس کے بھی اقسام تھے ۔ یعنی ایک ایک فن کا علیحدہ مدرسہ تھا ۔ جس کو اجمالاً آئندہ بیان کرونگا ۔

مکاتب کے درسیات بھی ملکوں کے ضروریات کے اعتبار سے مقرر تھے ۔ چنانچہ ہندوستان میں جو مکاتب تھے ۔ جس میں ہندو مسلمان دونوں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے وہ ملک کی ضرورت کو بدرجہ اتم پورا کرتے تھے ۔ ہندوؤں کے مذہبی مدارس کے تنظیم کے متعلق میری نظر سے اس وقت تک کوئی کتاب نہیں گذری لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں درسیات کا فقدان تھا بلکہ اس کے برعکس جہاں تک تاریخوں اور آثار قدیم سے پتہ چلتا ہے قطع نظر ادبیات اور مذھبیات کے ان کا فلسفہ اور جوتش کسی حالت میں یونان کے فلسفہ سے کم نہیں تھا ۔ اور یقیناً نجوم اس قوم کا حصہ تھا بہر حال بہ قول مورخین وسط نویں صدی ہجری میں سکندر لودھی کے عہد میں ہندوستان نے اپنے علوم کے علاوہ فارسی کی طرف بھی توجہ کی اور رفتہ رفتہ اس میں اسقدر شغف پیدا کیا کہ نہ صرف فارسی زباندانی بلکہ ادبیت میں بھی وہ دستگاہ حاصل کی کہ مستند شاعر اور مصنف بنے ۔ فارسی میں تاریخیں لکھیں ۔ افسانے لکھے ۔ دیوان لکھے ۔ لغات لکھیں ۔ تذکرہ لکھے ۔ قواعد لکھے ۔ یہی وہ علوم تھے جو اس زمانہ میں متداول تھے ۔ تفصیل کا یہ محل نہیں ۔ ورنہ فن واران کی تصانیف بھی بیان کرتا ۔ (باقی آئندہ)

اساتذہ کی یاد میں

قدیم طالب علم

تقریباً نصف صدی... سے پہلے دارالعلوم کی تعلیمی فضاء میں جب آنکھ کھولی تو دنیا ہی نئی نظر آئی اور خود درس اولین علاوہ الف خالی - ب - کے نیچے ایک نقطہ - زبر اوپر - زیر نیچے - پیش کا منہ ٹیڑھا - تشدید کے تین دندانے جزم گول دائرہ جب ۱۵ سالہ تعلیمی دور منشی عالم پنجاب کا ختم کیا تو مادر دارالعلوم نے اپنی تربیت آغوش سے جدا ہو کے للحیات کے کشمکش میں یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔

مدتیں گذریں زمانہ ہوگیا

کچھ مٹا مٹا سا نقش ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں کن کن اساتذہ نے مرہم پٹی کی اور کن کن بزرگوں نے جا و بیجا سختیاں کیں - البتہ یاد ہے -

۱۔ مولوی احمد حسین خانصاحب خوشنویس - جنکی دست شکن بید کے داغ ابھی تک ہاتھوں میں نمایاں ہیں - اور یاد ہیں بچپن کی خوشنما اور ہر دل عزیز چیزیں استعمال یا بچے کے ضابطہ میں خوشنویس صاحب کے صندوق میں محبوس ہو جاتیں اور ہم بادل ناخواستہ مغموم و محزون صبر کر لیا کرتے ہاں اس کا صلہ یہ ضرور ملا کہ لکھنے میں ہاتھ اتنک بے راہ نہ ہوا اور ج کا سر ڈیڑھ نکتہ میں کبھی فرق نہ آیا۔

۲۔ یہ دیکھئے مولوی سید مصطفےٰ صاحب قادری ہیں گداز جسم - بھاری بہ کم - رعب داب کے مالک - یہ راہ نجات پڑھا کر عاقبت کی دشواریوں کو آسان بنانے والے - جوں ہی جماعت میں داخل ہوئے روح میں ارتعاش پیدا ہونے لگا - دعائیں مانگی جاتیں کہ خداوندا گھنٹہ جلد ختم ہو - یا اچانک انکے سر میں درد ہونے لگے - مگر آج تک کبھی درد نہ ہوا اور گھنٹہ دو دو گھنٹہ ہی کا رہنے لگا - انکے لرزاں تیر ساں کیونکہ ضرب حیدری سے بڑے بڑے سرکش کانپ جاتے تھے مگر نہ جانے کیوں یہ حقیر بے خوف و خطر تھا شائد حضرت قبلہ گاہ کا شرف نیازمندی کارفرما ہو۔

۳۔ ملاحظہ ہو مولوی سید صدرالدین صاحب کو نحیف و لاغر پیوروں کی ڈالی ہے جو ہوا میں نشو و نما پا رہی ہے مگر دماغ ہے کہ زبردست سنداں تب ہی تو انکے ذمہ ریاضی اور اقلیدس - جیسے فولادی چنے تھے لیکن وہ ان کو اس سلیقہ سے نرم بناتے تھے کہ طلبا بلا بغیر کسی دشواری کے چبا جاتے اور ایسے کو رمغز

بھی تھے کہ مجبوراً انکی بید لڑکوں کی تواضع پر آمادہ ہوجاتی اور تب کہیں زاویہ قائمہ بناتی چلی جاتی۔ مگر ہماری حالت یہ تھی کہ آج تک بھی، الف، کو مرکز مان کر باپ، کی، دوری پر دائرہ ج، کھینچنا نہ آیا۔

۴۔ خاموش رہئیے مولوی خواجہ شرف الدین صاحب تشریف لا رہے ہیں اور دیوان حافظ سے یہ

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا ؛ کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

کا درس دینگے اور کبھی، کنار آب رکنا باد و گل گشت مصلیٰ را، کی سیر کرائیں گے اور کبھی، بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید، کا فلسفہ سمجھائینگے۔ باوجود اس قدر موشگافیوں کے وہ عشق جو اول آساں نا دکھائی دیا در حقیقت انتہائی مشکل ہی ثابت ہوا اور آخر کار یہی کہنا پڑا سہ

خبرم نیست کہ منزل گہ مقصود کجا است ؛ ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

۵۔ نگاہ بیرقدم مولوی غلام محی الدین صاحب عمامہ بہ سر، جبہ در بر، پوپلا منہ، پریشان بال۔ گویا فکریں سے ابھی چھٹکارا نصیب ہوا ہے فارسی برائے نام پڑھاتے تھے۔ جہاں لڑکوں نے شور کیا چپڑا ابن خاتون کو بیدار کرنے کیلئے ایستادہ۔ جہاں کسی طالب علم نے غلطی کی، واہ بے گدھے خان، کا خطاب عطا ہوا۔ انکی جماعت۔ جماعت نہ ہوتی بلکہ بنچوں پر استادہ ایک فوج ہے کہ کمانڈر کے حکم پر کٹ مرنے کیلئے تیار۔

۶۔ ادب سے بیٹھیے کہ خضر صورت مقدس سیرت مولوی عبد الحی صاحب کی زیارت نصیب ہونیوالی ہے انکے ذمہ فقہ کا درس تھا۔ دینیات کا پتارہ بغل میں۔ عمامہ کے نیچے سفید کنٹوپ۔ چمڑے کے موزے گلے میں قرآن شریف حمائل۔ گویا ایک مرتاض راہب ہے جس کو خدا نے آخری تلقین کے لئے ہم جیسے گنہگاروں کو گمراہ پڑ جانے بھجوایا ہے۔

۷۔ خزاں دیدہ چمن میں از سر نو بہار آئے گی۔ بلبل اپنا نغمہ سنائے گی۔ کیونکہ مولوی جمال علی صاحب جیسے شگفتہ ہستی آنے والی ہے نہ چہرہ پہ اجسم، خاموش انسان لیکن جب بولنے پر آئیں تو بلبل چہکنا بھول جائے نہر اپنی روانی بھول جائے۔ پژمردہ پھول تازہ ہو جائے۔ جہاں جماعت میں داخل ہوئے لڑکوں کے چہروں پر تازگی آگئی۔ کسی نے پان پیش کیا۔ کسی نے سگریٹ۔ وہ ایک کش لے۔ کچھ ستایا اور پھر ہاں کہی اور ایک لڑکے نے شروع کیا۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید ؛ گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

سمجھ لیجئے کہ مرغزار کشمیر آنکھوں کے سامنے۔ نہریں بہ رہی ہیں۔ آبشار گر رہی ہیں۔ پھول شگفتہ ہو رہے ہیں بات سے بات پیدا ہو رہی ہے، اکبری عہد اس کے رتن کی داستانیں چھڑی ہوئی ہیں۔ عرفی اور جہانگیر کے

تذکار۔ شعرا کی دلچسپیاں ۔ ابوالفضل اور فیضی عرفی کے نوک جھونک کہ یادت کے بہانہ فیضی کا استفسار کہ "ماکیانیم" ۔ حالت نزع میں عرفی کا جواب "مرغ دل پروازی کند تاکیان راچہ کار"، پر عروض کا درس شروع ہوا ۔ قافیہ ردیف کی بحث ۔ شعر کی موزونیت بحور اور اوزان ۔ تقطیع کا طریقہ شعر موزوں کرنے کا مشورہ اور پھر اسی سلسلہ میں شعری لطائف ۔

ایک شاگرد استاد کے مشورہ پر عمل کرکے باغ پہنچا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پر بیٹھا ہوا دماغ کے دروازے کھولے کہ کوئی شعر موزوں ہو جائے ۔ سامنے ایک سانپ آکر ناچنے لگا ۔ شاعر نے فی البدیہ شعر عرض کر دیا ۔

اک مار سیاہ دیدم افتشہ زنی کرد ۔ چوں دید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بگریخت

اگلے دن استاد کو آکر سنایا کہ قبلہ کس قدر برجستہ اور موزوں شعر ہوا ہے اجازت ہو تو عرض کروں ۔ نہایت خیانت سے مسکراتا ہوا سنایا ۔ اک مار سیاہ دیدم افتشہ ترقی کرد، استاد نے داد دی "بہ بہ خوب گفتی" ہاں تو دوسرا مصرعہ : ۔

چوں دید بگریخت ۔

استاد ۔ ارے میاں یہ تو بڑا ہی جھول کھا گیا ۔

شاگرد ۔ چونکہ سانپ بھاگ گیا تھا اسلئے یہ رعایت اس میں رکھی گئی ہے ۔

اور ایسا ہی لطیفہ سنئے : ۔ درخت دیدم گنا ۔ قل اعوذ برتیا ۔ ملکنا ۔ الاشیا ۔

دوسرا مصرعہ تو دس قدم آگے ہو گیا ہے ۔ قبلہ ۔ نے شکر ہی چونکہ لانبی ہوتی ہے اسلئے شاعرانہ مناسبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تقطیع میں بھی یہی رعایت رکھی ہے ۔ بہرحال لطائف اور ظرافت کے پیرایہ میں ایسے ایسے حقائق کے موتی پروتے کہ بے پڑھا بھی پڑھا سیکھ جائے ۔ یہی تعلیم تھی اور اس کا صدقہ کہ شعر کہنے کی آج بھی صلاحیت موجود ہے ۔ مگر تقطیع پر قادر نہو سکے اور ہمیشہ

بحر خیر میں ڈال کے بحر رمل چلے

کی عادت ہو گئی ہے لیکن یاد رکھیئے کہ : ۔

شعر می گویم بہ از آب حیات   من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

(۷) ایک منحنی ہستی جو محض پوست و استخواں ہے ۔ سر پر دیو گزی عمامہ اور جسم پر سہ گزی شیروانی ۔ یہ مولوی معین الدین صاحب ہیں ۔ جنکی ہر ادا فضیلت کا سبق دیتی ۔ ہاتھ میں "الف نعمہ ساکنہ نعل میں دحاسہ" پڑھاتے اس انداز میں کہ ہر لفظ زبان سے نکل کر دل و دماغ میں نقش کا آئینہ بن جاتا ۔ طالب علم

ایک ایک لفظ کو اپنی پلکوں سے اوٹھاتا اور تھوڑی دیر میں دامن کو پھولوں سے بھر دیتا جو کبھی مرجھانے کا نام نہیں لینگے۔

۹۔ اگر آپ مولوی وجیہ الدین صاحب کو نہ جانیں تو آپ دنیا ہی سے واقف نہ ہونگے۔ قدیم وضع کی ترکی ٹوپی سفید شیروانی۔ چہریرا بدن۔ اماین رشیں۔ ریاضی اور فلسفہ کے فاضل انگریزی میں سب کچھ جس کا خواہ مخواہ ادب کرنے کو جی چاہے۔ رعب کا یہ عالم کہ تمام اسکول آنکھ ملاکر بات کرنے سے گھبراتے حالانکہ یہ فرصت کے اوقات میں ہمارے بزرگوں کے ساتھ تاش و گنجفہ اڑاتے اور پتنگ کے پیچ لڑاتے اور ہم سے اسقدر بے تکلف اور پر مذاق باتیں کرتے کہ گویا ہمارے ہم عمر ہیں اور جہاں اسکول میں ملتے اتنے بے رخ رہتے جیسے جانتے ہی نہیں۔

ان میں اور مولوی معین الدین صاحب میں، بڑا ہی یارانہ تھا یہ ان سے عربی پڑھتے اور وہ انہیں انگریزی سکھاتے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے مولوی معین الدین انگریزی میں کامل ہوگئے اور یہ عربی کے فاضل اور ہم بدھو کے بدھو ہی رہ گئے۔

باوجود اساتذہ کی اس سختیوں اور محبتوں کے اسکول جانا کبھی ترک نہ کیا۔ کیونکہ اس بیرخیوں اور ان تلخیوں میں بھی علم کی ایک سچی تڑپ رہتی تھی کہ طالب علم کچھ سیکھ جائے۔

یہ ہیں۔ وہ ہستیاں جو انسان کو ملائک اور جانوروں کو انسان بنانے والی۔ خدا انکے مزاروں پر نور کی بارش برسائے جنہوں نے ہم سے جانوروں کو بھی اشرف المخلوقات کے زمرہ میں شریک کر دیا اور جینے اور زندگی بسر کرنے کے گر سکھا گئے۔

نوٹ :۔ آپ خریدار ہیں تو چندہ وقت پر ادا کیجئے۔ ملازم کو بار بار گردش دینے کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ اگر آپ کو آیندہ خریداری منظور نہیں تو جواب دینے میں کیوں تامل ہے۔

یہی حال وی۔ پی کا ہے ایک مہینہ قبل چندہ ختم ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے اور دوسرے مہینہ پرچہ وی۔ پی جاتا ہے۔ باوجود علم و اطلاع کے وی۔ پی واپس کرکے دفتر کو نقصان پہونچانے میں کیا آپکو لطف آتا ہے۔

بھی تھے کہ مجبوراً انکی بید لڑکوں کی تواضع پر آمادہ ہوجاتی اور تب کہیں زاویہ قائمہ بناتی چلی جاتی ۔ مگر ہماری حالت یہ تھی کہ آج تک بھی "الف" کو مرکز مان کر "ب" کی دوری پر دائرہ "ج" کھینچ نہ آیا ۔

۴ ۔ خاموش ۔ بیٹھے مولوی خواجہ شرف الدین صاحب تشریف لا رہے ہیں اور دیوان حافظ سے یہ

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا ۔ کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

کا درس دینگے اور کبھی "کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلی را" کی سیر کرائیں گے اور کبھی "بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" کا فلسفہ سمجھائینگے ۔ باوجود اس قدر موشگافیوں کے وہ عشق جو اول آسان سا دکھائی دیا در حقیقت انتہائی مشکل ہی ثابت ہوا اور آخر کار یہی کہنا پڑا سے

خبرم نیست کہ منزل گہ مقصود کجاست ۔ ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

۵ ۔ نگاہ بر قدم مولوی غلام محی الدین صاحب عمامہ بر سر ۔ جبہ در بر ۔ پوپلا منہ ۔ پریشان بال ۔ گویا فکر دین سے ابھی چھٹکارا نصیب ہوا ہے فارسی برائے نام پڑھاتے تھے ۔ جہاں لڑکوں نے شور کیا تیزی ان غافلوں کو بیدار کرنے کیلئے ایستادہ ۔ جہاں کسی طالب علم نے غلطی کی ، واہ بے گدھے خان ، کا خطاب عطا ہوا ۔ انکی جماعت ۔ جماعت نہ ہوتی بلکہ بچوں پر استادہ ایک فوج ہے کہ کمانڈر کے حکم پر کٹ مرنے کے لئے تیار ہے ۔

۶ ۔ ادب سے بیٹھے کہ خوش صورت مقدس سیرت مولوی عبدالحی صاحب کی زیارت نصیب ہونیوالی ہے انکے ذمہ تعزیہ کا درس تھا ۔ دینیات کا پشتارہ بنے ہیں ۔ عمامہ کے نیچے سفید کنٹوپ ۔ چمڑے کے موزے گلے میں قرآن شریف حمائل ۔ گویا ایک مرتاض راہب ہے جس کو خدا نے آخری تلقین کے لئے ہم جیسے گنہگاروں کو کلمہ پڑھانے بھجوایا ہے ۔

۷ ۔ خزاں دیدہ چمن میں از سر نو بہار آئے گی ۔ بلبل اپنا نغمہ سنائے گی ۔ کیونکہ مولوی جمال علی صاحب جیسے شگفتہ ہستی آنے والے ہے نہ چہرہ نہ جسم ۔ خاموش انسان لیکن جب بولنے پر آئیں تو بلبل چہکنا چھوڑ دے نہر اپنی روانی بھول جائے ۔ پژمردہ پھول تازہ ہو جائے ۔ جہاں جماعت میں داخل ہوئے لڑکوں کے چہروں پر تازگی آگئی ۔ کسی نے پان پیش کیا کسی نے سگریٹ ۔ وہ ایک کش لے ۔ کچھ مسکرایا اور پھر ان کی اور ایک لڑکے نے شروع کیا ۔

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر در آید ۔ گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

سمجھ لیجئے کہ مرغزار کشمیر آنکھوں کے سامنے ۔ نہریں بہہ رہی ہیں ۔ آبشار گر رہے ہیں ۔ پھول شگفتہ ہو رہے ہیں بات سے بات پیدا ہورہی ہے ، اکبر کا عہد اور اس کے رتن کی داستانیں چھڑی ہوئی ہیں ۔ عرفی اور جہانگیر کے

تذکار۔ شعرا کی دلچسپیاں۔ ابوالفضل اور فیضی عرفیؔ کے نوک جھونک کرنے یا درت کے بہانہ فیضی کا استفسار کہ "ما کیانیم"۔ حالت نزع میں عرفیؔ کا جواب "مرغ دل پرواز می کند تا کیان را چہ کار"، پر عروض کا درس شروع ہوا۔ قافیہ، ردیف کی بحث۔ شعر کی موزونیت بحور اور اوزان۔ تقطیع کا طریقہ۔ شعر موزوں کرنے کا مشورہ اور پھر اسی سلسلہ میں شعری لطائف۔

ایک شاگرد استاد کے مشورہ پر عمل کرکے باغ پہنچا اور اونچے ٹیلہ پر بیٹھا ہوا دماغ کے دروازے کھولے کہ کوئی شعر موزوں ہو جائے۔ سامنے ایک سانپ آکر ناچنے لگا۔ شاعر نے فی البدیہ شعر عرض کر دیا۔

اک مار سیاہ دید مرا فتنہ زنی کرد۔ چوں دید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بگریخت

اگرچہ استاد کو آکر سنایا کہ قبلہ کس قدر برجستہ اور موزوں شعر ہوا ہے اجازت ہو تو عرض کروں۔ نہایت خوبانہ منہ سے مسکراتا ہوا سنایا۔ اک مار سیاہ دید مرا فتنہ ترقی کرد، استاد نے داد دی "بہ خوب گفتی"، ہاں تو دوسرا مصرعہ:۔

چوں دید بگریخت:۔

استاد۔ ارے میاں یہ تو بڑا ہی جھول کیا!۔

شاگرد۔ چونکہ سانپ بھاگ گیا تھا اس لئے یہ رعایت اس میں رکھی گئی ہے۔

اور ایسا ہی لطیفہ سنئے:۔ درخت دیدم گنا۔ فس عود بر نیا۔ عکنا۔ الانبا۔

دوسرا مصرعہ تو دس قدم آگے ہو گیا ہے۔ قبلہ۔ نے نشا۔ ہی چونکہ لانبی ہوتی ہے اسلئے شاعرانہ مناسبات کو بھی نظر رکھنا ہے۔ تقطیع میں کچی یہی رعایت رکھی ہے۔ بہرحال لطائف اور ظرافت کے پیرایہ میں ایسے ایسے حقائق کے موتی پرو دئے کہ بے پڑھا بھی پڑھا سیکھ جائے۔ یہی تعلیم تھی اور اس کا صدقہ کہ شعر کہنے کی آج بھی صلاحیت موجود ہے۔ مگر تقطیع پر قادر نہ ہو سکے اور ہمیشہ۔

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

کی عادت ہو گئی ہے لیکن یاد رکھئے کہ:۔

شعری گویم بہ از آب حیات — من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

(۲) ایک منحنی ہستی جو محض پوست استخواں ہے۔ سر پہ دیوبند کی عمامہ اور جسم پہ سرگزی شیروانی۔ یہ مولوی شمس الدین صاحب ہیں۔ جنکے ہر ادا فضیلت کا سبق دیتی۔ ہاتھ میں، ان کے ہاتھ میں رسالہ، پڑھانے اس انداز میں کہ ہر لفظ زبان سے نکل کر دل و دماغ میں نقش کا آئینہ بن جاتا۔ طالب علم

ایک ایک لفظ کو اپنی پلکوں سے اٹھاتا اور تھوڑی دیر میں دامن کو پھولوں سے بھر لیتا جیسے جی مرجھانے کا نام نہیں لیں گے۔

۹۔ اگر آپ مولوی وجیہ الدین صاحب کو نہ جانیں تو آپ دنیا ہی سے واقف نہ ہونگے۔ قدیم وضع کی ترکی ٹوپی، سفید شیروانی، چھریرا بدن، اٹالین رنگ، ریاضی اور فلسفہ کے فاضل، انگریزی میں سب کچھ، جن کا خواہ مخواہ ادب کرنے کو جی چاہے۔ عجب کا یہ عالم کہ تمام اسکول آنکھ ملا کر بات کرنے سے گھبراتے حالانکہ یہ فرصت کے اوقات میں ہمارے بزرگوں کے ساتھ تاش و گنجفہ اڑاتے اور پتنگ کے پیچ لڑاتے اور ہم سے اسقدر بے تکلف اور پرمذاق باتیں کرتے کہ گویا ہمارے ہم عمر ہیں اور جہاں اسکول میں ملتے اتنے بے رخ رہتے جیسے جانتے ہی نہیں۔
ان میں اور مولوی معین الدین صاحب میں، بڑا ہی یارانہ تھا یہ ان سے عربی پڑھتے اور وہ انہیں انگریزی سکھاتے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے مولوی معین الدین انگریزی میں کامل ہوگئے اور یہ عربی کے فاضل اور ہم بدھو کے بدھو ہی رہ گئے۔
باوجود اساتذہ کے اس سختیوں اور محبتوں کے اسکول جانا کبھی ترک نہ کیا کیونکہ اس بیرخیوں اور ان تلخیوں میں بھی علم کی ایک سچی تڑپ رہتی تھی کہ طالب علم کچھ سیکھ جائے۔
یہ ہیں وہ ہستیاں جو انسان کو ملائک اور جانوروں کو انسان بنانے والی۔ خدا انکے مزاروں پر نور کی بارش برسائے جنہوں نے ہم سے ناداروں کو بھی اشرف المخلوقات کے زمرہ میں شریک کر دیا اور جینے اور زندگی بسر کرنے کے گر سکھا گئے۔

نوٹ:۔ آپ خریدار ہیں تو چندہ وقت پر ادا کیجئے۔ ملازم کو بار بار گردش دینے کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ اگر آپ کو آئندہ خریداری منظور نہیں تو جواب دینے میں کیا تامل ہے۔
یہی حال وی۔ پی کا ہے ایک مہینہ قبل چندہ ختم ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے اور دوسرے مہینہ پرچہ وی۔ پی۔ کیا جاتا ہے۔ باوجود علم و اطلاع کے وی، پی واپس کر کے دفتر کو نقصان پہونچانے میں کیا آپکو لطف آتا ہے۔

ہائے اردو

جناب عطارد صاحب

تو جاہلوں میں پیدا ہوئی۔ ادیبوں اور شاعروں میں پلی پروان چڑھی تجھ سے کسی کو بیر نہ تھا۔ ہندو تجھ پر فدا مسلمان تیرے گرویدہ۔ کبھی کسی نے یہ بھی نہ بتایا کہ تو ہندوؤں کی زبان ہے۔ یا مسلمانوں کی کیونکہ تیری پرورش اور نگہداشت میں دونوں برابر کے سہیم و شریک رہے۔ ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے بھی تیری پرداخت و نگہداشت میں کوتاہی نہ کی مگر بدقسمتی سے جب دفتری زبان انگریزی قرار پائی تو مدارس میں عربی، فارسی کی تعلیم میں انحطاط شروع ہوا، ادب اردو سے ناآشنائی بڑھنے لگی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آج ادیب و شاعر کی طرح صحیح اور با محاورہ اردو لکھنے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں دوسری زبان کے الفاظ اصلی حالت میں یا بہ تغیر شامل نہ ہوں۔ بین القومی تعلقات جیسے جیسے بڑھتے گئے زبان میں بھی نئے نئے الفاظ شریک ہونے لگے چنانچہ اردو میں بھی فارسی عربی الفاظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ آج ان کو خارج کرنا اردو کے حسین اور دلکش چہرے کو داغدار کرنا ہے البتہ غیر مانوس الفاظ کا استعمال پسندیدہ نہیں۔ لیکن عربی فارسی سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ کثیر الاستعمال الفاظ جنکو کسی وقت جہلا بھی ذی علم اصحاب کے فیض صحبت سے صحیح طور پر استعمال کرتے تھے۔ آج تعلیمیافتہ اصحاب ان کے استعمال میں فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر ع کوئی لیتا نہیں سرکار یہ کیا۔ افسوس نہ وہ لوگ رہے۔ اور نہ وہ صحبت رہی آج ہر لکھا پڑھا بزعم خود ارسطوئے زماں ہے۔

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار ایک واقعہ یاد آگیا۔ حیدرآباد میں ابتدا تو ترویج تعلیم کے مدنظر یہ حکم ہوا کہ مڈل کامیاب اشخاص ہی کو دفاتر تحصیلات میں ([illegible]) تک کی جائدادوں پر مامور کیا جائے دیہات کے باشندے بھی حصول ملازمت کے شوق میں تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ اسی اثنا میں ایک موضع کے مڈل کامیاب پولیس پٹیل نے درخواست روانہ کی کہ قریبی رشتہ دار کی شادی ہے جس کی شرکت کے لیے فلاں تاریخ سے بنگرانی مقدم مالی دو ہفتہ کی رخصت عطا فرمائی جائے۔

تحصیلدار صاحب نے درخواست منظور کی۔ اہلکار متعلقہ کی غفلت سے حکم جاری نہ ہوا تو دوسری درخواست بدیں مضمون وصول ہوئی "شادی کی تاریخ قریب ہے۔ اتبک رخصت منظور نہیں فرمائی گئی، لہذا بامید منظوری راہی ملک عدم ہو رہا ہوں"۔ بیچارہ کسی کو کہتے سن لیا تھا طرز گفتگو سے سمجھ گیا کہ اس جملہ کے معنے اچلے جانے کے ہیں۔ "ملک عدم" کسی شہر یا مقام کا نام ہوگا۔ بس اسی مفروضہ پر استعمال شروع کر دیا۔ اس غریب نے تو صرف مڈل ہی تک تعلیم اور جہلا کی صحبت میں پرورش پائی لیکن تعجب اس کا ہے کہ آج بعض تعلیمیافتہ نوجوان بھی اردو نظم و نثر میں اسی قسم کی مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ میرے اس بیان کو غلط یا مبالغہ قرار دیں۔ اجازت ہو تو بلا اظہار نام کسی کی تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ عبرت کے لئے چند نمونے بھی پیش کر دوں جو موقر اخبارات اور ادبی رسالہ جات سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی قومی زبان عربی ہے یا فارسی۔ ہندوستان آکر انہوں نے ہندوں کے میل، ملاپ سے اردو سیکھی یا ایجاد کی۔ مگر یہ بدبختی دیکھئے کہ اب ہم اوس سے لاپروا اور ہندو اوسکے مخالف ہونے لگے۔ سیاست کی دیوی نے قومی تصورات ہی بدل دئے۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب زبان اردو کو ہندوستان کے طول و عرض سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اب یہ طے فرمایا ہے کہ پاکستان ہو خواہ ہندوستان دونوں جگہ اردو نہیں ہندوستانی زبان کو رواج دیا ہے۔ سمجھا آپ نے ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں یہ وہی زبان ہے جو گزشتہ چند ماہ سے آپ روزآنہ آل انڈیا ریڈیو سے سماعت فرماتے ہوئے کانوں میں انگلیاں رکھہ دیتے ہیں۔ تجویز یہ منظور ہوئی ہے کہ زبان اردو سے عام فہم کثیر الاستعمال فارسی عربی الفاظ کو بھی خارج کرکے ان کی عوض سنسکرت کے الفاظ بھرے اور رکھے جائیں۔ عرصہ سے ہندی پرچار کے جو ادارے سرگرم عمل ہیں انکو ہدایت ہوئی ہے کہ نہایت دلدہی سے اس فرض کی انجام دہی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔ البتہ فارسی حروف تہجی کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ قوم پرست مسلمانوں پر یہ بھی ایک بڑا احسان ہے۔ حالانکہ بعض، برادران وطن تو اس کے بھی روادار نہیں کیونکہ اس سے اسلام کی بو آتی ہے۔ گاندھی جی کے حکم کی تعمیل تو ہوتی رہے گی۔ ہماری بے حسی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

اخبار میں آپ نے دیکھا یا سنا ہوگا کہ لندن میں مسلمانوں نے پاکستان کی مسرت میں ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں سفرائے دول اور وزرائے ملک کے علاوہ ایک انگریز کیمرج

یونیورسٹی کے فارسی عربی کے پروفیسر بھی مدعو تھے ۔ ڈنر کے ختم پر تقریریں ہوئیں ۔ سفراء نے ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے عالم وجود میں آنے پر مبارک بادیں دیں ۔ لیکن پروفیسر صاحب نے مراسم تہنیت پر ہی اکتفا نہیں کیا ۔ بلکہ یہ امید بھی ظاہر فرمائی کہ پاکستان کی وجہ اردو جیسی ہر دل عزیز شیریں زبان کے ادب کی خاطر خواہ ترقی بھی ہوگی ۔ ایک انگریز پروفیسر کی زبان سے ادب اردو کی رگ حمیت میں اضطراب پیدا نہ ہوگا ؟ افسوس ہندوستان کی سیاست اور حصول اقتدار کی ہوس کیسے کیسے گل کھلا رہی ہے ۔ مگر ہماری چشم بصیرت خیرہ ہوگئی ۔ ہمیں کچھ نہیں سوجھتا ۔

معاف فرمایئے کہنا کیا چاہتا تھا اور کہہ کیا رہا ہوں یہ جملہ معترضہ سہی مگر ہے اسی زنجیر کی ایک جدا نہ ہونے والی کڑی مجھے افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب کے قلم سے نکلے ہوئے غلط جملوں اور لفظوں کو پیش کرنے میں بہت دیر تک آپکو انتظار کی زحمت ہوئی ۔ لیجئے بغور ملاحظہ فرمایئے ۔

(۱) عمارتوں پر گراں بہا رقم صرف فرمائی " بہا بمعنے قیمت ۔ گراں بہا بیش قیمت یا بھاری قیمت رقم کی صفت گراں بہا صحیح نہیں ہے ۔

(۲) تاریخ کے جویا دن نے اس عہد کا تاریخی مواد فراہم کیا " جویا کے معنے ہیں ڈھونڈنے والا اول تو یہاں جمع کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جو اسم بطور تنکیر استعمال کیا جاتا ہے ۔ وہ واحد اور جمع دونوں میں یکساں مستعمل ہوتا ہے اگر جمع ہی استعمال کرنا منظور تھا تو فارسی ترکیب سے ، جوینیدگان تاریخ ، لکھتے بہرحال " تاریخ کے جویادن " صحیح نہیں ۔

(۳) " ہمارا قرآن شریف اور اسکی تفسیر خدا کے وجود کا پراپیگنڈہ ہے " کیا کسی تعلیم یافتہ مسلمان کے قلم سے یہ الفاظ نکل سکتے ہیں ۔ کیا قرآن شریف کا مقصد صرف خدا کے وجود کی تشہیر ہی ہے اور کچھ بھی نہیں ۔

(۴) وہ منظر نہایت قابل دید اور دلکش تھا ۔ جبکہ ایک جانب نعمتوں کے خوان یغما سے چیزیں چنی گئی تھیں ۔ دوسری جانب آسمان علم و فضل کے درخشاں ستارے اپنی رنگا رنگیوں اور بوقلمیوں سے محفل کو آراستہ کئے ہوئے تھے ۔ یہ ایک اٹ ہوم کی تعریف ہے ۔ یغما کے معنے لوٹ اور غارت کے ہیں ۔ مجازاً عام لنگر کو بھی کہتے ہیں ۔ جہاں بلا دعوت غرباً کو کھانا دیا جاتا ہے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے یہاں جو اٹ ہوم ہوتا اوسکو لنگر خانہ یا سدابرت سے موسوم کرنا تعجب خیز ہے ۔ قطع نظر اس کے درخشاں ستارے اپنی رنگا رنگی اور بوقلمیوں سے محفل کو آراستہ کرنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے اس رنگا رنگی اور بوقلمی سے ذہن کسی اور طرف منتقل ہوتا ۔

(۵) "مایوسی مسکراتی ہوئی نظر آئی" مایوسی کا مسکرانا نئی بات ہے غرض مایوسی مسکرائے یا ان الفاظ پہ کوئی قہقہہ لگائے۔ مگر ہے قطعاً غلط اور بے معنی

(۶) بجز اور سوائے ان امور کے کیا مہمل فقرہ ہے بجز اور سوا مترادف الفاظ ہیں مگر یہاں بجز کی تکرار اضافت کے لئے ہے۔ اضافت کے بعد لفظ "کے" کا اضافہ محض غلط ہے سوا ان امور کے کہہ سکتے ہیں "سوائے ان امور کے غلط ہے۔

(۷) اگرچہ کافی مقدار میں پیشگی قبل از یں فراہم کی گئی تھی۔ مگر خرابی پانی کی وجہ سے ادسکو روزانہ غیر متوقع زائد مقدار میں صرف کرنا پڑا" کیا آپ نے کیسی پاکیزہ گنگا جمنی اردو ہے "خرابی پانی" لکھ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ورنہ پانی کی خرابی کہتے تو کس قدر طوالت ہوتی۔ افسوس ہم کو اس کا بھی علم نہیں کہ فارسی اردو میں اضافت ناجائز ہے۔

(۸) "انجمن بیوپاریان گوشت" — "خوش خبری برائے بیوپاریان تیل کھوپرہ بلدہ و اضلاع" "انتناع آنا برائے صابون سازی" دل چاہتا ہے کہ ان جملوں کو بار بار پڑھا جائے۔ "بیوپاریان تیل کھوپرہ" کیا چست فقرہ ہے۔ اردو لفظ کی اضافت فارسی کے ساتھ یا فارسی لفظ کی اضافت اردو کے ساتھ صحیح ہو یا نہ ہو جب تعلیم یافتہ اصحاب کے قلم سے اس کا رواج ہو رہا ہے تو اعتراض کا کیا محل ہے۔

(۹) "حسب ذیل مخلوعہ جائدادوں کی پیری کے لئے امیدواران کی ضرورت ہے" مخلوعہ بے معنی لفظ ہے۔ صحیح لفظ مخلیٰ یا مخلوع ہے لیکن آج تعلیم یافتہ دبیر تعلیم یافتہ بیک لکھتے ہیں کسی نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی اس جملہ میں "پیری" کا لفظ قابل ملاحظہ ہے۔ جائدادوں کی پیری کے لئے امیدواران کی ضرورت ہے" کیا بامحاورہ جملہ ہے۔ بار بار پڑھئے اور داد دیجئے۔

(۱۰) "خود ہی استفادہ حاصل کیا ہے" استفادہ کے معنی ہیں فائدہ حاصل کرنا ہے اسلئے استفادہ حاصل کرنا محض غلط ہے۔

(۱۱) "کپڑا سربراہ کرنے کا نیا انتظام کیا جائے گا" لفظ سربراہ اسم فاعل ترکیبی ہے جسکے معنی ہیں سربراہی کرنے والا یا منتظم، مگر آج کل اس لفظ کا استعمال عجیب و غریب طرح ہو رہا ہے جو بالکل غلط ہے۔

فہرست بہت طویل ہے لیکن پند بر دیوار نوشتہ سے عبرت حاصل کرنے والے کے لئے یہ بھی بہت ہے۔

ہائے اردو

جناب عطارد صاحب

تو جاہلوں میں پیدا ہوئی۔ ادیبوں اور شاعروں میں پلی پروان چڑھی تجھ سے کسی کو بیر نہ تھا۔ ہندو تجھ پر فدا مسلمان ترے گرویدہ کبھی کسی نے یہ بھی نہ بتایا کہ تو ہندوؤں کی زبان ہے۔ یا مسلمانوں کی کیونکہ تری پرورش اور نگہداشت میں دونوں برابر کے سہیم و شریک رہے۔ ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے بھی تیری پرداخت و نگہداشت میں کوتاہی نہ کی۔ مگر بدقسمتی سے جب دفتری زبان انگریزی قرار پائی تو مدارس میں عربی، فارسی کی تعلیم میں انحطاط شروع ہوا۔ اور اردو سے ناآشنائی بڑھنے لگی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آج ادیب و شاعر ایک طرف صحیح اور بامحاورہ اردو لکھنے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں دوسری زبان کے الفاظ اصلی حالت میں یا بہ تغیر شامل نہ ہوں۔ بین الاقوامی تعلقات جیسے جیسے بڑھتے گئے زبان میں بھی نئے نئے الفاظ شریک ہونے لگے چنانچہ اردو میں بھی فارسی عربی الفاظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ آج اونکو خارج کرنا اوسکے حسین اور دلکش چہرے کو داغدار کرنا ہے البتہ غیر مانوس الفاظ کا استعمال پسندیدہ نہیں۔ لیکن عربی فارسی سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ کثیر الاستعمال الفاظ جنکو کسی وقت جہلا بھی ذی علم اصحاب کے فیض صحبت سے صحیح طور پر استعمال کرتے تھے۔ آج تعلیمیافتہ اصحاب اون کے استعمال میں فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ مگر ع کوئی کہتا نہیں سرکار یہ کیا۔ افسوس نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ صحبت رہی آج ہر لکھا پڑھا بزعم خود ارسطوئے زماں ہے۔

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار ایک واقعہ یاد آگیا۔ حیدرآباد میں ابتداً توسیع تعلیم کے مدنظر یہ حکم تھا کہ مڈل کامیاب اشخاص ہی کو دفاتر تحصیلات میں (۵۰روپے) تک کی جائداد پر مامور کیا جائے دیہات کے باشندے بجز حصول ملازمت کے شوق میں تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ کسی تعلقہ میں ایک موضع کے مڈل کامیاب پولیس پٹیل نے درخواست روانہ کی کہ قریبی رشتہ دار کی شادی ہے جس کی شرکت کے لئے فلاں تاریخ سے۔ نگرانی مقدم مالی دو ہفتہ کی رخصت عطا فرمائی جائے۔

تحصیلدار صاحب نے درخواست منظور کی۔ اہلکار متعلقہ کی غفلت سے حکم جاری نہ ہوا تو دوسری درخواست بدیں مضمون وصول ہوئی "شادی کی تاریخ قریب ہے۔ اتبک رخصت منظور نہیں فرمائی گئی، لہذا بامید منظوری راہی ملک عدم ہو رہا ہوں"۔ بیچارہ کسی کو کہتے سن لیا تھا طرز گفتگو سے سمجھ گیا کہ اس جملہ کے معنے اچھے جانے کے ہیں۔ "ملک عدم" کسی شہر یا مقام کا نام ہوگا۔ بس اسی مفروضہ پر استعمال شروع کر دیا۔ اس غریب نے تو صرف مڈل ہی تک تعلیم اور جہلا کی صحبت میں پرورش پائی لیکن تعجب اس کا ہے کہ آج بعض تعلیمیافتہ نوجوان بھی اردو نظم و نثر میں اسی قسم کی مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ میرے اس بیان کو غلط یا مبالغہ قرار دیں۔ اجازت ہو تو بلا اظہار نام کسی کی تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ عبرت کے لئے چند نمونے بھی پیش کر دوں جو موقر اخبارات اور ادبی رسالہ جات سے انتخاب کئے گئے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی قومی زبان عربی ہے یا فارسی۔ ہندوستان آکر انہوں نے ہندؤں کے میل ملاپ سے اردو سیکھی یا ایجاد کی۔ مگر یہ بدبختی دیکھئے کہ اب ہم اوس سے لاپروا اور ہندو اوسکے مخالف ہونے لگے۔ سیاست کی دیوی نے قومی تصورات ہی بدل دئے۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب زبان اردو کو ہندوستان کے طول و عرض سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اب یہ طے فرمایا ہے کہ پاکستان ہو خواہ ہندوستان دونوں جگہ اردو نہیں ہندوستانی زبان کو رواج دیا ہے۔ سمجھا آپ نے ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں یہ وہی زبان ہے جو گزشتہ چند ماہ سے آپ روزانہ آل انڈیا ریڈیو سے سماعت فرماتے ہوئے کانوں میں انگلیاں رکھ دیتے ہیں۔ تجویز یہ منظور ہوئی ہے کہ زبان اردو سے عام فہم کثیر الاستعمال فارسی عربی الفاظ کو بھی خارج کر کے ان کی عوض سنسکرت کے الفاظ بولے اور لکھے جائیں۔ عرصے سے ہندی پرچار کے جو ادارے سرگرم عمل ہیں انکو ہدایت ہوئی ہے کہ نہایت دلدہی سے اس فرض کی انجام دہی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔ البتہ فارسی حروف تہجی کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ قوم پرست مسلمانوں پر یہ بھی ایک بڑا احسان ہے۔ حالانکہ بعض برادران وطن تو اس کے بھی روادار نہیں کیونکہ اس سے اسلام کی بو آتی ہے۔ گاندھی جی کے حکم کی تعمیل تو ہوتی رہے گی۔ ہماری بے حسی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

اخبار میں آپ نے دیکھا یا سنا ہوگا کہ لندن میں مسلمانوں نے پاکستان کی مسرت میں ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں سفرائے دول اور وزرائے ملک کے علاوہ ایک انگریز کیمرج

یونیورسٹی کے فارسی عربی کے پروفیسر بھی مدعو تھے ۔ ڈنر کے ختم پر تقریریں ہوئیں ۔ سفراء نے ہندوستان
کی آزادی اور پاکستان کے عالم وجود میں آنے پر مبارک بادیں دیں ۔ لیکن پروفیسر صاحب نے
مراسم تہنیت پر ہی اکتفا نہیں کیا ۔ بلکہ یہ امید بھی ظاہر فرمائی کہ پاکستان کی وجہ اردو جیسی ہر دل عزیز
شیریں زبان کے ادب کی خاطر خواہ ترقی بھی ہوگی ۔ ایک انگریز پروفیسر کی زبان سے ادب اردو
کی رگ حمیت میں اضطراب پیدا نہ ہوگا ؟ افسوس ہندوستان کی سیاست اور حصول اقتدار کی ہوس
کیسے کیسے گل کھلا رہی ہے ۔ مگر ہماری چشم بصیرت خیرہ ہوگئی ۔ ہمیں کچھ نہیں سوجھتا ۔

معاف فرمائیے کہنا کیا چاہتا تھا اور کہہ کیا رہا ہوں یہ جملہ معترضہ بھی نکر ہے اسی زنجیر کی ایک جدا نہ ہونے
والی کڑی مجھے افسوس ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب کے قلم سے نکلے ہوئے غلط جملوں اور لفظوں کو پیش کرنے
میں بہت دیر تک آپکو انتظار کی زحمت ہوئی ۔ لیجئے بطور ملاحظہ فرمائیے ۔

(۱) عمارتوں پر گراں بہا رقم صرف فرمائی ،، بہا بمعنے قیمت گراں بہا بمعنی قیمتی یا بھاری قیمت رقم
کی صفت گراں بہا صحیح نہیں ہے ۔

(۲) تاریخ کے جویاؤں نے اس عہد کا تاریخی مواد فراہم کیا ،، جویا کے معنے ہیں ڈھونڈنے والا
اول تو یہاں جمع کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جو اسم بطور تنکیر استعمال کیا جاتا ہے ۔ وہ
واحد اور جمع دونوں میں یکساں مستعمل ہوتا ہے اگر جمع ہی استعمال کرنا منظور تھا تو فارسی ترکیب سے ،
جویندگان تاریخ ، لکھتے بہر حال ،، تاریخ کے جویاؤں ،، صحیح نہیں ۔

(۳) ,, ہمارا قرآن شریف اور اسکی تفسیر خدا کے وجود کا پراپیگنڈہ ہے ،، کیا کسی تعلیم یافتہ مسلمان
کے قلم سے یہ الفاظ نکل سکتے ہیں ۔ کیا قرآن شریف کا مقصد صرف خدا کے وجود کی تشہیر ہی ہے اور
کچھ بھی نہیں ۔

(۴) وہ منظر نہایت قابل دید اور دلکش تھا ۔ جبکہ ایک جانب نعمتوں کے خوان یغما سے چیزیں چنی
گئی تھیں ۔ دوسری جانب آسمان علم وفضل کے درخشاں ستارے اپنی رنگا رنگیوں اور بوقلمیوں سے
محفل کو آراستہ کئے ہوئے تھے ۔ یہ ایک اٹ ہوم کی تعریف ہے ۔ یغما کے معنے لوٹ اور غارت کے
ہیں ۔ مجازاً عام لنگر کو بھی کہتے ہیں ۔ جہاں بلا دعوت غربا کو کھانا دیا جاتا ہے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے یہاں
جو اٹ ہوم ہوتا اوسکو لنگر خانہ یا سدا برت سے موسوم کرنا تعجب خیز ہے ۔ قطع نظر اس کے وہ علم وفضل
کے درخشاں ستارے اپنی رنگا رنگی اور بوقلمیوں سے محفل کو آراستہ کرنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے اس
رنگا رنگی اور بوقلمی سے ذہن کسی اور طرف منتقل ہوتا ۔

(۵) "مایوسی مسکراتی ہوئی نظر آئی" مایوسی کا مسکرانا نئی بات ہے غرض مایوسی مسکرائے یا ان الفاظ پر کوئی قہقہہ لگائے۔ مگر ہے قطعاً غلط اور بے معنے

(۶) بجز اور سوائے ان امور کے کیا مہمل فقرہ ہے بجز اور سوا مترادف الفاظ ہیں مگر یہاں تحتاً اضافت کے لئے ہے۔ اضافت کے بعد لفظ "کے" کا اضافہ غلط ہے سوا ان امور کے کہہ سکتے ہیں "سوائے ان امور کے غلط ہے۔

(۷) اگرچہ کافی مقدار میں پیشگی قبل ازیں فراہم کر لی گئی تھی۔ مگر خرابی پانی کی وجہ سے اس کو روزانہ غیر متوقع زاید مقدار میں خرچ کرنا پڑا" دیکھا آپ نے کیسی پاکیزہ گنگا جمنی اردو ہے "خرابی پانی" لکھ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ورنہ پانی کی خرابی کہتے تو کس قدر طوالت ہوتی۔ افسوس ہم کو اس کا بھی علم نہیں کہ فارسی اردو میں اضافت ناجائز ہے۔

(۸) "انجمن بیوپاریان گوشت" — "خوش خبری برائے بیوپاریان تیل کھوپرہ بلدہ و اضلاع" "انتفاع آنا برغرض صابون سازی" دل چاہتا ہے کہ ان جملوں کو بار بار پڑھا جائے۔ "بیوپاریان تیل کھوپرہ" کیا چست فقرہ ہے۔ اردو لفظ کی اضافت فارسی کے ساتھ یا فارسی لفظ کی اضافت اردو کے ساتھ صحیح ہو یا نہ ہو جب تعلیم یافتہ اصحاب کے قلم سے اس کا رواج ہو رہا ہے تو اعتراض کا کیا محل ہے۔

(۹) "حسب ذیل مخلوعہ جائدادوں کی بیری کے لئے امیدواران کی ضرورت ہے" مخلوعہ بے معنے لفظ ہے۔ صحیح لفظ مخلی یا مخلوعہ ہے لیکن آج تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ سب لکھتے ہیں کسی نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی اس جملہ میں "بیری" کا لفظ قابل ملاحظہ ہے۔ "جائدادوں کی بیری کے لئے امیدواران کی ضرورت ہے" کیا بامحاورہ جملہ ہے۔ بار بار پڑھئے اور داد دیجئے۔

(۱۰) "خود ہی استفادہ حاصل کیا ہے" استفادہ کے معنی ہیں فائدہ حاصل کرنا ہے اسلئے استفادہ حاصل کرنا محض غلط ہے۔

(۱۱) "کپڑا سربراہ کرنے کا نیا انتظام کیا جائے گا" لفظ سربراہ اسم فاعل ترکیبی ہے جسکے معنی ہیں سربراہی کرنے والا یا منتظم، مگر آج کل اس لفظ کا استعمال عجیب و غریب طرح ہو رہا ہے جو بالکل غلط ہے۔

فہرست بہت طویل ہے لیکن پند بر دیوار نوشتہ سے عبرت حاصل کرنے والے کے لئے یہ بھی بہت ہے۔

آج کی بات

کو آپ اہمیت نہیں دیتے ۔ تیر کمان سے ۔ پانی نہر سے ۔ بات زبان سے ۔ نکل جائے تو پھر اسکو قابو میں لانا ناممکن ہے ۔ بات زبان سے نکلی جھنڈے چڑھی ۔ تیر کمان سے چلا کسی کو مجروح کیا پانی نہر سے بہا تلاطم پیدا ہو گیا ۔

بندہ نواز ۔ آپکی نصیحت سر آنکھوں پر ۔ لیکن اتنا تو بتا دیں :۔

بقدر بہر تو ضبط کر لیا ہوں پہ کیا کروں :: منہ سے نکل ہی جاتی ہے بات پیار کی

آج کی بات کو فراموش کرنے کا آپ مشورہ دیتے ہیں اور میری کل جس عالم میں گذرے گی اس کی بھی کچھ خبر ہے ؟ آج کی بات کو اسلئے چھوڑ دوں تاکہ :۔

ایک دن اور قیامت بھی کہیں آ جائیگی :: اور کیا عرض کروں آپ سے کیا کیا ہوگا

اسلئے آج اور کل میں امتیاز ہونا چاہیئے ۔

قبلہ حاجات میں تو آج ہی کی بات پر مستقل ہوں اور کل کی بات :: آپکو اصرار ہے لیکن یہ تو فرمائیے ۔

کل کی خبر ہے کس کو چھٹ جائے یا باقی رہے :: آنا جو یہ لہو کا دم قاتل میں ہے ۔

ایسے اتفاقات بار بار آنے لگے ہیں ۔ آج کی بات کو کل پہ اٹھا رکھوں ۔ میری طاقت سے باہر ہے اسلئے میری گذارشات پر توجہ فرمائیے ۔ ذرا سنئے تو ۔ ایک میکدہ بدوش نکلسن کیا کہتا ہے ۔

وہ بادۂ رنگین وہ ساقی جو ردِ غم کو الامان کرے :: جو ماضی و مستقبل کے وہم و شک کا انتقال کرے

بس آج کا اپنا سودا ہے سے سودا ، یہ فردا ہے :: معلوم نہیں کل ہو نہ ہو کہ تو نہ بہ ہر ایک پیالہ کرے

نوٹ ۔ اکثر حضرات سے جب یہ اطلاع ملتی ہے کہ پرچہ نہیں ملا تو بڑی کوفت ہوتی ہے ۔ حالانکہ بارہا عرض کیا گیا ہے کہ نہایت احتیاط سے پرچہ روانہ کیا جاتا ہے ۔ تاہم نہ ملے تو اندرون ۱۵ تاریخ مکرر طلب کرلیں ۔ لیکن آپ توجہ نہیں کرتے ۔ اور یہ شکایت ہمارے بس کی نہیں ۔

جزاک اللہ

آپ پابند ہوں تو پھر شکایت کا موقع باقی نہ رہے گا ۔

مغلیہ دور میں باغوں کی اہمیت

جناب محمد سید علی رضا صاحب

سرسبز و شاداب باغوں کا نام سنتے ہی انسان جھوم اٹھتا ہے اس کے دل و دماغ میں کیف و سرور کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے اور وہ اپنے آپ کو عیش و نشاط کی مستی پر فضا دنیا میں پاتا ہے جہاں پر رنگا رنگ کے پھول کھلے ہوتے ہیں اور باد بہاری کی اٹھکھیلوں پرندوں کی نغمہ سرائیوں اور چاندنی راتوں کی نزہت بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

باغات کی ابتدائی تاریخ

آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے باغ ہی میں قیام کیا تھا۔ شداد نے جزیرۃ العرب میں ایک ایسا دلکش باغ تعمیر کیا کہ گویا روئے زمین پر آسمانی جنت کا نقشہ کھینچ گیا۔ ہندوستان میں پھولوں اور پھلوں کی کاشت کا سلسلہ تاریخ کے ابتدائی زمانہ سے چلا آتا ہے ہم کو بودھی علم و فنون اور سنسکرت کے ڈراموں میں باغوں کے حوالے جابجا ملیں گے۔ شروع شروع بے شمار درخت بودھ مٹھوں کے اطراف و اکناف لگائے جاتے تھے۔ لیکن باغوں کی صحیح شکل و صورت اس وقت نمودار ہوئی جبکہ مغل بادشاہوں نے ایران و وسط ایشیا کی گھاٹیوں سے بادل کی طرح امنڈ کر آئے اور ہندوستان جیسے زرخیز میدانوں پر ان کے علوم و فنون کی بارش ہونے لگی۔ افغانوں نے اپنے فن تعمیر کا ذوق قلعوں کی تعمیر اور مسجدوں کی تعمیر پر ظاہر کیا۔ لیکن پھر بھی وہ زیادہ توجہ باغوں کی طرف نہ موڑ سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا زیادہ تر زمانہ جنگ و جدال کی مصروفیتوں میں گزرا۔ البتہ فیروز شاہ کے عہد میں ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء تک چونکہ ہندوستان میں نسبتاً امن و امان کا دور دورہ تھا۔ اس لئے فیروز آباد (دہلی) کے اردگرد تقریباً ایک سو باغات لگائے گئے۔ دو صدیوں کے بعد ۱۵۲۶ء میں جیسے ہی بابر نے ہندوستان میں فاتحانہ قدم رکھے۔ جمنا کے کنارے شاہی باغات کے علاوہ ایک اور باغ بھی تعمیر کیا۔ جس کا نام "رام باغ" تھا اس زمانہ میں ہندوستان کا پہلا مغلیہ باغ تھا۔

شاہی چار باغ

ہندوستان میں مغلیہ باغبانی کی تاریخ کا آغاز شہنشاہ بابر کی آمد سے شروع ہوا۔ اگرچہ کہ بابر

نے اپنی عمر کے (۴۷) سال جنگ وجدل میں صرف کئے۔ لیکن تزک بابری میں جگہ جگہ باغوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے غم انگیز بادلوں میں بھی اسے پھولوں پھلوں کی مسرت افزا چمک دمک دکھائی دیتی رہی۔ چنانچہ دوران جنگ میں وہ جہاں بھی جاتا قسم قسم کے پھولوں اور پرندوں سے اسکی نظر اوجھل نہ ہونے پاتی۔ ایک دفعہ وہ افغانستان کی پہاڑیوں میں سے گذر رہا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ وادیوں میں قسم قسم کے لالہ پھول اگے ہیں۔ جس وقت اس نے شمار کرنے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ (۳۲) بتیس اقسام کے لالہ ہیں۔ چنانچہ بابر خود کہتا ہے کہ ایک لالہ کی خوشبو گلاب سے ملتی جلتی تھی۔ اسلئے میں نے اسے گل ولالہ کا نام دیا یہ پھول صرف میدان شیخ میں ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد سمرقند کے باغات کا بابر تفصیلی ذکر کرتا ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بابر کو بچپن ہی سے باغبانی کا شوق تھا۔ ۱۵۲۶ء میں جب اس نے شمالی ہند کو فتح کیا تو آگرہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور یہاں آکر پہلا کام یہ کیا کہ "ہشت بہشت" چار باغ کی داغ بیل ڈالی۔

سکندرہ کا باغ۔

آگرہ سے ساڑھے پانچ میل کے فاصلہ پر شمال کی جانب سکندرہ ہے جہاں اکبر مدفون ہے۔ مقبرہ کے اطراف ایک دیوار ہے اور چاروں طرف کونوں میں تالاب ہیں۔ جن میں چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعے پانی آتا تھا۔ مقبرہ کی طرز تعمیر میں زیادہ تر ہندو ہی اور چینی آرٹ کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ یہ مقبرہ خود اکبر نے بنوایا تھا۔ آگرہ دہلی اور لاہور کے ارد گرد کئی مقبرے یا ان کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔ اس زمانہ میں مغل شہزادوں کا یہ دستور تھا کہ شہر سے باہر تفریح گاہیں بنوا لیتے جو بعد ازاں ان کے مقبروں کا کام دیتے۔ عام طور پر بارہ دری اس مقصد کے لئے مخصوص تھی کہ مالک کے انتقال کر جانے کے بعد اس کی تدفین اسی بارہ دری میں عمل آتی۔ پھول اور پھل فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اکبر کو ۱۵۵۶ء تک بھی باغات سے کافی دلچسپی تھی۔ لیکن اتنی نہیں جتنی کہ اس کے دادا بابر یا پوتے جہانگیر کو تھی۔ اکبر "آئین اکبری" میں لکھتا ہے کہ شہنشاہ کے نزدیک پودے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں۔

روضۂ تاج محل کا باغ

عام طور پر مغلیہ دور میں مقبرہ باغات کے وسط میں بنایا جاتا تھا۔ لیکن تاج محل کا نمونہ اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ وسط میں بجائے مقبرہ کے سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا تالاب ہے۔ جس کے چاروں طرف گھاس کے چوکور میدان اور روشیں ہیں۔ شاہجہاں نے تاج محل کو بناتے وقت روایات پارینہ سے کیوں انحراف کیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ دریا کے کنارے ایک چٹان تھی جس پر یہ

مقبرہ استوار کرکے منظر کی سحر آفرینی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شاہجہاں دریا کے دوسرے ساحل پر ایک اور تاج محل اپنے لئے بنوانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ دونوں تاج محلوں کو دریا کے پل کے ذریعہ سے آپس میں ملا دیا جائے، اور بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ بادشاہ اس مقبرہ کو ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے تاج محل دریا کے اونچے مقام پر بنایا گیا کہ اس کے برآمدے میں سے نظر آتا ہے۔ آخری عمر میں چونکہ شاہجہاں اس برآمدے میں لیٹا رہتا تھا اس سے یہ خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

توزک جہانگیری اور باغات

جہانگیر اپنی کتاب "توزک جہانگیری" میں باغات کا ذکر کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ میں نے آگرہ کے ایک بابری باغ میں سپاری کا ایک درخت دیکھا جو تقریباً نوے فٹ تھا۔ اکبر کے مقبرہ میں صنوبر سرو، سپاری اور چنار کے درخت لگائے گئے ہیں۔ جہانگیر ہندوستان کے جن مشہور شہروں میں گیا۔ وہاں اس نے باغات کی داغ بیل ڈالی وہ خود اپنی کتاب میں بیان کرتا ہے کہ میں نے ایک باغ دیکھا جس میں آم کے سو پیڑ تھے ایک اور موقع پر اس نے نگینہ باغ کی سیر کی جس میں لال لال پکے ہوئے انگوروں کے گچھے عجیب بہار دے رہے تھے۔ احمد آباد میں وہ ایک چھوٹے سے باغیچے میں پہنچا۔ جہاں کی انجیریں بڑی مزیدار تھیں۔ علاوہ ازیں اس نے یہاں سرخ گلاب ناشپاتی وغیرہ کے درخت دیکھے۔

انگوری باغ

آگرہ کے قلعہ میں بے شمار باغات تھے۔ آگرہ اور لاہور کے باغات کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کیلئے ندیوں اور نہروں کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ ہر جگہ باغوں میں فوارے اپنے قوت کیا نہ زور دکھاتے تھے اور پھولوں کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا کرتا تھا باغات میں درخت لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ درخت ایسے لگائے جاتے جس سے منظر کی دلکشی میں فرق نہ آنے پاتا۔ حوضوں میں چھوٹی مچھلیاں بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ باغ خاص محل کے سامنے ہے اور اس کے تین طرف راستے ہیں۔ یہ باغ خاص بیگمات کے لئے بنایا گیا تھا اس کے عین وسط میں ایک چبوترہ ہے جس میں ایک تالاب بنا دیا گیا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہاں پتھر کی "جعفری" بھی تھی جس پر انگور کی بیلیں، چڑھائی گئی تھیں اور غالباً اسی وجہ سے اس کا نام انگوری باغ رکھا گیا۔ انگوری بیلوں کے نقش ونگار کی نسبت کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں زرکثیر کے صرفہ سے بنوایا تھا۔

دہلی کے باغات

اب آگرہ کے باغات کو چھوڑ کر دہلی کے باغات کی طرف آئیے۔ مغلوں کے زمانے میں اس دارالسلطنت کا نام "شاہجہاں آباد" تھا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ مشرق کے اس عظیم الشان شہر میں لال قلعہ سے چاندنی چوک تک باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ لیکن افسوس ان مقامات پر عمارتیں ٹراموے وغیرہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ شاہجہاں آباد کے جنوب میں دریا کے قریب "مقبرہ ہمایوں" واقع ہے جس کے ساتھ ایک باغ بھی ہے اس کی وسعت تیرا ایکڑ مربع زمین ہے ابھی کچھ کچھ آثار باقی ہیں اس باغ کے کونہ میں ایک برج بنا ہوا ہے اس باغ کے دیکھنے سے مغلیہ باغوں کا عمومی نقشہ معلوم ہو سکتا ہے۔ ہمایوں کے مقبرہ اور رگھائی کے درمیان صفدر جنگ کا مقبرہ ہے جو ہمایوں کے وفات کے بعد تقریباً دو سو برس بعد ۱۷۵۴ء میں تیار ہوا۔ اس باغ کے مرکز میں ایک مقبرہ اور چار نہریں بھی ہیں جو باغ کے سیراب کرنے کے علاوہ بارہ دریوں کو بھی پانی مہیا کرتی ہیں یہ باغ کسی زمانے میں عمدہ میوہ جات کے درختوں سے بھرپور تھا۔

دہلی کا شالامار باغ

مقبروں کے پائیں باغات کے علاوہ دہلی میں ایک مشہور باغ بھی تھا جس کو "شالامار باغ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اکثر مورخین اور سیاحوں نے اس باغ کا ذکر کیا ہے لیکن اب اس کے آثار بہت کچھ ختم ہو چکے ہیں۔ اس باغ کو عزیز النساء بیگم شاہجہاں" نے شالامار باغ کشمیر کے نمونے پر تعمیر کروایا تھا۔ اس زمانے کے مشہور مورخ محمد صالح نے اس باغ کا تفصیل سے ذکر شاہجہاں نامہ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس باغ کا رقبہ تین سو مربع گز تھا اور اس کی دیواریں اونچی تھیں۔ پہلی منزل دوسری کی بہ نسبت (۹) فٹ بلند تھی۔ دونوں کے درمیان تین سو فٹ لمبی اور ۲۰۰ چوڑی ایک نہر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس باغ کو تعمیر کرنے کے لئے دو لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ اسی باغ میں اورنگ زیب کی رسم تاج پوشی منائی گئی۔

روشن آرا باغ

سبزی باغ کے مغرب میں "روشن آرا" باغ ہے۔ یہ باغ روشن آرا بیگم شاہجہاں کی بیٹی نے بنوایا تھا۔ جو ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ جہاں آرا بیگم کو اسی باغ میں دفن کیا گیا تھا اس باغ کو دہلی کے اور باغات سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

تبصرہ

رباعیات عمر خیام ۔ ترجمہ محشر نقوی ۔ ایم ۔ اے ۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب مصور ۔ انگریزی اردو ٹائٹل سہ رنگی ۔ ایک سو ایک رباعی قیمت (۲؎) دفتر "شہاب" حیدرآباد دکن

ہندوستان میں جوں جوں انگریزی کا مذاق بڑھتا گیا ۔ ہمارے نوجوانوں میں فارسی اردو کا ذوق گھٹتا گیا اور حالت اس نوبت پہونچ گئی کہ وہ اپنی مقدس کتاب کے مطالب کو بھی انگریزی کے ذریعہ سمجھنے کے مرض میں مبتلا ہوتے گئے ۔ اس انقلاب ذہنی میں کیا توقع تھی کہ عربی، فارسی اور اردو کے لٹریچر میں اپنی صلاحیتیں وقعت کرتے کیونکہ ان کے استاد یورپ نے جس کو اچھا کہا وہی لائق تقلید اور قابل پرستش ۔ حالانکہ عربی اور فارسی کے ایسے بیش بہا ذخائر ات میں جو منظم کوشش کے طالب ہیں ۔ چونکہ یورپ نے توجہ نہیں کی اس لئے اور ان کے قابل احترام مقلدوں نے قابل اعتنا نہ سمجھا ۔

یہی حال رباعیات عمر خیام ، کا ہے اور اب تک اردو میں بیسیوں ترجمے ہو چکے ہیں ۔ لیکن کسی تعلیم یافتہ فرد نے توجہ نہیں کی ۔ مگر جب یورپ کے فٹز جیرلڈ نے ان رباعیوں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تو ان نوجوانوں میں خیام کے فلسفہ کو سمجھنے کا ذوق بڑھتا گیا چونکہ اس ترجمہ کی محدود جلدیں شائع ہوئی تھیں ۔ بہت کم حضرات کو میسر آسکیں اس ذوق کو دیکھکر یورپ میں دوسرے حضرات نے بھی ترجمے پیش کئے ۔ اور ہمارا نوجوان تب کہیں واقف ہوا کہ خیام بھی کوئی شاعر ، حکیم ، فلسفی گذرا ہے ۔

یہ ایک تلخ حقیقت بھی ہے کہ ہماری اردو طباعت ایک ایسے دور سے گذر رہی ہے کہ جس میں عرصہ تک طور پر طباعت اور کتابت کے گلے پر کند چھری پھیری جا رہی ہے ۔ جس میں نہ کوئی حسن ہوتا ہے اور نہ نفاست کیونکہ مولف اور مرتب کے پیش نظر یہ خیال ہے کہ اخراجات کم ہوں اور فائدہ زیادہ یہی وجہ ہے کہ انکی جانب توجہ کرنے میں نوجوانوں کو پس و پیش ہوتا ہے ۔ چیز چاہے کیسی ہو اگر نفاست اور نزاکت کے ساتھ پیش کی جائے تو وہ نگاہوں کو جذب کرنے میں حیرت انگیز کام کرتی ہے ۔

انہیں خرابیوں کو دور کرنے اور انہیں جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کیلئے محشر نقوی کی یہ سعی قابل صد ہزار ستائش ہے کہ رباعیات کا مجموعہ انتہائی حسن و نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان پڑھ بھی دیکھکر بے اختیار للچائے ۔

اب تک تو خیام کے تراجم فارسی سے اردو اور انگریزی میں ہوتے رہے لیکن محشر نقوی نے یہ جدت کی ہے کہ فٹز جرلڈ کے انگریزی ترجمہ سے اردو آیا ہے اگرچہ اس سعی میں رباعی کے وزن سے بغاوت کرنی پڑی۔ لیکن ایک ایسی مترنم بحر میں رباعیات کہی گئی ہیں کہ نغمۂ خیام اور بلند آہنگ ہو گیا ہے ہر صفحہ پر انگریزی کے دوش بدوش اردو رباعی بھی لکھ دی گئی ہے کہ تقابل میں آسانیوں اور دشواریوں کا اندازہ ہو سکے۔ اگر ان دونوں زبانوں کے ساتھ خیام کی فارسی رباعیاں بھی ہوتیں تو بیسٹے سہ آتشہ ہو جاتی۔ لیکن اس مئی کو صرف دو پیمانوں میں پیش کیا ہے۔ وہ بھی ہمارے سرشار کرنے کے لئے بہت کچھ کافی ہے۔ پہلی رباعی کو یوں مصور کیا گیا ہے :۔

ایک خاتون محو خواب ناز ہے اور شفق کی رنگینیوں سے ایک فرشتہ اعلان کر رہا ہے۔

اٹھ جاگ کہ خورشید خاور وہ چرخ بریں کا خسرو بڑا تاریکی شب کی چادر کو اک آن میں کر پارہ پارہ

ہر برگ شجر ہر بام و در کو نور کا پہنا کر زیور یہ مشرق کی مہم کو سر کر کے اجرام فلک کو دے مارا

غرض تمام رباعیاں اسی بحر میں ہیں پڑھتے جائیے طبیعت سیر نہ ہو۔

تخیلات تمنا

جی عبد الصمد صاحب تمنا۔ عمر آبادی

میری نظر کے سامنے حسن جو بے نقاب تھا	دہر کا ذرہ ذرہ یوں رشک آفتاب تھا
میری نگاہ شوق ہی اصل میں پردہ دار تھی	جلوۂ حسن کیلئے ورنہ کہاں حجاب تھا
دیدۂ تر نے کر دیا عشق کے راز کو عیاں	ورنہ کہا سوال تھا اور کہاں جواب تھا
بجھ نہ سکی یہ تشنگی جلوۂ رنگ سے کبھی	میری نظر کے سامنے سارا جہاں سراب تھا
ہو سکے کس طرح سے حل راز حقیقت و مجاز	حسرت زدہ نگاہ میں عالم حسن خواب تھا
شوخی برق طور کیا ایک تجلی نقاب	اس سے بھی شوخ تر وہاں اصل میں پیچ و تاب تھا

صدقے نگاہ ناز کے کچھ تو سکون ہوا نصیب

ورنہ تمنا دل مرا حاصل اضطراب تھا

ٹوٹے ہوئے ستارے

۱۔س۔ا ایسے مضامین ہی مفید ہو سکتے ہیں۔ جنکی بنیاد مشاہدہ پر ہو۔ لیکن کتنے ہیں جو متاثر ہوکر غریبوں کے دکھ درد پر روئیں اور انکی چارہ سازیوں پر آمادہ ہوں۔ کاش ایسا ہوتا۔

۲۔ف۔ تغافل ہی اگر شیوہ اخلاق ہے تو کوئی شکایت نہیں۔ لیکن خاموشی بھی تو تغافل ہی میں شامل ہے۔ آپکو اپنے تغافل پسندی سے انکار ہے مگر:۔

ہم نے دیکھی ہے اوائل تری دیوانگی ؛ دیکھیں جیب و گریباں کی کچھ پہنچتا تھا

۳۔ میں اگر نہ لکھوں تو بھلا ممنون یاد فرمائیگی کیوں نہ کی جاؤں؟ یہ دھوپ چھاؤں حسب ضرورت بھی خوب ہے۔ لیکن جانتے ہیں آپ اس عرصہ میں مجھ پر کیسی کیسی مصیبت گذر گئی اور مقدر کی پیہم گردش نے کسی قابل نہ رکھا۔ اسی روز افزوں مصیبت میں پھنس کر اگر میں نہ لکھ سکی تو بھلا آپکو کیا غرض کہ پرسش حال کر لیتے۔

سات آٹھ مہینہ جس پریشانی میں کٹے ہیں، اللہ جانتا ہے۔ ابا جان کے انتقال کا زخم ابھی ہرا ہی تھا کہ ہماری چاہنے والی امی طویل اور روح گسل علالت کے بعد ہم لوگوں کو بے کسی اور بے بسی میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ قسمت کی گردش نے کس قدر جلد ماں باپ کی بے بہا نعمت اور محبت بھری گود سے محروم کر دیا۔ ہائے بسمل صاحب دلکو بہلانے کے لئے ہزاروں فریب کئے۔ لیکن کسی طرح تسلی نہیں ہوتی۔ دیوانوں کی سی حالت ہے اور زندگی ناقابل برداشت بوجھ:۔

موت کی تصویر اور اتنی ؛ زندگی کا خواب اور ایسا گراں

کاش انسان اس قدر بے بس نہ ہوتا۔"

آپ کے اس پیہم صدمہ میں دلی ہمدردی ہے لیکن یہ دنیا جائے آزمائش اور صبر ہے زمانہ خود بخود یہ زخم چنگا کرتا جائیگا ورنہ:۔ عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال ۔ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن۔

۴۔ فاطمہ لزیں۔ ایک عرصہ سے خیریت معلوم نہیں ہوئی کئی خطوط تقدیم خدمت کئے جا چکے ہیں۔ جس الکہیں آپ ہوں اپنی خیریت سے مطلع کیجئے۔ جن پریشانیوں میں آجکل ہم مبتلا ہیں وہاں دوستوں اور عزیزوں کی خیریت کی عدم اطلاع نہایت تشویش کن رہتی ہے۔

دل کا بننا سہل نہیں ہے!

جہاں بانو - ام - اے

ہاں ویسے تو ہمارے جاوید بھائی ہر فن مولا ہیں کوئی کام ان سے لیجیے بیچارے ہر شخص کی ہر دیرینہ آرزو کو پورا کر دینگے ــ نفی، تو ان کے ذہن کے لیے بنی ہی نہیں کسی دشمن کا بھی کوئی کام ہو اس حسن و خوبی سے اس کو انجام دینگے کہ وہ زمین میں گڑ جائے شرمندگی و ندامت سے۔ ایسی نفاست سے کوئی چیز بنائینگے کہ آپ بس دیکھتے ہی رہجائینگے ۔ دیوبندی پر جیسے ان کی حکومت ہے اور اس بنانے بگاڑنے کے سلسلہ میں جو خط وکتابت ان سے اور صاحب معاملہ سے ہوتی ہے۔

وہ اپنی ایک الگ ادیبانہ شان رکھتے ہیں فن کار تو جیسے ان کے ہاتھ کے کھلونے ہیں جس سے جو چاہا بنوا دیا اب میں کیا کیا بتاؤں بے شمار سی اشیا، انہوں نے بنوا کر دی ہیں انوکھے انوکھے روپ میں جدت طرازی اور حسن مذاق کے بہترین مرقعے۔ جو مانی۔ اور بہزاد کو شرمادیں۔

نظر بد نہ لگے تمہیں میرے بھیا کو۔ اللہ کرے بقیامت تک سلامت رہیں جاوید بھائی - اور قیامت کی انھیں آرزو ہی رہ جائے۔

اور وہ کبھی نہ آئے۔

ہاں ـــ تو ایک مرتبہ انھیں بڑی کٹھن منزل کا سامنا ہوا۔ شہانہ مجھ سے کہنے لگی میں اپنی ایک عزیز سہیلی کو ایک انوکھا، تحفہ دوں گی۔

ایک دل نما دوات اور اس کو لگا ہوا قلم۔ جس کی شکل تیر کی سی ہو۔ رنگیلا کیوپڈ - یعنی اس کا مجسمہ -- وہ اب اس کے نزدیک ایک فرسودہ سی چیز ہو گئی تھی۔

ویسے تو آج کیوپڈ کا تصور نہ ہوتا تو دل اور تیر کا قصہ ہی کہاں ہوتا۔

غرض وہ مصر تھی کہ میں دل ہی بنوا دوں

ہزار کعبے بنتے رہینگے لیکن اس کا دل بن جائے سب سے پہلے۔

اب مجھے کہاں اتنی فرصت ہے زندگی میں کہ دل بنانے کی خدمت انجام دیتی پھروں

شہاب

میرا ہی اپنا دل اتنا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے
کہ اس کو جوڑنے کی مہلت نہیں ملتی
— اس کا کیا ہے۔ یہ تو آئے دن
ٹوٹتا رہتا ہے۔
دل کوئی شیشہ تو نہیں جو ٹوٹنے
میں آواز دے۔ اور یہ تو خود اتنا بودا
اور نکما سا ہے کہ جو ذرا ذرا سی بات،
بلکہ محض اشارے پر دیکھتے دیکھتے گھڑی
بھر میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔
اب تک تو "بت گر" "شاعر گر" وغیرہ
قسم کے الفاظ نے ہماری شاعری کو
مصور کر دیا تھا۔
لیجیے جاوید بھائی "دل گر"
ہوئے جاتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔
تو اس طرح اس کی ساری ذمہ داری
میں نے ان کے سر تھوپ دی اور خود
الگ ہو گئی ہے۔
پہلے تو اس پر انھوں نے خود ہی مشق
شروع کی۔ بھابی سے پاؤ بھر آٹا لیا
وہ جھنجلاتی رہ گئیں کہ ارے یہ کیا
بچوں کی سی حرکتیں ہیں۔ کیا منڈ کلیا
کھیلو گے۔ پہلے ہی گیہوں نہیں ملتے اور
آپ کو شاعری سوجھی ہے۔

بہن شہرت ۱۳۵

بھابی بیچاری ہماری بڑی بھولی بھالی ہیں
لیکن کیا کریں۔ یوں ہی بھڑاس نکال
لیتی ہیں۔
کوئی صبر ایوب تو نہیں لائیں اپنے
ساتھ۔ ان کے کرتوتوں کا رد عمل
اس طرح ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی حد امکان
تک جاوید بھائی کا دل چھلنی کرتی رہتی
ہیں۔
مگر یہ بڑے زندہ دل ہیں۔ کبھی ابرو
پر بل نہیں آیا۔ ویسے ہی دل کے ٹوٹنے
کی آواز کب آتی ہے۔
بھابی کیا جانیں کہ دل کیسی
باتوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا
اپنا دل کبھی جاوید بھائی نے نہیں
توڑا۔
وہ ہماری بھابی کو ایک دیوی سمجھتے
ہیں۔ اور ہیں بھی ہماری بھابی ایک
دیوی۔
بھابی نے جب دیکھا کہ یہ انسان
تو بڑی ٹھنڈی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ قدرت
اس کے سینہ میں دل رکھنا ہی
بھول گئی ہے۔ اور وہ بس مشق ناز کرتی
رہتی ہیں خون دو عالم ان کی گردن پر۔

قیدِ زندگی

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں"

نگہت نسرین عثمانیؔ

آدھی رات ہونے کو ہے لیکن نیند جیسے مجھ سے کوسوں دور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیند کو بھی نیند آگئی ہو۔ جانے کیوں آج تنہائی سے طبیعت اُکتا سی جارہی ہے۔ ویسے تو تنہائی ہی میری سب کچھ تھی۔ میری ہمدرد، میری رفیق، میری غمخوار، جتنی پیار سے چاہوں اُسے مخاطب کرلوں۔ میری اپنی چیز جو ہوئی۔ انیسؔ بھی شائد میرے ہم خیال تھے کہتے ہیں

تنہائی میں کون ہو گا انیسؔ   ہم ہونگے قبر کا کونا ہو گا"

اے کاش! بقول فانیؔ میری قیدِ حیات کی زنجیریں ہی بدل جائیں۔ پر نہ جانے کیوں کسی کو جلا جلا کے مارنے میں مزہ آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کیا میری قیدِ حیات کی زنجیر بدل جانے میں مطمئن ہو جاؤنگی؟ جگرؔ مراد آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

قیدِ ہستی سے کب نجات جگرؔ
موت آئی اگر حیات گئی

ہو سکتا ہے کہ زندگی شائد رہ رہ کر تڑپ جانے کا نام ہو ایک کرب ——— ایک بےچینی کے ساتھ دماغ کے کسی کونے سے ہر وقت یہ صدا گونجتی رہتی ہے کہ "عورت کی زندگی ایک مسلسل قید ہے" ——— یوں تو امی کو مجھ سے کتنا پیار تھا لیکن ہر وقت بھیا کے آگے وہ ماند پڑ جاتا ——— بھیا آئے دن حکم چلاتے رہتے اور میں ۹ میں ایک فرمانبردار بہن کی طرح ان کی ہر خواہش کی تکمیل کرتی ——— کالج کے ہنگاموں سے تھک کر جب میں ستانے کے لئے مسہری پر دراز ہوتی تو عین اسی وقت بھیا کی آواز کانوں میں پہونچتی ——— ارے بی شمو! فوراً سے ہمارے دوستوں کیلئے پان بنادو۔ دیکھو کہ بھجوانا ——— سمجھیں!! وہ تو چلتے بنے۔ انھیں کون بتائے کہ بھیا آج پان کسی اور سے بنوائیے گا۔ ہماری طبیعت پست ہے۔ کہ نہ کسی طرح اٹھنا ہی پڑتا ——— اگر کسی دن حکم کی تعمیل نہ کی تو فوراً امی سے شکایت ہو۔ باقی

دانت جو سہنی پڑتی۔ پھر بھیا کا بھی تو دھیان رکھنا پڑتا — وہ الگ بھول جاتے نا — غرضیکہ
چھوٹا راشد بھی اسی طرح تنگ کیا کرتا — برا ہو یہ محبت کا — کبھی اس کی طبیعت خراب ہو جاتی
تو راتوں کی نیند حرام ہو جاتی — لیکن کبھی کسی وقت راشد میاں کی مرضی کے خلاف کوئی بات
ہوئی اور وہ ستانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگے۔ آن کی آن میں میری عزیز ترین کتابیں اور
میرے البم سیاہی میں ملبوس نظر آتے — امی فوراً ہنس دیتیں۔ اور کہتیں شمیم چھوٹے بھائیوں
کی ضد ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ انھیں کون سمجھائے کہ امی مجھے وہ چیزیں کتنی عزیز تھیں
غصہ پی لینا پڑتا — عورت کے جنم میں جو ہوئی !! — امی ہر وقت فکر میں رہتیں کہ
جلد سے جلد میرے عزیز ترین گھر، جہاں میں نے اپنی زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھی
تھیں، جس کا ذرہ ذرہ میرے لئے عزیز تر تھا، جدا کر دیا جائے — غرضیکہ اب مجھے
اپنی قید میں قدم رکھنا تھا۔ جس کے بھیانک تصور سے روح کانپ اٹھتی — دل چاہتا
تھا کہ کسی طرح امی سے التجا کروں کہ آپ مجھ سے اتنی بیزار کیوں ہیں۔ لیکن یہ تو دنیا کا دستور
ہی جو ٹھہرا — ویسے بھی لڑکیوں کا منہ کھولنا سماج کی نظروں میں کس قدر شرمناک تخیل ہے
بس! آپ بے زبان گائے کی طرح بر دان چڑھا دی گئی — یہ نیا گھر اور یہ نئی قید میرے
لئے ازحد آزمائش کی جگہ تھی۔ ہر ایک کا دل رکھنا پڑتا اپنے گھر میں تو صرف اپنے
ہی تھے۔ ان کی خدمت کی مہارت بچپن سے تھی۔ پر یہاں تو کبھی کسی قسم کی اونچ نیچ ہو جاتی
تو سارا انتظام درہم برہم ہو جاتا — ہر ایک نظر بچانے کی کوشش کرتا۔ اب بھلا ان طعنوں
اور نظروں کی تاب کون لائے — پہروں دعاؤں میں مصروف رہتی کہ کاش اس قید میں
بھی کوئی نجات کی صورت نکل آئے۔ اپنوں کی یاد سے دل بیٹھ بیٹھ جاتا — اپنے پھر اپنے
تھے — لیکن رنجیدہ عورتوں کی دعاؤں کی بھی کچھ وقعت نہیں — چند سال کی
پیہم کوششوں کے بعد یہ نئے گھر کو میں اپنا گھر سمجھنے لگی۔ ہر ہر بات پر مجھے ہر چیز کی
قربانی دینی پڑتی — جس کو میں صبر اور مسکراہٹ کے ساتھ اپنے میں ہضم کر لیتی — لیکن قدرت
کی ستم ظریفی کیا کہیے۔ مجھ سے یہ گھر بھی چھین لیا گیا — ہاں ایک معصوم بچے کے ساتھ اس دنیا
میں بالکل تنہا تھی۔ اب بھلا غم میں کون کسی کا ساتھی ہوتا ہے۔ سب اچھی نظروں سے دیکھنے

والے، محبت کا دعوٰے کرنیوالوں نے منہ پھیر لیا۔ اور اب میں ہر طرح آزاد تھی، لیکن اس آزادی میں ایک مسلسل قید پنہاں تھی — یہ زندگی کی قید!! — میں جی رہی تھی ایک بے حس مردے کی طرح — میری زندگی کا واحد مقصد یہ تھا کہ میں ایک معصوم زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھوں۔ میری کوششیں بیکار نہیں گئیں۔ میرا ننھا سا پودا سرسبز و شاداب لہلہانے لگا۔ میں اُسے دیکھکر پھولے نہیں سماتی — مسلسل تکالیف میں بھی ایک مسرت سی محسوس کرتی۔ لیکن شائد قدرت کی اس میں بھی کوئی چال تھی۔ عین اس وقت جبکہ اس میں پھل اور پھول آنے کو تھے۔ میری زندگی کا واحد سرمایہ، میری آرزوں کا چراغ، میری تمناؤں کا مرکز، مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھین لیا گیا۔ اب میں بالکل تنہا ہوں۔ بالکل تنہا — میں ایک ایسے راستے پر جا رہی ہوں جس کا ذرہ ذرہ مجھے بھیانک نظر آرہا ہے۔ جس کی ہر منزل پر آکر میں منزل بھول رہی ہوں۔ دردؔ نے بھی کیا خوب کہا ہے — ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چکے

میری بے چینی اس بات کا پیام دے رہی ہے کہ شائد اس قید کا سلسلہ بدل جانے کو ہے۔ اے کاش ایسا ہو جائے — ؎

دیکھئے اب موت کیا لاتی ہے میرے واسطے
زندگی تو لائی تھی معیادِ غم میرے لئے

۔ بقیہ سلسلہ ص ۴۲) ہوتی چلی ہے بقول شخصے یہ کہنا چاہیے کہ یہ بیمار رسم ابھی فیشن میں داخل ہو گیا ہے ہمارے ملک کی معاشی حالت عام طور پر اس قدر اچھی نہیں ہے کہ اس اسراف کو برداشت کر سکے۔
اس کے علاوہ آبادیوں کی مصاحبت سے بہت سے جھگڑے فسادات پیدا ہو کر ازدواجی زندگیاں تلخ ہوتی جاتی ہیں غرض کہ ان خرابیوں کی وجہ سماجی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ اس جانب فوری توجہ کی جائے۔
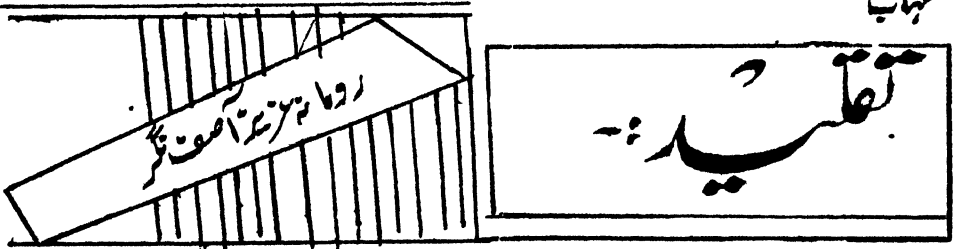
خواتین کے لئے یہ ضروری مسئلہ ہے اور آپ اپنے خیال میں آزادانہ رائے دیجئے اگر کسی بحث کو اٹھائے تو تاوقتیکہ اسکو تسلیم نہ کریں خاموش نہ رہیں۔ اس طرح سے تمام بدترین رسوم کی اصلاح ہوسکے گی کیونکہ ایسی کورانہ تقلید کی بدولت ہماری معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔

دور حاضرہ میں متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں جو معاشرتی انقلاب رونما ہو۔ اُس سے ہمارا ملک بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس جدید معاشرتی نظام یا نئی روشنی کی تیز شعاعیں ہمارے ملک میں پہونچیں اور صدیوں کی پرانی قدامت پسند شمع کی روشنی اس کے مقابل نہ ٹھیر سکی نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تہذیب اور معاشرت کو اس انقلاب کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا۔ اگر ہم اپنی موجودہ معاشرت کا مقابلہ قدیم معاشرت سے کریں تو معلوم ہوگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے حالات میں کسقدر انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔

یورپ اور امریکہ نے اکثر مسائل پر برسوں سیر حاصل بحثیں کر کے بال کی کھال نکال کر محیرالعقول لٹریچر ہر شعبہ زندگی کے متعلق پیش کیا ہے۔ ہمکو دوسروں کے تجربوں سے سبق حاصل کرنا اور انکی اچھائیوں کی تقلید کرنا چاہیے۔ اسلئے کہ تقلید بذات خود بری نہیں۔ البتہ اندھی تقلید ضرور بری ہوا کرتی ہے۔ اس سے جسقدر پرہیز کیا جائے کم ہے۔ چونکہ اچھی باتوں کی بہ نسبت بری باتیں زیادہ جاذب نظر اور سہل ہوا کرتی ہیں اس کے علاوہ ہم یورپ پر جو نظر ڈالتے ہیں وہ انتہائی سطحی ہوا کرتی ہیں۔ اسلئے بہت جلد ہم اندھی تقلید میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً یورپ کی جن چیزوں پر سب سے پہلے ہماری نظر پڑتی ہے وہ وہاں کے لوگوں کا ظاہری رکھ رکھاؤ طرز زندگی لباس، فیشن، وغیرہ ہے جن سے ہماری نظریں متاثر ہوتی ہیں اور ہمارے دل میں بھی ان کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور ہم ان کی تقلید میں کلب وغیرہ قایم کرتے اور طرز جدید کے کپڑے ماہرین سے تیار کروا کر زیب تن کرنے لگتے ہیں۔ یہ ہیں سطح بینی کے نتائج۔ اگر ہم کلب کی گھڑیوں میں بیٹھکر

جس کے جوڑنے کو دن لگیں۔ اب اس دل کی زلف کے سر ہونے تک دیکھئے کیا کیا ہوجائے

چاندی کا دل بھی بن گیا۔ جاوید بھائی کی میز پر رکھا رہا۔ کوئی ہفتہ عشرہ بھر تو وہ خود اس کو گھورتے رہے۔ ان کی محنت کا انجام۔ کتنا شاندار تھا۔ ایک دل کی شکل میں۔ ادھر سے بحالی آنے لگیں۔

"ارے ادھر نہ آجانا۔ یہ دم ہے تم سے یہ سب جھوٹ۔ جیسے کسی چور کو کوئی چوری کرتے دیکھ لے۔ ادھر جاوید بھائی کا دل۔ ان کا اپنا دل۔ چاندی کا دل نہیں۔ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ میں نے بھی آواز سنی اس دھڑکن کی کیا ہوگا سبب۔ نہیں معلوم۔

اور وہ تیر کا قصہ تو رہ ہی گیا۔

شہانہ نے دل پاکر جاوید بھائی کو جواب دیا۔

کعبہ اگر یہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصر دل نہیں جو بنایا نہ جائے گا!

آج میر - ہوتے تو کتنے خجل ہوتے۔

مکتوباتِ جمیلؔ

!— راحیل —

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہے
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے

سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا۔ اس کی حسین کرنیں فضا میں چھائے ہوئے کہر کے بادلوں کو چیرتی، شبنم آلود پھولوں اور پتیوں پر مدہم ۔ مدہم سے نقش و نگار بنا رہی ہیں بادِ صبا کے نکہت با خوش جھونکوں سے شعریت ابلی پڑ رہی ہے۔ آج کئی دن کے بعد طبیعت کچھ سنبھلی ہے تو تمہیں خط لکھ کر پریشان کرنے کے جنوں نے پھر سر اٹھایا۔ ؎

در حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا۔

فضا کے نکھار اور جوبن کو دیکھ کر تو یوں لگ رہا ہے جیسے آج کی یہ صبح نکہتوں کے گہوارے میں جھولتی اور مسرتوں کی لہروں میں بہہ رہی ہو۔ ایسی حسین صبح اور تمہاری یاد کا دل میں ایک چٹکی لے کر اسے تڑپا دینا۔۔ کتنا حسن ہے اسکی ستم ظریفی میں بھی۔ !

تم کو تو میں نے بھلا دیا۔ لیکن تمہاری یاد بھلا اس کو بھول سکتی ہوں ۔۔ انسان کی فطرت ہے کہ جسقدر وہ کسی کو بھلانا چاہتا ہے اسی قدر اسکی یاد حافظہ میں ابھرتی جاتی ہے۔ چاہتی ہوں کہ جسطرح تمہیں بھلا دیا۔ خواہ وہ مجبور ہو کر ہی سہی۔ تمہاری یاد کو بھی اس دل سے نوچ پھینکوں۔ کیونکہ تمہاری یاد سے دماغ میں ایک طرح کی الجھن ایک قسم کی کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ لیکن۔ ع۔

اے لبِ آرزو ہے خاک شدہ

کچھ یاد ہے تمہیں، میرے کتنے خط تمہاری خدمتِ ناز میں پہنچ کر میری نیاز مندی کی یاد دلا چکے ہیں۔ مگر اللہ رے تمہارا معشوقانہ اغماض۔ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب ہیں۔ اور اس طوفان خیز ہیجان کا جواب تمہارا خاموش عتاب۔!! تو پھر " کس سے محرومیٔ

قسمت کی شکایت کیجیے"۔

سوچتی ہوں جب تم نے میری یاد کو بھی حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ کیوں تمہیں خط لکھ لکھ کر پریشان کروں۔ مگر ذرا۔ اس دل کی نادانیاں تو دیکھو۔ "پھر وہی اگلی سی مہربانیاں"، پیا ہے ہی سہارا دے کر بے سہارا کر دینے والوں کو جھنجوڑ کر رکھ دینے کو کہتا ہے۔ "سوز نہاں سے بے محابا جل گیا" پھر بھی۔ وہ "اگلی سی مہربانیوں" کا حسرت زدہ ہے۔ یہ کیسا پاگل پن ہے اس کا جیسے نادان بچہ چاند کے لئے روئے۔ ارے اسکے تیکھے پن پر مت جاؤ اسے حاؤ

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

اس دن تم سے کالج میں پل بھر کے لئے ملنا ہو گیا تھا۔ میں خیال کرتی تھی کہ تم ملو گی تو میرے دل کی خلش مٹ جائیگی۔ قلب کو اطمینان میسر ہو جائے گا۔ اس گھڑی بھر کی ملاقات نے تو آتش شوق کو بجائے سرد کرنے کے اور زیادہ بھڑکا دیا۔ خوابیدہ تمنائیں پھر ایک بار جاگ اٹھیں۔ جی چاہتا ہے گھنٹوں تمہیں اپنے سامنے بٹھائے رکھوں۔ کسی ہندو پجارن کی پاربتی دیوی کی طرح۔ تمہارے من موہ لینے والی باتوں میں اپنے کو ہمیشہ کے لئے کھو دوں۔ مگر اللہ میری یہ آرزو!! کیسی حماقت آمیز ہے۔

مجھکو گوارا اپنی حیات غم کی اک اک گھڑی
کاش ہر ایک گھڑی کا احساس گوارا ہو جاتا

یوں بھی اب اس دل میں تم ہی ہو۔۔ اور صرف تم۔ !! تمنائیں تو آنسوؤں میں جذب ہو کر بہہ گئیں۔ اب میں ہوں اور ایک تنہا آرزو۔!!

درس و تدریس کے دوران میں تم کہتی ہو، ایم اے کا امتحان دے ڈالوں بہن، اچھا سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ مگر لکھنے سے پہلے اک ٹوٹی پھوٹی بسری یاد کا سہارا لیا ایک نظر میری بگڑی ہوئی صحت پر بھی تو ڈالی ہوتی۔ اسے تو پہلے ہی تمہاری انجان سی اور بے التفاتی نے گھن لگا دیا۔ اب تم ہی جیون کی طرف سے مایوس ہو کر قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا تو دو ہی مہینہ میں رستے اپنے دامن کی ہوا دے کر مجھے اپنا لیا۔ کیسا پیار ہے اسکو مجھ سے۔ پل بھر کی بھی تو جدائی اسے گوارا نہیں۔ اور اب تو ڈاکٹر نے نادری حکم کا

پروانہ بھی اسے مل گیا۔ پلنگ پر ایک مردہ کی طرح سارے دن پڑی رہتی ہوں۔ ہلنے جلنے کی اجازت نہیں۔ کتاب دیکھنا تو ایک طرف رہا اپنی حالت پر ماتم کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ کیسی پابندیاں ہیں میرے اللہ!! صبوحی سے تمہارا ذکر آیا تو کہنے لگی — تم تو راحیل پر مرمٹیں اور اس نے تمہاری خبر تک نہ لی — ہمت نہ تھی کہ بحث کرتی۔ یہ شعر سنا دیا ؎

کیوں نہ دعائیں دوں اُسے جس نے کہ دل دکھا دیا — روح تڑپ تڑپ اٹھی درد نے وہ مزا دیا

بیچاری صبوحی — کچھ نہ سمجھی — بچی وہ کیا جانے دردِ الفت کے مزے۔ مگر اب تو

"آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا"

کل کسی نے میرے زرد اور بیمار چہرے کو دیکھکر یوں عیادت کی۔ ؎

رنگِ رخ نکھر آیا بارِ غم اٹھانے سے

میں مسکرا دی — کل دن تمام لوگ مزاج پرسی کے لئے آتے رہے — اُدھر جس کی عیادت کے مزے لینے کو جی چاہتا ہے وہی مسیحا چپ ہے۔ یہ تو پھر بھی عیادت کے بہانے اپنا مزاج دکھانے والے — ہم میں سے کتنے ہیں جو حقیقت میں عیادت کر جاتے ہیں۔ بیمار تو خیر مردہ بدست زندہ ہوتا ہی ہے۔ تیماردار بیچارے الگ تھکے ماندے حیران و پریشان — ایسی حالت میں اپنی آؤ بھگت کی توقع رکھنا — انسان ہوتے ہوئے بھی اکثر لوگوں میں انسانیت نہیں ہوتی۔ اب تو جی — "دیکھ کر طرزِ تپاک اہلِ دنیا جل گیا" اس راکھ کو بھی جانے کس کی پھونکیں اڑا دیں — !! تمہیں تو شاید ابھی اپنی معشوقانہ اداؤں سے اتنی فرصت کہاں کہ کسی مرے ہوئے کی خبر لے — بہت ممکن ہے تمہیں اُس وقت خیال آئے میرا، جب مجھے اس کی ضرورت بھی نہ رہے۔ اور میں عالمِ بالا کی کھڑکی سے تمہاری حالت دیکھ کر یہ شعر گنگناؤں۔ ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

تمہاری ثریا

ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی ـــــ جاوید بھائی
نے آٹے کا دل بنایا۔ وہ کچھ ٹھیک سے
نہیں بنا۔ یعنی دل ٹوٹ کر بھی خوبصورت
ہو جاتا ہو گا۔ لیکن یہ ایک بے ڈھنگا سا
ہو گیا۔ بھابی کو ان کی ایسی حرکات پر
بجائے ہنسی کے غصہ آجاتا ہے۔

انھوں نے آخر تنگ آکر پوچھ ہی لیا
یہ آخر کیا بن رہا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں!
جاوید بھائی خفیف سے ہو گئے۔ کچھ بھی
نہ سدھرا انھیں اس وقت۔ وہ رونی
صورت بنا کر میری طرف دیکھنے لگے التجا سی
تھی آنکھوں میں ـــ کہ خدا کے لئے
کچھ کہہ نہ دینا۔

بھابی کو ذرا اس کی بو باس بھی
مل جائے کہ یہ شبانہ کے لئے دل کی
معماری ہو رہی ہے۔ تو پھر دیکھئے۔
خیریت نہیں جاوید بھائی کی۔ انھوں نے
چاہتے چاہتے کہا۔ تو یہ کہا۔ بلکہ
کچھ نہ کہہ سکے۔ کھسیانی ہنسی ہنس دی
اور بس۔

رات بھابی کی ایک سہیلی نے انھیں
"مہندی" فلم دیکھنے سیکنڈ شو پر مدعو
کیا ـ بھابی نے کہا چلئے نا آپ بھی
ہم سب ہی مل کر یہ فلم ایک ساتھ دیکھ لیں
سنا ہے یہ فلم مردوں کے دیکھنے کا ہے
لیکن بھابی کے ترکش کے سب تیر
بیکار گئے۔

نہ خوشامد چل سکی نہ التجا۔ کیونکہ جاوید
بھائی کیلئے ان کی غیر موجودگی کے یہی دو
گھنٹے 'دل گری' کے مشغلہ کو کافی تھے۔ دل
کی تشکیل میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ لیکن یہ
آٹے کا دل تھا۔

دو گھنٹے کی مشقت کافی تھی کتنا
شاعرانہ مشغلہ تھا۔
بھلا اس کو چھوڑ کر فلم دیکھنا۔ کیا
ایسی ضرورت تھی بھلا۔؟

انھوں نے کہا "تم چلی جانا"
مجھے ایک رپورٹ تیار کرنی ہے
بھابی بہت زیادہ الجھ گئیں۔
نصف بہتر کی یہ توہین ہو نصف
کمتر کے ہاتھوں۔
عورت اپنی شکست گوارا نہیں
کر سکتی۔

بھابی میں تو مکمل نسائیت بھری ہے
بس آپ کو تو میرے ہی ساتھ آنے
جانے میں عذر رہا ہے۔ دنیا کے کاموں

میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مجنوں کے
حجاب بنے ہوئے۔
اور میں اگر کچھ کہوں تو فوراً سے پیشتر
ایک نامعقول سی چپ لگ جاتی ہے۔
یا کوئی بھونڈا سا مہمل عذر تراش لیا
جاتا ہے۔
اب میں آیندہ کبھی کسی خواہش کا
ان سے اظہار نہ کرونگی۔ خصوصاً ساتھ چلنے
کو کبھی نہ کہوں۔
آٹے کے کھلونے بنانے میں وقت
ضایع نہیں ہوتا۔ اُس وقت رپورٹ
ڈیپوٹ کا خیال نہیں ستاتا۔
میں سب سمجھ رہی ہوں۔ کچھ کم عقل
ناسمجھ نہیں جو چپ رہیگی۔ زبان خنجر لہو
پکاریگا آستین کا۔
لیکن ایسے عہد بھابی نے لاکھوں
توڑے ہیں۔ ان کا بھی دل جاوید بھائی
کے ان شاعرانہ و غیر شاعرانہ مشغلوں
نے چکنا چور کر دیا ہے۔
غرض خوب چمکیں۔ خوب گرجیں،
خوب برسیں۔ لیکن جاوید بھائی کا دل
تو آٹے کے دل سے زیادہ ٹھنڈا تھا۔
کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ جو تک لگی ہی نہیں

میرے دماغ میں یہہ شعر گھومنے لگا۔
تم برستے رہے سر محفل
کچھ بھی میری زبان سے نکلا
بھابی چلی گئیں۔ انھیں تنہا چھوڑ کر۔ وہ
سمجھیں اپنی دانست میں کہ یہ بہت بڑی
سزا ہے۔ ان کے لئے۔ اور یہاں۔ منہ
مانگی مراد مل گئی۔
اب انھوں نے آٹا لیا اور دل گھڑنا
شروع کیا۔ آٹا کم خرچی میں اور پتلا
پتلا ہو گیا۔
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
اب جاوید بھائی بوکھلائے۔ پاؤ بھر آٹا تو
کتنی منت خوشامد سے ملا تھا۔ اور آٹے
تو کہاں سے آئے۔
کنجیوں کی حفاظت بھابی بہت زیادہ
کرنے لگی تھیں۔ اور وہ جہاں جاتیں ان
کے ساتھ لگی رہتیں۔
لو اسلیماً سے کہا۔ برا سا منہ
بن کر۔ "سلیماً بوا اب کیا کروں
تھوڑے سے آٹے کی ضرورت ہے۔
سلیماً ان کی التجا سے بہت متاثر ہو گئی
اور ان پر ترس کھا کر اپنے ناشتہ کا
آٹا دے دیا۔ میں بول اٹھی۔" اور سلیماً

تم صبح بھوکی رہو گی؟
بھابی تو ہرگز تمہیں آٹا نہ دینگی۔ آیندہ
کی سوچو۔"
جاوید بھائی نے مجھ پر آنکھیں نکالیں۔
جیسے میں ہی ساری خرابی کا باعث تھی۔
خیر تو آٹے کا اور معاملہ دل بنا
اور صبح سنار سے، چپکے چپکے، بھابی کی
چوری سے کچھ کھسر پھسر ہونے لگی۔ کہ دیکھ
اس نمونے کی دوا بنا دے۔ جو مزدوری
ہوگی میں دلوا دوں گا۔
سنار ہنسنے لگا۔ صاحب میری
سمجھ میں نہیں آرہا ہے یہ آپ نے کیا چیز
بنائی ہے۔
کوئی ٹھیک سے نہ بنا دیجئے۔ میرے فن
پر حرف آتا ہے۔
جاوید بھائی نے سنار سے التجا
کی۔ بہترین قسم کا بنا دے۔ میں خود تجھے
انعام دونگا۔
لیکن سنار نے یہ لینے سے انکار
کر دیا۔
اب بھیا بہت سٹ پٹے تھے۔ خواب
میں بھی وہ دل بنانے لگے تھے۔ صبح ہونے
تک سپنے بھی ٹوٹ جاتے۔ ساتھ ہی ساتھ
دل کے ٹکڑے بھی بچا لیجاتے۔
کسی کسی کے لئے تو دل کی طرف توجہ کرنا
اس کے متعلق کچھ سوچنا، محض زخموں
کا کریدنا ہو جائے، اور وہ بے کیف
سی مصروفیتوں میں خود کو الجھائے رکھے
دل جیسے ہے ہی نہیں پہلو میں۔
جہاں اس کو سوچا اور دبے ہوئے
زخم ناسور دینے لگے۔ ٹیسیں شروع ہوئیں
اور ان حضرت کو اس کا بنانا بگاڑنا
ایک کھیل ہو گیا۔
انھوں نے سوچا۔ نہیں ایک
ترکیب ٹھیک رہے گی۔
اور وہ آرٹس کالج کے پرنسپل سے
ملنے ان کے کالج پہنچے۔ پرنسپل صاحب
نے پہلے تو ان کے شاعرانہ تخیل کی داد
دی۔ بہت سراہا۔ اور وعدہ کیا کہ
ضرور بنوا دینگے۔ ایک پلاسٹر آف
پیرس کا دل ہے

بہت دل چاہیں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک
نکل کر چاہ کنعاں سے ابھی رہنا ہے زندان میں

چار پانچ روز کی محنت و دردسری
کے بعد آخر پلاسٹر کا دل تیار ہو گیا۔ جاوید
بھائی خوشی خوشی سے وہ دل لئے میرے پاس

ئے اور دیکھا شہانہ کی فرمائش پوری
ہوئی جاتی ہے۔
تم نہیں جانتیں میں نے کتنی محنت
کی ہے۔ اسکے پیچھے۔ کیا کیا تکلیف اٹھائی
ہے۔ تمہاری بھابی کے طعن الگ سوہان
روح۔ خواب میں بھی۔ سنا میری زبان سے
ــ دل۔ ارے نہیں ایسا بنا۔ یوں نہیں
۔ یوں بنتا ہے دل۔
اس نوعیت کے بے معنیٰ سے الفاظ
نکل جاتے ہیں۔
تمہاری بھابی نے سن لئے ہیں اور
وہ خواہ مخواہ بدگمان ہوئی جاتی ہیں حقیقت
کو سوچو تو کتنی معصوم سی خواہش ہے۔
ذرا اس لفظ "خواہ مخواہ" پر
آپ ہی غور کیجئے۔!
میں نے کہا۔ ہاں جاوید بھائی۔
زندگی کا جام تجربوں سے لبریز ہو جائے
تو اچھا ہے۔
خالی شکر سے ہی زندگی کی دلکشی
تیار نہیں ہوتی۔ جتنی تلخیاں ہوں زندگی
میں اتنی ہی میٹھی اور رسیلی ہوئی جاتی ہے
آپ اب تک سمجھ نہ سکے زندگی کو۔ بس
دل کے پیچھے ڈنڈا لے کر چلے ہیں زندگی

کی معمولی معمولی باتیں بھی سوچئے تو کتنی غیر
معمولی معلوم ہوتی ہیں۔
شہانہ کو بھیجد یا گیا یہ پلاسٹر کا دل ــ
وہ مسرت سے ناچنے لگی۔ جاوید بھائی
کو بہت اچھا سا خط لکھا۔
دل بے حد۔ بے حد پسند آیا۔ دل موم
کا بھی ہوتا ہے۔ اور فولاد کا بھی۔ اس کی
صفتوں میں تضاد ہوتا ہے۔ لیکن آپ
نے اس کی نزاکتوں کو بہت اچھی طرح
سمجھا۔
آپ کی تجسس اور مہربانی کا شکریہ اس
جنم میں تو میرے بس کا روگ نہیں۔
اور وہ تو اس جنم کو چلی گئی بس
کا روگ سوچتے۔
ادھر جاوید بھائی کو جیسے دنیا مل گئی
اپنی محنت کا ایک شاندار صلہ۔ کتنی بلیغ
سی عبارت تھی وہ بہت سراہا انھوں نے
اب اس دل کے پیچھے جاوید بھائی بری
طرح پڑ گئے تھے۔
نقروی دل جو انھیں بنوانا تھا دلوں
کی بہار جس دل میں کہیں نہ ملے۔ نجانے
اس کے بنوانے میں اتنی تاخیر کیوں ہوتی
جاتی تھی ــ کوئی ٹوٹا ہوا دل بھی تو نہ تھا

دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کلب کے کیا کیا مقاصد و فوائد ہیں وہاں پر کلب میں جو نئی نئی وضع کے
لباس نظر آتے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی خوش حال خواتین ایک دوسرے سے سبقت
کی کوشش میں (جو عورت کی فطرت ہے) اپنی جدت نگاری سے کام لیکر اوقات فرصت میں نئی نئی جدتیں
پیدا کرتی ہیں جس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا بہتر اوقات اچھا گذرتا ہے اور دوسرا یہ کہ اپنا کام آپ
کرنے سے کم خرچ بالانشین ہوجاتا ہے اسکے برخلاف جب یہی اندھی تقلید ہندوستان ہی سے کیجاتی ہے
تو ماہرین کی تلاش میں ایک کے چار خرچ کرنے پڑتے ہیں افسوس ہے کہ ہماری بہنیں ان امور کی
جانب توجہ نہیں کرتیں اور لباس کے بارے میں مردوں کے رہین منت رہتی ہیں۔ امراء ان
کے لئے جس قسم کا لباس وضع کردیں یہ انکو پہن کر اکڑتی پھرتی ہیں۔ حالانکہ لباس اپنی پسند اور اپنے
خیالات کے موزونیت کا ہونا چاہیے نہ کہ دوسروں کے یا دل نخواستہ وضع کیا ہوا۔ اگر خود اپنا
لباس آپ وضع کریں تو ظاہر ہے کہ ذاتی دلچسپی کے باعث زیادہ اچھا ہوگا۔ کاش ہماری تعلیم
یافتہ بہنیں مردوں کے وضع کئے ہوئے فلم اسٹارس کے لباس کی نقل کروانے کے بجائے اپنا لباس
آپ وضع کرکے اپنے نسوانی مذاق کے نمونے پیش کریں۔ یورپ سے کئی ایک رسائل نسوانی دلچسپیوں
جیسی لباس وغیرہ کے متعلق نکلتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں انکا کال ہے۔ آجکل کچھ پرچے ایسے بھی
نکل رہے ہیں جنکے اڈیٹر خواتین ہیں لیکن ان پرچوں کے مضامین ہوتے ہیں سیاسی۔ یا گرے ہوئے مذاق
کے افسانے اور غزلیں جو تقریباً تمام کے تمام مردوں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

لباس کے بعد اگر ہم گھریلو زندگی پر غور کریں تو یہ مرض عام نظر آیگا کہ ہر گھر میں ضرورت سے زیادہ
نوکروں۔ مثلاً آیا، چھوکرا، باورچی، ڈرائیور وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام بھی یورپ کی اندھی تقلید کا نتیجہ
ہے۔ یوروپین ممالک میں چونکہ خواتین بھی فکر معاش میں مبتلا ہوا کرتی ہیں اس لئے بچوں کی دیکھ بھال
وغیرہ کے لئے آیا وغیرہ رکھی جاتی ہیں اور اپنی بہتر صلاحیتوں کو گھریلو کاموں کے بجائے دوسرے مفید اور فائدہ
مند قومی کاموں میں صرف کرتی ہیں ہماری خواتین پر فکر معاش کی ذمہ داری کا کوئی سوال ہی نہیں لیکن
لیکن وہ اندھی تقلید اور سطحی نظری کے باعث یہ ضروری سمجھتی ہیں کہ گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کے لئے
آیا کا ہونا ضروری ہے ہماری خواتین کو نہ لباس سے کوئی دلچسپی اور نہ گھر میں کام کاج سے تعلق اور نہ کوئی
دوسری مصروفیت۔ بیکاری کی وجہ انکا اکثر وقت ماما ئیوں آیاؤں سے فضول بکواس میں صرف ہوتا ہے
انسان کے لئے بیکاری بری بیماری ہے جسکی وجہ ان میں بھی آئے دن بیماریوں کی کثرت (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵)

رجسٹرڈ آصفیہ ۱۲۲

محمودیہ مشین پریس چار مینار میں چھپ کر دفتر شہاب پیر پورہ سے شائع ہوا